نے بہ یک وقت حیرت اور کوفت محسوس کی۔ معظم تارڑ اس سے ملنے کے لیے یہاں تک آجائے گا، اسے قطعی امید نہیں تھی اور اب وہ آ گیا تھا تو اس کا اس سے ملنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

''اوکے! انہیں اندر بھیج دو۔'' قلبی کیفیت کے برخلاف اسے ایس پی کو باہر سے ہی لوٹانا اچھا نہیں لگا اس لیے جواب کے لیے منتظر کھڑے اہلکار سے بادلِ ناخواستہ کہا۔ وہ اس کا جواب سن کر فوراً ہی پلٹ گیا۔ اگلے لمحے معظم تارڑ کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔

''گڈ آفٹر نون سر! آئی ہوپ کہ اب آپ پہلے سے بہت بہتر ہوں گے۔'' اس نے مہکتا ہوا فلاور بکے بیڈ کے قریب رکھی سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں حالانکہ دشمنوں کی کوشش تو یہی تھی کہ میں بہت عرصے تک بستر سے اٹھ ہی نہ سکوں... لیکن اللہ کا کرم ہے کہ میں بہتر ہوں اور بہت جلد اپنی جگہ پر واپس پہنچ کر کام شروع کر دوں گا۔'' معظم تارڑ کو جواب دیتے ہوئے اس کا لہجہ خود بہ خود ہی قدرے طنزیہ ہو گیا تھا جسے وہ کمال صفائی سے نظر انداز کر گیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

''وائے ناٹ سر! ہم لوگ تو منتظر ہیں کہ آپ آئیں اور اپنی ذمے داریاں سنبھالیں۔''

''انشاء اللہ... وہ تو میں جلد سنبھال لوں گا۔ آپ یہ بتائیں کہ لاہور کسی کام کے سلسلے میں آنا ہوا تھا یا بہ طورِ خاص میری عیادت کے لیے تشریف لائے ہیں؟'' اس نے ذہن میں پنپتا سوال آخر کار کر ہی ڈالا۔

''دونوں ہی باتیں سمجھ لیں۔ اصل میں مجھے وزیرِ اعلیٰ صاحب سے ایک کام تھا۔ کام تو خیر میں ان سے فون پر بھی کہتا تو وہ کروا دیتے لیکن میں نے سوچا کہ ان سے ملاقات کے بہانے یہاں آؤں گا تو آپ کی مزاج پرسی بھی کر لوں گا۔'' معظم تارڑ نے اس کے سوال کا جواب دیا تو وہ محض سر ہلا کر رہ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ تارڑ کی وزیرِ اعلیٰ سے رشتے داری ہے اور اس رشتے داری کے بل بوتے پر وہ ان سے اپنے مطلب کا کام کروا سکتا ہے۔ کام کی نوعیت پوچھنے سے البتہ اس نے تجسس کے باوجود گریز کیا۔

''میرے علم میں آیا تھا کہ محکمہ پولیس کے کچھ افسران کو ایک تربیتی کورس پر دو سال کے لیے بیرونِ ملک بھیجا جا رہا ہے۔ میں نے ان افراد میں اپنا نام بھی شامل کرنے کی درخواست کی ہے۔ میں کچھ عرصے کے لیے اس سیٹ اپ سے نکلنا چاہتا ہوں بلکہ ہو سکتا ہے کہ اگر مجھے بیرونِ ملک کوئی اچھا چانس مل گیا تو میں وہیں سیٹل ہو جاؤں۔ یہاں رہنا اب مجھے اپنے لیے مناسب محسوس نہیں ہو رہا ہے۔'' اس کے سوال نہ کرنے کے باوجود تارڑ نے خود ہی اپنی وزیرِ اعلیٰ سے ملاقات کا سبب بتا دیا۔ اس کی باتیں سن کر شہریار چونک گیا اور غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ کچھ مضطرب اور الجھا ہوا لگ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی خلافِ معمول صورتِ حال سے دوچار ہے۔

''کیا بات ہے تارڑ صاحب! آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟'' آخر کار اس نے تارڑ سے پوچھ ہی لیا۔

''میں اپنے آپ کو یہاں اَن سیف محسوس کرنے لگا ہوں۔ آپ دیکھیں نا کہ حالات کس رخ پر جا رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ کوئی شخص محفوظ نہیں۔ آپ اپنے اغوا کی ہی مثال لے لیں۔ وہ تو آپ کی قسمت اچھی تھی کہ نہ جانے کس وجہ سے اغوا کاروں نے آپ کو آزاد کر دیا ورنہ یہاں تو بندہ غائب ہو جائے تو اس کا کوئی نام و نشان ہی نہیں ملتا۔'' اس نے اپنی پریشانی کا سبب بتایا لیکن شہریار یہ جواب سن کر پوری طرح مطمئن نہیں ہوا۔ اسے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی اور بھی بات ہے جسے تارڑ بتانا چاہتا ہے لیکن جھجک کا شکار ہے۔

''آپ پولیس والے ہو کر خود ڈر رہے ہیں تارڑ صاحب... یہ تو بڑی حیرت کی بات ہے۔'' تارڑ کو ٹٹولنے کے لیے وہ اسے چھیڑنے کے انداز میں بولا۔

''پولیس والے بھی انسان ہی ہوتے ہیں۔ پشت پر سے ہونے والا حملہ وہ بھی نہیں روک سکتے۔ آپ سجاد رانا صاحب ہی کی مثال لے لیں۔ وہ تو مجھ سے بہت اوپر کے افسر تھے لیکن ان کے ساتھ کیا ہوا؟ ان کی وردی ان کی حفاظت تو نہیں کر سکی نا۔'' اس نے گویا دلیل کے ساتھ شہریار کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

''خیر، سجاد بھائی کا تو کیس ہی الگ ہے۔ وہ جن خطرناک مجرموں کے خلاف کام کر رہے تھے، ان کے اختیارات اور وسائل بہت زیادہ تھے لیکن آپ کو کیا مسئلہ ہے؟ آپ تو ایک چھوٹے سے ضلع کا انتظام سنبھالے ہوئے ہیں اور وہاں بھی آپ کی اچھی پی آر ہے۔'' اس نے نہایت نرمی سے ایک بار پھر تارڑ کو طنز کی لپیٹ میں لیا۔

''پی آر وی آر کیا ہوتی ہے سر! طاقتور لوگ ہمیشہ اپنے سے نیچے والوں کو استعمال کرتے ہیں اور جب انہیں لگے کہ یہ بندہ اب ہمارے کام کا نہیں رہا، اسے اپنے راستے سے ہٹانے میں دیر نہیں لگاتے۔'' تارڑ کا یہ جملہ بے حد چونکا دینے والا تھا۔ شہریار نے اس کا اشارہ سمجھ لیا تھا۔ تارڑ کو استعمال

کرنے والا طاقتور شخص صرف ایک ہی تھا۔ چودھری افتخار عالم شاہ... اور تارڑ کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے چودھری کی طرف سے کوئی خطرہ درپیش ہے۔

''آپ مجھ سے کھل کر بات کریں تارڑ صاحب! آخر آپ کس قسم کے خدشات کا شکار ہیں؟'' اس نے تارڑ سے اصل بات اگلوانے کی کوشش کی۔

''نہیں سر! مجھے خدشات لاحق تھے لیکن اب میں مطمئن ہوں۔ کچھ دنوں میں، میں ملک سے باہر نکل جاؤں گا اور جب یہاں ہوں گا ہی نہیں تو پھر خطرے کی بھی کوئی بات نہیں رہے گی۔''

''اوکے! آپ نہیں بتانا چاہتے تو آپ کی مرضی۔'' تارڑ کا گریز دیکھ کر اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

''مجھے اجازت دیں سر! آپ کا کافی وقت لے لیا۔'' وہ یک دم ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور اس کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ شہریار نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ آج پہلی بار اسے تارڑ سے مصافحہ کرتے ہوئے اس کے ہاتھ کے دباؤ میں دوستانہ گرم جوشی محسوس ہوئی تھی۔

''اپنا خیال رکھیے گا سر اور ساتھ ہی محتاط بھی رہیے گا۔ زندگی ایک بار ملتی ہے اور اسے ایڈونچرز کی نذر نہیں کیا جا سکتا۔'' مصافحہ کرتے ہوئے اس نے شہریار کو نصیحت کی۔

''مشورے کا شکریہ لیکن میں یہ واضح کر دوں کہ میں اپنی زندگی کسی ایڈونچر کی نذر کرنے کے بجائے اسے مشن کے تحت بسر کرنے والا آدمی ہوں... اور مشن کی تکمیل کے لیے جان پر کھیل جانا بہادروں کا کام ہوتا ہے۔'' شہریار نے اسے دوبدو جواب دیا۔

''شاید آپ اپنی جگہ ٹھیک ہیں... مرنا تو بہرحال آدمی کو ہوتا ہی ہے۔ اقبال باجوہ کے بارے میں یاد ہے آپ کو کہ بے چارہ اچانک ہی مر گیا تھا۔'' اس نے سابقہ فاریسٹ آفیسر کا حوالہ دیا۔ اقبال باجوہ وہ شخص تھا جس کے تعاون سے ہی چودھری نے جنگل سے لکڑی اور کھالوں کی غیر قانونی اسمگلنگ کا کاروبار شروع کر رکھا تھا۔ ایس پی تارڑ خود بھی اس کام میں شامل تھا لیکن اب جانے کیا ہوا تھا کہ وہاں سے نکل بھاگنا چاہتا تھا۔

''باجوہ کی موت طبعی نہیں تھی سر! اسے ایک ایسا زہر دے کر ہلاک کیا گیا تھا جو بظاہر ہارٹ اٹیک کی علامات دکھاتا ہے... لیکن حال ہی میں ہونے والے باجوہ کی لاش کے پوسٹ مارٹم نے اصل حقیقت ظاہر کر دی ہے۔'' وہ ابھی تارڑ کے رویے کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ وہ اچانک اس پر یہ انکشاف کر کے تیز تیز قدموں سے چلتا باہر نکل گیا۔

اس کا یہ انکشاف شہریار کے لیے خاصا دھماکا خیز تھا۔ پیر آباد مرکزِ صحت پر ڈاکٹر ماریا اور ڈاکٹر داور دونوں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ سنایا تھا کہ باجوہ کی موت ہارٹ اٹیک کے باعث ہوئی ہے۔ ڈاکٹروں کی اس تشخیص کے بعد باجوہ کی موت کا سرٹیفکیٹ جاری کر دیا گیا تھا۔ صورتِ حال میں شک و شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی اس لیے پوسٹ مارٹم کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی تھی لیکن اب تارڑ اس پر انکشاف کر کے گیا تھا کہ باجوہ کی موت درحقیقت مہلک زہر سے ہوئی تھی اور یہ بات پوسٹ مارٹم کے ذریعے معلوم ہوئی تھی۔ موت کے اتنے دنوں بعد قبر سے لاش نکلوا کر اس کا پوسٹ مارٹم کروانے کی ضرورت کیسے اور کیوں محسوس ہوئی، ان سوالات کے جواب یقیناً تارڑ ہی دے سکتا تھا... لیکن وہ تو اسے الجھن میں گرفتار کر کے خود وہاں سے جا چکا تھا۔

☆☆☆

کشور کو عجیب سی گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ گھبرا کر اپنے کمرے سے باہر نکل آئی۔ آج کل اس کی طبیعت کا یہی عالم تھا۔ کبھی دم گھٹتا، کبھی متلی ہونے لگتی اور کبھی دل گھبراتا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ ساری کیفیات وہ ہیں جن سے تخلیق کے مرحلے سے گزرنے والی ہر عورت کو گزرنا پڑتا ہے لیکن بدقسمتی سے وہ ایک ایسی صورتِ حال میں اس اہم مرحلے سے گزر رہی تھی جس میں اسے ہر حال میں اپنا یہ راز چھپانا تھا... ورنہ نہ صرف اس کی اور آنے والے بچے کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی بلکہ حویلی والے اس کھوج میں بھی لگ جاتے کہ اسے اس حال تک پہنچانے کا ذمے دار کون ہے؟ وہ آفتاب کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی اس لیے بہت محتاط تھی۔ احتیاط کے باعث ہی وہ اپنے کمرے سے بھی کم ہی باہر نکلتی تھی کہ نہ کسی کا سامنا ہو اور نہ ہی کوئی اس کا بھید پا سکے۔

حویلی میں اس کی اس روش کو بہت زیادہ تشویش سے نہیں دیکھا گیا تھا۔ وہ پہلے بھی تنہائی پسند تھی اور اس کا زیادہ وقت اپنے کمرے میں کتابوں کے درمیان ہی گزرتا تھا۔ چنانچہ کمرے میں رہنے کے اوقات مزید طویل ہوئے تو کسی نے بہت زیادہ دھیان نہیں دیا۔ الٹیوں وغیرہ کے سلسلے میں ڈاکٹر ماریا کے اس بیان کے بعد کہ وہ ڈائریا کا شکار ہوئی ہے، وڈی چودھرائن کا شک بھی ختم ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر ماریا نے اسے جو دوائیں دی تھیں، وہ الٹیوں اور متلی کو روکنے میں بہت مددگار ثابت ہوئی تھیں اور دوبارہ کسی کے سامنے اس کی طبیعت اس طرح نہیں بگڑی تھی کہ اسے جواب دہ ہونا پڑتا۔

لیکن بہرحال وہ اپنی زندگی کے ایک نہایت نازک تجربے سے گزر رہی تھی جس میں طبیعت کا بالکل معمول پر رہنا ممکن نہیں ہوتا۔ عموی حالات میں اس مرحلے سے گزرنے والی عورتوں کو یہ سہولت حاصل رہتی ہے کہ اردگرد والے ان کا خیال رکھتے ہیں اور تجربہ کار لوگوں کے مشورے مشکل کو آسان بنا دیتے ہیں لیکن وہ تو کسی کو کچھ بتا ہی نہیں سکتی تھی۔ ابھی تو اسے یہ موقع بھی نہیں ملا تھا کہ آفتاب کو ہی یہ خوش خبری سنا دیتی۔ رانی کی حویلی سے غیر موجودگی نے اسے بالکل بے دست و پا کر کے رکھ دیا تھا اور اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ کس طرح آفتاب سے رابطے کی راہ نکالے۔ موبائل فون لاہور والی کوٹھی میں اس کے ہاتھ سے اس وقت نکل گیا تھا جب آفتاب کے دوست افضل کی بیوی مہتاب اس سے ملنے وہاں آئی تھی اور اسی وقت اچانک ہی اس کی ماں چودھرائن ناہید بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ اس نے ماں سے مہتاب کا تعارف اتفاقاً بن جانے والی ایک دوست کے طور پر کروایا تھا جس پر اس نے واضح ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ اسی وقت اس کی نظروں میں کشور کا موبائل بھی آ گیا تھا۔ کسی مشکل میں پڑنے سے بچنے کے لیے کشور نے موبائل کو مہتاب کی ملکیت قرار دیتے ہوئے اس کے حوالے کر دیا، یوں وہ خود موبائل سے محروم ہو کر آفتاب سے رابطے کی صورت کھو بیٹھی۔ ان حالات میں اس پر اپنی طبیعت کے سلسلے میں ہونے والا انکشاف بڑا سخت ثابت ہوا۔ ایک طرف اگر وہ اپنی محبت کی اس نشانی کے پھوٹنے پر خوش تھی تو دوسری طرف یہ خوف بھی لاحق تھا کہ کسی پر کچھ ظاہر نہ ہو جائے۔

خوف اور خوشی سے بھرے یہ دن وہ بالکل تنہا گزارنے پر مجبور تھی اور یہ تنہائی کبھی کبھی اس کی گھبراہٹ میں بے پناہ اضافہ کر دیتی تھی۔ اس وقت بھی وہ اسی گھٹن اور گھبراہٹ کا شکار ہو کر کمرے سے نکلی تھی۔ ارادہ تھا کہ کچھ دیر پائیں باغ میں جا کر کھلی فضا میں ٹہلے گی تاکہ طبیعت کچھ فریش ہو جائے لیکن اپنے کمرے سے نکل کر برآمدہ طے کرنے کے بعد جب وہ حویلی کے اس حصے میں پہنچی جہاں سے باہر کی طرف جانے کا راستہ گزرتا تھا تو وہاں ڈاکٹر ماریا کو دیکھ کر چونک گئی۔ ڈاکٹر ماریا اپنے میڈیکل باکس کے ساتھ کھڑی تھی اور قریب ہی وڈی چودھرائن بھی موجود تھی۔

''ہماری چھوٹی بہو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ملازمہ کا کہنا ہے کہ اسے وڈی الٹیاں ہو رہی ہیں اسی لیے میں نے تمہیں بلایا ہے کہ اسے دیکھ لو۔ آج کل شاید اس مرض کی وبا پھیل گئی ہے۔ پہلے کشور بیمار ہوئی، اب بہو بیگم کا مسئلہ ہو گیا۔ میں نے کہا کہ اگر کہیں مصیبت ماری مر مرا گئی تو وڈے چودھری صاحب کو کیا جواب دوں گی۔ ایسا کرو، تم اوپر جا کر اسے دیکھ لو اور کوئی دوا شوا دے دو تاکہ یہ سیاپا تو مٹے۔''

وڈی چودھرائن اپنے مخصوص تحکمانہ لہجے میں ڈاکٹر ماریا سے مخاطب تھی۔ ڈاکٹر ماریا نے اس کے لہجے کو یقیناً پسند نہیں کیا ہو گا تاہم وہ زبان سے کوئی اظہار کیے بغیر چپ چاپ بالائی منزل کی طرف جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ کشور جو ایک آڑ میں کھڑی یہ ساری باتیں سن رہی تھی، اپنی جگہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ اپنے حالیہ تجربے کے بعد اسے فریدہ کی حالت کے بارے میں سن کر تشویش لاحق ہو گئی تھی۔ فریدہ جو کہ نور پور کے زمیندار کی بہن تھی اور جسے چودھری جبراً اپنے ذہنی معذور بیٹے بہزاد شاہ کی منکوحہ بنا کر حویلی لے آیا تھا، درحقیقت چودھری کی ہوس مٹانے کا سامان بنی ہوئی ہے... اس راز سے صرف کشور واقف تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ ذرا ذرا سی باتوں کے لیے کھوج میں پڑ جانے والی وڈی چودھرائن فریدہ کی طبیعت کے بارے میں سن کر اس لیے نہیں چونکی تھی کہ اس کے نزدیک فریدہ ذہنی معذور بہزاد شاہ کی بیوی تھی اور بہزاد شاہ اس لائق نہیں تھا کہ بیوی کے حقوق ادا کر سکتا لیکن اصل حالات سے واقف کشور کا ٹھٹک جانا تو لازمی تھا۔

وہ پائیں باغ میں جانے کا ارادہ ملتوی کر کے وڈی چودھرائن کے منظر سے ہٹ جانے کا انتظار کرنے لگی۔ اس وقت چودھرائن کی چمچیاں چھیمی اور شادو بھی اس کی جاسوسی کے لیے اس کے قریب موجود نہیں تھیں۔ یہ مغرب سے کچھ دیر قبل کا وقت تھا اور اس وقت حویلی کے باورچی خانے میں رات کے کھانے کی تیاری کے سلسلے میں زیادہ تر ملازمائیں وہیں مصروف ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر ماریا کے اوپر جانے کے دو چار منٹ بعد وڈی چودھرائن وہاں سے ہٹی تو کشور کو سیڑھیاں چڑھنے کا موقع مل گیا۔ ورنہ جب سے وہ لاہور سے واپس آئی تھی، اس پر اوپر جانے پر پابندی عائد تھی۔ پابندی کی تو شاید وہ اتنی پروا نہیں کرتی لیکن درحقیقت وہ اپنے مسئلے میں اس طرح الجھ کر رہ گئی تھی کہ اسے فریدہ کا دھیان ہی نہیں رہا تھا۔

سیڑھیاں چڑھ کر وہ اوپر پہنچی تو حسب معمول وہاں خاموشی کا راج تھا۔ اوپر مکین ہی کتنے تھے۔ فریدہ، بہزاد شاہ اور ان کی ایک ملازمہ... اگر بہزاد شاہ کو دورہ پڑ جاتا یا وہ کسی بچکانا ضد پر اڑ جاتا تو اس خاموش ماحول میں ارتعاش پیدا ہو جاتا تھا۔ ورنہ وہاں سناٹے ہی بولتے رہتے تھے۔ اوپر پہنچ کر

کشور نے بہزاد شاہ کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اندر جھانکا تو وہ اسے اپنے بیڈ پر اس حال میں بیٹھا ہوا نظر آیا کہ اس کی گردن پر نیپکن لپٹا ہوا تھا اور ملازمہ اس کے سامنے بیٹھی اسے بڑے سے پیالے میں موجود کوئی دلیا نما شے کھلا رہی تھی۔ کشور خاموشی سے دبے پاؤں وہاں سے گزر گئی اور فریدہ کے کمرے کی طرف بڑھی۔ کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اس نے سیدھے اندر داخل ہونے کے بجائے باہر ہی رک کر اندر کی سن گن لی۔

''ڈاکٹر صاحبہ! تہانوں رب دا واسطہ اس گل کی کسی نوں خبر نہ ہونے دینا۔'' اسے اندر سے فریدہ کی منت بھری آواز سنائی دی اور ذہن میں پلتا شک اور بھی مضبوط ہو گیا۔

''لیکن کیوں؟ یہ تو خوشی کی خبر ہے۔ چودھری صاحب اور حویلی کے دوسرے لوگوں کو معلوم ہو گا کہ تم ماں بننے والی ہو تو سب بہت خوش ہوں گے۔ آخر تم حویلی کی بہو ہو اور حویلی والوں کی نسل بڑھانے کا سبب بنو گی۔'' جواب میں ڈاکٹر ماریا اس سے حیرت کا اظہار کر رہی تھی۔

''میں حویلی کی بہو تو ہوں لیکن ناپسندیدہ... یہ لوگ میرے بھائی سے انتقام لینے کے لیے زبردستی مجھے ویاہ کر یہاں لائے تھے اور فیر لا کر اس تنہائی میں ڈال دیا۔ اگر ان کی نظر میں میرا بہو والا مقام ہوتا تو یہ مجھے اس طرح الگ تھلگ کیوں ڈالتے؟ بس تسی مہربانی کرو کہ کسی کو ابھی یہ گل نہ پتا لگنے دو۔ میںوں ڈر ہے کہ اگر کسی نوں خبر ہو گئی تو فیر یہ لوگ دنیا میں آنے سے پہلے ہی اس بچے کی جان کے دشمن بن جائیں گے۔'' فریدہ بڑی لجاجت سے ڈاکٹر ماریا سے درخواست کرتے ہوئے اسے اپنا نقطہ نظر سمجھا رہی تھی جبکہ باہر کھڑی ہوئی کشور کے لیے اپنے قدموں پر کھڑا رہنا مشکل ہونے لگا۔

''ٹھیک ہے، فی الحال میں خاموش رہوں گی لیکن یہ کوئی چھپنے والی تو بات نہیں۔ آخر کار دوسروں کو اس کا علم ہو ہی جائے گا۔'' ڈاکٹر ماریا نے رضامندی ظاہر کرنے کے ساتھ فریدہ کو آنے والے وقت سے بھی خبردار کیا۔

''پتا لگنے میں بھی وقت لگے گا۔ ویسے بھی ادھر آتا کون ہے جو کچھ دیکھ سکے۔ مہینا بھر تو گزر گیا ہے مجھے اس حال میں۔ دو تین مہینے ہور گزر گئے تو فیر کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ ابھی بھی نوکرانی نے نیچے خبر پہنچا دی تھی میری طبیعت خراب ہونے کی تو وڈی چودھرائن نے آپ کو بلوا ڈالا۔ آئندہ کے لیے میں نوکرانی کو سختی سے منع کر دوں گی۔ آپ بھی مجھے کوئی دوا شوا دے جانا تاکہ طبیعت خراب ہو تو میں کھا کر گزارہ کر لوں۔'' فریدہ نے گویا سب کچھ سوچ رکھا تھا، سو بڑے اطمینان سے ڈاکٹر ماریا سے کہہ رہی تھی۔ کشور سے اب مزید برداشت نہ ہو سکا اور وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ اس کے اچانک اندر داخل ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر ماریا اور فریدہ دونوں ہی چونک گئیں لیکن پھر اسے سامنے پا کر دونوں کے چہروں پر اطمینان کے رنگ آ گئے۔ کشور اس معاملے میں ضرر رساں ثابت نہیں ہو سکتی، یہ بات دونوں ہی سمجھتی تھیں۔

''آئیں کشور صاحبہ! میں سوچ ہی رہی تھی کہ حویلی آئی ہوں تو آپ کی طبیعت بھی معلوم کرتی ہوئی چلوں گی۔ اچھا ہوا، آپ خود ہی یہاں آ گئیں۔'' ڈاکٹر ماریا نے ایک طرح سے اسے جتایا کہ اگر وہ اس کے اور فریدہ کے درمیان ہونے والی گفتگو سن چکی ہے تو اپنی زبان بند رکھے ورنہ خود اس کا اپنا راز بھی افشا ہو سکتا ہے۔

''میں ٹھیک ہوں اور آپ کی دی ہوئی دوائیں پابندی سے کھا رہی ہوں۔ اگر کوئی مسئلہ ہوا تو آپ سے رابطہ کر لوں گی۔'' اس نے ڈاکٹر ماریا کی بات کا جواب دیا اور فریدہ کے قریب بیٹھ کر نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اسے اس چھوٹی سی لڑکی سے دلی ہمدردی محسوس ہو رہی تھی جو پہلے ہی بہت مشکل میں تھی اور اب ایک اور بوجھ اٹھانے پر مجبور ہو گئی تھی... لیکن اسے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ فریدہ کو اپنے اوپر ڈھائے جانے والے ظلم کی نشانی اس بچے میں اتنی دلچسپی کیوں ہے کہ وہ اس کی زندگی بچانے کے لیے خود کو مشکل میں ڈال رہی ہے۔

''وائے ناٹ۔ مجھے آپ کے کام آ کر خوشی ہو گی۔ آپ دونوں میں سے جس کو بھی، جب بھی میری ضرورت ہو، آپ بلاتکلف مجھے کال کر سکتی ہیں۔'' اس کی سوچوں سے بے خبر ڈاکٹر ماریا نے خوشگوار لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا اور خود اپنا میڈیکل باکس سنبھال کر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تھینک یو ڈاکٹر۔'' کشور نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر ماریا مسکراتی ہوئی ان دونوں سے مصافحہ کر کے وہاں سے رخصت ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد کشور فریدہ کی طرف متوجہ ہوئی۔

''کیوں کر رہی ہو تم ایسا؟ کیوں گناہ کی اس پوٹ کو اپنے سینے سے لگا کر رکھنا چاہتی ہو؟''

''کیونکہ اسی میں میری بھلائی ہے۔ حقیقت جو بھی ہے لیکن کہلائے گا تو یہ بہزاد شاہ کی ہی اولاد نا۔ میں اس بچے کے ذریعے حویلی میں اپنے قدم مضبوط کرنا چاہتی ہوں۔ حویلی کے وارثوں میں سے ایک کی ماں بن کر میرا مقام

تبدیل ہو جائے گا۔" فریدہ نے اس پر اپنا نقطۂ نظر ظاہر کیا۔

"لیکن کوئی یقین نہیں کرے گا کہ یہ بچہ بہزاد شاہ کی اولاد ہے۔" کشور نے اسے احساس دلایا۔

"اس بات کو تمہارا باپ تسلیم کروائے گا، ورنہ میں سب کے سامنے یہ راز کھول دوں گی کہ بچہ بہزاد شاہ کا نہیں بلکہ چودھری افتخار عالم شاہ کی اولاد ہے۔" فریدہ کا لہجہ سخت سنگین تھا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے، اس پر عمل بھی کر گزرے گی۔ ایک ایسا شخص جو اپنا سب کچھ گنوا چکا ہو، اسے پھر کسی بات کا ڈر نہیں رہتا۔ فریدہ سے بھی اس کا گھر، محبوب اور عزت سب کچھ چھین لیے گئے تھے چنانچہ وہ ہر خوف سے آزاد ہو گئی تھی۔ کشور نے اپنے دل میں اس کے لیے گہری ہمدردی محسوس کی۔ اس نے بے ساختہ ہی فریدہ کو گلے لگا لیا اور ہمدردی سے بولی۔

"اللہ تمہاری مشکلات دور کرے۔ میری تو دلی خواہش تھی کہ تم اس مشکل سے نکل جاؤ اور قربان کے ساتھ ایک اچھی زندگی گزارو لیکن خود میں حالات کے گرداب میں اس طرح پھنسی ہوئی ہوں کہ تمہارے لیے کچھ کر نہیں پا رہی۔ ان حالات میں، میں تمہارے لیے بس یہ دعا ہی کر سکتی ہوں کہ زندگی تم پر مہربان ہو جائے اور تم میرے باپ کے ظلم سے آزاد ہو جاؤ۔"

"میں اس کے ظلم سے بچ کر نکل سکوں یا نہ نکل سکوں لیکن یہ طے ہے کہ اسے خود ایک دن اپنے ہر ظلم کا حساب دینا ہو گا۔ اس کے دامن میں اتنی بددعائیں ہیں کہ اللہ اسے معاف کر ہی نہیں سکتا۔" فریدہ نے جس نفرت سے بھرپور لہجے میں یہ بات کہی، اس نے کشور کا دل لرزا کر رکھ دیا۔ مظلوم کی آہ عرشِ الٰہی کو ہلا ڈالتی ہے۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھی لیکن طاقت و دولت کے نشے میں چور اپنے بدکردار و ظالم باپ کو سمجھانے سے قاصر تھی۔

☆☆☆

گل شیر کے عمران کے ہاتھوں قتل ہونے والے واقعے کو تین دن گزر گئے تھے۔ ماہ بانو نے اس واقعے کا وہاں کے ماحول پر کوئی اثر نہیں دیکھا تھا۔ اسے اس کی کوٹھری میں اسی طرح معمول کے مطابق تینوں وقت خاموشی کے ساتھ کھانا پہنچایا جاتا جس میں سے وہ خود کو سمجھا بجھا کر چند لقمے زہر مار کر لیتی کیونکہ پیٹ کی آگ دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ کم ہی سہی بددلی کے باوجود بہرحال وہ کچھ نہ کچھ حلق سے اتار ہی لیتی تھی کہ جب تک جسم سانسوں کی ڈور سے بندھا ہے، اس کی ضروریات بھی پوری کرنی ہی تھیں۔

اس تین دن کے عرصے میں اسے عمران کی شکل دوبارہ نظر نہیں آئی تھی۔ وہ دوبارہ اسے دیکھنے کی خواہش مند بھی نہیں تھی۔ اس کے بارے میں اپنے غلط اندازے نے خود اس کو بے حد مایوس کیا تھا۔ وہ شکل سے معصوم نظر آنے والا عمران اتنا وحشی نکلے گا، اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ عمران کے گل شیر کی کھوپڑی دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر توڑ ڈالنے کا منظر اسے بھلائے نہیں بھولتا تھا۔ بے شک اس نے جو کچھ کیا تھا، وہ اس کے لیے ہی کیا تھا۔ اگر وہ صحیح وقت پر وہاں نہ پہنچتا تو گل شیر اس کی عزت کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیتا۔ عمران کی مداخلت کی وجہ سے وہ ایک بار پھر کسی مرد کی ہوس نا کی کا شکار ہونے سے بچ گئی تھی لیکن اسے بچانے کے لیے عمران نے جو وحشیانہ طرزِ عمل اختیار کیا تھا، وہ اس کے لیے نہایت صدمے کا باعث تھا۔ وہ اب تک اس صدمے سے پوری طرح باہر نہیں نکل سکی تھی اور چاہتی تھی کہ دوبارہ عمران سے سامنا نہ ہو لیکن اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔

تیسرا دن بھی گزر جانے کے بعد جبکہ وہ رات کے کھانے سے فارغ ہو چکی تھی اور ایک آدمی کھانے کے برتن بھی لے گیا تھا، وہ آرام کی غرض سے لیٹی تو بہت دیر یونہی گزر گئی۔ ایک محدود جگہ میں بغیر ہاتھ پیر ہلائے گزرنے والے یہ شب و روز عموماً بے خواب ہی گزرتے تھے۔ نوجوانی کی وہ الہڑ نیند جو بستر پر گر کر آنکھیں موندتے ہی مہربان ہو جایا کرتی تھی، اب اکثر روٹھی رہتی تھی۔ وہ ایک عرصے سے خانماں برباد تھی۔ وقت کی آندھیاں اسے ادھر سے اُدھر اڑائے پھرتی تھیں۔ ان حالات میں ٹھیک سے نیند آ جاتی یہ ممکن ہی کہاں تھا اور یہاں اس قید میں تو یہ مشکل اور بھی بڑھ گئی تھی۔ خصوصاً گل شیر کی حرکت کے بعد تو اس بے سکونی میں خوف کا عنصر بھی شامل ہو گیا تھا۔ بار بار خیال آتا کہ یہاں صرف ایک گل شیر ہی تو نہیں تھا۔ یہاں تو بہت سے مرد تھے جو انسانی آبادی سے دور اس برف زار میں ایک غیر فطری زندگی گزار رہے تھے۔ گل شیر کی طرح ان میں سے کسی اور کو بھی فطرت اکسا سکتی تھی۔ ایسی صورت میں تو وہ مسلسل خطرے میں ہی تھی۔ شاید ذہن میں پلتا یہ خوف ہی تھا جو آج بھی وہ آنکھیں بند کر کے بہت دیر لیٹے رہنے کے باوجود سو نہیں سکی۔ لیٹے لیٹے یک دم اسے احساس ہوا کہ اس کے قریب ہی کوئی ہلکی سی آہٹ ابھری ہے۔ اس آہٹ کو سن کر وہ تیزی سے اٹھ بیٹھی۔ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ یقینی طور پر وہ ایک انسانی سایہ ہی تھا جسے وہ اپنے قریب دیکھ رہی تھی۔ اس سائے کو دیکھ کر اس کے اعصاب بری طرح تن گئے اور وہ جارحانہ انداز میں اپنی جگہ

سے کھڑی ہوئی۔

"ششش... شور مت مچانا۔ میں عمران ہوں اور تم سے کچھ دیر بیٹھ کر بات کرنا چاہتا ہوں۔" اس کے تیور دیکھ کر سائے نے دھیمی آواز میں سرگوشی کی۔ ماہ بانو نے آواز دھیمی ہونے کے باوجود شناخت کر لیا کہ یہ واقعی عمران ہے۔ حیرت انگیز طور پر اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

"کیا بات کرنی ہے تمہیں مجھ سے؟" وہ جو اب تک اس کا دوبارہ سامنا بھی نہ ہونے کی خواہش کر رہی تھی، اسے سامنے پا کر نرم پڑ گئی اور قدرے روٹھے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"میں تمہیں اپنے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔" وہ تھوڑے فاصلے سے اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"لیکن کیوں؟ میرا اور تمہارا تعلق ہی کیا ہے جو تم مجھے اپنے بارے میں کچھ بتانے سے دلچسپی رکھتے ہو؟" اس نے ناراض سے لہجے میں اس سے کہا۔

"تعلق تو واقعی کوئی نہیں ہے لیکن پھر بھی میرا دل چاہتا ہے کہ میں تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دوں تاکہ تم مجھ سے کم از کم اتنی نفرت نہ کرو جتنی کہ پچھلے واقعات کے بعد کرنے لگی ہو گی۔ میں نے تمہاری آنکھوں میں اپنے لیے اچھے جذبات دیکھے تھے۔ تمہارے انداز سے لگتا تھا کہ تم مجھے اچھا انسان سمجھتی ہو اور مجھے تمہاری یہ رائے بہت اچھی لگی تھی۔" دھیمی آواز میں نرمی سے بات کرتا ماہ بانو کو وہ وہی عمران لگ رہا تھا جیسا اس نے اسے پہلی بار دیکھنے کے بعد تصور کیا تھا۔ وہ خاموشی سے بیٹھی اس کی بات سنتی رہی۔ عمران کہہ رہا تھا۔

"میں ہمیشہ سے ایسا جنونی یا غصہ ور نہیں تھا جیسا کہ تم نے یہاں پایا ہے۔ میری شہرت تو بہت سلجھے ہوئے اور نیک نوجوان کی تھی۔ لوگ میری ماں سے کہتے کہ اللہ نے تمہیں ایک بیٹا دیا ہے، پر ہے نیک۔ امی یہ بات سنتیں تو خوشی سے مسکرا دیتیں۔ شاید انہیں لگتا ہو کہ میری صورت انہیں اپنی برسوں کی ریاضت کا صلہ مل گیا ہے۔" وہ جیسے ٹرانس کے عالم میں بول رہا تھا۔ اس نیم روشن جگہ پر بھی ماہ بانو اس کی کھلی آنکھوں کو کہیں خلاؤں میں بھٹکتا ہوا محسوس کر سکتی تھی۔ وہ اس سے مخاطب تھا لیکن اس کی طرف دیکھنے کے بجائے ذہن میں کھل جانے والے کسی دریچے سے اپنے ماضی میں جھانک رہا تھا۔

☆☆☆

"ہم صرف دو بہن بھائی تھے۔ میں اور مجھ سے تین سال چھوٹی بہن فرحانہ۔ میرے والد ہماری کم سنی میں ہی ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو گئے تھے۔ اس وقت امی نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا اور ایک پرائیویٹ اسکول میں ملازمت کرنے کے ساتھ ساتھ گھر پر بچوں کو ٹیوشن پڑھانے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ ان کی اس دن رات کی محنت سے ہمارے گھر کا چولہا جلنے لگا لیکن پرائیویٹ اسکول کی نوکری میں تنخواہ بھی کم ملتی تھی اور کام کا بوجھ بھی بہت زیادہ تھا۔ ایسے میں امی کی کسی سہیلی نے مشورہ دیا کہ وہ بی اے پاس تو ہیں ہی، ساتھ ہی بی ایڈ بھی کر لیں تو گورنمنٹ ملازمت حاصل کر سکتی ہیں۔ امی کو اپنی سہیلی کا یہ مشورہ اچھا لگا اور انہوں نے بی ایڈ کی تیاری بھی شروع کر دی۔ ان دنوں انہیں بہت سخت محنت کرنی پڑتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان دنوں وہ کس وقت سویا کرتی تھیں۔ رات کو ہم بہن بھائی جب سونے کے لیے لیٹتے تو انہیں اپنی کتابوں کے ساتھ مصروف جاگتے ہوئے چھوڑ کر سوتے اور صبح اٹھتے تو بھی امی جاگ رہی ہوتیں۔ ہمارے اٹھنے سے پہلے ہی وہ گھر کی صفائی ستھرائی سے فارغ ہونے کے علاوہ ناشتے کے ساتھ ساتھ دن بھر کا کھانا بھی تیار کر چکی ہوتیں۔ ان کے ان مصروفیت بھرے دنوں میں بھی میں نے کبھی کسی کام میں بے ترتیبی نہیں پائی۔ یہاں تک کہ وہ ہم بہن بھائی سے بھی جھنجلا کر یا سخت لہجے میں بات بھی نہیں کرتی تھیں۔"

اپنی ماں کا تذکرہ کرتے ہوئے عمران کے لہجے میں گہری عقیدت اور مٹھاس بھری ہوئی تھی۔ ماہ بانو کو حیرت ہونے لگی کہ یہ دل میں اتنی گہری محبت رکھنے والا لڑکا آخر نفرت کی راہ پر کیسے چل پڑا؟؟ اس کی اس حیرت سے بے خبر وہ اپنی ہی سنانے میں مصروف تھا۔

"امی کا بی ایڈ مکمل ہوا اور انہیں اپنے کسی جاننے والے کی وساطت سے گورنمنٹ اسکول میں ملازمت ملی تو ہماری زندگی میں سکون آ گیا اور دن رات ذرا ترتیب اور آرام سے گزرنے لگے۔ میں چونکہ بڑا تھا اس لیے مجھے امی کی شبانہ روز محنت اور کوششوں کا زیادہ احساس تھا۔ اس احساس کی وجہ سے ہی میں خوب دل لگا کر پڑھتا تاکہ امی کو خوش کر سکوں۔ امی واقعی مجھ سے خوش بھی تھیں لیکن میری چھوٹی بہن فرحانہ جسے ہم پیار سے فری کہتے تھے، امی کی جدوجہد کے ان دنوں میں شاید کسی نفسیاتی الجھن کا شکار ہو گئی تھی۔ اس کے ذہن میں پڑنے والی اس نفسیاتی گرہ کا ہمیں کبھی اندازہ نہیں ہو سکا۔ کبھی کبھی ہم اس کی زبان سے ایسے الفاظ سنتے کہ انسان کے پاس بہت ڈھیر ساری دولت ہونی چاہیے۔ ترس ترس کر اور خواہشات کو مار کر جینا بھی کوئی جینا

ہے... تو زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ ہمارے نزدیک تو یہ وہ باتیں تھیں جو آج کل کے کم از کم ستر اسی فیصد نوجوان کرتے ہی تھے۔ چنانچہ جب کالج میں ایڈمیشن ہونے کے بعد فرحانہ کے لائف اسٹائل میں تبدیلی آئی تو میں نے یا امی نے زیادہ غور نہیں کیا۔ میں تو یوں بھی زیادہ تر اپنی پڑھائی میں مصروف رہتا تھا، امی نے بھی اس لیے زیادہ نوٹس نہیں لیا کہ آج کل کی بچیاں پہننے اوڑھنے اور فیشن کرنے کی شوقین ہیں، فرحانہ کا بھی اپنی کالج فیلوز کو دیکھ کر ذرا بن ٹھن کر رہنے کو دل چاہتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

''مگر پھر بات فیشن کرنے سے کچھ اور آگے بڑھ گئی۔ فرحانہ نے ہفتے میں ایک دو دن کالج سے لیٹ گھر آنا شروع کر دیا۔ اس دیر کے لیے اس کے پاس یہ جواز تھا کہ اسے پریکٹیکل کرنے میں دیر ہو جاتی ہے۔ وہ ایف ایس سی پری میڈیکل کی طالبہ تھی اس لیے اس کا یہ بہانہ بھی قبول کر لیا گیا۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ امی ہم دونوں بہن بھائی پر بے پناہ اعتماد کرتی تھیں۔ انہیں اپنی تربیت پر پورا بھروسا تھا۔ میری حد تک یہ بھروسا قائم بھی رہا۔ فرحانہ بھی بہرحال کردار کے اعتبار سے کوئی خراب لڑکی نہیں تھی بلکہ فطرتاً وہ بہت معصوم اور بھولی بھالی تھی جس کی وجہ سے اسے زمانے کی چالاکیوں اور چالبازیوں کا کچھ علم نہیں تھا۔ اپنی اسی معصومیت اور کچھ دولت کی خواہش میں وہ ایک صنعت کار کے اوباش بیٹے کے جال میں پھنس گئی۔ اس لڑکے نے اسے نہ جانے کون کون سے سنہری خواب دکھائے کہ وہ اس کی محبت کے سحر میں گرفتار ہو گئی اور گھر والوں سے چھپ کر کالج سے باہر اس سے ملاقاتیں کرنے لگی۔ میں اور امی ان حالات سے قطعی ناواقف تھے۔ ہم پر تو اس وقت پہاڑ ٹوٹا جب ایک روز فرحانہ کالج سے شام ڈھلنے کے بعد گھر آئی۔ امی کو اس نے کالج جاتے ہوئے یہ تو بتا دیا تھا کہ آج اس کے پریکٹیکل کا دن ہے اس لیے واپسی میں دیر ہو جائے گی لیکن اتنی زیادہ دیر ہو جانے پر امی پریشان ہو گئیں اور انہوں نے فرحانہ کی دوستوں وغیرہ کو فون کر کے اس کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ اس کی ہر دوست نے یہی جواب دیا کہ آج کوئی پریکٹیکل نہیں تھا اور فرحانہ معمول کے مطابق کالج سے روانہ ہوئی تھی۔ یہ سن کر امی کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ فرحانہ کو کہاں تلاش کریں۔ میں بھی اس روز ایک انٹر کالج ڈیبیٹ کمپیٹیشن میں شرکت کے لیے گیا ہوا تھا۔ شام گئے گھر واپس پہنچا تو امی کو بے چینی سے ٹہلتا ہوا پایا۔ ان سے سبب پوچھنے پر فرحانہ کے غیاب کا علم ہوا تو میں بھی گھبرا گیا۔

''میں اور امی کوئی لائحہ عمل طے کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ فرحانہ گھر واپس آ گئی۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے اور وہ زخمی بھی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر امی کی چیخیں نکل گئیں۔ فرحانہ نے انہیں تسلی دی اور بتایا کہ کالج سے واپس آتے ہوئے اسے ایک گاڑی نے ٹکر مار دی تھی جس کی وجہ سے اس کا یہ حال ہو گیا۔ گاڑی والا تو ٹکر مارنے کے بعد فرار ہو گیا لیکن ایک ہمدرد راہ گیر نے اسے اسپتال پہنچا دیا جہاں اسے کئی گھنٹوں بعد ہوش آیا اور ہوش آتے ہی وہ رکشے میں بیٹھ کر گھر آ گئی۔ اس کی سنائی یہ کہانی سن کر امی نے اس سے سوال جواب کرنے چاہے لیکن میں نے ان سے کہا کہ ابھی وہ فری کو آرام کرنے دیں۔ صبح جب وہ اٹھے گی تو آپ اس سے تفصیلات پوچھ لیجیے گا۔ امی نے میری بات مان لی لیکن افسوس کہ دوسری صبح فرحانہ اٹھی ہی نہیں اور ہمیشہ کی نیند سو گئی۔ رات کے نہ جانے کون سے پہر اس نے اپنی دونوں کلائیوں کی رگیں کاٹ ڈالیں۔ ہمیں تو صبح بس اس کی لاش ہی ملی اور ساتھ ہی ایک خط بھی جس میں اس نے مجھے اور امی کو مخاطب کر کے ہم سے معذرت طلب کی تھی۔''

بہت دیر سے مسلسل بولتا عمران داستان کے اس مرحلے پر آ کر یک دم چپ ہو گیا۔ ماہ بانو نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کی آواز بھرا گئی تھی اور شاید وہ خود پر قابو پانے کی کوشش میں ہی خاموشی اختیار کر گیا تھا۔ رنج میں ڈوبے اس نوجوان کے لیے دل میں گہری ہمدردی محسوس کرتے ہوئے ماہ بانو نے دھیرے سے اس کا شانہ تھپتھپایا۔ یہ ایک خاموش دلاسا تھا جس نے عمران کو سنبھلنے میں مدد دی اور اس نے ایک بار پھر اپنی داستان کا سلسلہ جوڑ دیا۔

''فرحانہ نے اپنے اس خط میں واضح طور پر لکھا تھا کہ وہ کس صنعت کار کے بیٹے کی محبت کے جال میں پھنس گئی تھی اور وقتاً فوقتاً اس سے ملنے باہر جاتی رہتی تھی۔ آخری ملاقات میں وہ لڑکا اسے کلفٹن پر واقع اپنے اپارٹمنٹ لے گیا کہ چلو تمہیں وہ گھر دکھاتا ہوں جہاں تمہیں میرے ساتھ رہنا ہے۔ خوابوں کی دنیا میں رہنے والی فرحانہ خوشی خوشی اپنا مستقبل کا گھر دیکھنے اس کے ساتھ چلی گئی لیکن وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ وہ جال میں پھنس گئی ہے۔ اپارٹمنٹ میں اس امیر زادے کے چار دوست اور بھی تھے۔ ان سب دوستوں نے مل کر میری معصوم بہن کی آبروریزی کی...'' یہ سب بتاتے ہوئے عمران کی آواز واضح طور پر کانپ رہی تھی۔

''انہوں نے اس موقع پر اس کی تصویریں بھی کھینچ

لیں اور اپنی درندگی کے نتیجے میں اس کے جسم پر لگنے والی چوٹوں پر معمولی مرہم پٹی کرنے کے بعد یہ دھمکی دے کر وہاں سے روانہ کر دیا کہ اگر تم نے کسی کو ہمارے بارے میں بتایا تو یہ تصویریں تمہارے گھر پہنچانے کے علاوہ کالج میں بھی پھیلا دی جائیں گی۔ فرحانہ ان لوگوں کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکی تھی یا اس وقت اتنے شدید صدمے میں تھی کہ اس نے اس دھمکی کے باوجود میرے اور امی کے نام لکھے جانے والے اپنے آخری خط میں اس لڑکے کی نشان دہی کر دی۔ امی تو فرحانہ کی موت اور اس خط کی وجہ جان کر صدمے سے اس بُری طرح چُور ہوئیں کہ انہیں ہارٹ اٹیک ہو گیا اور وہ اسپتال پہنچ گئیں۔ ان کے اسپتال میں داخل ہونے کے بعد کون تھا جو مجھے روکتا یا کچھ سمجھاتا بجھاتا۔ میں نے تھانے میں اس واقعے کی رپورٹ لکھوا دی اور فرحانہ کا خط تھانے دار کو دکھا کر اس سے مطالبہ کیا کہ میری بہن کے ساتھ ظلم کرنے والے شخص کو گرفتار کیا جائے۔ تھانے دار بے وقوف نہیں تھا کہ میری بات پر کان دھرتا۔ اس نے لڑکے کے صنعت کار باپ سے رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ جناب کے بیٹے کے خلاف یہ رپورٹ درج ہوئی ہے۔ اب آپ فرمائیں کہ کیا کہتے ہیں؟ صنعت کار کو کیا کہنا تھا، اس نے تھانے دار کا کھلا ہوا منہ نوٹوں سے بھر کر بند کر دیا... اور اس طرح فرحانہ کے قتل کا کیس شروع ہونے سے پہلے ہی بند ہو گیا۔ میں بے بس سا کبھی انصاف کے لیے تھانے کے چکر لگاتا اور کبھی اسپتال میں داخل امی کو دیکھنے جاتا۔

''اس روز میں امی کے پاس اسپتال پہنچا تو معلوم ہوا کہ اب وہ نہیں رہی ہیں۔ ڈاکٹرز خود حیران تھے کہ ری کور کرتے کرتے اچانک انہیں کیا ہو گیا۔ پیرا میڈیکل اسٹاف سے پوچھ گچھ کی گئی تو معلوم ہوا کہ کوئی شخص امی سے ملنے آیا تھا اور ان کے لیے ایک لفافہ لایا تھا۔ امی نے اس لفافے کو کھول کر دیکھا تو اس کے بعد ان کی حالت بگڑ گئی اور پھر دوبارہ نہ سنبھل سکیں۔ میں نے امی کے سامان کی تلاشی لی تو ان کے پرس میں سے وہ لفافہ مل گیا۔ لفافے میں تصویروں کے کچھ ٹکڑے تھے جو یقیناً امی نے ہی کیے تھے۔ میں نے ان ٹکڑوں کو جوڑ کر دیکھا تو مجھے معلوم ہو گیا کہ امی کی یہ حالت کیوں ہوئی۔ وہ فرحانہ کی وہی تصویریں تھیں جو ان اوباش لڑکوں نے اسے دھمکانے کے لیے کھینچی تھیں اور اس کے مرنے کے بعد بھی وہ اس دھمکی پر عمل کرنے سے باز نہیں آئے۔ مجھے امی کی موت نے بالکل پاگل کر کے رکھ دیا اور میں ہر مصلحت کو بھول کر اس امیر زادے کو ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا۔ میں ارادہ کر کے نکلا تھا کہ وہ مجھے مل گیا تو میں اسے جان سے مار دوں گا لیکن اپنی اس دیوانگی میں، میں نے یہ تک سوچنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ کسی کو قتل کرنے کے لیے کسی ہتھیار وغیرہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

''جوش و جذبات سے بھرا میں نہتا ہی اسپتال سے سیدھا اس امیر زادے کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ وہاں گیٹ پر گارڈز کھڑے تھے۔ مجھے اندر کون جانے دیتا؟ میرے چیخنے چلّانے اور زبردستی اندر گھسنے کی کوشش کرنے پر گارڈز نے مجھے مار مار کر ادھ موا کر دیا اور پھر مجھے پولیس کے حوالے کر دیا گیا کہ اس شخص نے قاتلانہ حملے کی کوشش کی ہے۔ پولیس نے مجھے اور مارا اور پھر میں تین مہینے تک سلاخوں کے پیچھے قید اپنی بے بسی پر روتا رہا۔ میرا سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ نہ بہن رہی تھی نہ ماں۔ ماں کو تو میں... اس کے جنازے کو کندھا دے کر قبرستان تک بھی نہیں پہنچا سکا تھا۔ میرا تعلیمی سلسلہ جو کہ میرے روشن مستقبل کا راستہ تھا، وہ بھی سلاخوں کے پیچھے ہونے کے باعث منقطع ہو گیا۔ خیر، ان دنوں میں جس کیفیت سے گزر رہا تھا، اگر آزاد بھی ہوتا تو کچھ پڑھ لکھ نہیں سکتا تھا۔ میرے شب و روز عجب وحشت کے عالم میں گزر رہے تھے۔ کبھی میں دن بھر بھوکا رہتا تو کبھی رات رات بھر روتا رہتا۔

''میری یہ حالت دیکھ کر ایک دن ایک ساتھی قیدی میرے پاس آیا اور کچھ ایسی ہمدردی سے مجھ سے میرے حالات پوچھے کہ میں اس سے کچھ بھی نہیں چھپا سکا۔ اس شخص نے میرے حالات سنے تو مجھے سمجھایا کہ اس طرح بزدلوں کی طرح روتے رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ بہتر ہے کہ خود میں حوصلہ پیدا کرو اور اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کا بدلہ لو۔ وہ شخص اس دن کے بعد ہر روز مجھے اس طرح کی نصیحتیں کرتا۔ آخر کار میں اس کی باتوں سے متاثر ہونے لگا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ایک ایسی تنظیم سے وابستہ ہے جو اسی طرح کے مظالم کے خلاف جہاد کرتی ہے اور ظالموں کو ان کے صحیح انجام تک پہنچاتی ہے۔ اس شخص کی باتیں سن کر میں تنظیم کی کارکردگی سے بے حد متاثر ہوا۔

''میرے نزدیک واقعی وہ لوگ لائقِ تحسین تھے جو اپنی ذات کو فراموش کر کے معاشرے کی اصلاح کے لیے بے لوث خدمات انجام دے رہے تھے۔ اس بے پناہ متاثر ہونے کا ہی اثر تھا کہ جب چھ ماہ بعد مجھے اپنے کچھ دوستوں کی کوششوں کے نتیجے میں رہائی نصیب ہوئی تو میں سیدھا اس تنظیم کے افراد کے پاس پہنچ گیا۔ ان لوگوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ مجھے اپنی بہن کے قاتلوں سے انتقام لینے کے قابل

بتا دیں گے لیکن اس کے لیے مجھے کچھ صبر سے کام لینا ہوگا اور تربیت حاصل کرنی ہوگی۔ ابتدائی دو تین ماہ انہوں نے مجھے شہر میں ہی رکھ کر تربیت دی اور یہ جانچ لینے کے بعد کہ میں اپنے ارادے میں مضبوط ہوں، یہاں منتقل کر دیا۔ یہیں مجھے اطلاع دی گئی کہ تنظیم کے ساتھیوں نے میری بہن کے قاتل سے انتقام لے لیا ہے۔ اس روز تم نے جو وڈیو دیکھی تھی، وہ اسی شخص کی تھی۔ تم چاہے اسے ظلم کہو لیکن مجھے وہ منظر دیکھ کر بڑا سکون ملا تھا۔ میری معصوم بہن کی زندگی برباد کر دینے والا اور ہمارے ہنستے بستے گھر کو ختم کر دینے والا ایسے ہی انجام کا حق دار تھا۔"

آخری جملے بولتے ہوئے عمران کے لہجے میں نفرت کا وہی زہر بھر گیا تھا جس نے اس جیسے سلجھی ہوئی طبیعت کے نوجوان کی شخصیت بدل کر رکھ دی تھی اور وہ ان لوگوں کے درمیان آپھنسا تھا جو کسی طور بھی مثبت سوچ کے حامل نظر نہیں آتے تھے۔ عمران کے ماضی کے تناظر میں ماہ بانو کو تین دن قبل پیش آنے والا واقعہ بھی سمجھ آ گیا تھا۔ گل شیر کو اس کی عزت کے درپے دیکھ کر یقیناً عمران کو یونہی لگا ہوگا کہ اس کی اپنی بہن کی عزت خطرے میں ہے۔ اپنی بہن کو تو وہ بچا نہیں سکا تھا اور اس کے قاتل کو بھی اپنے ہاتھوں سے ہلاک نہیں کر سکا تھا، چنانچہ اس نے گل شیر کو وہی امیر زادہ تصور کرتے ہوئے اپنی ساری نفرت اور غصہ اس پر نکال ڈالا۔

"مجھے تمہارے حالات جان کر دلی رنج ہوا ہے لیکن میں پھر بھی یہی کہوں گی کہ تم جو کچھ کر رہے ہو، وہ صحیح نہیں ہے اور نہ ہی یہ لوگ صحیح ہیں جنہوں نے تمہیں برائیوں کے خلاف جہاد کے نام پر اپنے ساتھ شامل کر لیا ہے۔ یہ وحشت زدہ نیم دیوانے لوگ جن کی آنکھوں سے انسانیت کی رمق بھی مٹنے لگی ہے، مجاہد کہلانے کے حق دار ہو ہی نہیں سکتے۔ مجاہد کا تو بڑا مقام اور رتبہ ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر ایسی وحشت نہیں بلکہ نور برستا ہے۔ یہاں تمہیں کسی ایک شخص کے چہرے پر بھی ذرا سا بھی نور دکھائی دیا؟" عمران کی ساری داستان سننے کے بعد اس نے اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ آخر میں اس سے کٹیلے لہجے میں پوچھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ واقعی ان لوگوں میں مجاہدین والی کوئی بھی خوبو نہیں ہے۔" خلافِ توقع عمران نے اس سے اختلاف کرنے کے بجائے فوراً ہی اتفاق کر لیا تو وہ حیران رہ گئی۔

"اصل میں، میں جن حالات میں ان لوگوں سے ملا وہ ایسے تھے کہ کوئی بھی مجھے راہ سے بھٹکا سکتا تھا۔ انتقام کے جنون میں میری اچھے بُرے اور صحیح غلط میں فرق کرنے کی صلاحیتیں ختم ہو گئی تھیں۔ پھر ان لوگوں نے خود کو کچھ اس طرح سے میرے سامنے پیش کیا کہ میں ان کے بارے میں ٹھیک سے اندازہ ہی نہیں لگا سکا۔ تین دن پہلے تک بھی میں ان لوگوں کو بالکل صحیح سمجھتا تھا۔ میرے نزدیک یہ وہ خدائی فوجدار تھے جو معاشرے سے برائیوں کا قلع قمع کرنے کے لیے بے لوث ہو کر جدوجہد کر رہے تھے۔ میں انہیں مظلوموں کا ہمدرد اور ظالموں کا دشمن سمجھتا تھا لیکن پھر اتفاق سے میں نے کمانڈر اور اس کے نائب کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی اور نتیجتاً میری آنکھوں پر بندھی پٹی کھل گئی۔" عمران کے ان الفاظ نے ماہ بانو کا تجسس بھڑکا دیا۔ وہ سننے کے لیے بے چین ہو گئی کہ آخر وہ کون سے حقائق تھے جنہیں جاننے کے بعد عمران ان لوگوں سے بددل ہو گیا تھا۔

"گل شیر کی ہلاکت کے اگلے دن جب میں اپنے حواسوں میں واپس آیا اور مجھے احساس ہوا کہ میرے ہاتھوں اپنے ہی ساتھیوں میں سے ایک کا قتل ہو گیا ہے... جس کا ہو سکتا ہے، چند لوگوں کو افسوس بھی ہو تو میں کمانڈر کا ری ایکشن جاننے کے لیے اس سے ملاقات کے لیے چلا گیا۔ اب یہ اتفاق ہی تھا کہ اس وقت کمانڈر اور اس کے نائب کے درمیان اسی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ میں ان لوگوں کی زبان سے اپنا نام سن کر باہر ہی رک گیا کہ اچھا ہے بغیر سامنے جائے ہی ان کی رائے جان لوں۔ میں نے سنا، کمانڈر کا نائب اس سے کہہ رہا تھا کہ سر! عمران کا کیا کریں؟ یہ تو ضرورت سے کچھ زیادہ ہی جذباتی نوجوان ہے۔ کل رات اس کی وجہ سے ہمارا گل شیر جیسا قیمتی آدمی ضائع ہو گیا۔ لاکھوں کی رقم خرچ کی تھی ہم نے گل شیر کی تربیت پر... اور وہ تھا بھی اپنے کام کا ماہر۔ ہمارے تربیت دیے ہوئے آدمیوں میں... خودکش جیکٹ کی تیاری میں اس جیسی مہارت کسی اور کے پاس نہیں۔ وہ دھماکا خیز مواد کے بارے میں بے حد معلومات رکھتا تھا اور اسے اس طرح کی چیزوں کو ہینڈل کرنا بھی خوب آتا تھا۔ عمران نے اسے قتل کر کے ہمارا بہت بڑا نقصان کیا ہے... جواب میں کمانڈر بولا کہ بات تو تمہاری ٹھیک ہے اور مجھے خود بھی گل شیر جیسے آدمی کے ضائع ہو جانے کا بہت افسوس ہے لیکن ہم اس معاملے میں عمران کو کوئی تنبیہ بھی نہیں کر سکتے۔ گل شیر نے حرکت ہی ایسی کی تھی کہ اگر خود میں بھی اسے وہ حرکت کرتے ہوئے پکڑ لیتا تو سزا دیے بغیر نہیں چھوڑتا۔ وہ لڑکی ہمارے پاس یہاں بگ باس کی امانت ہے اور باس نے سختی سے حکم دیا تھا کہ لڑکی کو کوئی نقصان نہیں

پہنچنا چاہیے... لیکن میری تنبیہ کے باوجود گل شیر کی نیت خراب ہو گئی۔ وہ تو ایک طرح سے اچھا ہوا کہ عمران موقع پر وہاں پہنچ گیا ورنہ اگر لڑکی کو کچھ ہو جاتا تو میرے لیے بگ باس کو جواب دینا مشکل ہو جاتا۔ کمانڈر کی اس بات کو سن کر نائب بولا کہ وہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر لیکن عمران جیسے جونیئر بندے کے ہاتھوں گل شیر جیسے سینئر کا نقصان بھی قابلِ برداشت نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو اس سلسلے میں عمران کو کوئی سزا ضرور دینی چاہیے تاکہ وہ آئندہ سرکشی سے گریز کرے۔

"کمانڈر اپنے نائب کی یہ بات سن کر مسکرایا اور بولا کہ تم فکر نہ کرو۔ میں اس معاملے پر پہلے ہی غور و فکر کر چکا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ عمران بہت دور تک ہمارے ساتھ چلنے والا لڑکا ہی نہیں ہے۔ وہ صرف جذبات میں آ کر اس راہ پر چل پڑا ہے لیکن میرا تجربہ کہتا ہے کہ اس کی فطرت اسے اس راہ پر چلنے نہیں دے گی۔ معلوم نہیں کیسے کراچی میں موجود کیمپ کے انچارج سے اس لڑکے کو جج کرنے میں غلطی ہو گئی اور اس نے اسے یہاں تک بھجوا دیا۔ اب مجھے اس غلطی کو سدھارنا ہوگا اور اس کا ایک ہی حل ہے کہ ہم جلد از جلد عمران کو استعمال کر کے اس سے اپنی جان چھڑا لیں۔ اندر کمانڈر یہ سب کہہ رہا تھا اور میں باہر کھڑا حیران تھا کہ یہ کون دھوکے باز لوگ ہیں اور کس مقصد کے تحت انہوں نے یہ سارا سیٹ اپ قائم کر رکھا ہے؟ میرے ان سوالوں کا جواب کمانڈر کی آگے کی گفتگو نے دے دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ہمارے پاس وفاقی وزیر شوکت مرزا کے قتل کا ٹاسک موجود ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں اوپر سے بھی اشارہ مل چکا ہے اور یہاں ہم شوکت مرزا کے ایک مخالف کو بھی گھیر چکے ہیں کہ وہ اس کام کے لیے ہمیں معاوضہ دے دے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اس کام کے لیے عمران کو خودکش بمبار کے طور پر استعمال کیا جائے۔ شوکت مرزا کے بارے میں، میں نے جو معلومات حاصل کی ہیں، ان کے مطابق دیگر برائیوں کے ساتھ ساتھ وہ کئی عورتوں کی آبرو ریزی میں بھی ملوث ہے۔ اس کے اس طرح کے چکروں کی افواہیں تو گردش کرتی رہتی ہیں مگر کبھی وہ پکڑا نہیں گیا ہے لیکن یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ ایسا آدمی کتنا ہی ہاتھ پیر بچا کر کام کرے، کہیں نہ کہیں اس کے جرم کا ثبوت موجود ہوتا ہے... اور یہ ثبوت عموماً صحافی برادری کے کسی بندے کے پاس ہی ہوتا ہے۔ ہمارے لوگوں نے اس صحافی کو تلاش کیا جس کے پاس شوکت مرزا کے خلاف مواد موجود تھا اور وہ اس بلیک میلنگ اسٹف کے ذریعے اس سے بڑی بڑی رقوم اینٹھ رہا تھا۔ ہم نے صحافی سے وہ اسٹف حاصل کر لیا۔ اب میں وہ ساری چیزیں عمران کو دکھاؤں گا اور اسے شوکت مرزا پر خودکش حملہ کرنے کے لیے اکساؤں گا۔ اس کے کل رات والے ردِعمل کو دیکھتے ہوئے تم سمجھ سکتے ہو کہ وہ اس کام کے لیے فوراً راضی ہو جائے گا۔ اپنی بہن کی آبرو ریزی کے بعد وہ ہر اس طرح کے شخص کو واجب القتل سمجھتا ہے۔ اس لیے اسے شوکت مرزا پر خودکش حملہ کرنے میں کوئی تعرض نہیں ہوگا۔ اس طرح ہمارا ایک کام بھی ہو جائے گا اور ہم عمران سے نجات حاصل کرنے سے پہلے اس پر اب تک لگنے والی رقم بھی سود سمیت وصول کر لیں گے۔

"کمانڈر کے ان الفاظ نے جہاں مجھے لرزا کر رکھ دیا، وہیں اس کا نائب بے پناہ خوش ہوا اور بولا... یو آر سو جینئس سر! آپ نے مسئلے کا ایک ایسا حل ڈھونڈا ہے جسے سن کر دل خوش ہو گیا ہے۔ میں ان دونوں کی اس گفتگو کو سن کر اتنا مشتعل تھا کہ دل چاہتا تھا، ابھی اندر جاؤں اور انہیں جان سے مار ڈالوں لیکن پھر میں نے اپنے جذبات کو قابو میں کیا اور دبے پاؤں وہاں سے واپس پلٹ گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میری جذباتیت پہلے ہی مجھے بہت زیادہ نقصان پہنچا چکی ہے اس لیے اب مجھے جوش کے بجائے ہوش سے کام لینا ہوگا۔ میں نے وہ سارا دن معمول کے مطابق گزارا۔ پھر رات میں میرے پاس کمانڈر کا بلاوا آ گیا۔ میرا دل تو نہیں چاہ رہا تھا کہ میں اس منافق آدمی کی شکل بھی دیکھوں لیکن مصلحتاً برداشت سے کام لیتا ہوا اس کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ کمانڈر نے بڑی سنجیدگی سے میرا استقبال کیا اور مجھے اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے بولا کہ... کل جو کچھ ہوا اس کا مجھے بہت افسوس ہے عمران۔

"میں نے کہا... بھائی صاحب! افسوس مجھے بھی ہے۔ مجھے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی غصہ آ گیا تھا اور اس غصے کی وجہ سے گل شیر کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ یقیناً آپ کو اس کی موت کا بہت افسوس ہوا ہوگا... لیکن کمانڈر کے جواب نے مجھے حیران کر دیا۔ اس نے کہا کہ مجھے گل شیر کے قتل پر نہیں، اس کی حرکت پر افسوس ہے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہم مجاہدین کے درمیان اس جیسا شیطانی فطرت رکھنے والا آدمی بھی موجود ہے۔ تم نے اس شیطان کو قتل کر کے ایک کارنامہ انجام دیا ہے اور اس وقت میں نے تمہیں تمہارے اس کارنامے پر شاباش دینے کے لیے ہی بلایا ہے۔ اگر میں نے کمانڈر کا اصل چہرہ نہ دیکھ لیا ہوتا تو اس کی یہ باتیں سن کر بہت خوش ہوتا۔ میں نے دل ہی دل میں اس منافق پر لعنت

بھیجی اور مصلحتاً اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے مجھے غلط نہیں سمجھا۔ کمانڈر میری طرف سے شکر گزاری کے اظہار پر خوش ہوا اور پھر اس نے تھیلے سے بلی نکالتے ہوئے وفاقی وزیر شوکت مرزا کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ بڑھا چڑھا کر مجھے وزیر کی اخلاقی بے راہ روی کے بارے میں باتیں بتاتا رہا اور بولا کہ اس جیسا کرپٹ شخص اس لائق نہیں کہ اسے مزید اس دنیا میں رہنے دیا جائے۔ میں نے کمانڈر کی اس رائے سے اتفاق کیا اور ازخود اپنی خدمات پیش کر دیں کہ میں اس بدکردار آدمی کو ٹھکانے لگاؤں گا۔ کمانڈر نے میرے اس جذبے پر مجھے بہت شاباش دی اور بتایا کہ شوکت مرزا نہایت سخت سیکیورٹی میں رہتا ہے۔ اسے دور سے گولی مارنا یا کہیں ایسے ہی گھیر لینا ممکن نہیں ہے۔ اس شخص کو ختم کرنے کے لیے ہمیں خودکش حملے کی تکنیک ہی استعمال کرنی پڑے گی۔ اس کام کے لیے تمہیں یہ کرنا ہوگا کہ بارود سے بھری ہوئی گاڑی لے کر اچانک ہی شوکت مرزا کی گاڑی سے ٹکرا دو۔ گاڑی ہم تمہیں فراہم کر دیں گے اور شوکت مرزا کے شیڈول کے متعلق معلومات حاصل کر کے حملے کی جگہ اور وقت کا تعین کرنا بھی ہماری ذمے داری ہوگی۔ بس تم ذہنی طور پر اس بات کے لیے تیار رہو کہ تمہیں یہ کام اپنی جان کی قیمت پر کرنا ہے۔ باقی اس سلسلے میں تمہاری جو ٹریننگ وغیرہ ہونی ہوگی، اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔

"میں نے کہا... بھائی صاحب! جان کی کوئی پروا نہیں۔ اگر ایک شیطان کو دنیا سے مٹانے میں میری جان چلی جائے تو میں سمجھوں گا کہ میں نے جامِ شہادت نوش کر کے ہمیشہ کی زندگی پالی۔

"کمانڈر میرے اس جواب سے بہت خوش ہوا اور مجھے گلے لگا کر میرے جذبے کی بہت تعریف کی۔ میں اندر ہی اندر اس کی مکاری پر کڑھتا رہا لیکن زبان اور چہرے سے اظہار نہیں ہونے دیا۔ کمانڈر کی اصلیت کھلنے کے بعد میں مسلسل سوچتا رہا کہ میرا کیا لائحہ عمل ہونا چاہیے؟ یہ تو ظاہر ہے کہ میں یہاں رہ کر اکیلا ان سارے لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا، اسی کشمکش میں مبتلا دو دن گزر گئے۔ آج شام کمانڈر نے مجھے پھر اپنے پاس بلایا اور بتایا کہ کل کسی وقت مجھے یہاں سے روانہ کر دیا جائے گا۔ روانگی کے بارے میں سن کر مجھے تمہارا خیال آ گیا اور دل میں تجسس جاگا کہ تم سے معلوم تو کروں کہ آخر تم کون ہو اور کیسے ان لوگوں کے جال میں پھنس گئی ہو۔ ممکن ہے کہ میں تمہیں اس جال سے نکالنے کے لیے کچھ کر سکوں۔ میرے پاس زیادہ مہلت نہیں تھی اس لیے میں موقع ملتے ہی تم سے ملنے یہاں آ گیا ہوں۔ میں تمہیں ان بھیڑیوں کے درمیان تنہا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا۔ تمہاری صورت میں مجھے اپنی فری کی صورت دکھائی دیتی ہے۔ فری کو تو میں اپنی لاعلمی کی وجہ سے نہیں بچا سکا تھا لیکن تمہارے لیے جو بھی کر سکا، ضرور کروں گا۔"

عمران کے لہجے میں جو سچائی اور خلوص تھا، اس نے ماہ بانو کے دل پر گہرا اثر کیا اور فرطِ جذبات سے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ چند ظالموں کی وجہ سے وہ اگر حالات کے گرداب میں پھنس گئی تھی تو یہ حقیقت بھی اپنی جگہ تھی کہ دستِ قدرت ہر جگہ بہانے بہانے سے اس کی مدد کے لیے کارفرما ہو جاتا تھا۔ اس وقت بھی اللہ نے عمران کی صورت میں اس کے لیے ایک مددگار بھیج دیا تھا۔ وہ اس مددگار کے ظہور پر دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے عمران کو دھیمی آواز میں مختصراً اپنے حالاتِ زندگی سناتی چلی گئی۔ اس کی زندگی کی داستان ایسی نہیں تھی جو عمران جیسے دردِ دل رکھنے والے انسان کو متاثر نہیں کرتی۔ وہ خاموشی سے مگر دلی افسوس کے ساتھ اس کی داستان سنتا چلا گیا۔

"تم ذہنی طور پر تیار رہنا۔ میری کوشش ہوگی کہ کل یہاں سے روانہ ہوں تو تم ہر صورت میرے ساتھ موجود ہو۔" رات اپنا بالکل آخری پہر طے کر رہی تھی جب عمران نے اس کے پاس سے رخصت ہوتے ہوئے یہ الفاظ کہے اور اس کے دل میں امید کی شمعیں روشن کر کے خود جس طرح تاریکی میں خاموشی سے یہاں تک آیا تھا، اسی خاموشی سے واپس پلٹ گیا۔

☆☆☆

مشابرم خان ہنوز اسکردو میں ہی مقیم تھا۔ پولیس کی طرف سے عائد کردہ پابندی کے باعث وہ فی الحال اپنی ملازمت پر واپس نہیں جا سکتا تھا۔ اس طرف سے اسے کوئی پریشانی بھی نہیں تھی کیونکہ شہریار نے اس کی چھٹی منظور کرتے ہوئے اسے وہیں رکنے کا مشورہ دیا تھا۔ یہاں رہ کر وہ اپنی ماں کی دیکھ بھال بھی کر سکتا تھا اور اکرم خان کے قاتلوں اور ماہ بانو کے اغواکاروں کا کھوج بھی لگانے کی کوشش کر سکتا تھا۔ اسپتال میں داخل اس کی ماں کی حالت ہنوز پہلے جیسی تھی۔ جوان بیٹے کی موت کے غم نے اسے اتنی بری طرح متاثر کیا تھا کہ وہ آنکھیں کھول کر اس حقیقت کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔ مشابرم خان روز اسپتال جاتا اور خاموشی سے ماں کے سرہانے بیٹھا رہتا۔

اسپتال سے نکلتا تو ان لوگوں کی تلاش شروع کر دیتا جو نیاز علی کو اپنے آلۂ کار کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ نیاز علی نے مرنے سے قبل اسے یہ تو بتا دیا تھا کہ وہ کسی شخص کے کہنے پر پہاڑوں میں کہیں خفیہ طور پر روپوش لوگوں کے لیے خوراک اور ادویات کا ذخیرہ سپلائی کرتا ہے لیکن اس نے اس آدمی کی نشان دہی نہیں کی تھی۔ وہ ایسے کسی پوائنٹ کا نام بھی نہیں بتا سکا تھا جہاں سے اس سے سپلائی لی جاتی ہو۔ اس کے مطابق مال وصول کرنے والے ہمیشہ مختلف مقام پر اس سے وصولی کرتے تھے۔ یعنی نیاز علی کو استعمال کرنے کے باوجود وہ لوگ اس پر بھروسا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ایسی صورت میں مشابرم خان کے پاس یہی راستہ رہ جاتا تھا کہ وہ اس شخص کو تلاش کرے جو یہاں اسکردو میں نیاز علی کو آگے لے جانے کے لیے سامان فراہم کرتا تھا۔ اس شخص کی تلاش کے لیے اس نے نیاز علی کے ملنے جلنے والوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کر دیں۔ اس کے بہت زیادہ لوگوں سے تعلقات نہیں تھے اور کچھ عرصے سے تو اس نے دوستوں وغیرہ سے ملنا تقریباً ترک ہی کر دیا تھا۔ بس لے دے کر ٹورسٹ کمپنی میں اس کے ساتھ ملازمت کرنے والے چند ساتھی ہی تھے جن سے اس کا تھوڑا میل ملاپ تھا۔ مشابرم خان نے ان ملازمین اور کمپنی کے مالک پر نظر رکھنی شروع کر دی لیکن تنہا ہونے کی وجہ سے اسے اس کام میں بہت دشواری پیش آ رہی تھی۔ وہ بیک وقت ان تمام افراد کی نگرانی نہیں کر سکتا تھا۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ کمپنی سے وابستہ ڈرائیورز تو عموماً سفر میں ہی رہتے تھے۔ وہ ان میں سے کس کس کا پیچھا کرتا اور کس طرح؟ اس کے پاس یہاں اپنی کوئی ذاتی سواری بھی نہیں تھی۔ کرائے کی جیپ البتہ مل سکتی تھی لیکن ابھی تک اس نے اس سہولت کو حاصل کرنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ فی الحال وہ یہیں رہ کر جائزہ لے رہا تھا کہ کوئی ایسی مشکوک جیپ نظر آ جائے جسے پہاڑوں پر جانے والی کسی ایکسپی ڈیشن ٹیم کو واپس لانے جانا ہو اور اس کے باوجود اس میں سامان لوڈ ہو۔ اس مقصد کے لیے وہ اکثر نیاز علی کے دفتر کے آس پاس چکرا تا رہتا تھا۔ اسے امید تھی کہ نیاز علی کی موت کے بعد اس کام کے لیے کسی اور ڈرائیور کو ہائر کیا جائے گا۔ وہ کوشش میں تھا کہ کسی طرح نیاز علی کی جگہ لینے والے ڈرائیور کا کھوج لگا لے۔ نئے ڈرائیور کا علم ہو جاتا تو پھر اس شخص تک پہنچنے کی راہ بھی نکل آتی جو یہ کام کروا رہا تھا۔ اپنی اس کھوج کے چکر میں وہ صبح ہی صبح ٹورسٹ کمپنی کے دفتر کے سامنے جا پہنچتا۔ عموماً جیپیں اسی وقت روانہ ہوتی تھیں اور نظر رکھنے کی صورت میں ایسی جیپ پکڑ میں آ سکتی تھی جو مشکوک ہو۔ ابھی تک اسے اس مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی پھر بھی وہ ثابت قدمی سے اپنے معمول پر ڈٹا ہوا تھا۔

نگرانی کا کام انجام دینے کے لیے اس نے دفتر کے عین سامنے موجود ایک چھوٹے سے ہوٹل کو اپنا ٹھکانا بنا لیا تھا۔ وہ ہوٹل بھی کیا تھا، بس ایک طرح سے چائے خانہ ہی تھا جہاں چائے کے ساتھ ناشتے کے لوازمات بھی مل جاتے تھے۔ مشابرم خان ہر روز صبح وہاں پہنچ کر ناشتا کرتا۔ اس دوران اس کی نظریں ٹورسٹ کمپنی کے دفتر پر ہی لگی رہتیں۔ ابھی تک اس نے وہاں سے جتنی جیپیں روانہ ہوتی دیکھی تھیں، ان میں سے کوئی بھی مشکوک نہیں لگی تھی۔ وہ موقع پا کر جیپ کے ڈرائیور سے بات چیت بھی کر لیتا تھا۔ اس گفتگو سے اسے علم ہو جاتا کہ کون سی جیپ کہاں اور کس مقصد کے لیے روانہ ہو رہی ہے۔ اس کے حساب سے اب تک کوئی ایسی جیپ روانہ نہیں ہوئی تھی جسے کسی ایکسپی ڈیشن ٹیم کو واپس لانے جانا ہو۔ مسلسل ناکامی نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اس کا لائحہ عمل غلط ہے۔ اسے نیاز علی کی ٹورسٹ کمپنی کے علاوہ دوسری کمپنیوں پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ اب تک تو وہ اس شک کی بنیاد پر صرف اسی کمپنی کی جیپوں کی نگرانی کر رہا تھا کہ ہو نہ ہو، کمپنی کا مالک بھی اس کام میں شامل ہوگا۔ نیاز علی نے اگرچہ ایسا کوئی اعتراف نہیں کیا تھا لیکن مشابرم خان کو شبہ تھا کہ اتنا بڑا کام مالک کی شمولیت کے بغیر کرنا صرف ڈرائیور کے بس کی بات نہیں... لیکن اب وہ خود اپنے اس نظریے کی طرف سے مشکوک ہونے لگا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کی لائن آف ایکشن غلط ہے اور اب اسے اپنی نگرانی کا دائرہ وسیع کر کے دیگر ٹورسٹ کمپنیوں اور ان کے ڈرائیورز کو بھی چیک کرنا چاہیے۔ یہ بہت بڑا کام تھا جس کے لیے تنہا اس کی ذات ناکافی ہوتی اور اسے مقامی حکام سے مدد لینی پڑتی۔ شہریار کی وجہ سے اسے یہ مدد مل بھی جاتی لیکن اس صورت میں شاید وہ خود لاعلم رہ جاتا۔ سرکاری لوگ اسے اپنے ساتھ شامل کرنے کے بجائے جو بھی کرنا ہوتا، اپنے طور پر کرتے جبکہ اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ خود یہ مہم سر کرے۔

اکرم خان کے قتل اور ماہ بانو کے اغوا نے اس معاملے کو اس کی ذاتی لڑائی بنا دیا تھا۔ نہ وہ اپنے بھائی کے قاتلوں کو معاف کر سکتا تھا، نہ ہی اپنے گھر پناہ گزین ماہ بانو کے اغوا کو نظرانداز کر سکتا تھا۔ اب بھی کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس مصیبت میں مبتلا تھی اور کن حالات سے گزر رہی تھی۔ ان ساری سوچوں اور فکروں کے گرداب میں پھنسا آج پھر وہ اپنی مخصوص جگہ پر موجود تھا اور ناشتے سے فارغ ہونے کے

بعد سبز چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا۔ اچانک ہی اس کی جیب میں موجود سیل فون بجنے لگا۔ اس نے فون نکال کر اسکرین پر آنے والا نمبر چیک کیا۔ یہ اس اسپتال کا نمبر تھا جہاں اس کی ماں داخل تھی۔ اسپتال کا نمبر دیکھ کر اس کا دل دھڑک اٹھا۔ اس نے اسپتال انتظامیہ کو خود اپنا نمبر دیا تھا کہ کسی ایمرجنسی کی صورت میں اسے کال کر لی جائے۔ وہاں سے فون آنے کا مطلب تھا کہ خیریت نہیں تھی۔

"ہیلو۔" اس نے تشویش کے عالم میں کال ریسیو کی۔

"تمہاری ماں کی طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے، فوراً اسپتال پہنچو۔" کسی نے بہت تیزی سے یہ پیغام دے کر فون بند کر دیا۔ مشابرم خان اپنے بدترین اندیشے کے درست ثابت ہونے پر گھبرایا ہوا پھرتی سے اٹھ کر اسپتال کے لیے روانہ ہوا۔ اسے اپنی ماں سے بہت محبت تھی اور اس کے مسلسل بے ہوشی میں ہونے کے باوجود وہ یہ آس لگائے بیٹھا تھا کہ ایک دن ماں بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ اب جو اس کی طبیعت بگڑنے کا فون آیا تو اس کی اپنی دنیا زیر و زبر ہونے لگی۔ وہ حتی الامکان تیزی سے کام لے کر فوراً ہی اسپتال پہنچا لیکن جب ماں کو دیکھا تو وہ پہلے والی ہی کیفیت میں تھی۔

"مجھے یہاں سے کسی نے فون پر اطلاع دی تھی کہ میری ماں کی حالت بہت خراب ہے۔ کیا سچ مچ اس کی حالت بگڑ گئی تھی؟" یہ گمان کرتے ہوئے کہ ممکن ہے، ماں کی حالت خراب ہوئی ہو اور ڈاکٹرز نے قابو پا لیا ہو... اس نے ڈیوٹی نرس سے پوچھا۔

"نہیں، ان کی طبیعت تو پہلے ہی جیسی ہے۔ یہاں سے تو کسی نے آپ کو فون نہیں کیا۔ آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو گی۔" نرس کے جواب نے اسے چکرا کر رکھ دیا۔ یک دم ہی اسے احساس ہوا کہ اسے نہایت خوب صورتی سے بے وقوف بنایا گیا ہے۔ ماں کی طبیعت کی خرابی ایک ایسا بہانہ تھا جس کی مدد سے اسے اس کی جگہ سے ہٹایا جا سکتا تھا اور یقیناً اسے وہاں سے ہٹانے کے بعد مجرم اپنا کام کر گئے تھے۔ اس صورت حال نے جہاں اس پر یہ منکشف کیا کہ نیاز علی جس ٹورسٹ کمپنی سے وابستہ تھا، وہ اس غیر قانونی کام میں ملوث ہے وہیں یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ وہ لوگ اس کی طرف سے غافل نہیں تھے۔ انہیں علم تھا کہ وہ ان کی نگرانی کر رہا ہے... چنانچہ انہوں نے عین موقع پر اسے وہاں سے ہٹانے کا انتظام کر دیا۔

☆☆☆

کشور کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک طرف طبیعت کی خرابی نے نڈھال کر رکھا تھا تو دوسری طرف راز کھل جانے کا خوف ہر آن گھیرے رکھتا۔ فریدہ کے بارے میں ہونے والے انکشاف نے اسے اور بھی پریشان کر دیا تھا۔ اس کی کوکھ میں چودھری کے گناہ کا بیج پھوٹ پڑا تھا اور یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اسے ہر آن یوں لگتا کہ حویلی پر کوئی عذاب نازل ہونے والا ہے۔ اتنے بڑے بڑے مظالم اور گناہوں کے نتیجے میں عذاب نازل بھی ہونا چاہیے تھا۔ وہ تو حیران تھی کہ اللہ نے کیوں اب تک اپنی رسی دراز کر رکھی ہے؟ شاید اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت تھی... لیکن بہرحال وہ اس جگہ پر مزید ٹھہر کر کسی عذاب کا انتظار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کے وجود میں آفتاب کی محبت کی نشانی پل رہی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ کم از کم اتنا ضرور جیے کہ اپنی محبت کا یہ تحفہ آفتاب کو پیش کر سکے۔ یہ تحفہ اسی صورت میں آفتاب کو دیا جا سکتا تھا کہ وہ حویلی سے نکل جاتی لیکن اس کے لیے حویلی سے نکلنے کی ساری راہیں مسدود تھیں۔ رانی کی حویلی میں عدم موجودگی نے اس کے ہاتھ پیر کاٹ دیے تھے۔ رانی کی واپسی کے سلسلے میں اس نے ایک دو بار وڈی چودھرائن سے بات بھی کی تھی لیکن اس کا کہنا تھا کہ رانی کا لاہور والی کوٹھی میں رکنا ضروری ہے کیونکہ وہاں حاجرہ اکیلی صحیح طرح سے انتظامات سنبھال نہیں پا رہی تھی۔

کشور کہنا چاہتی تھی کہ رانی کو واپس بلا کر کسی اور ملازمہ کو وہاں بھیج دیا جائے لیکن اسے یہ بھی علم تھا کہ وڈی چودھرائن سے بحث فضول ہے۔ وہ وہی کچھ کرتی تھی جو اس کا دل چاہتا تھا۔ بہت سوچنے کے بعد آخر کشور کو آفتاب سے رابطے کی ایک صورت نظر آئی۔ آفتاب اس کی بڑی بہن تاجور کے بیٹے منور کو پڑھانے کے لیے جاتا تھا۔ اس کی دونوں بڑی سوتیلی بہنیں تاجور اور صنوبر اپنے ماموں کے گھر بیاہی ہوئی تھیں۔ وہ بہنوں اور ان کے بچوں سے ملنے کے بہانے وہاں جا سکتی تھی۔ اس امید پر کہ وہاں جانے پر آفتاب سے رابطے کی کوئی صورت نکل آئے، اس نے وڈی چودھرائن سے بہنوں کے گھر جانے کی اجازت طلب کی۔ پہلے تو وہ ٹال مٹول کرتی رہی پھر اس کے اصرار پر اس شرط پر راضی ہو گئی کہ دو دن بعد چلیں گے۔ ان دو دنوں میں اسے حویلی میں استعمال ہونے والے اناج کے اسٹورز کی اپنی نگرانی میں صفائی کروانی تھی۔ بے شمار مستعد ملازماؤں کی موجودگی کے باوجود وڈی چودھرائن ایسے ہر کام کی خود نگرانی کرنا پسند کرتی تھی۔ اسے شک رہتا تھا کہ اگر وہ ملازماؤں کے سر پر مسلط نہیں رہی تو وہ ہڈ حرامی کریں گی یا موقع کا فائدہ اٹھا کر کچھ چرا

کر لے جائیں گی۔ اللہ اللہ کر کے انتظار کے یہ دو دن گزرے اور کشور نے وڈی چودھرائن کے ساتھ اس کے میکے جانے کے لیے رخت سفر باندھا۔ اس کی اپنی ماں چودھرائن ناہید البتہ ساتھ نہیں جا رہی تھی۔ اسے وڈی چودھرائن نے اپنے پیچھے حویلی کی نگرانی کا کام سونپا تھا اور خود شاید کشور کی نگرانی کے لیے اس کے ساتھ گئی تھی۔

وہ دونوں وہاں پہنچیں تو ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ تاجور اور صنوبر ماں کی آؤ بھگت کرنے کے ساتھ ساتھ اسے بھی کریدتی رہیں کہ اس کی ذہنی حالت کو جانچ سکیں۔ پچھلے دنوں تسلسل سے یہ سننے میں آ رہا تھا کہ کشور کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں ہے۔ اسے دورے پڑنے لگے ہیں۔ تاجور تو اپنے تئیں لاہور میں اس کے قیام کے عرصے میں اس کی دیوانگی کا مظاہرہ اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی آئی تھی۔ یہ اس وقت کی بات تھی جب کشور نکاح کے بعد پہلی بار آفتاب سے ملنے گئی تھی اور اس نے اس ملاقات کے اہتمام کے لیے پور پور خود کو سجایا تھا۔ اس وقت رانی نے مصلحتاً یہ جھوٹ بول دیا کہ بی بی کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے اور وہ دیوانگی کی حالت میں خود کو اس طرح سجانے سنوارنے بیٹھ جاتی ہیں۔ تاجور نے واپس گاؤں آ کر ماں کو ساری رپورٹ دی۔ ساتھ ہی صنوبر کو بھی سب کچھ بتایا، چنانچہ اب جبکہ وہ بہنوں سے ملنے ان کے گھر گئی تھی تو وہ بہانے بہانے سے اس کی ذہنی حالت جاننے کی کوشش کر رہی تھیں۔ کشور نا سمجھ نہیں تھی لیکن سب کچھ سمجھنے کے باوجود انجان بن گئی اور بہنوں کی باتیں نظر انداز کر کے ان کے بچوں کے ساتھ ہنسنے کھیلنے میں لگی رہی۔ سوتیلے رشتے کے باوجود اسے ان بچوں سے بہت محبت تھی اور اب تو جبکہ وہ خود ماں بننے جا رہی تھی، اسے یہ بچے اور بھی اچھے لگ رہے تھے۔ بچوں کے ساتھ مصروف وقت کس طرح گزرا اسے احساس ہی نہیں ہوا۔ البتہ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اس کے اعصاب تن گئے۔ اسے معلوم تھا کہ آفتاب دوپہر کے بعد ہی منور کو پڑھانے آتا ہے اور اسے اسی موقع سے کسی طرح فائدہ اٹھانا تھا۔ کھانے کے بعد کا وقت اس کے لیے بڑا کٹھن اور صبر آزما تھا۔ آخر خدا خدا کر کے یہ وقت بھی گزرا اور ایک ملازمہ نے اطلاع دی کہ منور شاہ کے ماسٹر صاحب پڑھانے کے لیے آ گئے ہیں۔ کشور اس وقت غیر محسوس طور پر منور کے ساتھ ہی مصروف تھی اور اس کے بیگ سے کتابیں، کاپیاں نکال کر بظاہر اس سے پڑھائی کے بارے میں ہی پوچھ گچھ کر رہی تھی۔ اس نے ماسٹر کی آمد کی اطلاع سنی تو اس کا دل بری طرح دھڑک اٹھا۔ منور کی کتابیں کاپیاں سمیٹ کر بیگ میں رکھتے ہوئے اس کے ہاتھ بری طرح کپکپا رہے تھے۔

"منور کو پڑھانے کے بعد مجھ سے حویلی کے باغ میں ملیں۔" اس نے منور کی اردو کی کاپی کے اس صفحے پر جہاں آفتاب نے اسے ہوم ورک دیا تھا، یہ مختصر سا پیغام موقع ملتے ہی چپکے سے لکھ دیا تھا اور بیگ میں وہ کاپی سب سے اوپر رکھ دی تھی۔ پھر بھی اس کا دل ڈر رہا تھا کہ جانے آفتاب یہ پیغام دیکھے گا بھی یا نہیں۔ وہ کسی وجہ سے نہ دیکھ پاتا تو اس کا یہاں آنا بے کار چلا جاتا پھر دوبارہ ایسا موقع نکالنا بھی مشکل تھا۔ منور اپنی ملازمہ کے ساتھ پڑھنے کے لیے چلا گیا... وہ تب بھی بہت دیر تک تذبذب کے عالم میں بیٹھی رہی۔

"کیا گل ہے کشور! وڈی چپ چپ سی ہے؟" اس کی خاموشی کو دیکھ کر صنوبر نے اس سے دریافت کیا۔

"کچھ نہیں آپا! بس طبیعت کچھ سست ہو رہی ہے۔ تھوڑی دیر سوؤں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔" اس نے بہانہ بنایا۔ اس بہانے کی اسے ضرورت بھی تھی تاکہ کسی طرح ان لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو سکے۔

"تو جا، جا کر تھوڑی دیر سو لے۔" اس کی حسب خواہش صنوبر نے مشورہ دیا جس پر اس نے فوراً عمل کیا اور اپنی جگہ سے کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔

"میں بچوں کے کمرے میں جا کر لیٹ جاتی ہوں۔ وہاں آپ نے بڑی اچھی سیٹنگ کروائی ہوئی ہے۔ مجھے وہاں بڑا سکون ملتا ہے۔"

"یہ تو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اختر نے خاص طور پر شہر سے بندہ بلا کر وہ کمرا سیٹ کروایا تھا۔ تجھے وہاں چنگا لگتا ہے تو جا... وہیں جا کر سو جا۔ بچے کون سا وہاں رہتے ہیں؟ انہیں تو اماؤں کے کلیجے میں ہی گھسنے سے فرصت نہیں ملتی۔" اس کی تعریف پر خوش ہوتے ہوئے صنوبر نے اپنے شوہر کا نام لیا اور وہ بات بتائی جو اس سے قبل بھی متعدد بار بتا چکی تھی اور ساتھ ہی فراخ دلی سے اجازت بھی دے دی۔

"ابھی بچے چھوٹے ہیں نا آپا... اس لیے انہیں آپ کے پاس رہنا زیادہ اچھا لگتا ہے۔ بڑے ہوں گے تو خود اپنے کمرے کی طرف لپکیں گے۔" کشور نے اسے تسلی دی اور خود بچوں کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کمرے کا انتخاب اس نے خود جان بوجھ کر کیا تھا کیونکہ ایک تو واقعی یہ کسی کے زیر استعمال نہیں رہتا تھا، دوسرے اس کمرے میں سلائڈنگ ونڈوز لگی تھیں جن کے باہر کسی قسم کی سلاخیں یا جالیاں وغیرہ نہیں تھیں اور وہ وہاں سے اتر کر باغ میں جا سکتی تھی۔ کمرے

میں پہنچ کر اس نے اندر سے لاک لگا لیا اور وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگی۔ اس کے اندازے کے مطابق اب آفتاب کے وہاں سے رخصت ہونے میں دس منٹ ہی رہ گئے تھے۔ وہ ذرا سی کوشش کرتا تو گیٹ کی طرف جاتے ہوئے بائیں طرف مڑ کر باغ میں جا سکتا تھا۔ کشور کو یقین تھا کہ اس کا پیغام پڑھ لینے کی صورت میں وہ یہ کوشش ضرور کرے گا۔ ٹھیک دس منٹ بعد اس نے حسب پروگرام کمرا چھوڑ دیا اور نہایت احتیاط کے ساتھ کھڑکی پھلانگ کر باغ کی طرف بڑھ گئی۔ وہ جس حالت میں تھی، اس میں اس طرح کی حرکت نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتی تھی لیکن بڑے خطرے میں پھنسنے سے پہلے اس نے یہ قدرے چھوٹا خطرہ مول لینا مناسب سمجھا تھا۔ خیر گزری کہ وہ آسانی سے اس مرحلے سے گزر گئی اور باغ کے اس حصے میں پہنچ گئی جہاں امرودوں کے درخت تھے۔ دو منٹ بعد ہی اسے آہٹ سنائی دی۔ وہ آہٹ پر متوجہ ہوئی تو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ آنے والا آفتاب ہی تھا۔

"کہاں کھو گئی ہیں آپ؟ میں اس عرصے میں کتنا پریشان رہا ہوں آپ کو لفظوں میں بتا نہیں سکتا۔" اس کے قریب پہنچ کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے وہ بے تابی سے بولا تو کشور کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ یہ محبت ہی تو تھی جو اسے ہر خطرے سے بے خوف کر دیتی تھی لیکن فی الحال یہ جذباتی ہونے یا اپنی کیفیات کے اظہار کا وقت نہیں تھا۔ اسے اس مختصر سی مہلت میں آفتاب کو سارے حالات سے باخبر کرنا تھا چنانچہ خود کو مضبوط کرتے ہوئے بولی۔

"پچھلے دنوں مجھ پر کیا گزری اور میرا آپ سے رابطہ کس طرح ٹوٹا، یہ ساری تفصیلات میں آپ کو بعد میں بتاؤں گی۔ فی الحال میں نے آپ کو ایک بہت ضروری بات بتانے کے لیے بلایا ہے۔"

"کیا ہوا ہے کشور! خیریت تو ہے؟" آفتاب اس کی سنجیدگی دیکھ کر پریشان ہوا۔

"پتا نہیں اسے کیا کہیں گے۔ میں جو خبر آپ کو سنانے جا رہی ہوں، عام حالات میں تو وہ کسی شادی شدہ جوڑے کے لیے بہت بڑی خوش خبری ہوتی ہے لیکن ہمارے حالات ایسے ہیں کہ ہم کھل کر اس خوشی پر خوش بھی نہیں ہو سکتے۔"

"کیسی خوش خبری؟" اس کی بات سن کر آفتاب چونکا۔

"میرے وجود میں آپ کی محبت کی نشانی سانس لینے لگی ہے آفتاب۔" کشور نے جھجکتے ہوئے اسے بتایا۔

"واقعی؟" اس نے ردِعمل میں بے ساختہ خوشی کا اظہار کیا۔

"ہاں، یہ سچ ہے۔ میں تصدیق کروا چکی ہوں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اب میں مزید حویلی میں نہیں رک سکتی۔ کسی پر اگر میرا یہ راز کھل گیا تو حویلی میں قیامت آ جائے گی۔" اس کی خوشی کو دیکھتے ہوئے کشور کا دل تو نہیں چاہتا تھا کہ اس لمحے میں اس طرح کی گفتگو کرے لیکن مجبوری یہ تھی کہ اسے ابھی یہ ساری باتیں کرنی تھیں۔ آفتاب نے اس کی بات سنی تو سوچ میں پڑ گیا پھر کچھ دیر کی سوچ بچار کے بعد اس سے پوچھنے لگا۔

"کیا آپ کسی بہانے کچھ دیر کے لیے حویلی سے باہر کہیں جا سکتی ہیں؟ کچھ نہیں تو درگاہ تک ہی سہی۔"

"ہاں، یہ تو ممکن ہے۔ میں جمعرات کے دن درگاہ پر حاضری کے بہانے کسی ملازمہ کے ساتھ وہاں پہنچ سکتی ہوں۔" اس کا مطلب پوری طرح نہ سمجھتے ہوئے بھی کشور نے جوش سے اس کی بات کا جواب دیا۔

"بس تو پھر آپ اب آنے والی جمعرات کو عصر مغرب کے درمیان وہاں پہنچ جائیے گا۔" وہ دھیمی آواز میں اسے اپنا منصوبہ سمجھانے لگا۔ اچانک سامنے آ جانے والی اس صورتِ حال پر اس نے گھبرانے یا سٹپٹانے کے بجائے پوری بیدار مغزی کا ثبوت دیا تھا اور بہت تیزی سے آئندہ کا لائحہ عمل طے کیا تھا۔ کشور پوری توجہ سے اس کے منصوبے کی ساری جزئیات سن کر ذہن نشین کرنے لگی۔ اب اس منصوبے کی کامیابی پر ہی اس کی اور اس کے آنے والے بچے کی زندگی کا دارومدار تھا۔

"ٹھیک ہے نا... آپ میری ساری بات اچھی طرح سمجھ تو گئی ہیں نا؟" اسے سب کچھ سمجھانے کے بعد آفتاب نے اس سے سوال کیا جس کے جواب میں کشور نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بس تو پھر اب میں چلتا ہوں۔ میرا زیادہ دیر یہاں ٹھہرنا اور آپ کا منظر سے غائب رہنا کوئی مشکل بھی کھڑی کر سکتا ہے۔" آفتاب نے اس سے کہا اور جاتے جاتے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے کر اپنے ہونٹوں کے نزدیک لے گیا۔ بس یہی وقت کا وہ مختصر لمحہ تھا جو وہ دونوں اپنے اردگرد سے بے خبر ہو گئے اور انہیں اپنے اس گوشۂ تنہائی میں کسی کے آنے کی آہٹ سنائی نہیں دے سکی۔

"خبردار!" ایک نہایت رعب دار آواز قریب سے ابھری تو وہ دونوں بُری طرح بدک کر مدہوشی کی کیفیت سے نکلتے ہوئے اس سمت متوجہ ہو گئے جہاں سے آواز آئی تھی۔

حادثات و سانحات کی شکار.. پناہ کی تلاش میں سرگرداں ماہ بانو کی داستانِ حیات کے واقعات اگلے ماہ پڑھیے

چودھویں قسط

اسماقادری

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور بااثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں۔مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں ، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے...... یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے...... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے ۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے ۔ زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں ...... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے ۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے ...... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ جرم ،افسرشاہی ،جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل...... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پُرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرِ نگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں بیر آباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ چودھری ظالم و جابر اور عیاش تھا۔ وہ سرکاری افسروں کی ملی بھگت سے لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ کر رہا تھا۔ شہریار نہ صرف یہ دھندے روک دیتا ہے بلکہ علاقے میں اسکول وغیرہ قائم کرنے کی کوششیں شروع کر دیتا ہے۔ بیر آباد کا رہائشی ماسٹر آفتاب جو عرصے سے گاؤں کے پرائمری اسکول کی ترقی کا خواہش مند شہریار کا سہارا پاکر کھل کر اپنے مشن پر کام کرنے لگتا ..... آفتاب بھی چودھری کے ناپسندیدہ افراد میں سے ایک ہے جسے اسکول چلانے کے جرم میں چودھری اپنے آدمیوں کے ذریعے زدوکوب کرتا ہے لیکن آفتاب ہتھیار نہیں ڈالتا۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب کو دیکھتی ہے تو اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس کی محبت کی شدت کو دیکھتے ہوئے آفتاب کو اسے اپنے دل میں جگہ دینی پڑتی ہے اور دونوں کے درمیان ہونے والی چوری چھپے کی ملاقاتیں خفیہ نکاح تک جا پہنچتی ہیں۔ ماہ بانو کا تعلق بھی بیر آباد سے ہے۔ اس کے والدین بچپن میں ہی اسے اس کے خالہ خالو کو گود دے دیتے ہیں جن کے ساتھ وہ فیصل آباد میں رہتی تھی لیکن والدین اور بھائی بہنوں سے ملاقات کے لیے اس کا بیر آباد آنا جانا رہتا تھا۔ چودھری افتخار پیری مریدی کے چکر میں اپنے مرحوم دادا کا عرس بڑی شان و شوکت سے مناتا ہے۔ عرس کے دنوں میں جبراً حویلی کے کاموں کے لیے بلوائی جانے والی ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آ جاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکل کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اگلی بار اس کا اپنی بہن کی شادی میں دوبارہ بیر آباد آنا ہوتا ہے۔ چودھری اسے اغوا کروا لیتا ہے لیکن ماہ بانو ایک بار پھر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چودھری افتخار ہر صورت اس سے شادی کرنا چاہتا ہے مگر ماہ بانو شادی سے قبل ہی اپنی بہن زہرہ کے تعاون سے گھر سے بھاگ نکلتی ہے اور شہریار سے جا ملتی ہے۔ شہریار اسے اپنی گاڑی میں چھپا کر بیر آباد سے نکال دیتا ہے اور دارالامان بھجوا دیتا ہے لیکن چودھری کے آدمی وہاں بھی پہنچ جاتے ہیں لیکن دارالامان کے چوکیدار کی مداخلت کی وجہ سے وہ ماہ بانو کو لے جانے میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔ شہریار ماہ بانو کو دارالامان سے چودھری کے سابق دوست موتی والا کی کوٹھی پر بھجوا دیتا ہے۔ موتی والا جو لکڑی کی اسمگلنگ میں چودھری کا دستِ راست تھا، اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کے بعد چودھری کا ساتھ چھوڑ کر شہریار سے مل جاتا ہے۔ چودھری غداری کرنے کے جرم میں موتی والا اور اس کی بیوی کو مروا دیتا ہے۔ کوٹھی کی انیکسی میں مقیم ماہ بانو موتی والا کے ڈرائیور سرمد کی مدد سے فرار ہو کر اس کے ایک دوست عامر کے گھر پہنچ جاتی ہے۔ عامر کے گھر ایک ایسی لڑکی کا آنا جانا ہوتا ہے جو در حقیقت تیسری صنف سے تعلق رکھتی ہے۔ خواجہ سراؤں کا ایک گروہ اس لڑکی کے پیچھے پڑ جاتا ہے اور لڑکی کو بچانے کے چکر میں ماہ بانو خود اس گروہ کے ہاتھ لگ جاتی ہے۔ خواجہ سراؤں کا گرو الماس بطور سزا اس سے وہی کام لیتا ہے جو اس کے گرگے کرتے ہیں۔ ایک روز الماس اسے لے کر ایک ہندو سیٹھ کی کوٹھی پہنچتا ہے۔ راستے میں ٹیکسی والے کی بدتمیزی کی وجہ سے ماہ بانو زخمی ہو جاتی ہے۔ کوٹھی میں اسے ایک حیرت انگیز منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔ کوٹھی کے تہ خانے میں کئی خواجہ سرا جمع ہوتے ہیں جن کی موجودگی میں ان کا مہا گرو ایک نوجوان لڑکی کو ایک مورتی کے قدموں میں بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ وہ گرو الماس کے ساتھ واپس ٹھکانے پر آتی ہے اور وہاں ایک نیک فطرت خواجہ سرا انگار کو اس راز میں شریک کر لیتی ہے۔ انہی دنوں گرو انہیں ایک شادی پر بھیجتا ہے۔ وہاں ماہ بانو کو پتا چلتا ہے کہ دلہن نیلم وہ لڑکی ہے جسے موتی والا کا ڈرائیور سرمد پسند کرتا ہے اور لڑکی کی سوتیلی ماں اس کی زبردستی ایک بوڑھے سے شادی کروانے پر بضد تھی۔ وہ نیلم کو اپنے کپڑے پہنا کر ٹکا کر کے ساتھ وہاں سے نکال دیتی ہے۔ صبح شادی والے گھر پر چھاپا پڑتا ہے اور ماہ بانو کو عزت کے ساتھ تھانے لے جایا جاتا ہے جہاں شہریار کے ماموں زاد بھائی ڈی آئی جی سجاد رانا سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ سجاد رانا کو اپنی بیٹی شینا کی تلاش ہوتی ہے جسے خواجہ سراؤں کے ایک گروہ نے اغوا کر لیا تھا۔ چنانچہ جب اسے یہ اطلاع ملتی ہے کہ خواجہ سراؤں کے ایک گروہ میں ایک لڑکی دیکھی گئی ہے تو وہ اسے اپنی بیٹی سمجھ کر بازیافت کروانے کی کوشش کرتا ہے اور نتیجے میں ماہ بانو آزاد ہو جاتی ہے۔ ماہ بانو کو وہ اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاتا ہے جہاں شہریار بھی موجود ہوتا ہے۔ وہیں وہ شینا کی تصویر دیکھتی ہے اور شہریار کو بتاتی ہے کہ اس لڑکی کو ہندو سیٹھ کی کوٹھی میں ایک دیوی کے قدموں میں بھینٹ چڑھایا جا چکا ہے۔ ہندو سیٹھ کی کوٹھی پر چھاپا مارا جاتا ہے لیکن وہاں سے سیٹھ اور شینا کو اغوا کرنے والے خواجہ سراؤں کی لاشوں کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ سجاد رانا کو اپنی بیٹی کے قاتلوں کی تلاش تھی اور یہ تلاش اس کی راہ کے ایجنٹوں سے مڈبھیڑ کروا دیتی ہے جس کا حتمی نتیجہ اس کے قتل کی صورت میں نکلتا ہے۔ چودھری، ماہ بانو کی سجاد رانا کے گھر موجودگی کی بھنک پا کر اسے وہاں سے اغوا کروانے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہ کوشش ناکام ہو جاتی ہے اور شہریار اپنے ڈرائیور مشابر خان کے مشورے پر ماہ بانو کو کاغان منتقل کر دیتا ہے۔ کاغان سے ماہ بانو مشابر خان کے بھائی اکرم خان اور ماں کے ساتھ ہوتے ایک شادی میں شرکت کے لیے جاتی ہے اور وہاں کی کیمپنگ سائٹ پر ایک گورے کی ہوس کا نشانہ بننے سے بچ جاتی ہے لیکن وہ ماہ بانو کو اغوا کرتا ہے اور اس کارروائی میں اکرم خان مارا جاتا ہے۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ ماہ بانو کے بارے میں ساری معلومات حاصل کر لیتا ہے اور یہ جاننے کے بعد کہ چودھری ماہ بانو کی تلاش میں ہے، ایک منصوبہ تشکیل دیتا ہے۔ بیر آباد سے متصل جنگل کو اس کے مخصوص ماحول کی وجہ سے پوست کی کاشت کے لیے استعمال کرنا اس کے منصوبوں میں سے ایک ہے جس کے لیے وہ ماہ بانو کا لالچ دے کر چودھری کو اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ چودھری کے ظلم و جبر کی ایک نشانی فریدہ ہے۔ وہ نور پور گاؤں کے چودھری مختار کی بہن ہے۔ چودھری مختار کو افتخار عالم شاہ اس کی روشن خیالی اور اپنی غلامی نہ کرنے کی وجہ سے پسند نہیں کرتا تھا۔ فریدہ اپنے بھائی کے مخالفوں میں ایک نوجوان قربان کی محبت کے جال میں پھنس جاتی ہے اور اس کے ساتھ بھاگ کر بیر آباد چودھری کی پناہ میں آ جاتی ہے۔ وہاں اسے پناہ کے بجائے چودھری کی ہوس کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چودھری اسے اپنے ذہنی معذور بیٹے کی دلہن بنا کر حویلی لے آتا ہے۔ یہ شادی ایک ڈھونگ تھی جس کی آڑ لے کر چودھری مسلسل رشتوں کا تقدس پامال کر دیتا ہے۔ شہریار اور چودھری کے درمیان مخاصمت اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ چودھری ڈاکٹر ماریا نامی ایک لڑکی کے ساتھ اس کی قابلِ اعتراض تصویریں اتار کر اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ڈاکٹر ماریا کے تعاون کی وجہ سے شہریار وہ تصویریں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور چودھری کی چال سے بچ نکلتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اپنی پشت پر سے سنائی دینے والی بارعب آواز پر وہ دونوں بدک کر بولنے والے کی طرف متوجہ ہوئے اور دونوں کے سینے سے ہی بے اختیار ایک اطمینان بھرا سانس خارج ہوا۔ وہ منور شاہ تھا جو اپنے ننھے ہاتھوں میں ایک کھلونا کلاشنکوف اٹھائے ان کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس کی کلاشنکوف کا رخ ان دونوں کی طرف تھا۔ ’’میں نے آپ دونوں کو ڈرا دیا۔ اتنے بڑے ہو کر بھی آپ دونوں اتنے بزدل ہیں۔‘‘ منور شاہ جس کی کھلونا کلاشنکوف کا رخ ان دونوں ہی کی جانب تھا، اس طرح انہیں ڈرا دینے کے اپنے کارنامے پر کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔

’’بہت شریر ہو گئے ہو تم شیطان!‘‘ کشور نے اس کے قریب جا کر اس کا کان پکڑتے ہوئے کہا۔ ویسے وہ اور آفتاب دونوں ہی اپنی اپنی جگہ جھینپے ہوئے تھے کہ وہ ایک بچے سے ڈر گئے۔ اصل میں کچھ تو خوف ان کے اپنے اندر تھا اور کچھ منور آواز بھی بھاری بنا کر بالکل کسی بڑے آدمی کی طرح بولا تھا، اس لیے لمحہ بھر کے لیے وہ دونوں ہی سن پڑ گئے تھے۔

’’آپ دونوں یہاں کیا کر رہے تھے؟‘‘ منور نے اپنا کان کشور کی گرفت سے چھڑوانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ اس کے سوال نے انہیں احساس دلایا کہ منور کا یہاں آنا اور ان دونوں کو ساتھ دیکھ لینا اتنا بھی بے ضرر نہیں ہے۔ بے شک وہ بچہ تھا اور ان کے درمیان موجود تعلق کو نہیں سمجھ سکتا تھا لیکن اپنی نادانی اور معصومیت میں وہ کسی کے سامنے اس بات کا تذکرہ تو کر سکتا تھا۔

’’آپ جائیں آفتاب! میں اسے سنبھال لوں گی۔‘‘ گزرتے وقت کا احساس کرتے ہوئے کشور نے آفتاب کو پہلے وہاں سے رخصت کر دینا مناسب سمجھا۔ زیادہ تاخیر گیٹ پر موجود چوکیدار کی نظر میں آ سکتی تھی۔ اس کا مقصد سمجھتے ہوئے آفتاب نے بھی فوری طور پر وہاں سے رخصت ہو جانا مناسب سمجھا اور ننھے منور سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

’’اوکے ماسٹر! میں چلتا ہوں۔ تم اپنا ہوم ورک اچھی طرح کر لینا۔‘‘

’’یس سر! میں کر لوں گا بلکہ خالہ سے کہوں گا کہ یہ میرا ہوم ورک کروا دیں۔‘‘ منور نے جواب دیا۔ اس تھوڑے سے عرصے میں وہ آفتاب سے کافی مانوس ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ بڑے طریقے سلیقے سے بات چیت کرتا تھا۔ اصل میں ابھی وہ تھا بھی اتنا کم عمر کہ مزاج میں حاکمانہ خوبو پیدا نہیں ہوئی تھی۔ آفتاب نے اس کے معصومانہ انداز پر پیار سے اس کا رخسار تھپتھپایا اور مسکراتا ہوا وہاں سے رخصت ہو گیا۔

’’آپ میرا ہوم ورک کروائیں گی نا خالہ؟‘‘ کشور ابھی جانے والے کے قدموں کے نشانوں میں ہی محو تھی کہ منور نے اس کا ہاتھ ہلاتے ہوئے پوچھا۔ وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

’’بالکل کرواؤں گی... مگر ایک شرط پر۔‘‘

’’وہ کیا؟‘‘ منور نے تجسس سے پوچھا۔

’’آپ کسی کے سامنے ذکر نہیں کرو گے کہ آپ نے مجھے اور ماسٹر صاحب کو یہاں دیکھا تھا۔‘‘

’’نہیں کروں گا لیکن پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ دونوں یہاں کیا کر رہے تھے؟‘‘ منور نے اس کی بات ماننے کی تو ہامی بھر لی لیکن فطری تجسس کے باعث سوال کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

’’یہ بات میں تمہیں اندر چل کر بتاؤں گی۔‘‘ کشور نے گزرتے وقت کا احساس کرتے ہوئے اس سے کہا اور پھر اس کی انگلی تھام کر واپسی کے راستے پر چل پڑی۔

’’ہم یہاں سے اندر جائیں گے؟‘‘ وہ واپس بچوں کے کمرے کی کھلی سلائیڈنگ ونڈو کے پاس آ کر ٹھہری تو منور نے حیرت سے پوچھا۔

’’ہاں، یہاں سے اندر جانے میں بہت مزہ آئے گا۔‘‘ کشور نے اسے جواب دیا اور پہلے اسے سہارا دے کر کھڑکی پر چڑھنے میں مدد دی، اس کے بعد خود بھی کھلی کھڑکی سے گزر کر اندر پہنچ گئی۔

’’کیوں آیا نا مزہ؟‘‘ اندر پہنچ کر اس نے منور سے پوچھا۔

’’بہت مزہ آیا۔‘‘ وہ بچہ تھا اور اسے زندگی میں ہونے والا ہر نیا تجربہ انوکھا اور خوش کن ہی لگ سکتا تھا۔ چنانچہ اس وقت یوں کھڑکی پھلانگ کر اندر پہنچنے پر ہی خوش ہو گیا۔

’’بس اسی لیے میں یہاں سے چھلانگ لگا کر باغ میں گھومنے کے لیے گئی تھی۔ مجھے بھی ایسے کھڑکی سے آنے جانے میں بڑا مزہ آتا ہے۔‘‘ وہ منور کا ذہن اپنی اور آفتاب کی ملاقات کی طرف سے صاف کرنے کے لیے اقدامات کر رہی تھی۔

’’اور ماسٹر صاحب کس لیے باغ میں گئے تھے؟‘‘ خالہ کی طرف سے کچھ مطمئن ہونے پر اس نے اپنے استاد کے بارے میں سوال کیا۔

’’ان کا امرود کھانے کا دل چاہ رہا تھا اس لیے وہ وہاں گئے تھے۔‘‘ کشور نے اسے بہلایا۔

’’تو وہ مجھ سے کہہ دیتے۔ میں مالی سے بہت سارے امرود تڑوا کر انہیں دے دیتا۔‘‘

’’لیکن ان کا تو خود سے امرود توڑ کر کھانے کا دل چاہ رہا تھا۔ جیسے کھڑکی پھلانگ کر کمرے میں آنے جانے میں

بہت مزہ آتا ہے، ایسے ہی خود اپنے ہاتھ سے امرود توڑ کر کھانے میں بھی بڑا مزہ آتا ہے۔'' کشور نے اسے سمجھایا۔

''اچھا تو یہ بات تھی... ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔'' منور شاہ یوں سر کو ہلا کر بولا جیسے کوئی بہت بڑی گتھی سلجھ گئی ہو۔

''اب آپ کسی کے سامنے اس بات کا ذکر نہیں کرنا ورنہ پاپا ماسٹر صاحب سے ناراض ہو جائیں گے اور ان کا یہاں آنا بند کروا دیں گے۔ ماسٹر صاحب نہیں آئیں گے تو آپ کو پڑھائے گا کون؟'' وہ واقف تھی کہ منور، آفتاب کو اچھا خاصا پسند کرتا ہے اس لیے اس کی کمزوری کو پکڑتے ہوئے اسے زبان بندی کے لیے پابند رکھنے کی کوشش کی۔

''میں نے کہہ دیا ہے نا کہ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ اب آپ جلدی سے میرا ہوم ورک کروا دیں۔ ورنہ نانی جان آپ کو واپس بڑی حویلی لے جائیں گی۔'' منور نے اسے یقین دہانی کروائی اور اپنے مسئلے کی طرف متوجہ کروایا۔

''ٹھیک ہے۔ جاؤ، آپ اپنا بیگ لے کر آؤ۔ میں آپ کا ہوم ورک کروا دیتی ہوں۔'' کشور نے اس کی معصومانہ ادا پر اس کا رخسار چومتے ہوئے اس سے کہا تو وہ دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ کشور اس کے باہر نکلتے ہی بے دم سی ہو کر ایک فلور کشن پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ ایک ننھے سے بچے کی مداخلت کی وجہ سے صورتِ حال کافی گمبھیر ہو گئی تھی۔ اپنے طور پر تو اس نے پکا انتظام کر دیا تھا کہ منور شاہ کسی کے سامنے زبان نہ کھولے لیکن ایک معصوم بچے پر کتنا بھروسا کیا جا سکتا تھا۔ اپنی معصومیت میں وہ غیر ارادتاً ہی کسی کے سامنے یہ سارا واقعہ دُہرا دیتا تو بڑی مشکل ہو جاتی۔

☆☆☆

ناشتا کرتے ہوئے ماہ بانو کا ذہن رات عمران سے ہونے والی گفتگو میں الجھا ہوا تھا۔ عمران کی داستانِ حیات واقعی بڑی پُردرد تھی۔ ایک امیر زادے کی ہوس نے ہنستے بستے گھر کو اجاڑ ڈالا تھا۔ وہ گھر جو عمران کی ماں نے اپنی شبانہ روز محنت سے تنکا تنکا جمع کر کے بنایا تھا، صرف اس لیے بکھر گیا تھا کہ عمران کی نادان بہن اس امیر زادے کی محبت کے جال میں پھنس گئی تھی۔ امیر زادے نے جال میں پھنسی اس چڑیا کی بے بسی سے خوب لطف اٹھایا اور اس بات کی پروا نہ کی کہ اس کی یہ حرکت ایک عزت دار سفید پوش گھرانے کے لیے کیسی مصیبت لے آئے گی۔ ماہ بانو کو اپنی اور عمران کی زندگی میں کافی مماثلت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بھی ہوس پرست و دولت کے پجاری چودھری افتخار عالم شاہ کی وجہ سے دربدر تھی۔ چودھری نے اس کی وجہ سے اس کے پورے خاندان کو برباد کر دیا تھا۔ نہ تو فیصل آباد میں موجود اس کا وہ چھوٹا سا گھر باقی رہا تھا جہاں وہ بے بے اور ابا کی محبت کی چھاؤں میں رہا کرتی تھی اور نہ ہی پیر آباد کا وہ کچا مکان جہاں اس کے سگے ماں باپ، بھائی بہن رہتے تھے۔ وہ کبھی کبھی چھٹیوں میں گاؤں جاتی تھی تو اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ کچھ وقت گزار آتی تھی۔ اماں ابا سے بے شک اسے یہ شکوہ تھا کہ انہوں نے اسے بیٹی ہونے کی وجہ سے بوجھ جان کر پیدا ہوتے ہی دوسروں کو تھما دیا تھا لیکن بہرحال وہ اپنے دل سے ان کی فطری محبت نہیں نکال سکی تھی۔ چنانچہ جہاں اسے اپنے پرورش کرنے والے بے بے اور ابا کی ناگہانی موت رلاتی تھی، وہیں اپنا پیر آباد والا گھر اجڑ جانے کا غم بھی بے چین رکھتا تھا۔

وہ بالکل عمران کی طرح ہی خانماں برباد تھی۔ ان دونوں میں فرق تھا تو اتنا کہ ایک تو وہ عمران کی بہن فری کی طرح کسی کی ہوس کی بھینٹ چڑھنے سے بچ گئی تھی، دوسرے وہ عمران کی طرح انتقام کی راہ پر نہیں چلی تھی۔ عمران نے اپنا گھر اجاڑنے والے سے اس کی زندگی چھین لی تھی جبکہ وہ ابھی تک اپنی بقا کی جدوجہد میں معروف تھی۔ اس جدوجہد کے دوران اسے کبھی انتقام کا خیال آیا ہی نہیں تھا۔ وہ بس بھاگتی پھر رہی تھی کہ کسی طرح وہ گوشۂ عافیت میسر آجائے جہاں وہ چودھری کی دسترس سے محفوظ رہ سکے۔ اس خواہش نے اسے اس برف زار میں لا پھینکا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ ایک گرداب سے نکلے بغیر ہی دوسرے گرداب میں پھنس گئی ہے... جس سے باہر نکلنے کا اسے کل تک کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا لیکن گزشتہ رات عمران نے اسے آس دلائی تھی کہ وہ اسے یہاں سے نکال کر لے جائے گا۔ اس آس نے اس کے مایوسی میں بکھر جانے والے دل میں ایک بار پھر امید کی شمع روشن کر دی تھی۔ وہ جو دکھ اور مایوسی کے باعث کھانا پینا تک ترک کر چکی تھی، ایک بار پھر جی اٹھی تھی اور اس وقت اپنے سامنے رکھا ناشتا کافی رغبت سے کر رہی تھی۔

پوری طرح باخبر نہ ہونے کے باوجود اسے اتنا اندازہ بہرحال تھا کہ یہاں سے فرار کا سفر بہت دشوار ثابت ہوگا اور اس دشواری کا مقابلہ کرنے کے لیے جسم میں توانائی کا ہونا ضروری تھا۔ اس توانائی کے حصول کی خاطر ہی اس نے پیٹ بھر کر ناشتا کیا۔ ناشتے کے بعد اس کا وقت حسبِ معمول تنہائی کے اذیت ناک لمحے شمار کرتے ہوئے گزرنے لگا... لیکن آج آزادی کی امید نے اس اذیت کو کافی کم کر دیا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ قید جو نہ ختم ہوتی ہوئی نظر آتی تھی، اب اس سے نجات ملنے والی ہے۔ اس امید کے ساتھ ہی وقت دھیرے دھیرے آگے بڑھتا رہا اور صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہو گئی۔ شام کے سائے جب گہرے ہو کر رات کی تاریکی میں ڈھلنے لگے تو اسے تشویش محسوس ہونے لگی۔ پورے دن میں عمران نے اس سے ایک بار بھی رابطے کی کوشش نہیں کی تھی اور نہ ہی اسے ماحول میں کوئی ایسی تبدیلی نظر آئی تھی جس سے یہ احساس ہو پاتا کہ وہاں کوئی غیر معمولی صورتِ حال ہے۔ اسی فکر میں مبتلا وہ اپنے مخصوص انداز میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی کہ قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس آہٹ کو سن کر بھی اس کے اندر کوئی تحریک پیدا نہیں ہوئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہ رات کے کھانے کا وقت ہے اور کوئی نہ کوئی اس کے لیے کھانا لے کر آیا ہوگا۔

''ماہ بانو!'' آنے والے نے جب اسے اپنی طرف متوجہ نہ ہوتے دیکھا تو کھانے کے برتن اس کے قریب رکھتے ہوئے دھیمی آواز میں پکارا۔ وہ آواز شناخت کر کے فوراً ہی متوجہ ہوئی۔ وہ عمران ہی تھا جو اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔

''اچھی طرح پیٹ بھر کر کھانا کھا لو اور کچھ دیر آرام کر لو۔ چند گھنٹے بعد ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔'' سرگوشی کے انداز میں اسے یہ نوید سنا کر وہ ایک پل بھی مزید ٹھہرے بغیر تیزی سے واپس پلٹ گیا لیکن تشویش کا شکار ماہ بانو کے لیے اتنا ہی بہت تھا۔ اس اطلاع نے کہ چند گھنٹوں بعد وہ اس قید خانے سے نکل سکے گی، اس کے اندر ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ ملنے والی آزادی کی امید نے اسے اتنا پُرجوش کر دیا کہ اس نے اس قید خانے میں پہلی بار بے حد رغبت سے کھانا کھایا۔ آج کھانا تھا بھی کافی پُرتکلف۔ مرغی کے شوربے والے سالن کے ساتھ ساتھ فش کے تلے ہوئے قتلے بھی کھانے میں شامل کیے گئے تھے۔ ایک پیالے میں بھاپ اڑاتا کارن سوپ بھی تھا... یعنی پورا دعوت کا اہتمام تھا۔ اس نے جی بھر کر یہ غذائیت بخش کھانا کھایا اور حسبِ معمول اس مختصر سی جگہ میں ٹہلنے لگی۔ بیٹھے بیٹھے کھانا ہضم ہونا مشکل ہوتا ہے اس لیے اس نے قید کے دنوں میں یہ معمول بنا لیا تھا کہ کھانا کھا کر تھوڑی دیر ٹہلتی ضرور تھی۔ حالانکہ ٹہلنے کے لیے وہ جگہ بے حد محدود تھی۔ آج بھی اس نے دس منٹ تک چہل قدمی کی اور پھر عمران کی حسبِ ہدایت آرام کی غرض سے لیٹ گئی۔ بہت دنوں بعد پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا اور ذہن بھی کافی پُرسکون تھا، چنانچہ لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔

اسے اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کتنی دیر سوئی ہے لیکن ماحول میں کوئی غیر معمولی تبدیلی آئی تھی جس نے اسے نیند سے جگا

دیا۔ وہ لمحہ بھر تو خالی الذہنی کی کیفیت میں اچانک اپنی آنکھ کھلنے کی وجہ سمجھنے کی کوشش کرتی رہی پھر اس کی قوتِ سماعت نے احساس دلایا کہ وہ ماحول میں پیدا ہونے والے غیر معمولی شور کی وجہ سے جاگی ہے۔ اس جگہ جہاں کوئی مشکل سے ہی بولتا تھا اور وہ انسانی آواز سننے کے لیے ترس جاتی تھی، یہ شور بڑا عجیب محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے کان لگا کر آوازوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ سماعت پر ذرا سا زور دینے پر اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ لوگ اپنی بھونڈی آوازوں میں گانے کے ساتھ ساتھ بلند و بالا قہقہے لگا رہے ہیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہاں کوئی جشن منایا جا رہا ہو۔ اس کے اندر جشن کی نوعیت جاننے کے لیے تجسس جاگ اٹھا اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دبے قدموں سے باہر کی طرف بڑھی۔ اسے کھانا پہنچانے چونکہ عمران خود آیا تھا، اس لیے قید خانے کا راستہ کھلا ہوا تھا۔ وہ بے حد احتیاط سے چلتی آوازوں کی جانب بڑھتی چلی گئی۔ حسبِ معمول غار کے کشادہ حصے میں وہ سب جمع تھے اور محفل بجی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ ان بے ہنگم حلیوں والے لوگوں میں سے بیشتر دیواروں کے ساتھ لگ کر کچھ اس طرح بیٹھے ہوئے تھے کہ دائرہ سا بن گیا تھا اور اس دائرے میں پانچ چھ افراد رقص کے انداز میں جھوم رہے تھے۔ ناچنے والوں میں اور بیٹھے ہوئے دونوں افراد میں یہ قدر مشترک تھی کہ وہ بلند آواز سے گانے کے ساتھ ساتھ ہاتھوں میں جام بھی تھامے ہوئے تھے۔ جام پر جام لنڈھاتے وہ جس مستی کی کیفیت میں تھے، اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس محفل میں ام الخبائث گردش میں ہے، جس کے زیرِ اثر وہ وحشی مرد جھوم رہے ہیں۔

ماہ بانو کے دیکھتے ہی دیکھتے رقص کرنے والوں میں سے ایک نے ایک جانب بیٹھے عمران کو ہاتھ تھام کر کھڑا کیا اور پھر اپنے کاندھوں پر بٹھا کر ناچنے لگا۔ اس کی اس حرکت سے محفل میں مزید گرمی آ گئی اور بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے بھی مزید کچھ افراد کھڑے ہو کر ناچنے والوں میں شامل ہو گئے۔ عمران کو کاندھے پر بٹھانے والا درمیان میں رقص کر رہا تھا جبکہ باقی سب اس کے اردگرد ناچتے ہوئے بار بار عمران کے جسم کو تھپکی دیتے تھے۔ ان سب کے رویّوں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے عمران کوئی دُلہا ہو جس کی برات روانہ ہونے کو ہو... اور بے تکلف دوست اپنے یار کی شادی کا جشن منا رہے ہوں۔ کافی دیر تک یہ ہڑبونگ جاری رہی پھر یک دم ان میں سے ایک شخص اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ کے اشارے سے ناچنے گانے والوں کو خاموشی اختیار کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے بلند آواز میں بولا۔ ”دوستو! تھوڑا صبر کرو اور آرام سے بیٹھ جائیے۔ بھائی صاحب آپ لوگوں سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔“ اس شخص کے یہ اعلان کرتے ہی وہاں ایسی خاموشی چھا گئی جیسے وہاں کوئی ذی نفس موجود ہی نہ ہو۔ اس خاموشی کے چھا جانے کے بعد ایک دراز قد شخص اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ ماہ بانو نے اس شخص کو پہچان لیا۔

بھائی صاحب کہلانے والے اس آدمی کو اس سے قبل وہ اس وقت بھی دیکھ چکی تھی جب پروجیکٹر پر عمران کی بہن کی عزت برباد کرنے والے جوان کے ذبح کیے جانے کا منظر دکھایا جا رہا تھا۔ بھائی صاحب کہہ کر پکارا جانے والا وہ آدمی جو وہاں ان لوگوں کا کمانڈر تھا، کھڑے ہونے کے بعد اپنا گلا کھنکھارتے ہوئے بولا۔

”ساتھیو... میرے بہادر مجاہدو! آپ سب جانتے ہیں کہ ہم ایک بڑے مقصد کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے ہم نے اپنی جانیں تک قربان کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جس نیک مقصد کے لیے ہم جدوجہد کر رہے ہیں، اس کے لیے اگر ہماری جان بھی چلی جائے تو یہ سودا مہنگا نہیں۔ اس قربانی کے بدلے میں پروردگار ہمیں اپنی جنتوں میں ہمیشہ کی زندگی بخشے گا۔ میری دعا ہے کہ پروردگار ہم میں سے ہر ایک کو یہ اعزاز نصیب کرے۔ فی الحال میں یہ بتاتے ہوئے بے حد خوشی محسوس کر رہا ہوں کہ ہمارے درمیان سب سے کم وقت گزارنے والے اور ہم میں سے سب سے کم عمر عمران کے نصیب میں یہ خوش قسمتی لکھی گئی ہے کہ وہ ہم سب سے پہلے شہادت کی راہ پر چلنے کے لیے چن لیا گیا ہے۔ آج کا یہ جشن ہم عمران کے اعزاز میں ہی منا رہے ہیں۔ شہید کبھی مرتا نہیں بلکہ اسے ہمیشہ کی زندگی مل جاتی ہے۔ اس لیے راہِ شہادت پر جانے والے کے لیے رونے اور اداس ہونے کے بجائے اسے بہت خوش دلی سے رخصت کرنا چاہیے۔ آپ سب آج رات دل کھول کر کھائیں پئیں، ناچیں گائیں۔ آج آپ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔“ کمانڈر کے اس اعلان نے وہاں خوشی کی لہر دوڑا دی۔ ان میں سے کسی نے بھی یہ سوچے بغیر کہ ایک جیتے جاگتے، ہنستے کھیلتے جوان کو حرام موت کی طرف دھکیلا جا رہا ہے، تالیاں پیٹنا شروع کر دیں۔ تالیوں کی گونج تھمی تو کمانڈر نے عمران کو اپنے قریب بلایا اور اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔

”کیوں عمران! ڈر تو نہیں لگ رہا؟“

”نہیں بھائی صاحب! ڈرنے کا کیا سوال۔ میں تو آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس کام کے لیے چُنا۔“ عمران نے مسکراتے ہوئے کمانڈر کی بات کا جواب دیا۔

”شاباش میرے شیر! مجھے تم سے اسی بہادرانہ جواب کی امید تھی۔“ کمانڈر نے اس کے جواب پر خوش ہو کر ایک بار پھر اس کی پیٹھ پر زوردار تھپکی دی اور بلند آواز میں بولا۔ ”میری طرف سے ایک جام عمران کی اس بہادری کے نام۔“ فوراً ہی کمانڈر کے اعزاز میں سکوت اختیار کرنے والے حرکت میں آ گئے اور محفل میں ایک بار پھر جام گردش کرنے لگے۔

ماہ بانو پھٹی آنکھوں سے یہ سارا تماشا دیکھتی رہ گئی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کس قسم کے مجاہد ہیں جو شراب کے رسیا ہیں اور گانے بجانے سے دل بہلاتے ہیں۔ اپنی اس کیفیت میں اسے احساس بھی نہیں ہو سکا کہ وہ پوری طرح سے اوٹ میں نہیں رہی ہے اور اس پر کسی کی نظر پڑ سکتی ہے۔ خوش قسمتی سے اس پر نظر پڑی بھی تو عمران کی ہی۔ اسے دیکھتے ہی اس نے اسے اشارہ کیا کہ واپس پلٹ جاؤ۔ وہ خود بھی اسی کی طرف متوجہ تھی چنانچہ اس خفیف اشارے کو دیکھ لیا اور جس خاموشی سے وہاں تک آئی تھی، اسی خاموشی سے واپس پلٹ گئی۔ واپس اپنی جگہ پر پہنچ کر اس کے پاس انتظار کرنے کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں تھا اور اب انتظار کی یہ گھڑیاں بہت کٹھن لگ رہی تھیں۔ دل کے اندر یہی خواہش اٹھ رہی تھی کہ کسی طرح جلد از جلد یہاں سے نکلا جائے لیکن اُدھر سے سنائی دیتے شور کو سن کر یوں لگ رہا تھا کہ رات بھر یہ محفل بجی رہے گی۔ آخر اللہ اللہ کر کے انتظار کی یہ گھڑیاں گزریں۔ پہلے آہستہ آہستہ باہر سے سنائی دیتی گانے بجانے کی آوازیں معدوم ہونا شروع ہوئیں اور پھر یوں لگا جیسے سارے ماحول پر ایک سکوت سا طاری ہو گیا ہو۔ اس سکوت میں دو قدموں کی تیز آہٹ سن کر تیزی سے کھڑی ہوئی۔ حسبِ توقع اس طرف آنے والا عمران ہی تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں کچھ سامان اٹھایا ہوا تھا۔

”جلدی سے یہ لباس اور جوتے موزے وغیرہ پہن لو۔ پانچ منٹ میں ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔“ وہ اپنے ہاتھ میں موجود سامان اسے تھما کر خود جس تیزی سے آیا تھا، اسی تیزی سے واپس پلٹ گیا۔ ماہ بانو نے اس کی ہدایت کے مطابق وہ چیزیں پہننی شروع کر دیں۔ جو لباس اس نے اس وقت پہن رکھا تھا، وہ بھی خاصا گرم تھا جس پر اس نے عمران کا دیا ہوا موٹا اونی لبادہ پہن لیا۔ اسے یہاں لاتے وقت بھی اسی قسم کا لباس پہنایا گیا تھا اور وہ اس کی وجہ سمجھ سکتی تھی۔ اس برف زار میں باہر کا موسم غار کے مقابلے میں بہت شدید تھا۔ غار کے اندر کی سردی باہر کے مقابلے میں کچھ نہیں تھی کیونکہ یہاں ان قاتل ہواؤں کا گزر نہیں تھا جو انسان کے جسم سے ٹکراتی تھیں تو اسے لگتا تھا کہ ایک برچھی سی جسم میں اتر گئی ہو۔ لباس پہننے کے بعد اس نے پیروں میں موٹے اونی جراب پہن کر جوگرز چڑھائے۔ جوگرز اس کے پیروں میں قدرے ڈھیلے تھے اور چلتے وقت دشواری کا باعث بن سکتے تھے۔ اس بات کو محسوس کر کے وہ کچھ پریشان سی ہو گئی پھر یک دم ہی اس کی نظر جرابوں کی دوسری جوڑی پر پڑی۔ اس نے جوگرز اتار کر وہ دوسری جوڑی بھی پہلے والے جرابوں پر چڑھا لی۔ اب اس نے دوبارہ سے جوگرز پہنے تو وہ پہلے کے مقابلے میں اس کے پیروں میں کافی بہتر تھے۔ عمران کے لائے ہوئے سامان میں سے پہننے کے لیے اب دو چیزیں رہ گئی تھیں۔ ایک اونی ٹوپی اور دوسرے مثاف (پہاڑوں پر پہنے جانے والے خصوصی دستانے)۔ اس نے پہلے بالوں کو سمیٹ کر اونی ٹوپی اپنے سر پر جمائی اور پھر ہاتھوں پر مثاف بھی چڑھا لیے۔ اب وہ پوری طرح تیار تھی۔

”تم تیار ہو گئیں... ویری گڈ۔ چلو اب یہاں سے نکل چلتے ہیں۔“ اسی وقت عمران وہاں چلا آیا اور اسے تیار دیکھ کر بولا۔ اس وقت وہ خود بھی اس سے ملتے جلتے حلیے میں تھا اور اسی کی طرح اس حلیے میں اپنے اصل حجم سے کئی گنا زیادہ نظر آ رہا تھا۔

”ٹوپی کا باقی حصہ اپنے چہرے پر بھی چڑھا لو ورنہ باہر کی ٹھنڈی ہوا تمہارے چہرے کی جلد ادھیڑ ڈالے گی۔“ اس کا کھلا منہ دیکھ کر اس نے ماہ بانو کو ہدایت کی اور پھر ایک ذرا مختلف ساخت کی عینک اس کی طرف بڑھا دی۔ وہ خود بھی اپنی آنکھوں پر ایسی ہی عینک پہنا ہوا تھا۔ ماہ بانو نے خاموشی سے عینک تھام کر اپنی آنکھوں پر لگا لی۔ عینک لگانے کے بعد اسے لگا کہ وہ نیم تاریک ماحول پہلے کے مقابلے میں واضح ہو گیا ہو۔ یہ ان نائٹ گاگلز کا کمال تھا جو عمران کے کہنے پر اس نے ابھی ابھی پہنی تھیں۔

”آ جاؤ لیکن بہت احتیاط سے۔ سب لوگ نشے کی حالت میں دھت پڑے ہوئے ہیں... پھر بھی اگر آوازوں سے کسی کی آنکھ کھل گئی تو ہمارے لیے مشکل کھڑی ہو سکتی ہے۔“ سرگوشی میں اسے یہ ہدایت کر کے وہ وہاں سے آگے بڑھا۔ ماہ بانو اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ عمران کا بے حد محتاط رویّہ اسے بھی احتیاط پر کاربند کیے ہوئے تھا۔ اپنے ساتھیوں کی مدہوشی کے باوجود وہ اتنا محتاط اور چوکنا تھا کہ اس نے اپنے ہاتھ میں موجود ریوالور بالکل تیار رکھا ہوا تھا۔ اگر وہاں کوئی اسے روکنے کی کوشش کرتا تو یقیناً وہ اس کے سینے میں

اس ریوالور کی گولی بلاتکلف اتار دیتا۔ ریوالور کے علاوہ اس نے اپنے شانے سے ایک دور مار رائفل بھی لٹکائی ہوئی تھی۔ شاید لباس کے اندر بھی کچھ اسلحہ چھپایا تھا جس کو ماہ بانو دیکھ نہیں سکتی تھی، صرف اس کے بارے میں قیاس ہی کر سکتی تھی۔ مخصوص راستے پر سے گزرتے ہوئے وہ دونوں غار کے کشادہ ہال نما حصے میں پہنچے۔ وہاں مرغی کی چچوڑی ہوئی ہڈیاں، شراب کے خالی پیمانے اور انسانی جسم ایک جیسی بے ترتیب حالت میں اِدھر اُدھر لڑھکے ہوئے تھے۔ وہ دونوں اس احتیاط کے ساتھ کہ ان کا پیر کسی کے جسم سے نہ ٹکرا جائے، وہاں سے گزر کر غار کے دہانے کی طرف بڑھے۔

"کون ہے؟" ابھی وہ دہانے تک پہنچے ہی تھے کہ کسی کی مدہوش سی آواز ابھری اور مُردوں کی طرح بے جان پڑے انسانی جسموں میں سے ایک نے سر اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی۔ ماہ بانو کا دل اس صورتِ حال پر اچھل کر حلق میں آ گیا۔ یوں قفس کے دروازے پر دھر لیے جانے کا سوچ کر ہی اس کا جسم پھڑ پھڑانے لگا۔

"میں ہوں بھائی عمران۔ ذرا پیشاب کے لیے جا رہا ہوں۔" ماہ بانو کے برعکس عمران نے پُرسکون رہتے ہوئے متوازن آواز میں سوال کرنے والے کو جواب دیا جسے سن کر اس نے مطمئن ہو کر دوبارہ اپنی گردن فرش پر ڈال دی اور پہلے ہی کی طرح خراٹے لینے لگا۔ عمران نے ماہ بانو کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ سے دباؤ ڈالتے ہوئے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے اپنے سینے میں اٹک جانے والا سانس آہستہ سے خارج کرتے ہوئے قدم بڑھا دیے۔ غار کے دہانے سے باہر قدم رکھتے ہی سرد برفیلی ہواؤں نے ان کا استقبال کیا اور باوجود پوری تیاری کے، ماہ بانو کو اپنے جسم میں سردی کی ایک لہر سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ کپکپاتی ہوئی عمران کے ساتھ آگے بڑھی۔

باہر روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ صرف چاند کی مدھم روشنی تھی جو منظر کو پوری طرح واضح کرنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہی تھی۔ اگر ان دونوں نے اپنی آنکھوں پر نائٹ گاگلز نہیں لگائے ہوئے ہوتے تو بہت دشواری پیش آتی مگر گاگلز کی وجہ سے یہ مشکل آسان ہو گئی تھی۔ ماہ بانو دیکھ سکتی تھی کہ وہاں وہی قوی ہیکل جانور کھڑا ہے جس پر لاد کر اسے یہاں لایا گیا تھا۔ رات کی تاریکی میں وہ اپنے بھاری جثّے کے ساتھ اور بھی دہشت ناک لگ رہا تھا۔ ماہ بانو کو حیرت تھی کہ ان لوگوں نے کیونکر اس جانور کو سدھا کر اپنے استعمال کے لائق بنایا ہوگا۔ ایسے وحشی کو قابو کرنے کے لیے تو اس سے بڑھ کر وحشت کی ضرورت تھی اور شاید اسی وجہ سے وہ لوگ کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ بہرحال جو بھی تھا، اس وقت تو ایک سیاہ پُرشکوہ یاک ان کی سواری کے لیے تیار کھڑا تھا۔ اس پر سامان کا بڑا سا تھیلا بھی لدا ہوا تھا۔ یہ یقیناً زادِ راہ تھا جس کا عمران نے پہلے ہی انتظام کر لیا تھا۔

"ہمیں یہاں سے نکلنے کے لیے اس یاک کو استعمال کرنا ہوگا۔ اس برفانی علاقے میں یہ بہت تیزی سے حرکت کرتے ہیں اور پھر اس پر سواری کا دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ سدھائے ہوئے ہیں اور راستوں کو خوب پہچانتے ہیں۔ میں نے چونکہ خود بھی یہ جگہ اچھی طرح نہیں دیکھ رکھی اس لیے اندیشہ ہے کہ پیدل نکلنے کی صورت میں ہم راستہ بھٹک جائیں گے۔" یاک کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے عمران نے اسے بتایا اور پھر اس کے قریب پہنچ جانے پر ماہ بانو کو اس پر سوار ہونے میں مدد دینے لگا۔

"اپنی جگہ پر رک جاؤ عمران! اگر تم نے کوئی حرکت کی تو مارے جاؤ گے۔" ابھی ماہ بانو سوار نہیں ہو پائی تھی کہ وہ دونوں عقب سے سنائی دینے والی اس آواز پر بری طرح چونک کر پلٹے۔ وہ نائب کمانڈر تھا جو ہاتھ میں گن لیے ان دونوں کو خوں خوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کی گن کا رخ تو ظاہر ہے سو فیصدی ان دونوں ہی کی طرف تھا۔

"مجھے پہلے ہی شک ہو گیا تھا کہ تم کوئی گڑبڑ کرنے والے ہو اس لیے میں تم پر اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن بھائی صاحب اور میرا دونوں کا یہ خیال تھا کہ تم جو کچھ بھی گڑبڑ کرو گے، وہ شہر پہنچ کر کرو گے۔ ہمیں بالکل اندازہ نہیں تھا کہ تم یہاں ہمارے اس ٹھکانے پر ایسی کوئی جرأت کر سکتے ہو۔ وہ تو آج کی محفل میں، میں نے اتفاق سے اوروں کے مقابلے میں کم شراب پی تھی اس لیے میری اس وقت آنکھ کھل گئی اور میں نے دیکھ لیا کہ تم اس لڑکی کو لے کر یہاں سے فرار ہو رہے ہو۔ اب ایسا کرو کہ فرار کا خیال دل سے نکال کر اچھے بچوں کی طرح واپس اندر چلو۔ تمہارا فیصلہ صبح ہونے پر بھائی صاحب خود کریں گے۔" نائب کمانڈر نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں حکم صادر کرتے ہوئے کہا لیکن عمران اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوا اور وہیں کھڑا اسے گھورتا رہا۔

"ہری اپ مین! ٹائم ویسٹ مت کرو۔ تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ یہاں کتنی سردی ہے اور میں نے تمہاری طرح سردی سے بچاؤ کا انتظام بھی نہیں کر رکھا۔" عمران کو اپنی جگہ سے ہلتے نہ دیکھ کر نائب نے اسے پچکارتے ہوئے کہا۔ اس کے انداز سے یوں لگ رہا تھا کہ وہ اس صورتِ حال کو خوب

انجوائے کر رہا ہے۔ عمران کو یوں عین موقع پر دھر لیے جانے کے کارنامے پر یقیناً وہ بہت خوش تھا اور اس سے یہ خوشی سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔

"اور ہاں، دیکھو... آگے بڑھنے سے پہلے اپنے پاس موجود اسلحہ ضرور نیچے ڈال دو۔ یہ کافی خطرناک چیز ہے اس لیے تم جیسے بچے کے پاس اس کا رہنا مناسب نہیں۔" نائب نے ایک بار پھر عمران کا مذاق اڑاتے ہوئے اسے حکم دیا۔ اس کا یہ حکم سن کر عمران نے ہاتھ میں موجود ریوالور نیچے ڈال دیا اور پھر شانے سے لٹکی رائفل اتارنے لگا۔ رائفل اتارتے اتارتے اچانک ہی اس نے بے پناہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پینترا بدلا اور بجائے رائفل نیچے پھینکنے کے سیدھی کر کے نائب کی طرف ایک فائر داغ دیا۔ رائفل سے نکلی ہوئی گولی سیدھی جا کر نائب کے بائیں شانے سے ذرا نیچے سوراخ بنا گئی۔ گولی کھا کر نائب کو زوردار جھٹکا لگا اور وہ نیچے گر گیا۔ معلوم نہیں گولی نے اس کے دل کو متاثر کیا تھا یا نہیں... لیکن زخم بہرحال کاری تھا اور نائب زمین پر گرنے کے بعد دوبارہ اٹھ نہیں سکا تھا۔

"ہری اپ ماہ بانو! ہمیں بہت تیزی سے یہاں سے نکلنا ہوگا۔ گولی چلنے کی آواز سن کر اندر مدہوش پڑے ہوئے افراد میں سے کوئی نہ کوئی ضرور جاگ گیا ہوگا۔ اگر زیادہ افراد اٹھ کر باہر نکل آئے تو میں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکوں گا۔" اسے سوار کرواتے ہوئے وہ اس پر صورتِ حال واضح کرنے لگا اور پھر خود بھی اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ یاک پر سوار ہونے سے قبل وہ نیچے زمین پر گرا ہوا اپنا ریوالور اٹھانا ہرگز بھی نہیں بھولا تھا۔ سوار ہو کر اس نے جیسے ہی اشارہ کیا، یاک چل پڑا۔ اس کی رفتار خاصی تیز تھی پھر بھی ان دونوں کو لگ رہا تھا کہ وہ بہت سست روی سے آگے بڑھ رہے ہوں۔ رگوں کو کاٹتی سردی کے ساتھ ہڈیوں کا گودا جما دینے والا خوف مل کر ان کے جسموں کو کپکپا رہا تھا اور دل میں خواہش ابھر رہی تھی کہ کاش کسی طرح اس یاک کو پَر لگ جائیں اور وہ لمحوں میں اس جگہ سے بہت دور نکل جائیں۔ ایسے میں انہوں نے اپنے پیچھے کچھ آوازیں سنیں تو اور بھی زیادہ متوحش ہو گئے۔ دونوں نے بہ یک وقت پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ دو تین افراد تھے جو شاید گولی چلنے کی آواز سن کر جاگنے کے بعد غار سے باہر نکل آئے تھے اور اب نائب کمانڈر کی لاش کے قریب کھڑے صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے ابھی تک اس سمت نہیں دیکھا تھا جس طرف ماہ بانو اور عمران یاک پر سوار اڑے جا رہے تھے۔ ان کی یہ کوتاہی بے تحاشا شراب کے نشے کے سبب تھی ورنہ بھاری بھرکم یاک کے چلنے سے زمین میں جو دھمک پیدا ہوتی ہے اسے دور ہی سے محسوس کر لیا جاتا ہے۔

"یہاں اور بھی تو یاک ہیں۔ کہیں یہ لوگ ان پر سوار ہو کر ہمارا پیچھا کرنے کی کوشش نہ کریں؟" ماہ بانو نے خوف زدہ سے لہجے میں عمران سے کہا۔

"فی الحال وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ میں نے یاکوں کو کافی مقدار میں شراب پلا دی تھی اس لیے اس وقت ہمارے اس یاک کے علاوہ کوئی دوسرا یاک سواری کے لائق نہیں ہوگا۔ اگر ان لوگوں نے زبردستی ایسی کوئی کوشش کی بھی تو بڑا نقصان اٹھائیں گے۔" عمران نے اسے تسلی دیتے ہوئے اپنی توجہ پیچھے کی طرف ہی مرکوز رکھی تھی چنانچہ یہ نوٹ کیے بغیر نہیں رہ سکا کہ نائب کمانڈر کی لاش کے قریب کھڑے افراد ان کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔ وہ لوگ شور مچاتے ہوئے ان کے پیچھے لپکے لیکن درحقیقت وہ دونوں ان کی رسائی سے بہت دور نکل چکے ہیں، اس بات کو محسوس کر کے ان میں سے ایک کو عقل سوجھی اور اس نے رک کر اپنی رائفل ان کی طرف تان لی۔

"نیچے جھک جاؤ۔" عمران نے اسے ہدایت کی اور خود بھی اپنا سر اور بالائی جسم جھکا لیا۔ اب وہ دونوں تیزی سے حرکت کرتے یاک کی پشت پر اس طرح محوِ سفر تھے کہ ان کے جسم اس کے سیاہ جثّے سے لپٹے ہوئے تھے۔ پیچھے سے فائر داغا گیا جو کسی نشانے پر نہیں بیٹھ سکا، البتہ فائر کی آواز نے یاک کو بھڑکا کر اس کی رفتار اور بھی تیز کر دی۔

"خود کو مضبوطی سے اس کی پیٹھ پر جمائے رکھو۔ فائرنگ سے خوف زدہ مت ہونا۔ ہم بہت دور نکل آئے ہیں اور اتنے فاصلے سے ان لوگوں کے لیے ہمیں نشانہ بنانا ممکن نہیں۔" عمران نے یہ محسوس کر کے کہ کہیں وہ خوف کا شکار ہو کر یاک کی پشت سے گر نہ پڑے، اسے تسلی بھری ہدایت دی۔ اس نے اپنے اعصاب کو قابو میں رکھتے ہوئے اس ہدایت پر عمل کیا۔ پھر پے در پے ہونے والے اگلے مزید فائروں کی آواز نے عمران کی اس بات کی تصدیق بھی کر ڈالی کہ وہ فائرنگ رینج سے نکل چکے ہیں۔ پیچھے سے فائر کرنے والوں نے بھی اس بات کو سمجھ لیا اور فائرنگ کا سلسلہ موقوف کر دیا۔ اب وہ جانے کون سا حربہ استعمال کر کے ان دونوں کو روکنے کی کوشش کرتے، فی الحال یہ واضح نہیں تھا۔ وہ دونوں یاک کی پشت سے چپکے تن بہ تقدیر انجانے راستوں پر تیزی سے گزرتے جا رہے تھے....

☆☆☆

صبح پیش آنے والے واقعے نے مشا برم خان کو بری

طرح جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ اسے نہایت چالاکی کے ساتھ بے وقوف بنایا گیا تھا۔ وہ اتنے دنوں سے ٹورسٹ کمپنی کے دفتر کی نگرانی کر رہا تھا اور وہاں سے روانہ ہونے والی جیپوں پر نظر رکھے ہوئے تھا لیکن وہ ایک جیپ جس کی روانگی کا اسے انتظار تھا، نہایت صفائی سے اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر روانہ کر دی گئی تھی۔ کسی نے عین موقع پر اسے اسپتال کے نمبر سے فون کر کے یہ اطلاع دی تھی کہ تمہاری ماں کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ماں کی طبیعت کی خرابی کا سن کر وہ نگرانی وغیرہ بھول گیا اور دیوانہ وار اسپتال کی طرف دوڑا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ماں کی طبیعت تو حسب معمول ہے اور اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں آیا۔ اس وقت اسے احساس ہوا کہ یہ سارا ڈراما اسے ٹورسٹ کمپنی کے دفتر کے سامنے سے ہٹانے کے لیے رچایا گیا تھا۔

مخالف پارٹی کی اس چال نے جہاں اسے جھنجلاہٹ میں مبتلا کیا، وہیں اس بات کا بھی یقین ہو گیا کہ ٹورسٹ کمپنی کا مالک اس کام میں ملوث ہے۔ چنانچہ اب وہ کمپنی کے مالک کے خلاف ڈائریکٹ ایکشن لینے کے بارے میں ہی غور کر رہا تھا۔ کافی غور کرنے کے بعد اس کے ذہن میں جو منصوبہ آیا اس کے مطابق اس نے ٹورسٹ کمپنی کے دفتر کی معمول کی نگرانی ترک کر دی اور چائے کے ہوٹل پر جا کر بیٹھنے کے بجائے سارا دن اپنی ماں کے ساتھ اسپتال میں گزارا۔ شام کے وقت جب اس کی معلومات کے مطابق دفتر بند ہونے کا وقت قریب آیا تو وہ اسپتال سے نکلا اور چپکے سے کمپنی کے دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس سے قبل وہ اپنے لیے کرائے کی ایک جیپ حاصل کرنا بالکل نہیں بھولا تھا۔ جیپ کے لیے اس نے دن میں ہی اسپتال سے فون کر کے بکنگ کروالی تھی لیکن احتیاطاً دن میں اپنے پاس جیپ رکھنے سے گریز کیا تھا تاکہ اگر کوئی اس کی حرکات و سکنات پر نظر رکھے ہو تو جیپ کرائے پر لینے کی وجہ سے چونک نہ جائے۔

اسپتال سے روانہ ہوتے ہوئے بھی وہ اس طرف سے بہت محتاط رہا تھا لیکن اسے اپنے اردگرد کوئی ایسا مشکوک شخص نظر نہیں آیا جس کے بارے میں اسے یہ گمان ہوتا کہ وہ اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ شاید اپنا کام کر گزرنے کے بعد مخالفین نے اس کی نگرانی کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ نگرانی کی طرف سے مطمئن ہو کر وہ جیپ میں اس راستے کی طرف روانہ ہوا جو ٹورسٹ کمپنی کے دفتر کی طرف جاتا تھا لیکن دفتر تک جانے کے بجائے راستے میں ہی ایک جگہ رک گیا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں سے کمپنی کے مالک کو دفتر سے اپنے گھر جانے کے لیے لازماً گزرنا پڑتا۔ مشابرم خان کو مالک کے گھر کا پتا معلوم تھا اور وہ چاہتا تو وہاں جا کر بھی اسے چھاپ سکتا تھا لیکن ڈرائیور نیاز علی کی ہلاکت کے بعد وہ اس معاملے میں محتاط ہو گیا تھا۔ نیاز علی کو وہ اس کے گھر سے ہی معلومات حاصل کرنے کے لیے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ نیاز علی اپنی غلطی کے باعث کھائی میں گر کر ہلاک ہو گیا لیکن اس واقعے نے مشابرم خان کی حیثیت مشکوک کر دی تھی۔ اسی وجہ سے ابھی تک اسے بلتستان چھوڑنے کی اجازت نہیں تھی۔ ان حالات میں اگر ٹورسٹ کمپنی کے مالک کے ساتھ کچھ بُرا بھلا ہو جاتا اور اس کا نام سامنے آجاتا تو اسے اپنی جان چھڑانا مشکل ہو جاتی، اسی لیے اس کی پوری کوشش تھی کہ خود کو پوشیدہ رکھے۔

کمپنی کے مالک کو راستے میں ہی روکنے کے لیے بھی اس نے ایسے مقام کا انتخاب کیا تھا جہاں لوگوں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اسے امید تھی کہ وہ اس مقام پر اسے روکنے اور اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہو جائے گا۔ اپنی جیپ اس نے سڑک سے اتار کر ایک طرف روک لی تھی اور راستے پر نظریں جما کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہاں رکنے کے بعد اسے زیادہ دیر انتظار کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی۔ ٹورسٹ کمپنی کے مالک کی جیپ کو اس نے دور سے ہی شناخت کر لیا۔ اس کی جیپ شناخت کرتے ہی وہ فوراً حرکت میں آیا اور اپنی جیپ اسٹارٹ کر کے عین سڑک کے درمیان میں لے گیا۔ سڑک پر سیدھے چلے آنے والے ٹورسٹ کمپنی کے مالک کو اپنی جیپ کو ایمرجنسی بریکس لگانے پڑے۔

"کون پاگل کا بچہ ہے تو؟" جیپ رکتے ہی وہ غصے سے دہاڑتا ہوا باہر نکلا لیکن مشابرم خان تو اپنی جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود ہی نہیں تھا۔ جیپ عین سڑک پر روکنے کے بعد وہ بے مثال پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہوا اس سے کود کر نیچے سڑک پر رینگ گیا تھا۔ شام کے جھک آنے والے سایوں میں کمپنی کا مالک اس کی یہ نقل و حرکت نہیں دیکھ سکا، چنانچہ اب خالی ڈرائیونگ سیٹ دیکھ کر انگشت بدنداں تھا۔ اس کی اس حیرت میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب مشابرم خان نے پیچھے سے آکر اسے چھاپا۔ پھر کنپٹی پر لگنے والی مشابرم خان کی نپی تلی ضرب نے اس کے حواس اس طرح غائب کیے کہ وہ حیرت سمیت کچھ بھی محسوس کرنے کے قابل نہیں رہا اور لہراتا ہوا سڑک پر گرنے لگا لیکن مشابرم خان نے اس کے گرنے سے قبل ہی اسے اپنی بانہوں میں سنبھال لیا اور گھسیٹتا ہوا اپنی جیپ تک لے گیا۔ اسے جیپ کے پچھلے حصے میں ڈالنے کے بعد وہ خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور

سڑک پر ترچھی کھڑی جیپ کو ریورس کر کے اسے سیدھا کرتے ہوئے برق رفتاری سے دوڑا دیا۔ اتنی زیادہ تیزی کا مظاہرہ کرنے کے باعث جیپ کے پہیے بری طرح چرچرائے اور فضا میں چرچراہٹ دور تک پھیل گئی۔ اس دوران سڑک پر کوئی دوسری گاڑی نمودار نہیں ہوئی تھی اس لیے مشابرم خان کو اطمینان تھا کہ اس سارے واقعے کا کسی کو علم نہیں ہو سکا۔ ویسے اس نے جس انداز میں اپنی جیپ ریورس کر کے اسے دوڑایا تھا' وہ انداز بہت رسکی تھا۔ ذرا سی غلطی جیپ کو غیر متوازن کر کے حادثے کا سبب بن سکتی تھی لیکن خیر گزری اور اس کی ڈرائیونگ میں مہارت نے کوئی حادثہ رونما نہیں ہونے دیا اور وہ اسی رفتار سے جیپ چلاتا ہوا اپنی طے شدہ منزل کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

یہ ایک خوش کن اتفاق ہی تھا کہ ایک دن قبل ہی آذر نے اسے اپنے گھر پر رہائش اختیار کرنے کی پیشکش کی تھی۔ آذر نامی ٹورسٹ گائڈ جو اکرم خان کے دوستوں میں سے تھا، بہت اچھا اور بااخلاق آدمی ثابت ہوا تھا۔ نیاز علی کی موت کے بعد ایک روز اتفاقاً اس کی مشابرم خان سے چائے کے ہوٹل میں ملاقات ہو گئی تھی۔ اسے جب اس بات کا علم ہوا کہ مشابرم خان کی ماں ہنوز اسپتال میں داخل ہے اور وہ ایک سرائے میں سکونت اختیار کیے ہوئے ہے تو اس نے پُرزور اصرار کر کے مشابرم خان کو اپنے گھر پر ٹھہرنے کے لیے راضی کر لیا۔ آذر تنہا آدمی تھا جس کے ایک کمرے کے گھر میں کوئی دوسرا متنفس موجود نہیں تھا اور وہ خود بھی کم ہی اپنے گھر میں ٹک پاتا تھا۔ آئے دن اسے کسی نہ کسی ٹیم کے ساتھ پہاڑوں کے سفر پر جانا ہوتا تھا۔ مشابرم خان نے اس کے خلوص سے ہار کر اس کی پیشکش قبول کر لی تھی اور اس کی گزشتہ رات آذر کے گھر پر ہی گزری تھی۔

آذر حسب معمول ایک نئے سفر پر روانہ ہو گیا تھا اور جاتے جاتے گھر کی چابیاں مشابرم خان کو دے گیا تھا، چنانچہ مشابرم خان کے لیے ٹورسٹ کمپنی کے مالک کو اغوا کرنے کے بعد کسی ٹھکانے تک لے جانے کا کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا۔ درحقیقت وہ یہ سارا منصوبہ بنا ہی اس لیے سکا تھا کہ اس کے پاس ایک مناسب ٹھکانا موجود تھا۔ دوسرے گھروں سے ہٹ کر بنا آذر کا چھوٹا سا گھر اس کے لیے موجودہ صورتِ حال میں بہت کارآمد ثابت ہونے والا تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے بعد اس نے پہلے دروازے پر لگا تالا کھولا اور پھر جیپ کی پچھلی طرف پڑے ٹورسٹ کمپنی کے مالک کو اٹھا کر اندر لے گیا۔ اس نے عقل مندی کی تھی کہ اسے جیپ میں ڈالنے کے بعد ایک بڑے ترپال سے ڈھانپ دیا تھا اور اب اسی ترپال میں لپیٹے ہوئے ہی اندر لے گیا تھا۔ اگر کسی شخص نے اس کی نقل و حرکت دیکھ بھی لی ہوگی تو یہی گمان کیا ہوگا کہ وہ کوئی سامان مکان کے اندر لے جا رہا ہے۔

مکان کے اندر پہنچنے کے بعد اس نے ٹورسٹ کمپنی کے مالک صغیر بیگ کے ہاتھ پیروں کو رسی کی مدد سے باندھا اور ساتھ ہی آنکھوں پر پٹی باندھنے کے بعد اس کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونس دیا۔ یہ سب اس نے احتیاطی تدبیر کے طور پر کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ صغیر بیگ آذر کے گھر کو شناخت کر سکے یا ہوش میں آنے کے بعد شور مچا کر کسی راہ چلتے شخص کو متوجہ کر سکے۔ آذر کا گھر دوسرے مکانات سے الگ تھلگ ہونے کے باوجود وہ اپنے طور پر پوری احتیاط کرنا چاہتا تھا۔ اپنے ان انتظامات کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ باورچی خانے میں گیا اور وہاں سے گوشت کاٹنے کی تیز دھار والی چھری کے ساتھ پانی کا جگ بھی بھر کر لے آیا۔

پانی کا بھرا ہوا جگ اس نے صغیر بیگ کے چہرے پر انڈیل دیا۔ وہ چہرے پر ٹھنڈا پانی گرنے پر جھرجھری سی لے کر ہوش میں آیا۔ اس کے ہوش میں آنے کی نشانی یہ تھی کہ اس نے پانی ڈالے جانے کے بعد بے ساختہ ہی اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی تھی لیکن ہاتھ پیر بندھے ہونے کی وجہ سے اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ منہ میں کپڑا ٹھنسا ہونے کی وجہ سے آواز نکالنا تو یوں بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس صورتِ حال پر وہ بے چین ہو کر بُری طرح کسمسانے لگا۔

"میں تمہارے منہ میں ٹھنسا کپڑا نکالنے کے لیے تیار ہوں صغیر بیگ... لیکن اس سے پہلے تمہیں مجھے یہ یقین دلانا ہوگا کہ تم غیر ضروری آوازیں نہیں نکالو گے اور میں جو کچھ پوچھوں گا، اس کا صحیح جواب دو گے۔" اس کی بے چینی ملاحظہ کرتے ہوئے مشابرم خان نے گمبھیر لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے اپنی شرائط پیش کیں۔ جواب میں وہ شدومد سے اثبات میں سر ہلانے لگا۔ مشابرم خان نے آگے بڑھ کر اس کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا باہر کھینچ لیا۔ کپڑا نکلتے ہی وہ زور زور سے کھانسنے لگا۔

"پپ... پانی۔" کھانسی کے دوران ہی اس نے بہ مشکل یہ ایک لفظ ادا کیا۔ مشابرم خان نے جگ میں بچ جانے والے پانی میں سے دو گھونٹ اس کے منہ میں ڈال دیے۔

"کون... کون ہو تم؟ مجھے اس طرح اغوا کیوں کیا ہے؟" پانی نے خشک حلق کو تر کیا تو اس نے پوچھا۔

"سوال تم نہیں میں کروں گا اور تمہیں میرے ہر سوال کے جواب میں سچ بولنا ہوگا، ورنہ اپنے انجام کے تم خود ذمے

دار ہو گے۔" مشابرم خان نے اپنی آواز میں سفاکی سموتے ہوئے اسے دھمکی دی اور ساتھ ہی چھری کی نوک اس کے رخسار میں اس حد تک چبھوئی کہ وہاں سے خون کا ایک قطرہ نکل آیا۔

"مم... میں سب بتانے کو تیار ہوں۔ اگر تمہیں روپیا پیسا چاہیے تو وہ میں تمہیں دے دوں گا... بلکہ تم خود جا کر نکال لو۔ میرے دفتر میں لکڑی کی الماری کے پیچھے ایک سیف..."

وہ چھری کی صرف نوک چبھونے پر ہی اتنا خوف زدہ ہو گیا تھا کہ مشابرم خان کو کوئی لٹیرا سمجھ کر از خود اسے اپنے دفتر میں موجود خفیہ سیف کے بارے میں بتانے لگا۔

"مجھے تمہارے روپے سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ تم خود سے بک بک کرنے کے بجائے ان باتوں کا جواب دو جو میں تم سے پوچھوں۔" اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی مشابرم خان نے اسے ڈپٹ دیا تو وہ سہم کر خاموش ہو گیا۔

"تم کس کے لیے کام کرتے ہو؟" مشابرم خان نے اپنی تفتیش کا آغاز کیا۔

"کسی کے لیے نہیں۔ میرا اپنا ذاتی بزنس ہے۔ اسکردو پہنچ کر اوپر پہاڑوں پر جانے والے میرے تھرو سواری، پورٹرز اور دوسری ضروری چیزوں کا انتظام کرتے ہیں۔" اس نے نہایت بھولپن سے جواب دیا۔

"میں اس بزنس کے بارے میں نہیں پوچھ رہا ہوں۔ مجھے اپنے اس کام کے بارے میں بتاؤ جس کے لیے تم نیاز علی کو استعمال کرتے تھے۔ اب کون نیاز علی کی جگہ یہ کام کر رہا ہے؟" اس نے چھری کی نوک پر کچھ اور دباؤ ڈالتے ہوئے سرد لہجے میں پوچھا۔

"نیاز علی جیپ ڈرائیور تھا۔ اس کا کام ٹورسٹس کو لے جانا اور واپس لانا تھا۔ ابھی سیزن زوروں پر نہیں ہے اس لیے میں نے ابھی تک نیاز علی کی جگہ دوسرا ڈرائیور نہیں رکھا ہے۔" صغیر بیگ نے کراہتے ہوئے اسی معصومیت سے جواب دیا جس کا وہ اب تک مظاہرہ کر رہا تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم سیدھے طریقے سے میرے سوالوں کا جواب نہیں دو گے؟" مشابرم خان کو اس کا جواب سن کر اتنا غصہ آیا کہ اس نے صغیر بیگ کے رخسار میں چبھی چھری کی نوک کو بے دردی سے حرکت دے ڈالی۔ چھری کی نوک نے صغیر بیگ کے رخسار پر ڈیڑھ انچ کے قریب گہری سرخ لکیر کھینچ دی۔ اس زخم کو کھا کر صغیر بیگ کے حلق سے ایک بھیانک چیخ بلند ہوئی جس کو مشابرم خان نے درمیان میں ہی اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر گھونٹ ڈالا۔

"سچ سچ بتاؤ کہ نیاز علی جب کسی ٹیم کو واپس لینے کے لیے جاتا تھا تو اپنے ساتھ کسے راشن پانی سپلائی کرنے کے لیے لے جاتا تھا؟ کون ہیں وہ لوگ جو پہاڑوں پر چھپے ہوئے ہیں اور جنہوں نے اکرم خان کو قتل کرنے کے علاوہ اس کی مہمان لڑکی کو اغوا بھی کیا ہے؟" مشابرم خان نے قہر آلود لہجے میں اس سے سوال کرتے ہوئے اس کے منہ پر رکھا ہاتھ ہٹا دیا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" صغیر بیگ نے سسکی لیتے ہوئے جواب دیا۔

"میں تم سے معلوم کر کے رہوں گا۔" مشابرم خان نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا اور پھر اس پر پل پڑا۔ وہ بے دریغ اس پر لاتیں اور مکے برساتا جا رہا تھا۔ صغیر بیگ کا بندھا ہوا جسم اس کی لگائی گئی ہر ضرب پر تڑپتا لیکن وہ بالکل بے بس تھا اور اس کے پاس مار کھانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ آخر کار وہ مار سہہ سہہ کر ادھ موا ہو گیا اور اس کا جسم بالکل ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر مشابرم خان نے اپنے ہاتھ روک لیے۔ صغیر بیگ یقینی طور پر بے ہوش ہو چکا تھا۔ وہ پانی کا خالی ہو جانے والا جگ اٹھا کر باورچی خانے میں لے گیا اور ایک بار پھر جگ بھر کر کمرے میں واپس آیا۔ اس بار اس نے جگ میں موجود تمام پانی ایک ساتھ صغیر بیگ کے اوپر انڈیل دیا۔ ٹھنڈا پانی اسے بے ہوشی کی دنیا سے واپس لے آیا۔

"بولو، اب بھی سچ بتاؤ گے یا میں تمہاری اور خاطر کروں؟" مشابرم خان نے اس کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا بے دردی سے کھینچ کر باہر نکالتے ہوئے سوال کیا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں معلوم۔" صغیر بیگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ آنکھوں پر پٹی بندھے ہونے کی وجہ سے اس کے آنسو تو بے شک بہتے ہوئے نظر نہیں آ رہے تھے اور نہ ہی ان میں موجود تاثرات کو پڑھ کر سچ جھوٹ کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا لیکن اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے مشابرم خان کو سوچ میں ڈال دیا۔ اتنی مار کھانے کے بعد اس قدر استقامت سے جھوٹ پر ڈٹے رہنا بہت ہی ڈھیٹ اور پیشہ ور مجرموں کے لیے ہی ممکن ہوتا ہے لیکن صغیر بیگ جس قدر نڈھال اور خوف زدہ نظر آ رہا تھا، اسے دیکھتے ہوئے یہ بھی یقین نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ مجرموں کی اس قسم سے تعلق رکھتا ہے۔

"اگر تم نیاز علی کی حرکتوں سے واقف نہیں تھے تو یہ بتاؤ

کہ وہ تمہاری کمپنی کی جیپ میں تمہارے علم میں آئے بغیر سامان لوڈ کر کے کیسے لے جاتا تھا؟ کیا کبھی تم نے نوٹ نہیں کیا کہ جب وہ کسی ٹیم کو لینے جاتا ہے تو اس کی جیپ خالی نہیں ہوتی؟" اس بار اس نے اپنا لہجہ ذرا نرم کرتے ہوئے صغیر بیگ سے سوال کیا۔

"نیاز علی میرا بہت پرانا ڈرائیور تھا۔ میں اس پر بہت زیادہ اعتماد کرتا تھا۔ اسے جب پہاڑوں سے اترنے والی کسی ٹیم کو واپس لینے جانا ہوتا تھا تو وہ رات میں ہی مجھ سے جیپ لے جاتا تھا اور صبح دفتر آنے کے بجائے اپنے گھر سے ہی روانہ ہو جاتا تھا۔ اس کی کبھی کہیں سے شکایت نہیں ملی تھی اس لیے میں بھی اس معمول پر اعتراض نہیں کرتا تھا۔" صغیر بیگ نے گویا کوئی عقدہ کھولا جس پر مشابرم خان سوچ میں پڑ گیا۔ پہلے وہ سمجھ رہا تھا کہ ماں کی طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے اسے عین وقت پر صغیر بیگ کے دفتر کے سامنے سے اس لیے ہٹایا گیا تھا کہ اسے خاص جیپ کی روانگی کا علم نہیں ہو سکے... لیکن اب جو صورت حال سامنے آئی تھی، اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مشکوک جیپ تو صغیر بیگ کے دفتر سے روانہ ہی نہیں ہوئی تھی۔ یعنی اس نے اتنے دن دفتر کی نگرانی کر کے اپنا وقت ضائع کیا تھا لیکن بہر حال یہ کوئی حتمی بات نہیں تھی۔ ممکن تھا کہ صغیر بیگ جھوٹ بول رہا ہو۔ وہ اس کے نیاز علی کے بارے میں دیے گئے بیان کی تصدیق کیے بغیر اس پر مکمل بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔ اگر صغیر بیگ سچا تھا تو اس کا یہ مطلب تھا کہ اصل مجرم اس پر مکمل نظر رکھے ہوئے ہیں اور انہوں نے جان بوجھ کر اسے چھیڑنے کے لیے ایسی حرکت کی تھی جس کے باعث وہ صغیر بیگ کے پیچھے پڑ جائے۔

"کیا تم پولیس والے ہو؟" وہ اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ صغیر بیگ کی آواز نے اسے چونکایا۔

"ہاں۔" اس نے اس کے خیال کی تصدیق کرنا ہی مناسب سمجھا اور پھر سرد لہجے میں بولا۔ "تم نے جو کچھ مجھے بتایا ہے، اس کے سچ جھوٹ ہونے کا پتا لگا لیا جائے گا۔ سچ کی صورت میں رہائی اور جھوٹ کی صورت میں قہر تمہارا نصیب ہو گا۔ تم اپنے انجام کے لیے یہاں رک کر انتظار کرو۔" وہ ایک بار پھر صغیر بیگ کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر آذر کے گھر سے روانہ ہو گیا۔ عارضی طور پر قوتِ حرکت و گویائی سے محروم کردہ صغیر بیگ کی طرف سے اسے بے فکری تھی کہ وہ یہاں سے کسی طور نہیں بھاگ سکے گا۔

☆☆☆

"یہ کافی پی لو۔ اسے پی کر تمہارے جسم میں گرمی آ جائے گی۔" عمران نے بھاپ اڑاتا ہوا کافی کا کپ ماہ بانو کی طرف بڑھایا۔ وہ دونوں یاک کی پشت پر اندھیرے میں کیے جانے والے تکلیف دہ اور خطرناک سفر کو سپیدۂ سحر نمودار ہونے کے بعد کچھ دیر کے لیے ترک کر کے ایک پہاڑی چٹان کے سائے میں رکے تھے۔ اس موقع پر عمران نے اپنے ساتھ لائے ہوئے بڑے سے تھیلے کو کھول کر اس میں سے مٹی کے تیل سے جلنے والا اسٹوو نکالا اور پھرتی سے کافی تیار کر ڈالی۔ کافی کے ساتھ ڈبل روٹی کے ٹکڑے بھی تھے جو اس نے کھانے کے لیے ماہ بانو کو پیش کیے۔

"جلدی سے ناشتے سے فارغ ہو جاؤ تا کہ ہم اپنا سفر جاری رکھ سکیں۔ وہ لوگ ہمارے فرار کے بارے میں جاننے کے بعد آرام سے نہیں بیٹھیں گے... اور ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ لوگ ہمارے مقابلے میں ان راستوں سے بہت اچھی طرح آشنا ہیں اس لیے وہ زیادہ تیزی سے فاصلہ طے کر سکتے ہیں۔" کافی کا ایک بڑا سا گھونٹ حلق سے نیچے اتارتے ہوئے عمران نے بے حد صاف گوئی سے ماہ بانو کو حقیقت سے آگاہ کیا۔

"تو پھر چلو، ابھی چلتے ہیں۔" اس نے فوراً ہی اپنے ہاتھ میں موجود کپ نیچے رکھ دیا اور سراسیمگی سے بولی۔

"پہلے ناشتا کر لو۔ اس علاقے میں سروائیو کرنے کے لیے جسم میں طاقت ہونا بہت ضروری ہے ورنہ دشمن سے پہلے موسم کی سختی ہمیں ہلاک کر ڈالے گی۔ خصوصاً تمہیں تو بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ ایک تو تم عورت ہونے کے ناتے ویسے ہی کمزور ہو، اوپر سے قید کے دنوں اور ڈپریشن نے تمہیں اور بھی کمزور کر دیا ہے۔" عمران نے بُردباری سے اسے سمجھایا تو وہ فوراً ہی قائل ہو گئی اور عمران کی پیروی کرتے ہوئے خود بھی ڈبل روٹی کے ٹکڑے تیزی سے حلق سے نیچے اتارتے ہوئے کافی کے بڑے بڑے گھونٹ بھرنے لگی۔ پانچ منٹ بعد وہ ناشتے سے فارغ ہو چکی تھی۔ اس اثنا میں عمران جو کہ پہلے ہی ناشتے کو نمٹا چکا تھا، ناشتے کی تیاری کے لیے نکالا جانے والا سامان واپس رکھ چکا تھا۔ وہ ناشتے سے فارغ ہوئی تو انہوں نے ایک بار پھر سفر کا آغاز کر دیا۔ ابھی وہ مشکل سے چند گز ہی آگے بڑھے تھے کہ فضا میں فائر کی آواز گونجی اور اگلے ہی لمحے عمران کے منہ سے ایک درد بھری چیخ نکلی۔ اس چیخ کو سن کر ماہ بانو نے اس پر نظر ڈالی تو یہ دیکھ کر خوف زدہ ہو گئی کہ عمران کے بائیں شانے سے خون نکل کر اس کے اونی لباس پر پھیلتا جا رہا ہے۔

"اپنا سر جھکا لو اور نیچے چھلانگ لگانے کی کوشش

کرو۔'' پہلی بے ساختہ چیخ کے بعد خود پر قابو پاتے ہوئے اس نے بھنچی ہوئی آواز میں ماہ بانو کو ہدایات دیں۔ اتنی دیر میں کچھ اور گولیاں بھی سائیں سائیں کرتی ہوئی ان کے آس پاس سے گزر چکی تھیں۔ دشمن نے ان کی توقع سے بہت قبل انہیں آلیا تھا اور اب ان کی فرار کی راہ مسدود کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عمران جانتا تھا کہ بھاگنے کی کوشش کارگر ثابت نہیں ہوگی کیونکہ تعاقب میں آنے والے اس راستے پر سفر کرنے میں ان سے زیادہ مہارت رکھتے تھے۔ اب ان کے پاس یہی چارہ تھا کہ وہ رک کر اپنے پیچھے آنے والوں کا مقابلہ کریں اور ان سے جان چھڑانے کے بعد آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔

ماہ بانو نے بھی بڑے خودکار انداز میں یہ بات سمجھ لی تھی، چنانچہ نیچے چھلانگ لگانے سے قبل از خود ایک رائفل اپنے ہاتھ میں لے لی۔ عمران یقیناً اس کی اس حرکت پر حیران ہوا ہوگا اور اس کے ذہن میں یہ سوال بھی ابھرا ہوگا کہ یہ نازک اندام لڑکی بھلا رائفل کا کیا کرے گی؟ لیکن یہ موقع کسی قسم کے سوال جواب کا نہیں تھا اس لیے وہ چپ رہا اور اسے ایک پہاڑی کی آڑ میں ہونے کا اشارہ کرتا ہوا خود بھی اس کی طرف دوڑ گیا۔ اس دوران میں ان پر مسلسل فائرنگ کی جاتی رہی تھی اور یہ محض خوش قسمتی تھی کہ وہ دونوں اب تک کسی گولی کی زد میں نہیں آئے تھے اور پہاڑی کی آڑ لینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

آڑ میں پہنچنے کے بعد عمران نے رائفل سیدھی کر کے اس سمت فائرنگ کرنا شروع کر دی جس طرف ان کے تعاقب میں آنے والے موجود تھے۔ اس جوابی فائرنگ کا کوئی خاص نتیجہ اس لیے نہیں نکل سکا کہ آنے والے بھی اپنے تحفظ کا خیال رکھتے ہوئے آڑ میں چھپے ہوئے تھے۔ دو تین منٹ تک دونوں طرف سے فائرنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ ماہ بانو نے اگرچہ عمران کے پاس موجود فاضل رائفل ہاتھ میں لے لی تھی لیکن ابھی تک اس نے کوئی فائر نہیں کیا تھا جبکہ دوسری طرف سے سنائی دینے والی فائرنگ کی آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ لوگ تعداد میں کم از کم تین سے چار ہیں۔

''وہ ہمیں گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' یکایک عمران کو احساس ہوا کہ فائرنگ پہلے کی طرح ایک سمت سے ہونے کے بجائے مختلف سمتوں سے ہو رہی ہے تو وہ سرسراتی ہوئی آواز میں ماہ بانو سے بولا۔ وہ جواب میں کچھ کہتی، اس سے قبل ہی سامنے نظر آنے والے منظر نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ ان کی سواری کا کام دینے والا یاک جو کہ اس سارے ہنگامے سے بُری طرح پریشان ہو گیا تھا اور پریشانی کے عالم میں ادھر سے اُدھر بھاگا پھر رہا تھا، یک دم ہی گولیوں کی زد میں آ گیا تھا۔ قوی ہیکل جانور کے گولی کھا کر تڑپنے کا وہ منظر بے حد دل دوز تھا۔ گولی کا زخم فوراً ہی اسے زمین بوس کرنے کے لیے کافی نہیں تھا۔ البتہ اس زخم کو کھا کر وہ غضب ناک ہو کر بُری طرح اچھل کود کرنے لگا تھا۔ اس کے بھاری قدموں کی دھمک فائرنگ کے شور کے باوجود سنی جا سکتی تھی۔

اپنی اس غضب ناکی میں وہ بے قابو ہو کر بھاگا اور سیدھا اس شخص سے جا کر ٹکرایا جو رائفل اٹھائے جھکا جھکا آگے آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ قوی ہیکل جانور کی ٹکر نے اسے کئی فٹ اوپر اچھالا اور پھر وہ ایک دل دوز چیخ کے ساتھ دوبارہ زمین پر آ کر گرا۔ اس کی رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کئی گز دور جا گری اور پھر مرے پر سو دُرے کے مصداق بھاری بھرکم مشتعل یاک اسے روندتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

یاک کے اس پر سے گزرنے کے بعد یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اس کی کوئی ہڈی سالم رہی ہوگی یا وہ ایک کے بعد دوسرا سانس لے سکا ہوگا۔ زخمی یاک کو بھی زیادہ سانسیں لینے کا موقع نہیں ملا۔ وہ طیش کے عالم میں کچھ اور تباہی مچاتا، اس سے قبل ہی ایک سنسناتی ہوئی گولی آئی اور اس کے سر میں پیوست ہو گئی۔ یقیناً یہ گولی مرنے والے کے کسی ساتھی نے اپنے بھائی بند کی موت کا انتقام لینے کے لیے چلائی تھی۔

''وہ دیکھو... وہ راستہ اوپر کی طرف جا رہا ہے۔ اگر ہم وہاں سے اوپر چلے جائیں تو بہتر پوزیشن میں آ جائیں گے۔'' یاک کی موت کے بعد ماہ بانو نے عمران کی توجہ ایک تنگ سے راستے کی طرف مبذول کروائی۔ جس وقت عمران جوابی فائرنگ میں مصروف تھا، وہ اردگرد کا جائزہ لینے کا ہی کام کرتی رہی تھی اور یہ راستہ اس کی نظر میں آ گیا تھا۔ عمران نے خود کو گھیرے جانے کا خدشہ ظاہر کیا تو اس نے حل کے طور پر اپنے ذہن میں آنے والی تجویز اس کے گوش گزار کر دی۔ عمران نے اس کی تجویز پر لمحے بھر کے لیے غور کیا تو اسے یہ ایک بہت ہی موزوں حل نظر آیا۔ بلندی کی طرف جانے کے باوجود اس راستے کی خوبی یہ تھی کہ وہ دونوں براہِ راست فائرنگ کی زد میں نہیں آ سکتے تھے۔ جگہ جگہ ابھری ہوئی چٹانیں انہیں اوپر تک پہنچانے کے لیے بہترین آڑ فراہم کر سکتی تھیں۔

''چلو... ہری اَپ۔'' عمران نے ماہ بانو سے کہا اور خود اس راستے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے یہ احتیاط کی تھی کہ کھڑے ہو کر سیدھے چلنے کے بجائے ہاتھ پیروں کے بل رینگتا ہوا اوپر چڑھ رہا تھا۔ اس طرح اگر کوئی دور سے دیکھ بھی

رہا ہوتا تو وہ فوراً اس کی نظر میں نہیں آسکتا تھا۔ ماہ بانو نے بھی اس کی تقلید کرتے ہوئے اوپر چڑھنے کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا۔ اب فائرنگ کی آوازیں جس طرح سے سنائی دے رہی تھیں، اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ دشمن ان کی سابقہ پناہ گاہ سے بہت قریب پہنچ چکا ہے۔

پھر یکا یک فائرنگ رک گئی۔ یقینی طور پر وہ لوگ عمران کی طرف سے فائرنگ کا سلسلہ بند ہونے پر سوچ میں پڑ گئے تھے۔ خاموشی چھا جانے پر وہ دونوں اور بھی تیزی سے بلندی تک کا سفر طے کرنے لگے۔ اسی تیزی کی وجہ سے ماہ بانو سے ذرا سی بے احتیاطی ہوئی اور اس کے پیر تلے آنے والا ایک پتھر اپنی جگہ سے ہٹ کر نیچے کی طرف لڑھکتا چلا گیا۔ پتھر کے لڑھکنے کی آواز نے انہیں گھیرنے کی کوشش کرنے والوں کو متوجہ کر دیا۔ فوراً ہی ایک فائر ہوا اور ماہ بانو کے منہ کے قریب چٹان کے کئی ٹکڑے اِدھر اُدھر اڑے۔ ایک نکیلا سا ٹکڑا اس کی پیشانی سے بھی آ کر ٹکرایا اور اس نے شدید تکلیف کے ساتھ ساتھ پیشانی سے خون بھی نکل کر بہتا ہوا محسوس کیا لیکن موجودہ صورتِ حال میں یہ تکلیف کچھ بھی نہیں تھی۔

وہ فائر کی زد میں آنے سے بال بال بچی تھی۔ اگر اس پر فائر کرنے والے کا نشانہ نہ چوکتا تو چٹان کے بجائے اس کی کھوپڑی کے ٹکڑے اِدھر اُدھر اڑ رہے ہوتے۔ اس نے بُری طرح گھبرا کر خود کو ایک چٹان کی آڑ میں چھپایا اور پلٹ کر اس طرف دیکھنے کی کوشش کی جہاں سے فائر ہوا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے بلند چیخ کے ساتھ ایک شخص کو نیچے گرتے ہوئے دیکھا۔ یہ عمران کا کارنامہ تھا جو اس سے پہلے مطلوبہ مقام تک پہنچ گیا تھا اور ماہ بانو پر فائر کرنے والے کے نظر میں آ جانے پر اس نے اسے ٹھکانے لگا دیا تھا۔

ماہ بانو نے ایک گہرا سانس لیا اور مزید اوپر چڑھنے کا ارادہ ترک کر کے اسی چٹان کی آڑ میں بیٹھ کر اردگرد کا جائزہ لینے لگی۔ اس کو نشانہ بنانے کی کوشش کرنے والے کی موت کے بعد دو سمتوں سے ان پر بڑی شدت سے فائرنگ کی جانے لگی تھی۔ فائرنگ کی آواز سے دشمن کی پوزیشن کا اندازہ کرتے ہوئے اس نے اپنے پاس موجود رائفل سیدھی کی اور دائیں طرف موجود شخص کو اس کی فائرنگ کا جواب دیا۔ اسے میدانِ عمل میں اترتے دیکھ کر عمران کو کچھ تقویت سی محسوس ہوئی۔ اب تک وہ بہت بلند ہمتی کا مظاہرہ کرتا رہا تھا، ورنہ زخمی شانے کے ساتھ مسلسل فائرنگ کرنا اور اتنی بلندی پر چڑھنا آسان نہیں تھا۔ بلندی پر پہنچ جانے کے بعد البتہ یہ فائدہ ضرور ہوا تھا کہ وہ بہتر پوزیشن پر آ گیا تھا اور اس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ حملہ آور کہاں سے فائرنگ کر رہے ہیں۔ بائیں طرف والے نے ایک بڑے سے پتھر کی آڑ میں پناہ لے رکھی تھی جبکہ دائیں طرف والا ایک چھوٹی چٹان کے پیچھے تھا۔

عمران اِکا دُکا فائر کرتے ہوئے اس تاک میں لگا ہوا تھا کہ ان دونوں میں سے کسی سے غلطی ہو اور وہ جوش میں آ کر اپنی پناہ گاہ سے جسم کا کوئی عضو باہر نکالنے کی غلطی کرے تو وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا سکے۔ آخرکار بائیں جانب والے نے اسے یہ موقع فراہم کر دیا۔ اس کی طرف سے فائرنگ میں وقفے کی وجہ سے اس نے شاید کوئی چانس لینے کی کوشش کی تھی لیکن اس کی یہ کوشش اسے مہنگی پڑی اور جونہی اس کا سر پتھر کی آڑ سے باہر آیا، عمران کی رائفل سے نکلی ہوئی گولی سیدھی جا کر اس کی پیشانی میں پیوست ہو گئی۔ وہ بغیر آواز نکالے ڈھیر ہو گیا۔ اب صرف ایک دشمن باقی رہا تھا جس سے انہیں اپنی جان چھڑانی تھی لیکن وہ بے حد محتاط تھا اور اس نے اپنی پناہ گاہ سے انگلی تک باہر نکالنے کی غلطی نہیں کی تھی۔ یقیناً اس نے اپنے ساتھی کی رائفل خاموش ہونے پر اس کی موت کا اندازہ لگا لیا ہوگا۔

''خبیث... بھاگنے کی کوشش کر رہا ہے۔'' یک دم ہی عمران کو احساس ہوا کہ مقابل کی طرف سے فائر تو کیا جا رہا ہے لیکن اس کی آواز دور ہوتی جا رہی ہے۔ سو وہ غصے سے بڑبڑایا اور پھر ہونٹ بھینچتے ہوئے اپنے پاس موجود چند گرینیڈ نکالا۔ اگلے ہی پل اس کے دائیں بازو نے فضا میں قوس بناتے ہوئے حرکت کی اور ہینڈ گرینیڈ درمیان کا اچھا خاصا فاصلہ طے کرتا ہوا اس چٹان کے عقب میں جا کر گرا جس کے پیچھے ان کا آخری دشمن اب تک چھپا رہا تھا۔

پہاڑوں میں ایک کان پھاڑ دھماکا گونجا اور چٹان کے عقب سے مٹی اور پتھروں کے اٹھتے طوفان کے ساتھ اس نے انسانی اعضا کو بھی اڑتے ہوئے دیکھا۔ دل کو کپکپا دینے والے اس منظر نے وقت کے اس پل میں اسے حقیقتاً بے حد سکون بخشا تھا۔ کسی انسان کی ایسی عبرت ناک موت لاکھ ناپسندیدہ سہی لیکن یہ سچ تھا کہ جو لوگ ابھی اس کے ہاتھوں مارے گئے تھے، اسے ان میں سے کسی کی بھی موت کا افسوس نہیں تھا۔ ان افراد کی موت نے اس کے اور ماہ بانو کے علاوہ اور بھی بہت سے انسانوں کی زندگی کو بقا بخشی تھی۔ وہ جو ابھی ان پہاڑوں میں حقیر چوہوں کی طرح مارے گئے تھے، درحقیقت خود چلتی پھرتی موت تھے... جو اگر جیتے تو جانے کتنوں کی زندگیوں کا چراغ گل کر ڈالتے۔

آخری دشمن کے بھی موت کے گھاٹ اتر جانے کے بعد عمران کچھ نڈھال سا ہو کر وہیں اپنی جگہ پر ہی لیٹ گیا۔ ماہ بانو جو کہ اس لڑائی میں کسی دشمن کو ٹھکانے نہیں لگا سکی تھی لیکن عمران کی معاونت کرتی رہی تھی، امن ہو جانے پر اپنی پناہ گاہ سے نکل کر اس کے پاس آئی۔

''تمہارا تو بہت زیادہ خون بہہ رہا ہے۔'' عمران کے خون سے تر لباس کو دیکھ کر اس نے تشویش سے کہا اور پھر اس کے قریب بیٹھ کر اس کے زخمی شانے کا معائنہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ میرے خیال میں ہمیں یہاں مزید ٹھہرنے کا خطرہ مول لینے کے بجائے آگے کا سفر شروع کرنا چاہیے۔'' عمران نے اسے معائنے کے لیے اپنا زخمی شانہ پیش کرنے کے بجائے آہستہ سے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر واپس نیچے کی طرف جانے لگا۔ ماہ بانو نے بھی کچھ سوچتے ہوئے خاموشی سے اس کی پیروی کی۔ وہ دونوں انسانی لاشوں کو نظرانداز کرتے ہوئے اس مقام تک پہنچے جہاں ان کی سواری کا کام دینے والے یاک کا مُردہ جسم پڑا ہوا تھا۔ ان کے سامان کا تھیلا اب بھی یاک کی پشت سے بندھا تھا اور سواری سے محروم ہو جانے کے باوجود یہ بات خوش آئند تھی کہ یاک ایسے رخ سے گرا تھا کہ ان کے سامان کا تھیلا اس کے دیوہیکل جسم کے نیچے آنے سے محفوظ رہا تھا، ورنہ دوسری صورت میں وہ دونوں کسی طور بھی اس کے پہاڑ جیسے وجود کو ہٹا کر اس کے نیچے سے اپنا سامان نہیں نکال سکتے تھے۔

''یہ تو گیا۔ اب ہمیں پیدل ہی سفر کرنا ہوگا۔'' یاک پر سے اپنا تھیلا اتارتے ہوئے عمران بولا۔

''ہمارے تعاقب میں آنے والے بھی تو کسی سواری پر آئے ہوں گے۔'' اس کی بات سن کر ماہ بانو نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

''یہ لوگ دو یاکوں پر آئے تھے لیکن وہ دونوں یاک فائرنگ کے شور سے بدک کر بہت پہلے ہی یہاں سے بھاگ چکے ہیں۔ اب اگر ہم نے کسی طرح ان یاکوں کو تلاش بھی کر لیا تو ان پر قابو پا کر ان پر سواری نہیں کر سکیں گے۔'' عمران نے سنجیدگی سے اس کی بات کا جواب دیا اور سامان کے تھیلے میں سے ایک نسبتاً چھوٹا تھیلا نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

''میں شرمندہ ہوں لیکن مجبوری ہے کہ تمہیں بھی اس سفر میں کچھ وزن اٹھانا پڑے گا۔'' وہ یقیناً اپنے زخمی شانے کی وجہ سے ایسا کہہ رہا تھا۔

''سامان میں دوائیں وغیرہ بھی موجود ہیں یا نہیں؟'' اس کے ہاتھ سے تھیلا تھامتے ہوئے ماہ بانو نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

''بالکل ہیں بلکہ اسی تھیلے میں ہیں جو میں نے ابھی تمہیں دیا ہے۔''

''ٹھیک ہے تو پھر تم کچھ دیر آرام سے بیٹھ جاؤ۔ پہلے میں تمہارے زخمی شانے کی مرہم پٹی کروں گی پھر ہم آگے کا سفر کریں گے۔'' عمران کا جواب سن کر وہ تحکمانہ لہجے میں بولی۔

''میرا خیال تھا کہ ہم کچھ فاصلہ طے کر لیتے پھر اس کے بعد یہ مرہم پٹی کا کام ہوتا رہتا۔'' عمران نے انکار کرنا چاہا۔

''نہیں، تم بہت زخمی ہو اور اس حالت میں تمہارا وزن اٹھا کر ایسے ہی سفر جاری رکھنا مناسب نہیں۔'' ماہ بانو کے انداز میں جو قطعیت تھی، اس سے عمران کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اپنی بات سے پیچھے نہیں ہٹے گی چنانچہ اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ ماہ بانو نے اچھی خاصی مہارت سے کام لیتے ہوئے اس کے زخمی شانے کی مرہم پٹی کی اور دواؤں میں موجود ایک پین کلر اسے کھانے کے لیے دی۔ کالج میں بھی شوق میں لی جانے والی فرسٹ ایڈ کی ٹریننگ اس ویران برفانی پہاڑی علاقے میں کام آئے گی، اسے کبھی گمان بھی نہیں گزرا تھا۔ اس وقت اس نے اپنی تربیت کی اچھی خاصی لاج رکھتے ہوئے عمران کی ٹھیک ٹھاک قسم کی بینڈیج کر تو دی تھی لیکن اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ گولی اندر ہی موجود ہے اور وہ اس گولی کو نکالنے سے معذور تھی۔ اس کام کے لیے نہ تو اس کے پاس مطلوبہ مہارت تھی اور نہ ہی سامان۔ وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ جلد از جلد کسی محفوظ پناہ گاہ تک پہنچ جائیں جہاں طبی سہولتیں بھی میسر آسکیں۔ پھر اس نے عمران کی معیت میں آگے کا سفر شروع کر دیا۔ ایک ایسا سفر جس کے راستوں کا انہیں علم نہیں تھا۔ وہ جسے ان راستوں پر چلنے کی تربیت دی گئی تھی، ایک مٹی کے تودے کی طرح بے جان پڑا تھا۔ ایک جانور کی موت نے انہیں سواری ہی نہیں راہنما سے بھی محروم کر دیا تھا اور اب وہ اپنا بوجھ خود اٹھائے انجانے راستوں پر تن بہ تقدیر سفر کرنے پر مجبور تھے۔

☆☆☆

''تم یہیں رکو، اندر میں اکیلی جاؤں گی۔'' درگاہ کے احاطے میں پہنچنے کے بعد کشور نے اپنے ساتھ آئی ہوئی شادو سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''لیکن بی بی... وڈی چودھرائن نے تو کہا تھا کہ میں آپ کے ساتھ ساتھ رہوں۔'' اس نے فوراً ہی اعتراض کیا۔

کشور کی درگاہ پر حاضری کی خواہش پر وڈی چودھرائن نے یوں تو کوئی اعتراض نہیں کیا تھا لیکن اپنی خاص ملازماؤں میں سے شادو کو اس کے ساتھ روانہ کر دیا تھا۔ حویلی کی عورتیں تنہا صرف ڈرائیور کے ساتھ کہیں جاتی بھی نہیں تھیں۔ ایسے ہر موقع پر ان کے ساتھ کوئی نہ کوئی ملازمہ ضرور موجود ہوتی تھی لیکن کشور جانتی تھی کہ اس وقت شادو کو اس کے ساتھ بھیجنے کا مقصد روایت کی پاسداری نہیں بلکہ اس کی نگرانی ہے اور اب شادو کے جملے نے اس بات کی تصدیق بھی کر دی تھی۔

”ساتھ رہنے کو کہا تھا، یہ تو نہیں کہا تھا کہ میرے سر پر ہی سوار ہو جانا۔ یہاں تک ساتھ آ گئی ہے نا، بس کافی ہے۔ اندر حاضری کے وقت میں تجھ کو اپنے سر پر نہیں برداشت کر سکتی۔ حویلی واپس جا کر تو وڈی چودھرائن کو بتا دینا کہ میں نے تجھے باہر روک دیا تھا۔“ کشور نے سخت لہجے میں اسے جھڑک کر اپنے ساتھ اندر جانے سے روک دیا۔ وہ عموماً ملازماؤں سے ایسا برتاؤ کرنے کی عادی نہیں تھی لیکن اس وقت صورت حال ایسی تھی کہ اسے شادو سے اپنا پیچھا چھڑانے کے لیے ایسا لہجہ اختیار کرنا پڑا۔ ویسے بھی تجھی، شادو اور ان کی یاں جس طرح ہر وقت بڑی چودھرائن کی چمچہ گیری کرتی رہتی تھیں، اسے ان سے کچھ چڑ سی ہو گئی تھی۔

”لا، یہ مجھے دے۔“ شادو جھڑکی سن کر تذبذب کے عالم میں کھڑی تھی کہ اسے مزید کچھ بھی کہنے کا موقع دیے بغیر اس نے اس کے ہاتھ میں موجود بڑا سا تھال خود تھام لیا اور حسب قاعدہ پیروں سے چپل اتار کر اس بڑے سے ہال میں داخل ہو گئی جس کے بالکل وسط میں اس کے دادا چودھری مراد عالم شاہ کی قبر بنائی گئی تھی۔ اس کا حتمی انداز دیکھتے ہوئے شادو ہمت نہیں کر سکی تھی کہ اس کے پیچھے اندر داخل ہو۔ اس نے اندر پہنچ کر دروازہ بند کر دیا اور کنڈی چڑھا دی۔ قیمتی سنگِ مرمر کی دیواروں والے اس ہال کے اندر ٹھنڈک کا احساس تھا۔ مختلف مقامات پر لگے بلبس کے علاوہ عین قبر کے اوپر موجود بڑے سے فانوس کی دودھیا روشنی نے ماحول میں ایک عجیب سا تقدس بھرا احساس پیدا کر دیا تھا۔ اس احساس کو تقویت دینے کے لیے وہ خوشبوئیں بھی اہم کردار ادا کر رہی تھیں جنہیں قبر پر موجود چادر کے علاوہ دیواروں پر بھی چھڑکا گیا تھا۔

سادہ لوح اَن پڑھ دیہاتی یہ سب دیکھ کر بے حد متاثر ہوتے تھے اور ان کے دینی تعلیم و شعور سے ناواقف ذہن اندھی عقیدت کے تاریک گڑھے میں بھٹکنے لگتے تھے... لیکن کشور کے لیے یہ سب کچھ کسی ڈرامے کے سیٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ جس شخص کی تربیت نے اس کے باپ جیسے شیطان صفت آدمی کو جنم دیا ہے، وہ خود اخلاقی اعتبار سے کس قدر پستی میں ہوگا۔ ایسے شخص سے کسی بھی قسم کی عقیدت محسوس کرنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ یوں بھی اس کا شعور اسے قبروں کی پوجا سے روکتا تھا چنانچہ وہ اس سارے سیٹ اپ سے ذرا بھی متاثر ہوئے بغیر سپاٹ سے انداز میں چلتی ہوئی قبر کے قریب پہنچی اور اپنے ہاتھ میں موجود تھال اس کے سرہانے رکھ دیا۔ اس تھال میں جلتا ہوا دیا، سبز رنگ کی قیمتی چادر، گلاب کے پھول، خشک میوہ جات اور نذرانے کی موٹی رقم موجود تھی۔

درگاہ پر حاضری کے لیے آنے والوں کے لیے مثال قائم کرنے کی خاطر حویلی کے مکین وقتاً فوقتاً اسی اہتمام کے ساتھ یہاں آتے رہتے تھے۔ حویلی کے مکینوں کی پیروی کرتے ہوئے دوسرے لوگ بھی کوشش کرتے کہ اسی طرح کا اہتمام کر سکیں۔ باہر سے آنے والا کوئی بھی شخص اپنے ساتھ نذرانے کے لیے جو کچھ بھی لاتا، درگاہ کے خدام اسے فوراً قبضے میں لے لیتے لیکن چونکہ اس وقت چودھری افتخار عالم شاہ کی بیٹی وہاں حاضری دینے آئی تھی، اس لیے کسی خادم کو اجازت نہیں تھی کہ وہ اس ہال میں رک سکے۔ اس کی وہاں موجودگی تک دیگر عقیدت مندوں کا بھی وہاں آنا ممکن نہیں تھا بلکہ انہیں تو درگاہ کے احاطے میں بھی آنے کی اجازت نہیں تھی۔ بی بی کشور اپنے دادا کی قبر پر چڑھاوا چڑھا کر واپس جاتی تو پھر عام لوگ اپنی عقیدت مندی کے اظہار اور حاجات کے بیان کے لیے یہاں قدم رکھ سکتے تھے۔ اب یہ الگ بات تھی کہ کشور بی بی کا یہاں سے واپس حویلی لوٹنے کا کوئی پروگرام ہی نہیں تھا۔ وہ یہاں سے نئی دنیاؤں کے سفر پر روانہ ہونے کا ارادہ کر کے حویلی سے نکلی تھی، چنانچہ نذرانوں سے بھرے تھال کو قبر کے سرہانے رکھنے کے بعد پھرتی سے چلتی ہوئی ہال کے اس دروازے کی طرف بڑھی جو دوسری سمت میں موجود تھا۔

عرس وغیرہ کے موقع پر جب درگاہ پر لوگوں کا بے حد رش ہوتا تھا، صرف ایک دروازہ کافی نہیں ہوتا تھا۔ لوگ اندر داخل ہونے اور باہر نکلنے کے چکر میں ایک دوسرے کو روندنے لگتے تھے۔ چنانچہ اس بدنظمی پر قابو پانے کے لیے ہال کی چاروں دیواروں میں ایک ایک دروازہ لگا دیا گیا تھا۔ عام دنوں میں تین دروازے بند رہتے تھے اور صرف وہ ایک دروازہ کھلا رکھا جاتا تھا جس سے گزر کر کشور اندر داخل ہوئی تھی۔ اپنے باہر نکلنے کے لیے اس نے تین بند دروازوں میں سے اس دروازے کا انتخاب کیا تھا جو درگاہ کی عقبی دیوار سے سب سے زیادہ نزدیک تھا۔

دروازے کی موٹی کنڈی اندر سے بند تھی لیکن اس پر کوئی تالا وغیرہ نہیں لگا تھا۔ کشور نے ہاتھ بڑھا کر اس کنڈی کو کھولنے کی کوشش کی تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ کافی سختی سے بند ہے اور اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر رہی ہے۔ شاید بہت کم استعمال ہونے کی وجہ سے کنڈی جام ہو گئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کا زور لگا کر اسے کھولنے کی کوشش کی۔ زیادہ طاقت کے استعمال سے کنڈی نے تھوڑی سی حرکت تو ضرور کی لیکن ساتھ ہی رگڑ کا شور بھی بلند ہوا۔ یہ شور کسی کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا تھا، خصوصاً باہر موجود شادو کی طرف سے اسے خطرہ تھا کہ وہ بے شک اس کے ساتھ اندر داخل نہیں ہو سکی ہے لیکن کان اسی طرف لگا کر کھڑی ہوگی کہ کوئی بھی غیر معمولی بات ہو تو فوراً اس کے علم میں آ سکے۔

اس نے کنڈی پر زور لگانا چھوڑ کر لمحہ بھر کے لیے اس مسئلے کا حل سوچا اور پھر پلٹ کر قبر کی طرف آ گئی۔ سرہانے رکھے تھال میں موجود دیا ہنوز جل رہا تھا۔ اس نے پھونک مار کر اسے بجھایا اور تھال سے اٹھا کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دیا ہاتھ میں لیے وہ واپس دروازے کی طرف آئی اور اس میں موجود تیل کنڈی پر ڈالنے لگی۔ کنڈی کو تیل دینے کے بعد اس نے تقریباً تیس سیکنڈ تک انتظار کیا اور ایک بار پھر اس پر طبع آزمائی کرنے لگی۔ اس بار کنڈی نسبتاً آسانی سے اور کم شور کے ساتھ حرکت کرنے لگی۔

اس نے مستقل مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوری کنڈی کھلنے تک اپنے ہاتھوں کو نہیں روکا۔ اس ذرا سی مشقت پر اس کی آئندہ زندگی کا دارومدار تھا چنانچہ وہ کسی طور پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی۔ کنڈی کھلی تو اس نے بے حد احتیاط سے زور لگا کر دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی شام کی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ کنڈی کھولنے کی مشقت میں اس کے چہرے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئی تھیں۔ ہوا کا جھونکا چہرے سے ٹکرایا تو اس نے بڑی فرحت محسوس کی اور ادھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے قدم باہر رکھ دیے۔

مغرب کا وقت قریب تھا چنانچہ ماحول اتنا روشن نہیں تھا۔ شام کے اترتے سایوں نے دن کی روشنی کو شکست دینا شروع کر دی تھی۔ درگاہ کے احاطے کی لائٹیں بھی فی الحال روشن نہیں کی گئی تھیں اس لیے بھی کچھ اندھیرا سا ہو رہا تھا۔ اس کے لیے یہ نیم تاریکی ایک نعمت کے مانند تھی۔ وہ محتاط قدموں سے چلتی ہوئی احاطے کی دیوار کی طرف بڑھنے لگی۔ اسے آفتاب نے یہیں تک کے ایکشن کے بارے میں ہدایات دی تھیں۔ اس کے مطابق آگے کے معاملات وہ خود سنبھال لیتا۔ وہ اپنے حصے کا کام کرنے کے بعد کچھ ہراساں سی عقبی احاطے میں کھڑی تھی کہ کسی نے آہستہ سے اسے پکارا۔

”کشور بھابی! آئیں، میرے ساتھ آ جائیں۔“ اس پکار پر وہ چونک کر پلٹی تو افضل کی جانی پہچانی شکل نظر آئی۔ اسے دیکھ کر اس نے اپنے دل میں طمانیت کی ایک لہر سی دوڑتی ہوئی محسوس کی اور وہ بنا کوئی سوال جواب کیے اس کے ساتھ چل پڑی۔

”یہاں سے باہر نکلنے کا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے اس لیے آپ کو تھوڑی سی زحمت کرنی پڑے گی۔ ویسے دیوار زیادہ بلند نہیں ہے۔ آپ میری پیٹھ پر پیر رکھ کر آرام سے اس پر چڑھ سکتی ہیں۔“ وہ چند قدم چلنے کے بعد دیوار کے قریب پہنچے تو افضل نے اس سے کہا۔ کشور جو دیوار کی جڑ میں بے ہوش پڑے آدمی کو دیکھ کر الجھ گئی تھی، اس کی بات سن کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ زمین پر گھٹنوں اور کہنیوں کے بل گھوڑا بنا ہوا تھا۔ بے ہوش آدمی کے مخصوص سبز لباس کی وجہ سے یہ اندازہ لگانے کے بعد کہ وہ درگاہ کا کوئی خادم ہے، جو یقیناً اس طرف پہرے کا فریضہ انجام دے رہا تھا اور افضل کے ہاتھوں اس حالت کو پہنچا ہے، وہ افضل کی ہدایت کے مطابق اس کی پیٹھ پر چڑھ گئی۔

وہ دیوار پر چڑھی تو افضل پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اچک کر خود بھی دیوار پر چڑھ گیا اور دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ دوسری طرف پہنچنے کے بعد اس نے کشور کو سہارا دے کر آہستہ سے نیچے اتار لیا۔ احاطے کی دوسری طرف دور تک گھنی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں اور لوگوں کا عموماً اس طرف گزر نہ ہونے کی وجہ سے یہ جگہ زیادہ تر سنسان ہی پڑی رہتی تھی، اسی لیے کشور کے فرار کا منصوبہ بناتے وقت اس جگہ کا انتخاب کیا گیا تھا۔ کشور دیکھ سکتی تھی کہ وہاں ایک گاڑی کھڑی ہے اور گاڑی کی عقبی نشست پر ایک نقاب پوش عورت بھی موجود ہے۔ عورت کے بارے میں اس نے فوراً ہی اندازہ لگا لیا کہ وہ افضل کی بیوی مہتاب ہے۔ افضل نے گاڑی کا عقبی دروازہ کھول کر اسے اندر بٹھایا تو اس کے اندازے کی تصدیق بھی ہو گئی۔ مہتاب نے والہانہ انداز میں اسے اپنے گلے سے لگا کر پیار کرتے ہوئے سلام کیا جس کا کشور نے گرم جوشی سے جواب دیا۔ البتہ افضل ان دونوں کی طرف سے یکسر انجان بنا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا اور اب اس کی گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ کشور جو پہلے

ہی خود کو چادر سے ڈھانپے ہوئے تھی، تھوڑا سا اور گھونگھٹ نکال کر بیٹھ گئی۔ ابھی وہ لوگ گاؤں کی حدود میں موجود تھے چنانچہ اس کے لیے بہت زیادہ خطرہ تھا۔ وہ اپنے ساتھ ساتھ افضل اور مہتاب کی سلامتی کے لیے بھی پریشان تھی۔

اگر کسی کے علم میں یہ بات آجاتی کہ وہ اسے لے کر یہاں سے فرار ہو رہے ہیں تو اس سے پہلے ان لوگوں کو بدترین انجام سے دوچار ہونا پڑتا۔ زیرِلب دعائیں مانگتے ہوئے، دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے وہ سارا راستہ طے کیا۔ مہتاب اور افضل کی خاموشی سے بھی پتا چل رہا تھا کہ وہ لوگ بھی اعصابی تناؤ کا شکار ہیں۔ کشور کو پیر آباد سے نکال کر لے جانا شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالنے کے برابر تھا۔ چنانچہ ان کا اعصاب زدہ ہونا کچھ ایسا انوکھا بھی نہیں تھا۔

”آفتاب کہاں ہیں؟ وہ آپ لوگوں کے ساتھ کیوں نہیں آئے؟“ گاڑی پیر آباد کی حدود سے کافی آگے نکل کر بڑی سڑک تک پہنچی تو کشور نے سکون کا سانس لیتے ہوئے بہت دیر سے ذہن میں اٹکا ہوا سوال دھیمی آواز میں مہتاب سے کیا۔

”آفتاب کو میں نے جان بوجھ کر اپنے ساتھ نہیں رکھا۔ اس کے کسی بھی طرح کے شک سے محفوظ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ یہیں سب کی نظروں کے سامنے موجود رہے۔“ دھیمی آواز کے باوجود اگلی نشست پر موجود افضل نے اس کا سوال سن لیا تھا چنانچہ خود اسے جواب دیا۔

”تمہیں یہاں سے نکال کر لے جانے کے ساتھ ساتھ ہمارے لیے تم دونوں کے مستقبل کی سلامتی بھی بہت اہمیت رکھتی ہے، چنانچہ ہم نے بہت سوچ سمجھ کر اور بڑی عرق ریزی کے ساتھ ساری منصوبہ بندی کی ہے۔ آفتاب نے جو منصوبہ بنایا تھا، وہ بہت زیادہ پُرخطر تھا۔ افضل نے دماغ لڑا کر اس کی خطرناکی کو ذرا کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں اور افضل اس وقت تنہا پیر آباد نہیں آئے ہیں۔ ہمارے ساتھ ایک اور گاڑی میں میڈیا کے چند دوسرے نمائندے موجود تھے جو افضل کے ایما پر پیر آباد اور اردگرد کے دوسرے دیہاتوں میں ہونے والے ترقیاتی کاموں پر ایک رپورٹ تیار کر کے اپنے چینل پر چلائیں گے۔ وہ لوگ چینل کی گاڑی میں آئے ہیں جبکہ ہم نے یہ کار کرائے پر لے لی تھی۔ چینل کے جو نمائندے ہمارے ساتھ آئے ہیں، انہیں ہمارے اس منصوبے کا کچھ علم نہیں۔ افضل نے ان سے کہا تھا کہ میری بیوی کو دیہاتی زندگی دیکھنے کا بہت شوق ہے اور وہ اس دورے پر میرے ساتھ جانا چاہتی ہے اس لیے میں آپ کی گاڑی کے بجائے الگ گاڑی میں چلوں گا۔ ان لوگوں کو ظاہر ہے کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ پروگرام چونکہ سارا افضل نے ترتیب دیا تھا، اس لیے ہمیں آفتاب کے تم سے طے کیے گئے وقت کے مطابق درگاہ تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ بس مجھے ذرا سی ایکٹنگ کرنی پڑی۔“ یہ جملہ کہتے ہوئے مہتاب دھیرے سے ہنسی۔

”ایکٹنگ... وہ کیوں؟“ کشور نے حیرت سے پوچھا۔

”ہمیں یہاں سے اپنی قبل از وقت روانگی کے لیے کوئی بہانہ چاہیے تھا چنانچہ میں نے عین موقع پر یہ ڈراما شروع کر دیا کہ میرے گردے میں شدید درد ہو رہا ہے۔ افضل نے اپنے ساتھیوں سے معذرت کی کہ وہ مزید ان کے ساتھ نہیں ٹھہر سکتے کیونکہ انہیں اپنی وائف کو اسپتال لے جانا پڑے گا۔ بس پھر ہم بہانے سے وہاں سے نکل آئے۔ تمہارے میاں جی البتہ گھرے ہوئے تھے میڈیا والوں کے درمیان اور انہیں بتا رہے تھے کہ کس طرح ان کا اسکول ترقی کے مدارج طے کر رہا ہے۔ میں آتے آتے ان چھپے رستم کو آنکھ مار کر آئی ہوں۔ بے چارے بڑے جھینپے لیکن سب کے سامنے مجھے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے۔“ مہتاب نے اپنی بات کے اختتام پر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ جوں جوں وہ لوگ فاصلہ طے کرتے جا رہے تھے، اعصابی تناؤ کم ہوتا جا رہا تھا اور ان کی حرکات و سکنات اور رویّے میں واضح فرق نظر آ رہا تھا۔

”منصوبہ تو واقعی آپ لوگوں نے بہت اچھا بنایا ہے۔ اگر آپ لوگ چینل والوں کے ساتھ آنے کے بجائے ایسے ہی آجاتے تو گاڑی کی وجہ سے فوراً ابا جی کے کارندوں کی نظر میں آجاتے اور پھر وہ لوگ آپ کی یہاں آمد کا مقصد جانے بغیر آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔“ کشور جو اس کی بات پر خود بھی دھیرے سے ہنسی تھی، سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے تحسین آمیز لہجے میں بولی۔

”اس منصوبے سے ہمیں ہی نہیں آفتاب کو بھی بہت سیفٹی ملے گی۔ جس وقت آپ کے گاؤں سے غائب ہونے کا واقعہ پیش آیا ہے، وہ مسلسل سب کی نظروں کے سامنے رہا ہے۔ پھر چینل والوں کی موجودگی سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ گاؤں کے بیشتر لوگ ٹی وی والوں کو دیکھ کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے اور ہمیں میدان صاف مل گیا۔“ افضل نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے اس سارے معاملے کے مزید پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

”میں آپ کی بہت شکرگزار ہوں افضل بھائی۔ آپ اور مہتاب بھابی اتنا ساتھ نہیں دیتے تو میں بڑی مشکل میں پڑ

جاتی۔“ کشور کی آنکھوں میں یک دم نمی اتر آئی۔

”بے وقوف... اس میں شکریہ ادا کرنے کی کیا بات ہے۔ تم ہمارے لیے چھوٹی بہنوں جیسی ہو۔ اس مشکل گھڑی میں ہم تمہارا ساتھ نہ دیتے، یہ کیسے ممکن تھا۔“ مہتاب نے اسے آہستہ سے اپنے ساتھ لگایا۔

”مہتاب ٹھیک کہہ رہی ہے بھابی! ویسے بھی مجھے تو لڑکی بھگانے کا پرانا تجربہ ہے۔ ضرورت پڑنے پر یہ تجربہ میرے دوست کے کام آگیا تو اس میں کیا حرج ہے۔“ افضل نے بھی شوخ لہجے میں بولتے ہوئے ماحول کی اداسی کو کم کرنے کی کوشش کی۔

”فضول نہ بولیں۔ اللہ نہ کرے کہ ہم بلاوجہ کسی لڑکی کو اس کے گھر سے نکلنے کی ترغیب دیں۔ میرے اور کشور کے کیس میں صرف محبت گھر چھوڑنے کا سبب نہیں بنی ہے۔ ہم دونوں ایسی خواتین ہیں جنہیں اگر اپنے گھر والوں کی محبت اور اعتماد حاصل ہوتا تو ہم ہرگز گھر کی دہلیز پار نہیں کرتے لیکن جب ہم نے دیکھا کہ ہمارے اپنے ہمارے بنیادی حقوق سلب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو ہمیں مجبوراً یہ قدم اٹھانا پڑا۔“ مہتاب نے افضل کی بات کا کچھ بُرا مانتے ہوئے فوراً ہی اسے ٹوکا۔

”سوری بیگم صاحبہ! آپ تو بُرا ہی مان گئیں۔ میرا ایسا کوئی مطلب نہیں تھا۔ میں صرف مذاق کر رہا تھا ورنہ میرے دل میں تمہاری جتنی قدر ہے، اس کے ہوتے ہوئے ممکن ہی نہیں کہ میں تمہارے لیے کوئی غلط لفظ استعمال کروں۔“ افضل نے جلدی سے معذرت کی۔

”مجھے معلوم ہے افضل... آپ صرف مذاق کر رہے تھے لیکن صرف اپنی مرضی سے میکے کی دہلیز پار کرنے والی عورت کے ساتھ یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی بھر اس بات سے ڈرتی رہتی ہے کہ کہیں کوئی اسے ”بھاگی ہوئی عورت“ کا طعنہ نہ دے دے۔ اس لیے میں نہ چاہتے ہوئے بھی آپ کی بات کا بُرا مان گئی تھی۔“ مہتاب نے اس کی معذرت سن کر اداس سے لہجے میں اپنے رویّے کی وضاحت کی تو کشور کا دل بھی عجیب سی اداسی میں گھر گیا۔

اداسی کے اس احساس کو ختم کرنے کے لیے اس نے موضوعِ گفتگو بدلا اور مہتاب کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

”یہ تو بتائیں بھابی کہ آپ کے وہ دونوں بلونگڑے کہاں ہیں؟ آپ دونوں سیر کرنے کے لیے نکلے ہوئے ہیں تو انہیں کہاں چھوڑا ہے؟“

”وہ دونوں گھر پر ہی ہیں۔ میں نے کام والی کو ایکسٹرا پیسے دے کر اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ آج رات تک ہمارے گھر پر بچوں کے ساتھ رک جائے۔ اچھی اعتماد کی عورت ہے، میرے کہنے پر فوراً راضی ہو گئی۔ بچے بھی اس سے مانوس ہیں اس لیے آرام سے اس کے ساتھ رک گئے۔ اب ہم تمہیں اپنے ساتھ لے کر گھر جائیں گے تو خوب خوش ہوں گے کہ چچی آئی ہیں۔ بہت یاد کرتے ہیں تمہیں۔ اصل میں بے چارے ننھیال، ددھیال دونوں سے ہی محروم ہیں اس لیے کوئی بھی بھولا بھٹکا مہمان گھر آجائے تو بڑے خوش ہوتے ہیں۔“ مہتاب ابھی تک مکمل طور پر اداسی کے حصار سے نہیں نکل سکی تھی۔

”چلیں اب تو مہمان بلائے جان بن کر آپ کے گھر میں نازل ہو رہے ہیں۔ جانے کتنا عرصہ مجھے آپ کے ہاں قیام کرنا پڑے۔ بچوں کا خوش ہو ہو کر بھی دل بھر جائے گا۔“ کشور کی اپنی کیفیت اندرونی طور پر مہتاب جیسی ہی تھی لیکن وہ خود کو سنبھال کر اسے اداسی کے حصار سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”خوامخواہ... تم کیوں ہونے لگیں بلائے جان؟ ذرا ہمارے ساتھ رہ کر تو دیکھو پھر دیکھنا ہم تمہیں کیسے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھتے ہیں۔“ حسبِ توقع مہتاب اسے ٹوکتے ہوئے اپنی سابقہ ٹون میں لوٹ آئی۔

”اب یہ تو آزمانے پر ہی معلوم ہوگا۔“ کشور نے جان بوجھ کر اسے چھیڑا۔ جواباً وہ اسے مصنوعی غصے سے گھورنے لگی اور پھر یک دم دونوں ہی کھلکھلا کر ہنس دیں۔ ایک ایسی ہنسی جس میں زندگی اور امید تھی۔

☆☆☆

وڈی چودھرائن کے سامنے کھڑی شادو بید مجنوں کی طرح کانپ رہی تھی۔ شدید خوف کے باعث اس میں یارا نہیں تھا کہ وڈی چودھرائن کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکے۔ وہ بس نظریں جھکائے کھڑی اس کی گھن گرج سن رہی تھی۔

”جانتی ہے تیرا کیا انجام ہو سکتا ہے؟ میں نے تیرے ذمے ایک کام لگایا تھا اور وہ بھی تجھ سے نہیں کیا گیا۔ اپنا منحوس بوتھا لے کر میرے سامنے آگئی ہے کہ کشور بی بی درگاہ سے کہیں غائب ہو گئی ہیں۔ میں پوچھتی ہوں کہ تیرے ہوتے ہوئے وہ کیسے غائب ہو گئی؟ تو نے بھنگ پی رکھی تھی جو تجھے اتنی وڈی کڑی کے کہیں جانے کا پتا نہیں لگا؟“ اس پر گرجتی چودھرائن درحقیقت اندر سے خود لرزاں تھی۔ چودھری کی غیر موجودگی میں حویلی کے اندرونی معاملے کلی طور پر اس کے ذمے ہوتے تھے۔ ایسے میں کشور کا غائب ہو جانا خود اس کے لیے باعثِ عتاب بن سکتا تھا۔

”میں تو پورا ٹیم (ٹائم) ہوشیار ہی کھڑی تھی وڈی چودھرائن جی... پر آپ کے حکم کے مطابق کشور بی بی کے ساتھ اس لیے نہیں رہ سکی کہ انہوں نے مجھے ڈانٹ کر باہر رکنے کا حکم دیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ اندر درگاہ میں سے غائب ہو جائیں گی۔ میں تو وڈی دیر تک باہر کھڑی ان کے اندر سے نکلنے کا ہی انتظار کرتی رہی۔ وہ تو جب درگاہ کے خادموں میں شور مچا کہ ان کا ایک ساتھی باہر بے ہوش پڑا ہے اور درگاہ کا پچھلا دروازہ کھلا ہے تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں فوراً اس دروازے سے اندر گئی، پر کشور بی بی کا اندر نام و نشان نہیں تھا۔ چڑھاوے کا تھال جو وہ اپنے ساتھ لے گئی تھیں، وہ ادھر ہی تھا لیکن بی بی کا کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں کسی سے بی بی کے بارے میں تو پوچھ نہیں سکتی تھی کہ اس میں حویلی کی بدنامی تھی۔ میں آپ ہی ساری درگاہ میں گھوم پھر کر بی بی کو تلاش کرتی رہی پر وہ اندر تھیں ہی نہیں۔“ شادو نے وہ ساری تفصیلات جن سے وہ حویلی پہنچتے ہی وڈی چودھرائن کو آگاہ کر چکی تھی، ایک بار پھر دہرائیں۔

”ڈرائیور سے کیا کہا تھا تو نے کہ بی بی تیرے ساتھ واپس حویلی کیوں نہیں جا رہی ہیں؟“ وڈی چودھرائن نے اسے گھورتے ہوئے پُرسوچ لہجے میں پوچھا۔

”میں نے اس سے کہا تھا کہ بی بی ابھی کچھ دیر اور درگاہ پر رکیں گی۔ مجھے انہوں نے حویلی میں کچھ کام بتایا ہے اس لیے مجھے حویلی لے چل۔ بی بی کو لینے کے لیے وڈی چودھرائن بعد میں دوسری گڈی بھیج دیں گی۔“ شادو کا جواب سن کر وڈی چودھرائن نے ایک ہنکارا بھرا اور پھر سوچ میں ڈوب گئی۔ اس کی پیشانی پر پھیلی لکیروں کا جال اس کے گہرے تفکر کا پتا دے رہا تھا۔ اسی کمرے میں اس کے ساتھ کشور کی سگی ماں چودھرائن ناہید بھی موجود تھی لیکن وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھنے کے علاوہ کسی بھی قسم کے ردِعمل سے محروم تھی۔ بیٹی کے اس طرح سے غائب ہو جانے نے اس کی سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں گم کر دی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے اور بیٹی کے اس فعل کی سزا اسے بھی بھگتنی ہو گی۔

”نجمی کہاں ہے؟ اس کو یہاں بلا کر لا۔“ وڈی چودھرائن کی پیشانی پر پھیلی لکیریں کچھ کم ہوئیں تو اس نے شادو کو حکم دیا۔ وہ تیر کی طرح اس حکم کی تعمیل کے لیے کمرے سے باہر نکلی۔

”اب سر پکڑ کر بیٹھی ہو، اگر پہلے ہی دھی کی لگامیں کھینچ کر رکھی ہوتیں تو آج یہ دن دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔ مجھے تو بہت دنوں سے کڑی کی حرکتیں شک میں ڈالے ہوئے تھیں۔ اپنے طور پر کوشش بھی کی کہ اصل معاملے کی کھوج لگا سکوں، پر تیری دھی تھی وڈی ہوشیار۔ میری آنکھوں میں بھی دھول جھونک گئی۔ ویسے بھی میں اکیلی جان کون کون سے دھندے نبیڑوں۔ حویلی کی ساری ذمے داری میرے کندھوں پر ہے۔ تم تو ساری حیاتی بس عیش ہی کرتی رہیں۔ نہ کوئی ذمے داری سنبھالی، نہ ہی اپنی اولاد۔ کچھ نہیں اپنی اولاد کو ہی دیکھا ہوتا تو آج یہ مشکل سر پر کھڑی نہ ہوتی۔ اب بتاؤ چودھری صاحب کو کون جواب دے گا؟ وہ تو جان کھا جائیں گے ساروں کی۔“

شادو کے باہر نکلنے کے بعد وڈی چودھرائن نے چودھرائن ناہید کے لتّے لینا شروع کر دیے۔ شادو کے تنہا درگاہ سے واپس لوٹنے کا معاملہ ابھی ان تینوں کے ہی درمیان تھا اور بات وڈی چودھرائن کے کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ کسی کو کچھ معلوم ہو جاتا تو حویلی کی عزت خاک میں مل جاتی۔ چنانچہ اندر ہی اندر بے حد چراغ پا ہونے کے باوجود وڈی چودھرائن بڑے ضبط سے کام لے رہی تھی۔

”کسی کچھ کرو وڈی آپا! کسی طرح اس نا ہنجار کو ڈھونڈ کر واپس حویلی لاؤ، ورنہ چودھری صاحب تو میری چوٹی ہی گدی سے اکھاڑ ڈالیں گے۔“ سوکن سے ڈانٹ کھانے کے بعد بجائے بُرا ماننے کے چودھرائن ناہید اس کی منت سماجت کرنے لگی۔

”چوٹی تو وہ میری بھی اکھیڑ دیں گے۔ بس اب تو دعا کر کہ کسی طرح یہ معاملہ نبٹ جائے ورنہ پھر چودھری صاحب کو امریکا فون کر کے سب کچھ بتانا پڑے گا۔ ابھی تو میں اس... کا بندوبست کرنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ کسی کو کشور کے غائب ہو جانے کی خبر نہ ہو سکے۔ کڑی کو تو بعد میں چودھری صاحب ڈھونڈ ہی نکالیں گے لیکن ابھی حویلی کی عزت بچانا سب سے اہم ہے۔“ وڈی چودھرائن کے لہجے سے پریشانی ہویدا تھی۔

وہ اپنی بات کہہ کر خاموش ہی ہوئی تھی کہ شادو، نجمی کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔ چودھرائن جانچتی ہوئی نظروں سے نجمی کا جائزہ لینے لگی اور پھر کچھ مطمئن ہوتے ہوئے سر ہلایا۔

”کشور کی الماری میں سے کوئی چنگا سا جوڑا نکال کر پہن لے اور چپکے سے درگاہ پہنچ جا۔ وہاں سے شادو تجھے ڈرائیور کے ساتھ جا کر لے آئے گی۔ اپنا منہ چنگی طرح چھپا لینا۔ ڈرائیور کو خبر نہ ہونے پائے کہ تو کشور نہیں نجمی ہے۔“ اس نے نجمی کو حکم دیا تو دونوں بہنیں سمجھ گئیں کہ وڈی چودھرائن کشور کے غائب ہونے کے معاملے کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہے اور یہ تاثر دینا چاہتی ہے کہ کشور درگاہ سے

واپس لوٹ آئی ہے۔

”چنگا وڈی چودھرائن“ کہتی ہوئی وہ دونوں حکم کی تعمیل کے لیے باہر نکل گئیں۔ ان کے باہر جانے کے بعد وڈی چودھرائن نے ایک ملازمہ کے ذریعے منشی کو طلب کیا اور خود ملاقات کے کمرے میں پہنچ گئی۔ پردے کے پیچھے منشی اس کا منتظر تھا۔

”منشی! تجھے گاؤں کی کچھ خبر ہے؟ گاؤں میں کوئی نئی گل ہوئی ہے تو مینوں بتا۔“

”ایسی کوئی خاص گل تو نہیں ہوئی چودھرائن جی۔ بس آج ٹی وی والے ادھر آئے ہوئے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ یہاں جو ترقیاتی کام ہوئے ہیں، ان کے بارے میں فلم تیار کریں گے۔ اسی اے سی نے بھیجا ہو گا انہیں اپنی شہرت کے لیے۔“ منشی نے منہ بناتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔

”اور اس ماسٹر کے بارے میں کیا خبر ہے؟ وہ گاؤں میں ہی ہے یا کہیں گیا ہوا ہے؟“ چودھرائن کو کشور اور آفتاب کے تعلقات کے بارے میں حتمی طور پر کچھ معلوم نہیں تھا لیکن پھر بھی اسے شک سا رہتا تھا اس لیے اس نے آفتاب کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔

”وہ تو گاؤں میں ہی ہے جی۔ وہ تو ہے ہی اے سی کا چمچہ... آج وہ کیسے گاؤں سے کہیں جا سکتا تھا۔ لگا ہوا ہے ٹی وی والوں کے سامنے اے سی کی تعریفیں کرنے میں۔“ منشی نے رپورٹ دی تو چودھرائن پر مایوسی طاری ہونے لگی۔ اس کے حساب سے تو اگر کشور غائب تھی تو آفتاب کو بھی منظر سے غائب ہونا چاہیے تھا۔

”ٹھیک ہے منشی! تُو جا... اور ہاں، ارد گرد نظر رکھنا۔ چودھری صاحب کی غیر موجودگی میں تجھے ہی ہر معاملے پر نگاہ رکھنی ہے۔“ وہ منشی کو ہدایت دیتے ہوئے واپس پلٹ گئی۔

اب اسے نجمی اور شادو کا انتظار تھا۔ دوسرے وہ چودھری کو امریکا فون کر کے اس حادثے کی اطلاع کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی تاکہ اس کی ہدایات کے مطابق ایکشن لے سکے۔ معاملہ اتنا نازک تھا کہ خود سے اسے کچھ سجھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔

”منشی جی آپ سے ملنا چاہتے ہیں وڈی چودھرائن جی۔“ ابھی اسے ملاقاتی کمرے سے واپس آئے پانچ منٹ نہیں گزرے تھے کہ ایک ملازمہ نے آ کر اطلاع دی۔ وہ تیزی سے منشی سے ملنے کے لیے پہنچی کہ شاید کوئی نئی خبر مل جائے۔

”معافی چاہتا ہوں وڈی چودھرائن۔ گل تو اتنی خاص نہیں کہ میں آپ کو پریشان کرتا لیکن فیر بھی میں نے سوچا کہ آپ کو اطلاع دے دوں۔“

”کیا گل ہے؟“

”ابھی ابھی درگاہ کا ایک خادم میرے پاس آیا ہے۔ کہتا ہے کہ وہاں کسی نے پچھلی طرف پہرا دینے والے خادم کو بے ہوش کر دیا ہے۔ وہ کون تھا اور کیوں آیا تھا، کسی کو سمجھ نہیں آیا لیکن میں اس لیے پریشان ہو گیا کہ مجھے خبر ملی تھی کہ آج کشور بی بی درگاہ گئی ہوئی ہیں۔“ اس کے پوچھنے پر منشی نے وہ اطلاع دی جو شادو کی زبانی پہلے ہی اس تک پہنچ چکی تھی۔

”کشور کے لیے پریشان نہ ہو۔ شادو ڈرائیور کے ساتھ اسے لینے گئی ہوئی ہے، ابھی واپس آ جائے گی... لیکن یہ معلوم کرنے کی کوشش ضرور کرو کہ وہ کون تھا جس نے خادم کو بے ہوش کیا۔“ چودھرائن منشی کو حکم دے کر ایک بار پھر اپنے کمرے میں واپس پہنچ گئی جہاں چودھرائن ناہید ہنوز پہلے والی پوزیشن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے نظر انداز کر کے وہ اپنی وسیع و عریض مسہری پر نیم دراز ہو گئی۔ کچھ دیر بعد شادو واپس پہنچ گئی۔

”میں نے نجمی کو کشور بی بی کے کمرے میں پہنچا دیا ہے وڈی چودھرائن۔ آپ بتائیں میرے لیے اور کیا حکم ہے؟“ چودھرائن کی خود پر جمی نظروں سے گھبرا کر اس نے اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ آگے کے لیے بھی ہدایت چاہی۔

”چنگی گل ہے۔ اب ایسا کر کہ نجمی سے بول کہ واپس اپنے کپڑے پہن کر باہر آ جائے۔ فیر تم دونوں بہنیں تہ خانے کے دروازے پر پہنچ جاؤ۔ میں بھی ادھر ہی آ رہی ہوں۔“

”چنگا وڈی چودھرائن۔“ اس کا حکم سن کر شادو مستعدی سے بولتی ہوئی پلٹی۔

”گل سن...“ چودھرائن نے اسے پکارا۔

”جی وڈی چودھرائن۔“ شادو نے فوراً اس کی پکار کا جواب دیا۔

”تم دونوں بہنوں کے علاوہ اور کس کس کو اس معاملے کی خبر ہے؟“ اس کو اندر تک اتر جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے چودھرائن نے دریافت کیا۔

”کسی کو نہیں چودھرائن جی۔ ہم نے تو اپنی اماں کو بھی ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔“

”ٹھیک ہے، فیر تُو جا اور نجمی کو اپنے ساتھ لے کر تہ خانے تک پہنچ۔“ اس حکم کی شادو نے پھرتی سے تعمیل کی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں بہنیں تہ خانے کے راستے پر پہنچ گئیں اور سہمی ہوئی وڈی چودھرائن کا انتظار کرنے لگیں۔ تین چار منٹ کے انتظار کے بعد انہوں نے وڈی چودھرائن کو چابیوں

کے تچھے کے ساتھ وہاں آتے دیکھا۔

''تالا کھول۔'' اس نے چابیوں کا گچھا شادو کو تھمایا تو اس نے کانپتے ہاتھوں سے گچھا تھام کر چودھرائن کی نشان دہی کردہ چابی سے تالا کھول دیا۔ پھر اس کے اشارے پر دونوں بہنیں سیڑھیاں اتر گئیں۔ خود چودھرائن بھی اپنے بھاری بھرکم جثے کو سنبھالے ان کے پیچھے تھی اور بُری طرح ہانپتی ہوئی سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ کئی کوٹھریوں پر مشتمل اس تہ خانے میں پہنچ کر اس نے شادو کے ہاتھ سے ہی ایک کوٹھری کا دروازہ کھلوایا اور پھر اس سے چابیوں کا گچھا لیتے ہوئے دونوں بہنوں کو اندر داخل ہونے کا حکم دیا۔ وہ دونوں جواب کسی حد تک خود کو یہاں تک لائے جانے کا مقصد سمجھ گئی تھیں، اندر داخل ہونے کے بجائے اس کے پیروں میں گر گئیں۔

''ہمیں مافی دے دیں چودھرائن جی۔ ہمیں اس کال کوٹھری کی سزا نہ دیں۔'' چودھرائن کے قدموں سے لپٹی وہ آہ وزاری کرتے ہوئے اس سے استدعا کرنے لگیں۔

''دور ہٹو نمک حراموں۔ تمہاری غلطی کی وجہ سے اتنا بڑا حادثہ ہو گیا۔ اب کیا دوسری غلطی میں کروں اور تمہیں آزاد چھوڑ دوں کہ تم لوگوں کے سامنے سب بکتی پھرو۔'' چودھرائن نے اپنی بھاری ٹانگ ان دونوں کو رسید کرتے ہوئے انہیں پیچھے دھکیلا۔

''ہم کسی سے کچھ نہیں کہیں گے وڈی چودھرائن! ہم تو ہمیشہ سے آپ کے وفادار رہے ہیں۔ ہماری ماں نے بھی ساری حیاتی آپ کی خدمت کی ہے اور ہم بھی ہمیشہ آپ کی خدمت کریں گے۔'' اب وہ دونوں اپنے ہاتھ جوڑے اپنی خدمتوں کا واسطہ دیتے ہوئے اس کا دل نرم کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''تمہاری خدمتوں کا ہی خیال ہے جو میں تمہیں صرف اس کوٹھری میں قید کر رہی ہوں۔ کوئی اور ملازمہ ایسی غلطی کرتی تو میں اس پر کتے چھڑوا دیتی۔ اب بھی تم نے زیادہ شور مچایا تو فیر مجھے اسی طریقے سے تمہارا منہ بند کرنا پڑے گا۔'' چودھرائن کی دھمکی اتنی خطرناک تھی کہ دونوں بہنوں کی آوازیں حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئیں اور وہ از خود اس اندھیری کوٹھری میں داخل ہو گئیں۔ آج انہوں نے جان لیا تھا کہ دوسروں کے خلاف سازش کر کے مالکوں کا قرب حاصل کرنے سے کامیابی نہیں ملتی کیونکہ جن کو ظلم کی عادت ہو، وہ رحم بھی ایسے کرتے ہیں کہ ان کے ظلم سے بچنا ممکن نہیں ہوتا۔

☆☆☆

''لنڈا... مائی ڈارلنگ! میں تمہیں کیا بتاؤں کہ تمہاری قربت میں کیسا جادو ہے۔ میں اس سے پہلے بھی بہت بار نیویارک آیا ہوں لیکن اس سے پہلے مجھے نیویارک اتنا حسین کبھی نہیں لگا جتنا کہ اب لگ رہا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اپنا ویزا بڑھوا کر مزید کچھ عرصہ یہاں رک جاؤں۔'' چودھری کی انگلیاں لنڈا کے عریاں بازو پر تھرک رہی تھیں اور اس کی آنکھوں سے شراب وشباب کا نشہ چھلکا پڑ رہا تھا۔

''ویزا تو آپ کا ابھی کافی باقی ہے چودھری صاحب... لیکن ہم تو چاہتے ہیں کہ آپ اس سے پہلے ہی واپس روانہ ہو جائیں۔ آپ یہ مت سمجھیے گا کہ آپ کی میزبانی کرنا ہمیں بھاری پڑ رہا ہے مگر وہاں پاکستان میں کچھ کام ہیں جن کے لیے آپ کا وہاں ہونا ضروری ہے۔ لنڈا کا کیا مسئلہ ہے، یہ خود آپ سے ملنے وہاں آ جائے گی۔''

ڈیوڈ کی بے وقت انٹری نے چودھری کے رومانٹک موڈ کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا لیکن اس کا آخری جملہ ایسا تھا کہ اس نے ڈیوڈ کی بات کی تلخی کو کچھ کم کر دیا اور چودھری دانت نکالتے ہوئے بولا۔ ''اگر لنڈا وہاں آ گئی تو پھر تو ہمیں اپنا... ہیرآباد آپ کے نیویارک سے بھی زیادہ حسین لگنے لگے گا۔''

''آپ نے خوب پٹڑی بدلی ہے چودھری صاحب! ہیرآباد سے نکلے تھے تو ماہ بانو کے سوا کچھ یاد نہیں تھا اور اب لنڈا میں یوں کھوئے ہیں کہ ماہ بانو بالکل بھول گئی ہے۔'' ڈیوڈ نے اسے چھیڑا۔

''وہ بالکل الگ معاملہ ہے مسٹر ڈیوڈ! لنڈا سے تو ہمیں عشق ہو گیا ہے جبکہ ماہ بانو ہماری ضد ہے۔ اس لڑکی نے ہماری انا کو للکارا ہے۔ ہم جب تک اسے خاک میں نہیں ملائیں گے، ہمیں چین نہیں آئے گا۔'' چودھری نے پُررعونت انداز میں جواب دیا۔

''چلیں آپ پاکستان واپس پہنچیں، آپ کی یہ خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔ ہماری طرف سے ہماری دوستی کا ثبوت ماہ بانو کی شکل میں آپ تک پہنچ جائے گا اور لنڈا تو ہے ہی آپ کی۔ جب آپ اسے یاد کریں گے، تب یہ آپ کی خدمت میں پہنچ جائے گی۔'' بلتستان کے پہاڑی کیمپ کے انچارج نے ابھی تک ماہ بانو کے فرار کی خبر ڈیوڈ تک نہیں پہنچائی تھی اور فی الحال اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح مفرور ماہ بانو اور عمران کو ڈھونڈ نکالے اس لیے ڈیوڈ بڑے پُراعتماد لہجے میں چودھری کے سامنے دعویٰ کر رہا تھا۔ درحقیقت پہلے تو خود اس کی نیت ماہ بانو پر خراب ہوئی تھی۔ مشرقی حسن کا نمونہ ماہ بانو پہلی نظر میں ہی اس کے دل کو بھا گئی تھی۔

پہلی بار اس نے اسے اس وقت بشام ہوٹل کے باہر دیکھا تھا جب وہ ایک ایکسپی ڈیشن ٹیم کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو رہا تھا۔ اس وقت وہ شہریار کے ساتھ تھی اور چونکہ وہ خود بھی وہاں سے روانہ ہو رہا تھا اس لیے اس کی طرف ایک فلائنگ کس اچھال کر ہی اکتفا کر لیا تھا۔ بعد میں وہ اتنا مصروف رہا کہ اسے ماہ بانو کا خیال بھی نہیں رہا۔ وقتاً فوقتاً پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں جا کر ہائیکنگ کے بہانے وہ ان پہاڑوں کے محلِ وقوع اور مختلف جغرافیائی حالات کے بارے میں بیش قیمت معلومات حاصل کرتا رہتا تھا۔ انجینئرنگ کی پیشہ ورانہ تعلیم اور تنظیم کی طرف سے دی گئی تربیت کی وجہ سے اسے اپنے کام میں خاص مہارت حاصل تھی۔ سیر و تفریح اور ایڈونچر کے بہانے مختلف علاقوں میں گھومتے ہوئے اس نے کئی اہم اور قیمتی نقشے تیار کر لیے تھے جو نہ صرف ان کی اپنی تنظیم کے پاس ریکارڈ میں موجود تھے بلکہ وقتاً فوقتاً وہ ان معلومات کا بھارتی سیکرٹ سروس را سے بھی تبادلہ کرتے رہتے تھے۔ ان معلومات کی فراہمی کے عوض را کو بھی ان کے لیے خدمات انجام دینی پڑتی تھیں لیکن چونکہ یہ خدمات پاکستان مخالف سرگرمیوں پر ہی مشتمل ہوتی تھیں اس لیے را والے بِنا احتجاج خاموشی سے ان کا یہ کام کر دیتے تھے۔

بعض اوقات معلومات کی اس فراہمی پر وہ لوگ صرف پاکستان کے خلاف کارروائی کروانے پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ نقد معاوضہ بھی وصول کرتے تھے۔ اپنی پاکستان دشمنی میں بھارتی حکومت کو یہ سودا بھی مہنگا نہیں لگتا تھا کیونکہ موساد سے حاصل کردہ معلومات انہیں پاکستان کے خلاف شرانگیز کارروائیاں کرنے میں مدد دیتی تھیں۔ موساد کا اہم ترین ایجنٹ ڈیوڈ اپنے پاکستان کے دوروں میں نہ صرف یہ معلومات جمع کرتا تھا بلکہ موساد ہی کی پالیسی کے تحت قائم کردہ ایک مذہبی انتہاپسند تنظیم جو درحقیقت دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث تھی، اس کے مختلف مراکز کا دورہ بھی کر ڈالتا تھا۔ اس بار بھی اس نے پہاڑوں پر موجود خفیہ کیمپ کا دورہ کیا تھا اور وہاں کے انچارج سے زیرِ تربیت افراد کے بارے میں رپورٹ حاصل کرنے کے علاوہ ہتھیاروں اور بارود کی مزید فراہمی کے بارے میں بھی ان کی ضروریات کے بارے میں جان کر آیا تھا۔ یہ ہتھیار اور بارود، فوڈ سپلائی کے ساتھ ہی چھپا کر کیمپ تک بھیجے جاتے تھے لیکن انہیں لے جانے والے جیپ ڈرائیورز کو اس بارے میں کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی اور وہ اچھے معاوضے کے عوض ایک بظاہر بے ضرر نظر آنے والا کام بخوشی انجام دے دیا کرتے تھے۔

ڈیوڈ اپنے معمول کے کامیاب دورے سے واپس لوٹ رہا تھا جب اس نے ہوشے میں ماہ بانو کو ایک بار پھر دیکھا۔ اس موقع پر وہ مخصوص پہاڑی لباس زیب تن کیے ہوئے تھی اور بشام کے باہر نظر آنے والی ماہ بانو کے مقابلے میں خاصی مختلف نظر آنے کے باوجود اپنی شخصیت کی خاص دل آویزی کے باعث وہاں موجود سب خواتین سے ممتاز لگتی تھی۔ اس موقع پر ڈیوڈ نے بے ساختہ ہی اس کی کئی تصویریں کھینچ ڈالیں۔ جواب میں اس نے ماہ بانو کے چہرے پر پھیلنے والا ناگواری کا تاثر بھی دیکھا تھا لیکن پروا نہیں کی۔ البتہ خواہش کے مطابق وہ وہاں اس سے ملنے یا چھیڑ چھاڑ کرنے کی جرأت بھی نہیں کر سکا۔

کئی برسوں سے ان علاقوں میں سفر کرتے رہنے کے باعث اسے وہاں کے لوگوں کے مزاج کے بارے میں... بخوبی علم تھا اور وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے کوئی بھی بے احتیاطی کی تو اسے لینے کے دینے بھی پڑ سکتے ہیں... مگر اگلی صبح جب اس نے ماہ بانو کو اپنی کیمپنگ سائٹ پر دیکھا تو شدید غلط فہمی کا شکار ہو گیا۔ اس نے گمان کیا کہ ماہ بانو ان لڑکیوں میں سے ہے جو غربت سے نمٹنے اور روپیا کمانے کے لیے غیر ملکی سیاحوں کا کھلونا بننا قبول کر لیتی ہیں۔ اسی حساب سے اس نے اسے اپنے خیمے میں گھسیٹ کر اس سے زبردستی کرنی چاہی لیکن ماہ بانو کے ردِعمل نے اسے بتا دیا کہ وہ غلطی پر ہے۔ پھر اکرم خان کی مداخلت کی وجہ سے نہ صرف اسے اپنے مکروہ ارادے میں ناکام ہونا پڑا بلکہ اکرم خان کے ہاتھوں شدید ہزیمت بھی اٹھانی پڑی۔

جہاں وہ اپنی اس ذلت پر بُری طرح چڑا، وہیں ماہ بانو کی شخصیت کے بارے میں بھی کھٹک گیا۔ اس کے پہاڑی لڑکیوں سے مختلف نین نقش ویسے ہی چونکا دینے والے تھے، اس پر سے اس کی اس سے جو مختصر گفتگو ہوئی، اس سے بھی یہ بات سامنے آ گئی کہ وہ کوئی پہاڑی دوشیزہ نہیں ہے۔ ایک مختلف ماحول کی لڑکی ان پہاڑی وادیوں میں کیا کر رہی ہے، اس کے ذہن میں تجسس جاگ اٹھا۔ ری سورسز کی تو اس کے پاس کمی نہیں تھی۔ وہ پاکستان میں موجود اپنے نیٹ ورک کو حرکت میں لے آیا۔ نتیجتاً اسے ماہ بانو کی ساری ہسٹری معلوم ہو گئی۔ چودھری افتخار کا نام اپنے مقاصد کے حصول کے لیے پہلے ہی ان کی لسٹ میں موجود تھا۔ چودھری کو لالچ دینے کے لیے اس نے بہتر سمجھا کہ ماہ بانو کو کسی طرح اپنے قبضے میں لے لیا جائے۔ ہوشے سے اسے اغوا کر کے کسی بڑے شہر تک فوری طور پر پہنچانے میں خطرہ ہوتا چنانچہ اس نے اس کام کے لیے اپنے پہاڑی کیمپ پر موجود بندوں کو استعمال کیا اور یوں ماہ

باتو ہوشے سے نکل کر برف زار کے ایک غار میں پہنچ گئی۔

ڈیوڈ کو اطمینان تھا کہ وہ ماہ بانو کی تلاش کا سلسلہ ٹھنڈا پڑنے پر جب چاہے گا اسے وہاں سے نکال کر چودھری تک پہنچا دے گا۔ اس طرح ایک تیر سے دو شکار ہو جاتے۔ چودھری بھی ان کی مٹھی میں آجاتا اور ماہ بانو سے وہ اپنی ذلت کا بدلہ بھی چکا دیتا۔ اکرم خان کو تو پہلے ہی اس کے آدمی ٹھکانے لگا چکے تھے۔ جدید دنیا کا باسی... بہ ظاہر بہت مہذب دکھائی دینے والا ڈیوڈ درحقیقت پیرآباد کے چودھری افتخار سے فطرت میں مختلف نہیں تھا۔ چودھری کو اگر اپنی چودھراہٹ اور جاگیر کا غرور تھا تو ڈیوڈ بھی اپنے اختیارات پر نازاں تھا۔ یہ غرور اور ناز ایسے جذبات نہیں جو آدمی کو آپے میں رہنے دیں۔ ''میں اوروں کے مقابلے میں بااختیار ہوں...'' یہ احساس بہت کم ہی افراد میں عاجزی اور خدمت گزاری کا وصف پیدا کرتا ہے، ورنہ عموماً تو لوگ خود کو زمینی خدا تصور کرنے لگتے ہیں جنھیں خلافِ مزاج کچھ گوارا نہیں ہوتا اور جب کچھ مرضی سے ہٹ کر ہو جائے تو پھر وہ اس کا بدلہ لیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

''کیا بات ہے مسٹر ڈیوڈ! آپ ہم سے بات کرتے کرتے کن خیالات میں ڈوب گئے؟'' چودھری سے ماہ بانو کا ذکر کرتے ہوئے ڈیوڈ کو خود بھی بہت کچھ یاد آگیا تھا چنانچہ وہ کچھ دیر کے لیے ماحول سے کٹ گیا۔ اس کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے چودھری نے اسے ٹوکا۔

''ہمیں کس کے خیالوں میں ڈوبنا ہے چودھری صاحب! یہ تو آپ خوش نصیب ہیں جو ہر جگہ ایک حسینہ آپ کی منتظر ہے۔'' ڈیوڈ نے ہنس کر مذاق میں بات ٹالی تو چودھری بھی زوردار قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ اس قہقہے کی گونج میں ہی اسے اپنے موبائل کی گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے موبائل نکال کر اسکرین پر آنے والا نمبر دیکھا۔ حویلی کے نمبر سے کال کی جارہی تھی۔ پہلے اس کا دل چاہا کہ لائن کاٹ دے پھر یہ سوچ کر کہ ہوسکتا ہے کوئی اہم معاملہ درپیش ہو، کال ریسیو کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ شہریار کے اغوا والے معاملے کے بعد وہ اپنی فون کالز کی طرف سے خاصا محتاط تھا۔ اس وقت بھی موبائل فون بند رکھنے کی وجہ سے اس کا اپنے بندوں سے رابطہ منقطع ہو گیا تھا اور کچھ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

''سلام چودھری صاحب! میں وڈی چودھرائن گل کر رہی ہوں۔'' چودھری نے جیسے ہی کال ریسیو کی، دوسری طرف سے اپنی بیگم نمبر ایک کی آواز سنائی دی جسے خود کو وڈی چودھرائن کہلوانے کی اس قدر عادت پڑ چکی تھی کہ اپنے نام کا استعمال وہ خود بھی ترک کر چکی تھی اور خود کو اکثر وڈی چودھرائن ہی کہہ کر متعارف کرواتی تھی۔

''کی گل ہے؟ اس وقت تو نے مجھے کیسے فون کیا ہے؟'' جوان و حسین لنڈا کی قربت میں اپنی موٹی بھدی اور برسوں پرانی بیوی کی آواز سننا بھی اسے سخت ناگوار گزرا تھا، چنانچہ اس کے سلام کا جواب دیے بغیر بیزاری سے پوچھا۔

''وڈی خاص گل تھی چودھری صاحب... اس لیے مجھے آپ کو فون کرنا پڑا۔ آپ اتنی دور ہو، کچھ چنگی گل نہیں لگتی کہ آپ کو پریشان کروں، پر میں بھی مجبور ہوں... گل ہی کچھ ایسی ہے کہ آپ کو بتائے بغیر رہا بھی نہیں جا سکتا۔ میری تو اپنی مت ماری گئی ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ اب آپ ہی کچھ مشورہ دیں گے تو میں کچھ کر سکوں گی۔''

''کیا پہیلیاں بجھوائے جارہی ہے... سیدھی طرح بتا کہ کیا گل ہے؟'' وڈی چودھرائن کے لہجے سے اس نے اتنا تو بھانپ لیا تھا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آچکا ہے لیکن یہ اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ وہ کون سی غیر معمولی صورتِ حال ہو گی جس کے لیے وڈی چودھرائن نے اسے اتنی دور کال کر کے اطلاع دینا ضروری سمجھا ہے؟ اس لیے ذرا غصے اور چڑچڑے پن سے سوال کیا۔

''کیا بتاؤں چودھری صاحب! گل ہی کچھ ایسی ہے کہ بتاتے ہوئے میری زبان رکتی ہے۔ حویلی کی عزت داؤ پر لگی ہے اور میری کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ کیا کروں؟'' اپنی بات کے اختتام پر وڈی چودھرائن نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا۔

''میں کہتا ہوں مینوں اصل گل دس، پہیلیاں نہ بجھوا۔'' چودھری اعصاب زدہ ہو کر حلق کے بل دہاڑا۔

''کشور کہیں غائب ہو گئی ہے چودھری صاحب! آپ کی دھی ہمارے منہ پر کالک مل گئی ہے۔'' وڈی چودھرائن نے ایسے الفاظ اور انداز میں اطلاع دی کہ حادثے کی شدت دگنی ہو کر چودھری تک پہنچی۔

''کیا بک رہی ہے... ہوش میں تو ہے یا نہیں؟'' اس نے یقیناً چیخنے کی ہی کوشش کی تھی لیکن آواز حلق کے اندر ہی گھٹ کر رہ گئی تھی اور وہ بس سرگوشی میں ہی وڈی چودھرائن سے یہ سوال کر سکا تھا۔

''ہوش تو میرے سچ مچ گم ہو گئے ہیں چودھری صاحب! لیکن جو کچھ میں نے آپ کو بتایا ہے وہ بالکل سچ ہے۔''

''مجھے تفصیل سے ساری گل بتا۔ آخر تیرے ہوتے ایسا کس طرح ہو گیا؟ کیا میرے پیچھے تو نے حویلی کے معاملات کی طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں؟'' وہاں ڈیوڈ

اور لنڈا کی موجودگی کی وجہ سے اس نے خود کو کافی سنبھال لیا تھا لیکن پھر بھی لہجے سے دبا دبا غصہ جھلک ہی رہا تھا۔ ڈیوڈ کی اردو اور پنجابی سے واقفیت کی بنا پر اسے خاص طور پر احتیاط برتنی پڑ رہی تھی۔

''میری آنکھیں بند نہیں تھیں مگر وہ میری آنکھوں میں دھول جھونک گئی۔ حویلی سے درگاہ جانے کی اجازت لے کر نکلی تھی۔ شادو اور ڈرائیور اس کے ساتھ تھے لیکن جانے اس نے کیا چکر چلایا کہ ان دونوں کو خبر بھی نہیں ہوئی اور وہ درگاہ سے غائب ہو گئی۔ جانے کون ہے جس نے اس کو یہ راہ دکھائی اور اپنے ساتھ لے اڑا۔ میں تو پہلے ہی اس کڑی کے کرتوتوں کی طرف سے فکر میں تھی لیکن اس کی ماں کی شہ اور آپ کی ڈھیل کی وجہ سے ہر واری مجھے ہی چپ ہونا پڑا۔'' وہ بہت عرصے سے کشور کے خلاف اپنے دل میں جمع زہر اگلنے لگی۔

''یہ وقت ایسی گلاں کرنے کا نہیں۔ تو ایسا کر کہ اس کی سب سے قریبی ملازمہ رانی کو ٹٹول۔ مجھے یقین ہے کہ اس کو ضرور کچھ نہ کچھ خبر ہو گی۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلتا ہوا اپارٹمنٹ کی بالکنی کی طرف چلا گیا اور دھیمی آواز میں چودھرائن کو مشورہ دیا۔

''ہاں چودھری صاحب! میں ابھی بندہ دوڑاتی ہوں۔ رانی آج کل شہر والی کوٹھی میں رہ رہی ہے۔ اسے گاؤں بلوا کر میں اس کے حلق سے اگلواتی ہوں کہ یہ سارا چکر کیا ہے؟'' چودھری کا مشورہ سن کر وہ فوراً جوش میں آگئی۔ کشور کی ملازمۂ خاص رانی پر ویسے ہی اسے شک رہتا تھا کہ وہ حویلی سے زیادہ کشور کی وفادار ہے لیکن آج کل چونکہ رانی لاہور میں رہ رہی تھی، اس لیے کشور کے غائب ہوتے ہی اسے رانی کا خیال نہیں آیا تھا۔

''تو یہ کام کر۔ میں پہلی فلائٹ ملتے ہی واپس آتا ہوں۔ اور ہاں... خیال رکھنا کہ کسی کو کانوں کان اس گل کی خبر نہ ہو سکے۔''

''تسی فکر نہ کرو چودھری صاحب! کسی نوں کچھ خبر نہیں ہے۔ صرف شادو اور اس کی بہن چھی کو ملوم تھا، ان دونوں کو میں نے حویلی کے تہ خانے میں ڈال دیا ہے۔'' چودھری کی ہدایت کے جواب میں اس نے فخر سے اپنا کارنامہ سنایا۔

''چنگی گل ہے۔ اب تو فون بند کر۔ میں کچھ دوستوں کے ساتھ ہوں زیادہ کھل کر گل نہیں کر سکتا۔'' چودھری نے کہتے ہوئے خود ہی لائن کاٹ دی اور پھر موبائل جیب میں رکھ کر چہرے پر ایک نمائشی سی مسکراہٹ سجائے ہوئے کمرے میں واپس آیا۔

''خیریت چودھری صاحب! آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟ کوئی مسئلہ ہے تو بتائیں... آخر ہم آپ کے دوست ہیں، آپ کی پریشانی برداشت نہیں کر سکتے۔'' اس کی مسکراہٹ کے باوجود ڈیوڈ نے اس کی پریشانی کو بھانپتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''کچھ نہیں مسٹر ڈیوڈ! بس ایک چھوٹا سا پرسنل پرابلم ہے، میں خود ہی سولو کر لوں گا... بلکہ ابھی آپ ذکر کر ہی رہے تھے کہ مجھے واپس پاکستان چلے جانا چاہیے تو بس سمجھیں کہ ایسا سبب بن گیا ہے کہ میں خود بھی فوری طور پر واپس جانا پسند کروں گا۔'' جو حادثہ اس کے ساتھ پیش آچکا تھا، وہ اس کے بارے میں اپنی زبان سے کسی کو کیسے کچھ بتا سکتا تھا؟ چنانچہ ڈیوڈ کے سوال کرنے پر اسے ٹال گیا اور پھر فوری طور پر اس سے اور لنڈا سے اجازت لے کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ ابھی وہ جس پریشانی میں مبتلا تھا، اس کے ہوتے لنڈا کا حسین وجود بھی اپنی کشش کھو بیٹھا تھا۔ لنڈا اور ڈیوڈ نے اس کا یہ انداز دیکھا تو چونک پڑے۔

''مجھے لگتا ہے کہ چودھری کے ساتھ کوئی بڑا مسئلہ ہو گیا ہے۔ ہوسکتا ہے ہم اس کے مسئلے سے کوئی فائدہ اٹھا سکیں۔ تم فون کر کے پیرآباد میں موجود ایجنٹ کی ڈیوٹی تو لگاؤ کہ وہ ذرا اس معاملے کی کھوج لگائے۔'' ڈیوڈ نے لنڈا کو ہدایت کی تو وہ ٹیلی فون پر مطلوبہ نمبر ملانے لگی۔ رابطہ ملنے پر اس نے ڈیوڈ کا حکم دوسری طرف سنایا اور پھر اس اطمینان کے ساتھ کہ جلد اصل معاملہ ان کے سامنے آجائے گا، کال منقطع کر دی۔

☆☆☆

''تم شہر کس کام سے آئے تھے؟'' گاڑی کی پچھلی نشست پر اپنے سامان کی گٹھڑی کے ساتھ بیٹھی رانی نے ڈرائیور سے پوچھا۔ اسے اتنی اچانک واپسی کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ ڈھنگ سے اپنا سامان بھی سمیٹ نہیں پائی تھی۔ اب گاڑی میں بیٹھ کر اسے یاد آرہا تھا کہ کوٹھی کی عقبی جانب اس نے اپنا بالکل نیا جوڑا دھو کر ڈالا تھا اور جلدی میں وہ جوڑا وہیں رہ گیا تھا۔ یہ جوڑا اسے کشور نے اپنے لاہور میں قیام کے عرصے میں خرید کر دیا تھا اور اسے خاصا پسند تھا۔ اس کے علاوہ اس کی چاندی کی بالیاں بھی جو کہ حاجرہ نے اس سے مستعار لے کر پہنی تھیں، وہیں رہ گئی تھیں۔ دوسرے بھی کئی چھوٹے چھوٹے معاملات تھے جن پر اس کے خیال میں وہ ڈرائیور کے جلدی مچانے کی وجہ سے خاطر خواہ توجہ نہیں دے سکی تھی لیکن اب چلتی گاڑی میں بیٹھ کر کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا اس لیے وقت گزاری کے لیے ڈرائیور سے گفتگو شروع کر دی۔

”نہیں، مجھے شہر میں کوئی کام نہیں تھا۔ بس میں تجھے لینے کے لیے ہی آیا تھا۔ سویرے سورج نکلنے سے بھی پہلے وڈی چودھرائن کا حکم ملا کہ شہر جا کر رانی کو لے آؤ تو میں تجھے لینے آ گیا۔“ ڈرائیور نے اس کے سوال کے جواب میں بیزاری سے بتایا۔ اسے اپنا منہ اندھیرے جگا کر شہر روانہ کیا جانا اچھا نہیں لگا تھا لیکن اسے کیا خبر تھی کہ وڈی چودھرائن نے رات بھی کس مشکل سے گزاری ہے۔ کشور کے غائب ہونے کا علم ہونے کے بعد دیگر معاملات سے نمٹنے اور چودھری سے رابطہ ہونے میں اچھا خاصا وقت لگ گیا تھا، ورنہ ممکن تھا کہ وہ رات کو ہی اسے لاہور روانہ کر دیتی۔

”کشور بی بی تو خیریت سے ہیں نا؟ کہیں انہوں نے ہی تو مجھے نہیں بلوایا؟“ رانی چونکہ اپنے اچانک بلائے جانے پر حیران تھی اس لیے اس اچانک طلبی کی وجہ جاننے کی کوشش کی۔ اس کے خیال میں کشور کی ضد ہی اس کی واپسی کا سبب بن سکتی تھی اس لیے اس کے بارے میں سوال کیا۔

”مجھے تو وڈی چودھرائن کا حکم ملا تھا۔ اب ان سے کس نے کہا مجھے خبر نہیں۔ ویسے تو اطمینان رکھ، کشور بی بی بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ کل ہی میں عصر کے بعد انہیں درگاہ پر حاضری کے لیے لے کر گیا تھا۔“ اس کی فکرمندی دیکھتے ہوئے ڈرائیور نے اسے تسلی دی تو وہ ذرا دیر کے لیے خاموش ہو گئی لیکن تشویش اپنی جگہ قائم تھی۔ بغیر وجہ کے وہ خاص طور پر گاڑی بھیج کر اپنے بلوائے جانے کو کسی طرح قبول نہیں کر پا رہی تھی۔

”میرے گھر پر تو سب ٹھیک ہے نا؟“ مختصر سی خاموشی کے بعد اس نے دل میں آنے والے ایک اندیشے کے تحت سوال کیا۔

”ہاں ہاں، سب ٹھیک ہے۔ اگر ٹھیک نہیں بھی ہوتا تو کیا تیرے خیال میں حویلی والے اتنے رحم دل ہیں کہ تیرے گھر کی پریشانی پر گاڑی بھیج کر تجھے شہر سے بلواتے۔ ان کا اپنا ہی کوئی کام شام ہوگا جو انہوں نے تجھے بلوایا ہے۔“ ڈرائیور نے جھنجلاہٹ زدہ لہجے میں جو جواب دیا، وہ تلخ ہونے کے باوجود اپنی جگہ بالکل صحیح تھا جسے سن کر رانی کو خاموشی اختیار کرنی پڑی۔ اسی خاموشی میں اونگھتے جاگتے واپسی کا سفر طے ہو گیا اور وہ پیر آباد کی حدود میں داخل ہو گئے۔ گاڑی کے پیر آباد میں داخل ہوتے ہی رانی کے دل نے بے حد خوشی محسوس کی۔ لاہور جیسے بڑے اور پُررونق شہر میں رہ کر بھی اسے اپنے اس کچے پکے گھروں والے پیر آباد کی یاد مسلسل ستاتی رہی تھی اور اب جبکہ وہ پیر آباد کی فضاؤں میں سانس لے رہی تھی تو یہ اس کے لیے ازحد خوشی کا مقام تھا۔ خوشی کی اس کیفیت میں ڈوبی وہ آنے والے ظالم وقت کی آہٹیں سنے بغیر حویلی تک پہنچ گئی۔

”سیدھی وڈی چودھرائن کے پاس چلی جا۔ انہوں نے کہا تھا کہ رانی کو لاتے ہی فوراً میرے پاس بھیجنا۔“ وہ گاڑی سے اتر ہی رہی تھی کہ ڈرائیور نے اسے وڈی چودھرائن کا پیغام پہنچایا۔ وہ جو حویلی پہنچتے ہی کشور کے کمرے کا رخ کرنے کا ارادہ رکھتی تھی، اس حکم کو سن کر ٹھٹک گئی۔ اب تک وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ اسے کشور کے اصرار پر حویلی واپس بلوایا گیا ہوگا لیکن اب اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔ گڑبڑ کا پتا وڈی چودھرائن سے ملنے کے بعد ہی چل سکتا تھا چنانچہ وہ اس کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ اس کے سامان کی گٹھڑی بھی اس کی بغل میں دبی ہوئی تھی۔

”وڈی چودھرائن اپنے کمرے میں نہیں ہے رانی! میرے ساتھ آ میں تجھے ان کے پاس لے چلوں۔“ ابھی وہ وڈی چودھرائن کے کمرے کی طرف جانے والی راہداری میں مڑی ہی تھی کہ اسے چھچی مل گئی۔

”خیر تو ہے... تو بڑی کمزور لگ رہی ہے... چہرہ اترا ہوا سا ہے۔ کیا بیمار رہی ہے؟“ چھچی کے ساتھ قدم ملا کر چلتے ہوئے اس نے اس سے دریافت کیا۔

”ٹھیک ہوں میں۔“ چھچی نے جس کی شکل ایک دن کی قید کے بعد ہی بالکل اتر کر رہ گئی تھی، سپاٹ سے لہجے میں جواب دیا تو اس کی مزید سوال جواب کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ویسے بھی چھچی اور اس کی بہن شادو سے اس کے تعلقات کبھی بھی زیادہ اچھے نہیں رہے تھے۔ وہ ان خوشامدی اور سازشی لڑکیوں سے دور ہی رہنا پسند کرتی تھی۔

”وڈی چودھرائن ادھر ہے؟“ جب چھچی اسے لے کر تہ خانے کی سیڑھیاں اترنے لگی تو اس نے حیرت سے پوچھا۔ جواباً چھچی نے محض اثبات میں سر کو جنبش دینے پر اکتفا کیا۔

”پر وہ ادھر کیا کر رہی ہے؟“ اسے تہ خانے میں جاتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

”اس کی مرضی جو چاہے کرے۔ تُو اور میں کون ہوتے ہیں سوال کرنے والے؟“ چھچی کا لہجہ اگرچہ جھنجلایا ہوا تھا لیکن بات اس نے سولہ آنے درست کہی تھی۔ واقعی کسی ملازمہ کی کیا مجال تھی کہ وہ مالکن سے سوال کر سکتی۔ رانی کو بھی چار و ناچار تہ خانے کی سیڑھیاں اترنی پڑیں لیکن اب اس کے دل میں خوف اس طرح جڑ پکڑ چکا تھا کہ گاؤں آنے کی ساری خوشی اڑن چھو ہو گئی تھی۔ سیڑھیاں اترنے کے بعد چھچی اسے

لیے تہ خانے کے ایک کمرے کی طرف بڑھی۔ رانی کا آج پہلی بار تہ خانہ دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا لیکن اس تہ خانے کے بارے میں اس نے بہت سی کہانیاں ضرور سن رکھی تھیں۔

سنا تھا کہ یہ تہ خانہ چودھری کے دادا نے حویلی تعمیر کرتے وقت بنوایا تھا اور اس تہ خانے کی حیثیت ایک نجی جیل جیسی تھی جہاں وہ اپنے ناپسندیدہ افراد کو قید میں رکھتے اور ایذا دیتے تھے۔ دادا کے بعد چودھری کا باپ بھی اس تہ خانے کو اسی مقصد کے لیے استعمال کرتا رہا لیکن چودھری کے بارے میں یہی سننے میں آیا تھا کہ اس نے تہ خانے کا یہ استعمال بند کر دیا تھا۔ اس کی وجہ اس کی رحم دلی نہیں بلکہ عقل مندی تھی۔ بدلتے ہوئے سیاسی حالات کے پیشِ نظر اس نے یہ احتیاط کی تھی کہ اپنی ذاتی رہائش گاہ کو کسی متنازع کام کے لیے استعمال نہ کرے۔ دوسرے وہ اپنے باپ دادا کی طرح اپنے مخالفین کو مستقل قید میں رکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا تھا۔ عموماً اس کے مجرم و دشمن چند دن کی قید اور ایذا سہہ کر اپنے انجام کو پہنچ جاتے تھے... اور اس مقصد کے لیے ڈیرا حویلی سے زیادہ مناسب تھا جہاں معاملات اہلِ خانہ سے بھی مخفی رہتے ہوئے بالا ہی بالا طے پا جاتے تھے۔ بہرحال جو بھی تھا، فی الحال تو رانی اس بدنام تاریخی پس منظر رکھنے والے تہ خانے کی گھٹن زدہ فضا میں خود کو نہایت خوف زدہ اور مجبور محسوس کر رہی تھی۔ چھچی اسے لے کر ایک کمرے میں داخل ہوئی تو وہاں موجود وڈی چودھرائن کے چہرے کے تاثرات نے اس کے خوف کو اور بھی زیادہ بڑھا دیا۔ وہ قہر برساتی نظروں سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”سلام وڈی چودھرائن۔“ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں سلام کیا۔ اپنا جرم معلوم نہ ہونے کے باوجود وہ اتنا اندازہ تو لگا چکی تھی کہ کچھ نہ کچھ ایسا ہوا ہے جس نے وڈی چودھرائن کو اس کی طرف سے برگشتہ خاطر کر دیا ہے۔

”شادو، چھچی! اسے پکڑ کر رسیوں سے باندھ دو۔“ اس کے سلام کا جواب دیے بغیر وڈی چودھرائن نے اپنی چمچیوں کو حکم دیا۔ وہ دونوں فوراً ہی حرکت میں آ گئیں۔ خود ان کے ساتھ وڈی چودھرائن نے جو سلوک کیا تھا، اس کے پیشِ نظر تو اصولاً ان دونوں کی ہمدردیاں رانی کے ساتھ ہونی چاہیے تھیں لیکن وہ اپنی لالچی اور مکار فطرت کی وجہ سے ایک بار پھر وڈی چودھرائن کے جھانسے میں آ گئی تھیں۔

وڈی چودھرائن نے ان سے کہا تھا کہ میں جانتی ہوں تم دونوں میری وفادار ہو اور کشور والے معاملے میں بھی مجھ سے وفاداری نبھاتے ہوئے رازداری برتو گی لیکن میں تمہیں قید کرنے پر مجبور تھی کیونکہ یہ چودھری صاحب کا حکم تھا۔ اب ایسا ہے کہ تم دونوں کی جان اسی طرح چھوٹ سکتی ہے کہ کسی طرح کشور ہمارے پاس واپس آ جائے۔ اسے واپس لانے کے لیے ہم جو کوششیں کر رہے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کشور کی ملازمۂ خاص رانی سے کسی طرح اس شخص کا نام پتا اگلوایا جائے جس کی خاطر کشور نے ایسی حرکت کی ہے۔ میں رانی کو یہاں بلوا کر پوچھ گچھ کروں گی۔ ظاہر ہے، وہ آسانی سے تو بتائے گی نہیں اس لیے ہو سکتا ہے کہ اسے مار پیٹ کر سچ اگلوانے کی کوشش کرنی پڑے۔ میں خود تو یہ کام نہیں کر سکتی اس لیے تم دونوں کو میری مدد کرنی ہوگی۔ اگر تم رانی سے سچ اگلوانے میں کامیاب ہو گئیں تو میں چودھری صاحب سے تمہاری سفارش کر کے تمہیں یہاں سے باہر نکلوا دوں گی۔

آزادی کے لالچ میں دونوں بہنوں نے اس کی یہ پیشکش قبول کر لی تھی اور یہ بھول گئی تھیں کہ حکمرانوں کے وعدے بھی انہی کی طرح جھوٹے ہوتے ہیں۔ اس وقت چودھرائن نے جو پیشکش کی تھی، وہ اپنی غرض سے تھی۔ رانی سے سچ اگلوانے کا کام وہ تنہا خود نہیں کر سکتی تھی اور کسی اور ملازم کو اس کام کے لیے استعمال کرنا بات کو پھیلانے کا سبب بنتا چنانچہ جو پہلے ہی سے باعلم تھے، انہی کو استعمال کرنا بہتر تھا۔

”چھوڑو... مجھے کیوں باندھ رہی ہو؟“ دونوں بہنیں اسے بازو سے پکڑ کر رسّی تک لے گئیں تو وہ احتجاجاً چلائی مگر انہوں نے اس کی مزاحمت کے باوجود اسے دو مخالف دیواروں میں لوہے کے کنڈے کی مدد سے دیوار سے لگی ہوئی رسیّوں تک پہنچا کر دم لیا۔ پہلے اس کے دائیں ہاتھ کو رسّی کی مدد سے باندھا گیا اور پھر بائیں ہاتھ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ اب وہ فرش پر اس طرح کھڑی تھی کہ اس کے دونوں ہاتھ دائیں بائیں بندھی رسیّوں سے لٹکے ہوئے تھے۔

”میرا قصور کیا ہے وڈی چودھرائن! میں نے ایسی کون سی غلطی کر دی ہے کہ آپ مجھے ایسی سزا دے رہی ہیں؟“ خود کو باندھے جانے کے بعد اس نے مزاحمت ترک کر کے وڈی چودھرائن سے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

”زیادہ معصوم نہ بن۔ مجھ سے اپنا قصور پوچھتی ہے نمک حرام! تو ہی تو ہے جس کے سہارے وہ کشور کی بچی اتنا بڑا کام کر گئی ہے۔ اب تو ہمیں بتائے گی کہ وہ حویلی سے بھاگ کر اپنے کس یار کے پاس گئی ہے؟“ وڈی چودھرائن نے قہرآلود لہجے میں پوچھا۔

”کشور بی بی حویلی سے چلی گئیں؟“ رانی حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں بولی۔

”ہاں... اور اب تُو ہمیں بتائے گی کہ وہ بھاگ کر کہاں گئی ہے؟“ چودھرائن نے اس کا انداز بھانپ لیا اور دوٹوک لہجے میں بولی۔

”میں یہ کیسے بتا سکتی ہوں جی! میں تو حویلی میں تھی ہی نہیں۔ مجھے بھلا کیا خبر کے وہ کہاں گئی ہیں؟“ رانی نے تجاہل برتتے ہوئے اپنی قطعی لاعلمی کا مظاہرہ کیا۔

”شادو...“ اس کا جواب سن کر وڈی چودھرائن بلند آواز سے چیخی۔ نتیجتاً رانی کے بائیں جانب ہاتھ میں چمڑے کا بیلٹ لے کر کھڑی ہوئی شادو کا ہاتھ حرکت میں آیا۔ بیلٹ کا بکل لوہے کا تھا اور شادو نے اسے اس انداز سے پکڑا ہوا تھا کہ بیلٹ حرکت کرتا ہوا اس کی پیٹھ کی طرف بڑھا تو اس کا بکل والا سرا آزاد تھا جو ٹھک سے آ کر اس کی پیٹھ پر لگا۔ کھا کھا کر جسم میں چربی جمع کر لینے والی شادو کے اس وار میں بڑی طاقت تھی۔ رانی اچھی خاصی سخت جان ہونے کے باوجود بلبلا کر رہ گئی۔

”اب بھی وقت ہے، مجھے سب کچھ بتا دے ورنہ میں تیری کھال اُدھڑوا کر رکھ دوں گی۔“ اسے بلبلاتے دیکھ کر وڈی چودھرائن نے اسے خبردار کیا۔

”مجھے کچھ نہیں معلوم۔“ چودھرائن کی دھمکی کے باوجود رانی اپنے بیان سے پیچھے نہیں ہٹی۔ وہ ہمیشہ کشور سے وفاداری کا دم بھرتی رہی تھی اور آج وہ وقت آ گیا تھا کہ وہ اپنی وفاداری کو ثابت کر دکھاتی۔ چنانچہ نتائج کی پروا کیے بغیر اپنی لاعلمی کے دعوے پر قائم رہی۔

”ٹھیک ہے پھر۔ تیری چمڑی کو مار ہی چاہیے تو اب میں اِن دونوں کو نہیں روکوں گی۔ جب تیرا مار کھا کھا کر دل بھر جائے تو آپ مجھے بتا دینا۔“ چودھرائن سفاکی سے کہتے ہوئے کرسی کی پشت سے اطمینان کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور منکر نکیر کی طرح رانی کے دائیں بائیں کھڑی چھی اور شادو کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں کمرے میں موجود واحد کرسی پر براجمان چودھرائن کے اشارے پر فوراً ہی حرکت میں آ گئیں اور ان کے ہاتھ متواتر چمڑے کی بیلٹوں سے رانی کی پشت پر ضرب لگانے لگے۔ ہر ضرب پر رانی کے حلق سے ایک دل دوز چیخ نکلتی لیکن مارنے والے ہاتھ اور تماشا دیکھنے والی آنکھیں رحم سے ناواقف تھیں۔

”مجھے چھوڑ دو۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔“ چیخوں کے درمیان رانی کا تواتر سے کہا جانے والا یہ جملہ بھی گویا کوئی سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ بالآخر پہلے اس کے الفاظ کم ہوئے اور پھر حلق سے نکلتی چیخیں بھی دم توڑ گئیں۔ وہ اس بہیمانہ تشدد سے نڈھال ہو کر بے ہوش ہو گئی تھی اور اس کا سر ایک طرف لڑھک گیا تھا۔ اگر اس کے دونوں ہاتھ دیوار کے ساتھ بندھی رسیوں میں نہ جکڑے ہوتے تو وہ فرش پر گر پڑتی لیکن اب اس کا بے ہوش وجود کسمپرسی کے عالم میں جھول رہا تھا۔ وہ بے ہوش ہوئی تو چھی اور شادو نے اپنے ہاتھ روک لیے۔ وہ خود اس مشقت کی وجہ سے ہانپ سی گئی تھیں۔

”ہوش میں لاؤ اسے۔ مکر کر رہی ہے نمک حرام۔ اسے سارے چکر کا چنگی طرح پتا ہے۔ دن رات کشور کے پاس گھسی رہتی تھی۔ اس کی رازداں تھی جب ہی تو وہ ہر وقت اس کی طرف داری کرتی تھی۔ اس کے سوا کسی اور نوکرانی کو تو اس نے کبھی اتنا سر نہیں چڑھایا۔“ رانی کو بے ہوش ہوتے دیکھ کر وڈی چودھرائن نے نفرت زدہ لہجے میں حکم جاری کیا۔ اس کے حکم پر شادو نے وہاں موجود پانی کا جگ رانی کے چہرے پر الٹ دیا۔ پانی کی ٹھنڈک سے وہ جھرجھری سی لے کر ہوش میں آ گئی۔

ہوش میں آنے کے بعد تکلیف کے شدید ترین احساس کے ساتھ اس نے جو دوسری بات محسوس کی وہ یہ تھی کہ چہرے اور گردن کو بھگونے کے بعد قمیص کو بھی تر کر کے زمین پر گرنے والے پانی کے قطروں کے علاوہ کوئی اور سیال بھی ہے جو اس کے جسم پر سے قطروں کی صورت پھسلتا ہوا نیچے گر رہا ہے۔ اس سیال کی حرکت وہ اپنی پشت پر محسوس کر رہی تھی۔ ذرا سا سر جھکا کر نیچے اپنے قدموں کی طرف دیکھا تو پانی کے ساتھ گھلتے ملتے سرخ رنگ نے اس پر حقیقت عیاں کر دی۔ لوہے کے بکل سے اُدھڑ جانے والی پیٹھ سے خون کا اخراج شروع ہو گیا تھا اور یہ خون قطرہ قطرہ کر کے نیچے گر رہا تھا۔

”کچھ یاد آیا تجھے... یا یاد کروانے کے لیے کچھ اور انتظام کروں؟ میرے پاس ابھی تجھ سے سچ اگلوانے کے لیے بہت طریقے ہیں۔“ چودھرائن نے اس کی کھلی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے طنز سے پوچھا۔

”میں کچھ نہیں جانتی جی! میں تو یہاں تھی ہی نہیں۔“ رانی نے نقاہت زدہ لہجے میں اپنا پچھلا بیان دہرایا۔

”اچھا چل، مان لیا کہ تو یہاں نہیں تھی اس لیے تجھے کچھ خبر نہیں کہ تیری بی بی کس کے ساتھ اور کس طرح بھاگی، پر جب تو یہاں تھی، تب کی گل تو بتا سکتی ہے۔ مجھے بتا کہ وہ کس سے چھپ چھپ کر فون پر گل کرتی تھی۔ اس کے پاس جو موبائل تھا وہ اسے کس نے دیا تھا؟“ چودھرائن نے طراری کے ساتھ اس سے سوال کیا۔

”مجھے نہیں خبر۔ میں نے ان کے پاس کوئی موبائل نہیں دیکھا۔“ اس نے چودھرائن سے نظریں چراتے ہوئے اس کے سوال کا جواب دیا۔

”تو بہت ڈھیٹ چیز ہے۔ تیری اس ڈھٹائی کا علاج کرنا ہی پڑے گا۔“ چودھرائن اس کا جواب سن کر چراغ پا ہو گئی اور اپنی چمچیوں کو ہاتھ سے کوئی اشارہ کیا۔ اس اشارے کو پا کر چھی نے ایک جانب رکھی پلاسٹک کی برنی اٹھائی اور اس میں موجود نمک اور سرخ مرچوں کا مکسچر مٹھی میں بھر کر رانی کی زخمی پیٹھ پر مل ڈالا۔ پہلے ہی ٹیسیں دیتے زخم، نمک اور مرچ لگتے ہی جل اٹھے۔ رانی کو بالکل ایسا لگا کہ اس کی پیٹھ پر کسی نے آگ بھڑکا دی ہو۔ وہ تکلیف کی شدت سے ذبح کیے جانے والے بکرے کی طرح چیخنے لگی۔ یہ تکلیف اتنی شدید تھی کہ ایک دفعہ تو اسے وفاداری کا سبق بھی بھولنے لگا اور دل میں خیال آیا کہ وڈی چودھرائن کو سب کچھ بتا کر اس عذاب سے نجات حاصل کرلے لیکن یہ خیال بس لمحاتی ہی تھا۔ شدید تکلیف کے عالم میں بھی عقل نے اس کا دامن تھام لیا اور وہ سچ اگلتے اگلتے اپنے لبوں کو بھینچ گئی۔

یک دم ہی اسے خیال آ گیا تھا کہ سچ بولنے کے بعد بھی اس کی جاں بخشی ہونا ممکن نہیں۔ کشور کے جرم میں اس کا ساتھ دینے اور اس کے راز کو راز رکھنے کا قصور اتنا بڑا تھا کہ وہ سب بتا کر بھی سزا سے نہیں بچ سکے گی۔ حویلی والوں کی یہ ریت رہی تھی کہ وہ اپنی کسی بہو، بیٹی کے قدم لڑکھڑانے پر اس سے بعد میں حساب لیتے تھے، اس کے مددگاروں کو پہلے ٹھکانے لگاتے تھے۔ یعنی یہ طے تھا کہ وہ زبان بند رکھے یا کھول دے، خود کسی صورت نہیں بچ سکتی تھی... تو پھر بہتر تھا کہ اپنی وفاداری پر آنچ نہ آنے دیتی اور کشور کو جس سے وہ حقیقتاً خود بھی بہت محبت کرتی تھی، ایک بار اسے اس کی مرضی کی زندگی جینے کا موقع فراہم کر دیتی۔ ذہن و دل میں بہ یک وقت ابھرنے والے یہ خیالات و جذبات ایسے تھے کہ پیٹھ پر بھڑکتے شعلوں کی آنچ کم ہونے لگی اور اس کے حلق سے نکلتی چیخیں دم توڑ گئیں۔ درحقیقت وہ ایک بار پھر ہوش و خرد سے بیگانہ ہو کر بازوؤں میں بندھی رسّی سے جھول گئی تھی۔

”اسے ایسے ہی بندھا رہنے دو۔ دوبارہ ہوش آئے تو کھانا پانی دینے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ ہوش میں آنے کے بعد ایک بار پھر اس کے زخموں میں نمک بھر دینا اور ناک میں مرچوں کی دھونی دینا۔ یا تو یہ اپنی زبان سے سچ نکالے گی یا پھر اس کے جسم سے روح نکلے گی۔“ رانی کی مستقل مزاجی نے وڈی چودھرائن کو وقتی طور پر تو ہار ماننے پر مجبور کر دیا تھا لیکن وہ اسے چھوڑنے یا اس کی بات پر یقین کرنے کے لیے قطعی تیار نہیں تھی۔ چنانچہ رعونت سے حکم جاری کرنے کے بعد اپنے بھاری بھرکم جثے کو سنبھالتی ہوئی وہاں سے روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

”باجوہ والے معاملے کی تحقیق کروائی تم نے عبدالمنان! کچھ معلوم ہوا کہ تارڑ کے بیان میں کتنی سچائی ہے؟“ طبیعت ذرا بہتر پا کر شہریار نے اسپتال سے چھٹی لے لی تھی اور اپنی ڈیوٹی پر واپس آ گیا تھا۔ اسپتال میں داخل رہنے کے دوران بھی وہ اپنے ضلع کے معاملات سے یکسر بے خبر نہیں رہا تھا اور فون پر عبدالمنان کو ہدایات جاری کرتا رہتا تھا۔ باجوہ والا معاملہ بھی اس نے فون پر اسے بتا دیا تھا۔ تارڑ اسپتال میں اس سے ملاقات کے لیے آیا تھا تو اس نے دبے لفظوں میں یہ شک بھی ظاہر کر دیا تھا کہ اس قتل کے پیچھے چودھری کا ہاتھ ہو سکتا ہے کیونکہ اب باجوہ قانون کی نظروں میں آنے کے بعد اس کے لیے زیادہ مفید نہیں رہا تھا۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ وہ نیا فاریسٹ آفیسر اپنی مرضی کا لے آئے گا لیکن اتفاق سے ڈاکٹر ماریا کی سفارش پر شہریار کو عابد انصاری جیسا بندہ مل گیا۔ شہریار اس سے ملاقات کر کے کافی مطمئن ہوا تھا اور اسے لگا تھا کہ یہ شخص اس کی خواہش کے مطابق بہت اچھے طریقے سے کام کرے گا۔ بہرحال، عابد انصاری کی کارکردگی تو ابھی سامنے آنی تھی لیکن اس سے پہلے وہ باجوہ والے معاملے کو پرکھنا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لیے اس نے عبدالمنان کی ڈیوٹی لگا دی تھی جس کے بارے میں اسے علم تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح یہ کام سرانجام دے ڈالے گا۔

”یس سر! میں نے ساری معلومات حاصل کر لی ہیں۔ باجوہ کا آبائی گاؤں الگ ضلع میں ہونے کی وجہ سے معلومات حاصل کرنے میں کچھ وقت تو لگا لیکن تارڑ کے بیان کی تصدیق ہو گئی ہے۔ میرے اعتماد کے ایک آدمی نے گورکن سے مل کر یہ تصدیق کر لی ہے کہ باجوہ کی قبر کھود کر وہاں سے اس کی ڈیڈ باڈی نکالی گئی ہے اور ڈیڈ باڈی نکالنے والے سرکاری اہلکار تھے۔ وہ شخص باجوہ کی خالی قبر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہے۔ اس کے علاوہ ہم نے اس پولیس سرجن کو بھی اپروچ کر لیا ہے جس نے باجوہ کا پوسٹ مارٹم کیا تھا۔ وہاں سے بھی یہ تصدیق ہو گئی ہے کہ تارڑ کی آپ کو دی ہوئی انفارمیشن درست ہے۔ باجوہ کی موت واقعی ہارٹ فیل سے نہیں بلکہ زہرخورانی کی وجہ سے ہوئی ہے۔“ حسبِ توقع عبدالمنان کے پاس مکمل رپورٹ موجود تھی۔

”جب اتنی باتیں درست ہیں تو تارڑ کا یہ شک بھی درست ہو سکتا ہے کہ باجوہ کی موت کے پیچھے چودھری کا ہاتھ

ہے لیکن مسئلہ وہی ہے کہ ہمارے پاس ایسا کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں جس کی بنیاد پر ہم چودھری پر ہاتھ ڈال سکیں۔ خود تارڑ بھی اس سے خوف زدہ نظر آرہا ہے اور ملک سے باہر نکلنے کے چکر میں ہے بلکہ سمجھو کچھ دن میں روانہ ہی ہو جائے گا۔''

''آپ کا خیال درست ہے سر... لیکن سر دست ہم اس مسئلے پر کچھ نہیں کر سکتے اور بہت سے معاملات کی طرح ہمیں اس معاملے کو بھی فی الحال نظر انداز ہی کرنا ہوگا۔'' عبدالمنان نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا۔

''ایسا ہے تو ایسا ہی سہی لیکن تم دیکھنا کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب چودھری کو اپنے اعمال کا حساب اسی دنیا میں دینا پڑے گا۔ اس کی گردن کب گرفت میں آتی ہے، یہ ابھی مجھے بھی نہیں معلوم لیکن وہ پکڑا ضرور جائے گا۔''

''ضرور سر! انشاء اللہ۔'' عبدالمنان نے صدقِ دل سے کہا پھر موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے کہا تھا کہ آپ کے مختلف دیہاتوں میں دورے کا شیڈول تیار کردوں، وہ میں نے کردیا ہے۔ آج آپ کو لنچ ٹائم کے بعد وزٹ کے لیے نور پور جانا ہوگا۔''

''اوکے! یہ تم نے اچھا کیا کہ سب سے پہلے نور پور کا وزٹ رکھ لیا۔ میں کافی دنوں سے چودھری بختیار سے ملنا چاہ رہا ہوں لیکن موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ اب جاؤں گا تو مل لوں گا۔'' عبدالمنان کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے شہریار نے ایک بار پھر اپنے دل میں اس شخص کی صلاحیتوں کو بہت گہرائی سے محسوس کیا۔ اپنے آفیسر کا اس حد تک مزاج آشنا پائے نکل جانا بڑے شکر اور خوشی کا مقام تھا۔

''ایک کام اور کرو عبدالمنان! میری ایس پی تارڑ سے بات کروادو۔ اس شخص میں بہتری کے آثار نظر آرہے ہیں تو کیوں نہ موقع کا فائدہ اٹھا لیا جائے۔'' عبدالمنان نے فوراً ہی اس کے حکم کی تعمیل کی اور تارڑ کا نمبر ملا کے اس کے لائن پر آنے کے بعد ریسیور شہریار کو تھما دیا۔

''خیریت سر! آج صبح صبح ہماری یاد کیسے آگئی آپ کو؟'' شہریار کی ہیلو کے جواب میں تارڑ نے خوش گوار لہجے میں اس سے سوال کیا۔

''میں نے سوچا کہ اب تو آپ رخصت ہونے والے ہیں، آپ سے معلوم کرلوں کہ کوئی کام وغیرہ میرے لائق ہو تو بتا دیں۔'' شہریار نے بھی جوابی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

''کام تو کوئی نہیں، ہاں ایک خواہش ہے کہ اگر میرے جانے سے پہلے آپ میرے ساتھ کسی روز ڈنر کرلیں تو بہت اچھا رہے گا۔'' تارڑ نے پیشکش کی۔

''چلیں ٹھیک ہے، ایسا کر لیتے ہیں لیکن ڈنر میری طرف سے ہوگا۔ آپ نے پہلے ذکر چھیڑ دیا ورنہ اصولی طور پر مجھے آپ کو اس الوداعی ڈنر کی دعوت دینی تھی۔ آپ ایسا کریں کہ اس سنڈے کو میرے بنگلے پر تشریف لے آئیں، ساتھ بیٹھ کر ڈنر بھی کرلیں گے اور کچھ گپ شپ بھی رہے گی۔'' اس نے جوابی پیشکش کی جس سے انکار ظاہر ہے تارڑ کے لیے ممکن نہیں تھا۔

''مجھے آپ سے ایک کام اور تھا تارڑ صاحب! امید ہے کہ آپ میرے ساتھ تعاون کریں گے۔'' رسمی گفتگو کا سلسلہ ختم ہوا تو اس نے اصل مطلب پر آتے ہوئے تارڑ سے کہا۔

''حکم فرمائیے سر! اگر میرے اختیار میں ہوا تو میں ضرور آپ سے تعاون کروں گا۔''

''نور پور بم بلاسٹ میں خودکش حملہ آور لڑکے کے والدین اور بڑے بھائی کو آپ نے گرفتار کرلیا تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ گرفتار تو وہ میرے کہنے پر کیے گئے تھے لیکن بعد میں آپ نے انہیں اپنی کسٹڈی میں لے لیا تھا۔ ان لوگوں کا بعد میں کچھ پتا نہیں چلا حالانکہ میں ہنڈرڈ پرسنٹ شیور ہوں کہ ان بے چاروں کا اس بم بلاسٹ سے کوئی تعلق نہیں تھا اور وہ بالکل بے قصور تھے۔ آپ کی مہربانی ہوگی اگر آپ مجھے ان لوگوں کے بارے میں انفارم کردیں۔'' اس کی اس درخواست کے جواب میں تارڑ پل بھر کے لیے خاموش ہوگیا اور پھر بولا تو اس کے لہجے میں ندامت تھی۔

''آئی ایم سوری اے سی صاحب! اس فیملی کا تو اب مجھے بھی کچھ اتا پتا معلوم نہیں ہے۔ انکوائری بلاسٹ کی انویسٹی گیشن شروع کرتے ہی ایجنسیز والوں نے ان لوگوں کو اپنی کسٹڈی میں لے لیا تھا، چنانچہ بعد میں میرا بھی ان لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔'' تارڑ کا جواب اس کے لیے خاصا مایوس کن تھا۔ وہ افسر شاہی کا ایک پرزہ تھا اور بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ ایجنسیز کے ہاتھ لگ جانے والوں کے بارے میں کچھ بھی معلوم کرنا آسان نہیں ہوتا۔

''اوکے تارڑ صاحب! آپ نے جتنا بتا دیا، یہ بھی کافی ہے۔ اب مجھے اجازت دیں۔ مجھے کچھ اور بھی ضروری امور نمٹانے ہیں۔'' ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے رابطہ منقطع کردیا اور پل بھر کے توقف کے بعد اپنا موبائل نکال کر مشابرم خان کا نمبر ملانے لگا۔ عبدالمنان کو وہ تارڑ سے گفتگو کے دوران ہی اشارے سے جانے کی اجازت دے چکا تھا چنانچہ اس وقت اپنے دفتر میں بالکل تنہا تھا۔ اس تنہائی

نے اسے ماہ بانو کی یاد دلائی تھی، تب ہی اسے اس کی تلاش میں سرگرداں مشابرم خان سے رابطے کا خیال آیا تھا۔ اس کے نمبر ملانے پر بہت دیر تک بیل جاتی رہی لیکن دوسری طرف سے کال ریسیو نہیں کی گئی۔ اللہ جانے مشابرم خان کہاں مصروف تھا کہ اسے اس کی کال ریسیو کرنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ اس کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد اس نے بلتستان میں موجود اپنے ہم منصب سے رابطہ کیا۔

''ماہ بانو نامی لڑکی کے اغوا کے کیس میں کچھ پیش رفت ہوئی جناب یا نہیں؟'' رسمی سلام دعا اور حال احوال کے بعد اس نے وہ سوال کیا جس مقصد کے تحت کال کی تھی۔

''سوری مسٹر شہریار! میں بہت شرمندہ ہوں کہ ابھی تک ہم لڑکی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کر سکے ہیں۔ یہ کیس بہت پیچیدہ صورت اختیار کرگیا ہے۔ پہلے ٹورسٹ کمپنی کا وہ ڈرائیور حادثاتی موت کا شکار ہوا جس کی جیپ چھین کر اسے ماہ بانو کے اغوا کے لیے استعمال کیا گیا تھا اور اب ٹورسٹ کمپنی کا مالک صغیر بیگ غائب ہے۔ صغیر بیگ کی گاڑی ایک جگہ خالی کھڑی پائی گئی ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسے کسی نے اغوا کرلیا ہے لیکن کڈنیپر کون ہے، اس کے بارے میں ابھی تک کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکا۔'' دوسری طرف سے ذرا شرمندہ سے لہجے میں جواب دیا گیا۔

''یہ تو واقعی بہت پیچیدہ صورتِ حال ہے۔ بہرحال، آپ خیال رکھیے گا اور جیسے ہی کوئی نئی بات معلوم ہو، پلیز مجھے انفارم کردیجیے گا۔'' وہ جانتا تھا کہ ان لوگوں کا اپنا طریقہ تفتیش ہے جو ان کی سیدھی سادی زندگیوں کے باعث اتنا زیادہ تیز رفتار نہیں۔ ویسے بھی پولیس کی کارکردگی تو لاہور اور کراچی جیسے بڑے شہروں میں بھی اتنی واجبی تھی کہ اتنے دشوار گزار علاقے میں ان سے کوئی اچھی امید رکھنا عبث تھا۔

اس کال سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ایک بار پھر مشابرم خان کا نمبر ٹرائی کیا۔ اس بار بھی بیل جاتی رہی لیکن کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ بالآخر وہ مایوس ہو کر سلسلہ منقطع ہی کرنے لگا تھا کہ کسی نے کال ریسیو کرلی۔ کال ریسیو کرنے والے کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی سترہ اٹھارہ سال کا کم عمر لڑکا ہے۔

''کون بات کر رہا ہے؟ یہ مشابرم خان کا فون ہے نا تو وہ خود کہاں ہے؟'' اس نے تیز لہجے میں لڑکے سے سوال کیا۔

''ہم نہیں جانتا صاحب کہ مشابرم خان کون ہے۔ یہ فون ہمیں راستے میں پڑا ہوا ملا تھا تو ہم نے اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا۔'' لڑکے نے گھبرائے ہوئے لہجے میں جواب دیا تو وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا اور قدرے نرمی سے پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''ہم سمندر خان ہے۔ یہاں ایک موٹیل میں ویٹر کا کام کرتا ہے۔'' لڑکے نے فخریہ لہجے میں جواب دیا۔

''سنو سمندر خان! یہ موبائل جس شخص کا ہے، مجھے اس سے بات کرنی ہے۔ تم ایسا کرو کہ ہوٹلوں میں گھوم پھر کر معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ مشابرم خان کہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ وہ مل جائے تو یہ فون اسے دے دینا۔ اس کے بدلے تمہیں انعام مل جائے گا۔'' بہت سمجھانے والے انداز میں اس نے لڑکے کو یہ ہدایت دی۔

''ٹھیک ہے جناب! ہمیں وقت ملا تو کوشش کرے گا۔'' لڑکے کا انداز ٹالنے والا تھا۔

''وقت کی بات مت کرو، تمہیں ہر حال میں مشابرم خان کو تلاش کرنا ہے۔ انعام میں، میں تمہیں اس سے بھی اچھا موبائل دلوا دوں گا۔'' یہ محسوس کرکے کہ لڑکا موبائل کے لالچ میں مشابرم خان کو ڈھونڈنے میں آنا کانی کر رہا ہے، اس نے اسے لالچ دیا۔

''سچ کہہ رہے ہو صاحب؟'' اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''سو فیصد سچ کہہ رہا ہوں۔ بس تم میرا کام کردو... اور ہاں، اس موبائل کو آف مت کرنا۔ میں اسی نمبر پر تم سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد رابطہ کرتا رہوں گا۔'' اس نے لڑکے کو پابند کرنے کے لیے کہا۔ دراصل وہ مشابرم خان کی طرف سے تشویش میں مبتلا ہوگیا تھا۔ اس کا موبائل کسی جگہ پڑا ملنا کوئی اچھی علامت نہیں تھا۔ یہاں بیٹھ کر وہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ موبائل مشابرم خان سے بے خیالی میں گر گیا تھا یا وہ کسی غیر معمولی صورتِ حال سے دوچار ہوا تھا اور کسی سے لڑائی جھگڑے میں اس کا موبائل گرنے کی نوبت آگئی تھی۔

''سنو سمندر خان! ایک کام کرو۔ ہوٹلوں میں معلوم کرنے سے پہلے سب سے پہلے دوخانے (اسپتال) جاؤ۔ وہاں مشابرم خان کی ماں داخل ہے۔ تم وہاں جاؤ گے تو مشابرم خان مل جائے گا یا پھر اس کے بارے میں کوئی خبر ہی مل جائے گی۔'' وہ فون بند ہی کرنے لگا تھا کہ مشابرم خان کی تلاش کا ایک نسبتاً آسان راستہ دکھائی دیا چنانچہ سمندر خان کو ہدایت دی۔

''ٹھیک ہے صاحب! ہم ایسا ہی کرے گا۔'' سمندر خان نے جواب دے کر فون بند کردیا تو وہ بھی اپنا سر جھٹک کر دوسرے کاموں کی طرف متوجہ ہوگیا لیکن یہ توجہ خالصتاً پیشہ

ورانہ نوعیت کی تھی۔ اس مصروفیت کے دوران بھی دل اس پریشانی میں مبتلا تھا کہ جانے ماہ بانو کہاں اور کس حال میں ہو گی؟ اپنی بے پناہ مصروفیات اور مسائل کے باوجود وہ زندگی میں آنے والی اس بہ ظاہر عام سی لڑکی کو فراموش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ ہر پریشانی، ہر مصروفیت اور ہر کام کے دوران اس کا خیال ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ اس طرح پل پل خیال میں رہنے والی ہستی درحقیقت زندگی میں سب سے اہم مقام کی حامل ہوتی ہے۔ اے سی شہریار عادل کو ابھی اس حقیقت کا ادراک نہیں ہوا تھا۔ ابھی وہ محبت میں اس مقام تک نہیں پہنچا تھا جہاں کام عشق کے آڑے آنا چھوڑ دیتا ہے اور بندہ صرف محبوب کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ جو بھی تھا، فی الحال تو وہ اپنے فرائضِ منصبی کو ہی ترجیح دیتا تھا چنانچہ خیال کے پردے پر بار بار ابھرنے والی ماہ بانو کی شبیہہ سے نظریں چرا کر لنچ ٹائم تک اپنے معمول کے کام نمٹاتا رہا۔ لنچ کے فوراً بعد وہ اور عبدالمنان نور پور کے لیے روانہ ہو گئے۔ نور پور تک کا راستہ کافی طویل ہونے کی وجہ سے یہی امید تھی کہ انہیں واپسی میں مغرب تک کا وقت تو ضرور ہی ہو جائے گا۔

"نور پور میں کنسٹرکشن کی کیا صورتِ حال ہے؟" دورانِ سفر اس نے عبدالمنان سے پوچھا۔

"کام تو حتی الامکان تیزی سے ہی ہو رہا ہے۔ اسکول اور مرکزِ صحت دونوں کی عمارتیں تیاری کے تقریباً آخری مراحل میں ہیں۔ ہم نے اسٹاف کے اپائنٹمنٹ کی کارروائی بھی شروع کر دی ہے لیکن نور پور کا اہم مسئلہ یعنی بجلی کی فراہمی... ابھی تک اس سلسلے میں کچھ نہیں ہو سکا ہے۔ چیمہ صاحب نے اس سلسلے میں جو وعدہ کیا تھا، وہ ابھی تک بس وعدہ ہی ہے۔ میری چودھری بختیار سے جو آخری ملاقات ہوئی تھی اس میں اس نے اس معاملے کی طرف توجہ دلوائی تھی۔ اصل میں اس نے گاؤں میں چھوٹی صنعتوں کے آغاز کا جو منصوبہ بنا رکھا ہے، اس پر عمل درآمد کے لیے بجلی کی عدم موجودگی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔" عبدالمنان نے تفصیل سے اس کے سوال کا جواب دیا۔

"واقعی یہ تو بہت اہم مسئلہ ہے۔ میں بھی پچھلے سارے عرصے میں اتنی بری طرح الجھا رہا کہ اس معاملے کو بھول ہی گیا۔ تم ذرا چیمہ صاحب کا نمبر ملاؤ۔ ابھی اسی وقت انہیں یاد دہانی کروا دیتے ہیں۔" اپنی کوتاہی پر دلی افسوس محسوس کرتے ہوئے اس نے عبدالمنان کو حکم دیا جس پر اس نے فوراً ہی عمل درآمد کیا۔

"میں اے سی شہریار عادل صاحب کا پی اے عبدالمنان بات کر رہا ہوں۔ اے سی صاحب مسٹر چیمہ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ کیا اس وقت یہ ممکن ہو سکے گا؟" رابطہ ہونے پر اس نے مہذب لہجے میں دوسری طرف سے کال ریسیو کرنے والے چیمہ کے پی اے سے پوچھا۔

"آئی ایم سوری مسٹر عبدالمنان! فی الحال چیمہ صاحب ایک اہم میٹنگ میں ہیں اس لیے ان سے بات کروانا ممکن نہیں۔ جیسے ہی وہ میٹنگ سے فارغ ہوتے ہیں، میں انہیں میسج دے دیتا ہوں۔" دوسری طرف سے بھی اسی پیشہ ورانہ تہذیب کا مظاہرہ کیا گیا۔ ویسے چیمہ کا پی اے چونکہ شہریار اور چیمہ کی ملاقات کے دوران موجود رہا تھا، اس لیے وہ اس سے اور اس کے خاندانی پس منظر سے اچھی طرح واقف تھا... ورنہ ممکن تھا کہ ایک وفاقی وزیر کا پی اے، ایک چھوٹے ضلع کے اے سی کے پی اے سے اتنی رواداری کا مظاہرہ نہ کرتا۔

"او کے! فی الحال تو بات نہیں ہو سکی لیکن تمہیں خود دوبارہ اب دھیان سے میری چیمہ صاحب سے بات کروانی ہو گی۔" عبدالمنان نے دوسری طرف سے ملنے والا جواب شہریار کے گوش گزار کیا تو اس نے اسے تاکید کی اور پھر فوراً ہی سامنے کے منظر میں الجھ گیا۔ وہ تقریباً دس بارہ افراد تھے جو ایک چارپائی اٹھائے سڑک پر آ نکلے تھے۔ چارپائی پر کوئی مختصر سا وجود دراز ہے، یہ فاصلہ ہونے کے باوجود شہریار نے دیکھ لیا تھا۔

"گاڑی روک دو۔" ہجوم تقریباً سڑک کے درمیان آ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ ڈرائیور اس سے کنی کاٹ کر آگے نکل جاتا، شہریار نے اسے حکم دیا۔ ڈرائیور نے حکم کی تعمیل کی۔ شہریار اور عبدالمنان گاڑی سے نکل آئے۔

"یہ کیا معاملہ ہے؟ تم لوگ اس طرح بیچ سڑک پر کیوں کھڑے ہو؟" عبدالمنان نے آگے بڑھ کر ان لوگوں سے سوال کیا۔

"یہ میرا بھانجا ہے صاحب! اس کی حالت بہت خراب ہے۔ اگر اسے فوراً اسپتال نہیں پہنچایا گیا تو یہ مر جائے گا۔ ہم اپنے گاؤں سے اسے منجی پر ڈال کر یہاں تک لائے ہیں کہ اگر کوئی لاری یا ٹرک سڑک سے گزرے تو اسے نورکوٹ کے اسپتال تک پہنچا سکیں۔" ایک منحنی سے شخص نے آگے بڑھ کر عبدالمنان کے سوال کا جواب دیا۔ اس دوران لوگوں نے چارپائی نیچے رکھ دی تھی اور اس پر لیٹا بارہ تیرہ سال کا لڑکا صاف نظر آ رہا تھا۔ لڑکے کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ اس کی باچھوں سے جھاگ بہہ رہا تھا اور وہ خود تقریباً غشی کے عالم میں تھا۔

"اسے گاڑی میں بٹھاؤ عبدالمنان۔ ہم واپس نورکوٹ جائیں گے۔" لڑکے کی حالت کے پیشِ نظر شہریار نے فوری فیصلہ کرتے ہوئے عبدالمنان کو حکم دیا اور خود واپس گاڑی کی اگلی نشست پر جا بیٹھا۔ اس کے حکم پر لڑکے کو چارپائی سے اٹھا کر گاڑی کی پچھلی نشست پر منتقل کیا گیا۔ اس کے ساتھ عبدالمنان اور لڑکے کا ماموں بھی موجود تھا۔

"آپ کا بہت شکریہ صاحب! یہ لڑکا میری بہن کا اکلوتا پتر ہے۔ اس کا پیو وڈی خراب طبیعت کا مالک ہے۔ اگر منڈے کو کچھ ہو گیا تو وہ میری بہن کو جان سے مار دے گا۔" ڈرائیور نے گاڑی موڑ کر واپس نورکوٹ جانے والے راستے پر ڈالی تو بچے کا ماموں شکر گزار لہجے میں بولا۔

"اس بچے کو ہوا کیا ہے؟" شہریار نے بچے کی غیر ہوتی حالت دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"رب جانے صاحب کہ کیا ہو گیا۔ چنگا بھلا ہی تھا سویرے تک۔ دوپہر میں تاپ چڑھا تو ماں ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ اس نے جانے کیسا ٹیکا لگایا کہ بچہ ہاتھوں میں آنے لگا۔ خبیث بولا کہ پریشانی کی کوئی گل نہیں۔ بچے کو گھر لے جاؤ، تھوڑی دیر بعد طبیعت سنبھل جائے گی۔ میری بہن سیدھی سادی عورت اس کی چال میں آ گئی، پر گھر جا کر تو بچے کی حالت ہی بگڑ گئی۔ اس کو جھٹکے لگنے لگے۔ بہن دوبارہ ڈاکٹر کی دکان کی طرف بھاگی کہ اسے بلا کر بچے کی حالت دکھائے لیکن وہ مردود تو وہاں پر تھا ہی نہیں۔ اردگرد والوں نے بتایا کہ وہ تو ایک تھیلے میں اپنا سامان رکھ کر اپنی ویسپا پر بھاگ نکلا۔ میں نے کہا اس مردود سے بعد میں نمٹیں گے، پہلے بچے کو تو اسپتال پہنچانے کی کوشش کریں۔ بس اللہ نے ساتھ دیا کہ سڑک پر آتے ہی آپ کی گڈی مل گئی۔ بچہ چنگا بھلا ہو کر خیر نال گھر آ جائے، باقی اس ڈاکٹر دے پتر سے تو اس کا پیو خود ہی بعد میں دو دو ہاتھ کر لے گا۔ وڈا اوکھری بندہ ہے وہ۔ جھٹ پٹ ایسا کہ گل بعد میں کرتا ہے بندے کی گدی پہلے پکڑتا ہے۔" بچے کا ماموں مسلسل بولتا ہوا انہیں معلومات فراہم کر رہا تھا۔

"اس ایریے میں ڈاکٹر کہاں سے آیا؟ ہمیں اپنے ہیلتھ یونٹس کے لیے تو ڈاکٹرز ملتے نہیں ہیں۔" شہریار نے پلٹ کر عبدالمنان سے سوال کیا۔

"ڈاکٹر واکٹر کیا سر... اس طرح کے علاقوں میں جہاں میڈیکل کی سہولیات دستیاب نہیں ہوتیں، اتائی اپنی دکانیں کھول کر بیٹھ جاتے ہیں اور خود کو ڈاکٹر کہلوانے لگتے ہیں۔ ان نان کوالیفائیڈ ڈاکٹرز کی کم علمی اور اناڑی پن کی وجہ سے اس طرح کے واقعات رونما ہونے کی اطلاع ملتی رہتی ہے... جیسا کیس اس وقت ہمارے سامنے ہے۔" عبدالمنان نے اپنے سامنے موجود بچے کی طرف اشارہ کیا جس کی حالت ہر گزرتے لمحے کے ساتھ دگرگوں ہوتی نظر آ رہی تھی۔

"یہ تو سیدھا سیدھا کرائم ہے۔ ایسے افراد کے خلاف تو سخت ایکشن لینا چاہیے۔ آخر ہم کیسے کسی کو اجازت دے سکتے ہیں کہ وہ انسانی زندگیوں کے ساتھ کھیلے۔" بچے کی حالت شہریار کو غصے میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ ذرا سا رخ موڑ کر بچے کے ماموں کی طرف متوجہ ہوا۔

"آپ اس جعلی ڈاکٹر کا حلیہ اور اس کی ویسپا کا نمبر بتا سکتے ہیں؟"

"ویسپا کا نمبر تو مجھے نہیں مالوم صاحب! بس اتنا پتا ہے کہ نیلے رنگ کی ویسپا ہے۔ رہی اس خبیث کے حلیے کی گل تو حلیہ تو اس کا ایسا ہے کہ دیکھتے ہی اس کی خباثت کا مالوم پڑ جاتا ہے۔ کالی سیاہ توے جیسی رنگت، بوٹا سا قد، خوب باہر کو نکلی ہوئی توند اور وڈی وڈی مونچھیں ہیں اس کی۔" بچے کا ماموں جو شہریار کو بطور اے سی نہیں پہچانتا تھا، اس کے بارعب لہجے اور انداز سے اس کی بااختیار حیثیت کا اندازہ لگاتے ہوئے مرعوب سے لہجے میں بتانے لگا۔

"عبدالمنان! ڈی ایس پی منظور کو فون کرو کہ ساری چیک پوسٹس پر پیغام دے دے کہ نیلے رنگ کی ویسپا پر ایسے حلیے والا کوئی شخص نظر آئے تو اسے فوراً گرفتار کر لیا جائے۔ ابھی اتنی زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔ وہ شخص ضلع سے باہر نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہو گا۔" اس نے عبدالمنان کو حکم دیا جس کی تعمیل کے لیے وہ اپنا موبائل نکال کر فوراً ہی ڈی ایس پی منظور کو کال کرنے لگا۔

"یہ کون صاحب ہیں جناب؟" وہ کال کر کے فارغ ہوا تو بچے کے منحنی سے ماموں نے سرگوشی میں اس سے پوچھا۔

"یہ ہمارے ضلع کے اے سی صاحب ہیں۔" عبدالمنان نے جواب دیا تو اس کا منہ کھل گیا۔ یقیناً کسی سرکاری افسر کا ایسا ہمدردانہ رویہ اس کے لیے حیران کن تھا۔ اسے اپنی اس حیرت کا زبان سے اظہار کا موقع نہیں ملا اور گاڑی نورکوٹ کے اسپتال کے سامنے رک گئی۔ ڈرائیور اور بچے کے ماموں مل کر بچے کو گاڑی سے اتار کر اسپتال میں منتقل کرنے لگے۔ اسپتال کے عملے کے لیے شہریار کی گاڑی جانی پہچانی تھی چنانچہ فوراً ہی ایک ذمے دار بھاگا ہوا باہر آیا۔

"اس بچے کا ٹریٹمنٹ بہت کیئرفل ہو کر کرنا ہے۔ بعد

میں مجھے اس کی حالت کے بارے میں انفارم کیجیے گا۔"

شہریار نے اسے ہدایت دی جس کے جواب میں اس نے تیزی سے اپنی گردن کو حرکت دی اور بولا۔ "آپ فکر نہ کریں سر! ہم بچے کا پورا دھیان رکھیں گے۔"

"واپس دفتر چلو۔" اسپتال کے گیٹ پر عملے کے کسی فرد نے ڈرائیور کی جگہ سنبھال لی تھی اس لیے وہ واپس آگیا تھا۔ شہریار نے یہ جملہ اسی سے کہا تھا۔ اس نے فوراً حکم پر عمل درآمد کیا اور گاڑی دفتر کی طرف چل پڑی۔ اس ایمرجنسی کیس کی وجہ سے ان کا آج نور پور جانے کا پروگرام ملتوی ہو گیا تھا لیکن شہریار مطمئن تھا۔ ایک انسانی زندگی اس کے نور پور کے دورے سے زیادہ اہم تھی۔

"اس جعلی ڈاکٹر کو گرفتار کر لیا گیا ہے سر۔" وہ لوگ ابھی دفتر واپس نہیں پہنچے تھے کہ عبدالمنان کے موبائل پر کال موصول ہوئی اور اس نے شہریار کو اطلاع دی۔

"گڈ... ویری گڈ۔ خیال رکھنا کہ یہ شخص کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب نہ ہو۔ اس کے علاوہ اس طرح کے جو دوسرے افراد مختلف علاقوں میں سرگرم ہیں، ان کے بارے میں بھی معلومات حاصل کر کے ان کے خلاف ایکشن لو۔ ہم لوگوں کی زندگیاں ان اتائیوں کے ہاتھ میں دینے کا خطرہ نہیں مول لے سکتے۔" جعلی ڈاکٹر کی گرفتاری پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس نے مزید ہدایات جاری کیں لیکن خود اسے اس بات کا بھی احساس تھا کہ عوام کو اتائیوں کے چنگل سے نکالنے کے لیے صرف ان افراد کے خلاف ایکشن لینا کافی نہیں ہوگا۔ اسے جلد از جلد لوگوں کو علاج کی ایسی سستی سہولیات فراہم کرنی ہوں گی کہ اگر کوئی اتائی کہیں بے خبری میں اپنا دھندا جمانا بھی چاہے تو از خود ناکام ہو جائے۔ طبی سہولیات کی ناقص فراہمی یا عدم دستیابی ملک بھر کا مسئلہ ہے، وہ جانتا تھا لیکن پورے ملک کے مسائل کو حل کرنا اس کے دائرۂ اختیار میں نہیں تھا۔ وہ اپنے دائرۂ عمل میں رہ کر جو اور جتنا کر سکتا تھا، اتنا کر رہا تھا اور مزید بھی کرتے رہنے کا عزم دل میں رکھتا تھا۔

☆☆☆

ان کے ہر سُو برف ہی برف تھی۔ وہ گھنٹوں چلتے تھے اور پھر بھی خود کو اسی برف زار میں پاتے تھے۔ انہیں خود بھی ادراک ہو چکا تھا کہ وہ اس برف زار میں بھٹک گئے ہیں۔ درحقیقت وہ دونوں ہی راستوں سے قطعی ناآشنا تھے۔ انہوں نے فرار کا منصوبہ بناتے وقت صرف ایک بات کو مدِنظر رکھا تھا اور وہ یہ کہ تربیت یافتہ یاک انہیں جانے پہچانے راستوں سے گزار کر خود ہی منزلِ مقصود تک پہنچا دے گا لیکن قسمت کی خرابی سے وہ پہلے ہی مرحلے پر یاک سے محروم ہو گئے تھے۔ انہیں فرار سے روکنے کی کوشش کرنے والوں نے جب ان پر فائرنگ کی تھی تو اس فائرنگ کی زد میں ان کی سواری کا ذریعہ اور راہبر یاک آگیا تھا۔ یاک کے بغیر وہ بالکل بے دست و پا ہو کر رہ گئے تھے۔ اوپر سے عمران خود بھی زخمی تھا۔ ماہ بانو مخصوص وقفے کے بعد اس کے زخم کی مرہم پٹی کر دیتی تھی۔ وہ درد کم کرنے اور بخار اتارنے کی گولیاں بھی باقاعدگی سے کھا رہا تھا لیکن اس کے باوجود اس کی حالت مسلسل دگرگوں ہوئی جا رہی تھی۔

ایسا اس گولی کی وجہ سے تھا جو ابھی تک جسم میں پیوست تھی اور زخم کو خراب کرنے کا سبب بن رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ تکلیف کی شدت سے نڈھال تھا اور ساتھ ہی اس کے چہرے کی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی سرخی اس بات کی نشان دہی کر رہی تھی کہ بخار ایک بار پھر کافی زیادہ ہو گیا ہے۔ اس کیفیت کے باوجود اس نے اپنے قدم نہیں روکے تھے اور مسلسل چل رہا تھا۔ اس کے صحت مند شانے سے وہ تھیلا بھی لٹکا ہوا تھا جس میں ان کی ضرورت کا سامان تھا۔ ایسا ہی ایک تھیلا ماہ بانو کے پاس بھی تھا۔ یاک کی موت اور عمران کے زخمی ہونے کے بعد انہوں نے اپنے ساتھ لایا ہوا سامان دو حصوں میں تقسیم کر کے الگ الگ تھیلوں میں رکھ لیا تھا۔ ماہ بانو کے حصے میں جو تھیلا آیا تھا، اس میں خوراک اور ادویات موجود تھیں جبکہ عمران کے تھیلے میں سلیپنگ بیگز، اسٹوو، پانی کی بوتلیں اور کچھ ایسی چیزیں موجود تھیں جو کسی برفانی علاقے میں سفر کے دوران معاون ثابت ہوتی ہیں۔ اسلحہ بھی زیادہ تر اس نے اپنے پاس ہی رکھا تھا اور ماہ بانو کے پاس صرف ایک ہلکی سی رائفل تھی۔ اگر وہ زخمی نہیں ہوتا تو یقیناً سارا بوجھ خود ہی اٹھانا پسند کرتا لیکن اب مجبوری تھی اس لیے ماہ بانو کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑ رہا تھا۔

وہ دونوں ہی بے حد تھک چکے تھے لیکن ایک بار پھر زندگی کی رونقوں میں شامل ہونے کی خواہش نے انہیں سفر جاری رکھنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ اس خواہش کا دامن تھامے، اس وقت وہ ایک گلیشیئر پر سے گزر رہے تھے۔ قدرے سخت برف والے اس گلیشیئر پر قدم جما کر چلنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آ رہی تھی لیکن تیز نکیلی ہوائیں خوب مزاج پوچھ رہی تھیں۔ ان ہواؤں کی ٹھنڈک میں ایسی کاٹ تھی کہ بارہا انہیں محسوس ہوتا جیسے ہوا کے ساتھ برف کی کرچیاں سی آ کر ان کے چہرے سے ٹکرا رہی ہوں۔ ان کاٹ دار ہواؤں سے بچنے کے لیے انہوں نے اپنے سروں پر پہنی مخصوص ٹوپیوں کو چہرے پر بھی کھینچ لیا تھا اور اب صرف ان کی آنکھیں ہی کھلی تھیں جن پر انہوں نے چشمے چڑھا لیے تھے... لیکن برف زاروں کی موسمی شدت کا مقابلہ کرنا اتنا آسان کہاں ہوتا ہے... یہاں موسم اتنی تیزی سے اور اچانک بدلتے ہیں کہ ہر احتیاطی تدبیر ناکام ہوتی چلی جاتی ہے۔

ان کے ساتھ بھی یہی صورتِ حال پیش آئی۔ پہلے ٹھنڈی یخ ہواؤں کا ساتھ دینے کے لیے موٹے موٹے بارش کے قطرے ٹپکنے لگے اور پھر بڑی تیزی سے ان قطروں نے منجمد ہو کر برف کی شکل اختیار کر لی۔ روئی کے گالوں کی طرح تواتر سے گرتی برف جہاں سردی کے احساس کو بڑھا رہی تھی، وہیں اس نے اردگرد کے منظر کو بھی دھندلا ڈالا تھا۔ ان کے لیے چند فٹ آگے کا راستہ دیکھنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ قدم اٹھانے پر مجبور تھے کیونکہ آس پاس کوئی ایسی پناہ گاہ بھی نہیں تھی جہاں کچھ دیر رک کر اس برف باری سے محفوظ رہا جا سکے۔

"ماہ بانو! میرا ہاتھ تھام لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس دُھند میں ہم ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔" ماہ بانو کو اپنے قریب سے عمران کی مدھم سی آواز سنائی دی تو اس نے فوراً اس کی ہدایت پر عمل درآمد کیا۔ اس ویران برف زار میں تنہا رہ جانے کا خیال ہی بہت خوفناک تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ جگہ جہاں عمران کے ساتھ ہونے کے باوجود زندگی کی بقا کے لیے جدوجہد کرنا دشوار محسوس ہو رہا ہے، تنہا رہ جانے کی صورت میں دشوار ترین ہو جائے گی۔

"پتا نہیں ہم یہاں سے نکل بھی سکیں گے یا نہیں؟" لحظہ بہ لحظہ اپنے لباس پر موٹی ہوتی برف کی تہ کو محسوس کرتے ہوئے اس نے قدرے مایوس کن لہجے میں عمران سے کہا۔

"انشاء اللہ... ہم یہاں سے ضرور نکلنے میں کامیاب ہوں گے۔ تمہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسے اللہ تمہیں پہلے ہر مصیبت سے بچاتا رہا ہے، ویسے ہی یہاں سے بھی بچا کر نکال دے گا۔" عمران نے اسے تسلی دی۔

"شاید تم ٹھیک کہہ..." ابھی اس کے الفاظ اس کے منہ میں ہی تھے کہ ایک زوردار جھٹکا لگا اور اس نے اپنے بڑھے ہوئے دائیں قدم کے نیچے سے زمین کو غائب پایا۔ اس کا بایاں قدم ابھی زمین پر ہی تھا لیکن وہ بھی اتنی مضبوطی سے نہیں جما ہوا تھا کہ وہ خود کو سنبھال پاتی۔ اضطراری طور پر اس کے حلق سے ایک زوردار چیخ نکلی پھر اس کے جسم کو ایک اور زوردار جھٹکا لگا۔ یہ عمران تھا جس نے پوری قوت سے اسے پیچھے کی طرف کھینچا تھا۔ نظر اسے بھی کچھ نہیں آیا تھا لیکن ماہ بانو کا ہاتھ گرفت میں ہونے کی وجہ سے اس نے اس کے جسم کو لگنے والا جھٹکا فوری طور پر محسوس کر لیا تھا اور فوری ردِعمل کے طور پر اسے پیچھے کی طرف کھینچ لیا تھا۔ اس خوفناک لمحے سے گزرنے کے بعد انہوں نے بہ غور جائزہ لیا تو ایک دراڑ نظر آئی۔ کسی گلیشیئر پر موجود ایسی دراڑیں نہایت قاتل ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص بے دھیانی میں دراڑ میں گر جائے تو پھر اس کا بچنا ممکن نہیں رہتا۔ نیچے موجود یخ برف جیسا پانی لمحوں میں اسے منجمد کر کے زندگی سے محروم کر دیتا ہے۔ یہ ماہ بانو کی خوش قسمتی تھی کہ دراڑ نے اسے نگلتے نگلتے یک دم ہی بخش دیا تھا اور عمران کا ہاتھ تھامنا اس کے کام آگیا تھا۔

جو حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا، اس کے خوف نے انہیں مزید قدم آگے بڑھانے کی ہمت نہیں کرنے دی اور وہ وہیں رک کر برف باری رکنے کا انتظار کرنے لگے۔ یہ انتظار زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا اور برف باری جس طرح اچانک شروع ہوئی تھی، اسی طرح اچانک رک گئی... لیکن اتنی دیر میں ان دونوں کا حشر خراب ہو چکا تھا۔ ان پر اتنی برف گر چکی تھی کہ وہ خود برف سے بنے ہوئے پتلے لگ رہے تھے۔ برف باری رکی تو انہوں نے اپنے اوپر سے برف کی تہ جھاڑی اور آگے کا سفر شروع کیا۔

جس دراڑ میں ماہ بانو گرتے گرتے بچی تھی، وہ زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ ان دونوں نے آرام سے وہ دراڑ پھلانگ لی اور آگے کا سفر شروع کیا لیکن اب وہ بہت زیادہ محتاط تھے اور ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھا رہے تھے۔ انہوں نے اپنی رائفلوں کو واکنگ اسٹک کی طرح ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ اس طرح وہ برف کی کسی پتلی تہ کے نیچے چھپی دراڑ سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ آگے کا سفر زیادہ طویل نہیں تھا۔ وہ جلد گلیشیئر کو پار کر کے ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں کچھ دیر سستایا جا سکتا تھا۔ عمران جواب تک بہت زیادہ ہمت کا مظاہرہ کرتا رہا تھا، اس مقام پر پہنچ کر بالکل ڈھے گیا اور اپنا سلیپنگ بیگ بچھا کر اس میں گھس گیا۔ اس کی حالت کے پیشِ نظر ماہ بانو نے چولھا جلایا اور جلدی سے نوڈلز سوپ کا پیکٹ نکال کر سوپ تیار کیا اور پھر چائے کا پانی چڑھایا۔

گرما گرم سوپ نے عمران کے سرد پڑتے جسم کو خاصی توانائی فراہم کی اور وہ اس لائق ہو گیا کہ اٹھ کر بیٹھ سکے۔ سوپ پینے سے خود ماہ بانو نے بھی خود کو کافی بہتر محسوس کیا تھا۔ چنانچہ چائے نکالنے سے پہلے اس نے پہلے عمران کے زخم کی نئے سرے سے مرہم پٹی کی۔ ٹھنڈک نے زخم پر برا اثر ڈالا تھا اور زخم کے اردگرد کی جگہ پر اس کا گوشت کالا پڑتا ہوا محسوس

ہو رہا تھا... لیکن ماہ بانو مجبور تھی۔ وہ زخم کی پٹی تبدیل کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ پٹی تبدیل کرنے کے بعد اس نے کپوں میں چائے نکالی۔ ساتھ ہی ڈبل روٹی کے ٹکڑے بھی تھے۔ چائے کے ساتھ ڈبل روٹی کھانے کے بعد عمران نے بخار اور درد کم کرنے والی گولیاں کھائیں اور ماہ بانو کو سامان سمیٹتے ہوئے دیکھتا رہا۔

''اب آگے چلتے ہیں۔'' وہ سامان سمیٹ چکی تو اس نے اس سے کہا۔

''تم مزید چل سکو گے؟'' ماہ بانو نے اس کی حالت کے پیشِ نظر تشویش سے پوچھا۔

''چلے بغیر گزارہ بھی تو نہیں ہے۔ یہاں بیٹھ کر اپنی موت کا انتظار کرنے سے بہتر ہے کہ آخری سانس تک جدوجہد کی جائے۔'' اتنی تکلیف اور مایوس کن صورتِ حال کے باوجود عمران کا عزم اور حوصلہ قابلِ ستائش تھا۔

''ٹھیک ہے پھر چلتے ہیں۔'' ماہ بانو نے اپنے سامان کا تھیلا کاندھے پر لٹکا لیا۔ سامان سمیٹ کر رکھنے کے دوران وہ عمران کے تھیلے کا بھی کچھ سامان اپنے تھیلے میں منتقل کر چکی تھی۔ وہ زخمی اور بیمار تھا اس لیے وہ اسے کم سے کم زحمت دینا چاہتی تھی۔ اگر ممکن ہوتا تو وہ پورا ہی سامان خود اٹھا لیتی... لیکن ظاہر ہے اس کا تعلق صنفِ نازک سے تھا اور وہ ایک حد سے زیادہ بوجھ اٹھانے کی اہل نہیں تھی۔ اگر اس کی پرورش گاؤں کے سخت ماحول میں ہوئی ہوتی تو پھر بھی اسے سخت کوشی کی عادت ہوتی لیکن بے بے اور ابا نے اسے بڑے ناز و نعم سے پالا تھا اور اس نے زندگی میں کتابوں کے بوجھ کے سوا مشکل سے ہی کوئی دوسرا بوجھ اٹھایا تھا۔ وہ تو اس میں قدرتی طور پر ماحول کے مطابق خود کو ڈھال لینے کی زبردست صلاحیت موجود تھی اس لیے وہ اپنے سخت حالات سے کسی نہ کسی طرح گزرتی جا رہی تھی۔ اس صلاحیت کے بغیر ممکن ہی نہیں تھا کہ گرم میدانوں کی رہنے والی یہ لڑکی اس برف زار میں اپنی بقا کی جنگ لڑ سکتی۔

''میرے خیال میں ہم اپنا رخ بدل کر جنوب کی طرف سفر شروع کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے اس سمت میں چلنے پر ہمیں آبادی کی طرف جانے والا کوئی راستہ دکھائی دے جائے۔'' کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد عمران نے خیال ظاہر کیا۔ اس کے پاس اتفاق کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ لوگ برف کے ان سفید اندھیروں میں مسلسل ٹامک ٹوئیاں ہی مار رہے تھے۔ ان کے پاس سفر کے لیے کوئی واضح منصوبہ تو موجود نہیں تھا کہ اختلاف کی گنجائش نکل پاتی۔ بس راستہ چلتے ایک کو اگر کوئی خیال سوجھ جاتا تو دوسرا اس پر عمل درآمد کرنے میں ہی بہتری جانتا۔

اس وقت بھی انہوں نے اپنا رخ بدل کر جنوب کی سمت سفر شروع کر دیا۔ زخمی ہونے کے باوجود عمران کی رفتار اس سے زیادہ تھی۔ وہ اپنے تھیلے کے بوجھ میں اضافہ کرنے کے بعد کچھ سست رفتار ہو گئی تھی لیکن بہرحال منظر صاف ہونے کی وجہ سے یہ درمیانی فاصلہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا اور وہ دور رہ کر بھی ایک دوسرے پر نظر رکھ سکتے تھے۔ اس وقت وہ جس مقام سے گزر رہے تھے، وہ خود تو ہموار تھا لیکن اس پر بہت سی برف پوش چوٹیاں جھکی ہوئی تھیں۔ ان چوٹیوں نے نہ جانے کب سے گرنے والی برف کا بوجھ اپنے سروں پر اٹھایا ہوا تھا اور دیکھنے کے ساتھ ہی یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ اپنا بوجھ اتار پھینکنے کی خواہش مند ہوں۔ کم از کم ماہ بانو کو ان چوٹیوں پر نظر ڈال کر یہی احساس ہوا تھا۔ اب جانے یہ قدرت کا طے شدہ فیصلہ تھا یا اس کے احساس کی شدت کہ یکایک فضا میں ایک زوردار دھماکا گونجا اور دو پہاڑوں کے درمیان سے برف کا تودہ لڑھکتا ہوا نیچے آنے لگا۔

برف کا یہ بھاری تودہ اپنے راستے میں موجود برف کو بھی دھکیلتا ہوا لا رہا تھا۔ برسوں سے پہاڑوں پر گری برف سفید سفوف کے آبشار کی شکل میں نیچے کی طرف برق رفتاری سے بہتی چلی آ رہی تھی۔ یہ ایوالانچ تھا۔ برف زاروں کا ایک خاص تحفہ جسے ایک جانب کھڑے ہو کر خوش گوار موڈ میں دیکھو تو اس سے بڑھ کر خوب صورت منظر کوئی نہ لگے... اور اگر جو کوئی اس کی زد میں آ جائے تو بچ نکلنے کی راہ نہ پائے۔ ماہ بانو نے اپنی زندگی میں پہلی بار کوئی ایوالانچ دیکھا تھا چنانچہ پل بھر کو تو وہ منہ کھولے حیرت کے عالم میں اسے تکتی ہی چلی گئی لیکن پھر یک دم اسے عمران کا خیال آیا۔ وہ اسی طرف تھا جس طرف اس ایوالانچ کا رخ تھا۔ اس نے نظروں کا رخ بدل کر عمران کی پوزیشن کا اندازہ کرنے کی کوشش کی۔ اس نے بھی ایوالانچ کی وجہ سے ابھرنے والی گونج سن لی تھی اور بالکل اسی کی طرح حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اپنی اس کیفیت میں اسے قطعی ادراک نہیں تھا کہ ایوالانچ اس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے۔

''عمران! بھاگو... ہٹ جاؤ وہاں سے۔'' ماہ بانو زور سے چیخی لیکن اس کی آواز برفانی تودے کی گڑگڑاہٹ میں دب گئی۔ پھر عمران نے خود ہی صورتِ حال کو بھانپ لیا اور اپنی جگہ سے بھاگا لیکن اس کی رفتار ایوالانچ کی رفتار کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ ایوالانچ کسی پھنکاریں مارتے سفید اژدہے کی طرح اس کی طرف لپکتا چلا جا رہا تھا۔

حادثات و سانحات کی شکلیں... پناہ کی تلاش میں سرگرداں
ماہ بانو کی داستانِ حیات کے واقعات اگلے ماہ پڑھیے

پندرھویں قسط

اسماقادری

ہمارے سماج میں قانون کتابوں
میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور بااثر
سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی
بدل کے رہ جاتے ہیں۔مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون
کے بھی کئی رخ ہیں ، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل
تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے..... یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں
تحریر ہوتی ہے..... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں
بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور
مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے ۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔محبت نہ تو
روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا
انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت
اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے ۔ زندگی کی
بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں ..... کبھی بازی
پلٹ بھی جاتی ہے ۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے ..... اس
وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ جرم ،افسر شاہی ،جاگیرداری
اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل...... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرِ نظر ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیرآباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ چودھری ظالم و جابر اور عیاش تھا۔ وہ سرکاری افسروں کی ملی بھگت سے لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ کر رہا تھا۔ شہریار نہ صرف یہ دھندے روک دیتا ہے بلکہ علاقے میں اسکول وغیرہ قائم کرنے کی کوشش شروع کر دیتا ہے۔ پیرآباد کا رہائشی ماسٹر آفتاب جو عرصے سے گاؤں کے پرائمری اسکول کی ترقی کا خواہش مند شہریار کا سہارا پا کر کھل کر اپنے مشن پر کام کرنے لگتا ہے۔ آفتاب بھی چودھری کے ناپسندیدہ افراد میں سے ایک ہے جسے اسکول چلانے کے جرم میں چودھری اپنے آدمیوں کے ذریعے زدوکوب کرتا ہے لیکن آفتاب ہتھیار نہیں ڈالتا۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب کو دیکھتی ہے تو اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس کی محبت کی شدت کو دیکھتے ہوئے آفتاب کو اسے اپنے دل میں جگہ دینی پڑتی ہے اور دونوں کے درمیان ہونے والی چوری چھپے کی ملاقاتیں خفیہ نکاح تک جا پہنچتی ہیں۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیرآباد سے ہے۔ اس کے والدین بچپن میں ہی اسے اس کے خالہ خالو کو دے دیتے ہیں جن کے ساتھ وہ فیصل آباد میں رہتی تھی لیکن والدین اور بھائی بہنوں سے ملاقات کے لیے اس کا پیرآباد آنا جانا رہتا تھا۔ چودھری افتخار پیری مریدی کے چکر میں اپنے مرحوم دادا کا عرس بڑی شان و شوکت سے مناتا ہے۔ عرس کے دنوں میں جبراً حویلی کے کاموں کے لیے بلوائی جانے والی ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آ جاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکل کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اگلی بار اس کا اپنی بہن کی شادی میں دوبارہ پیرآباد آنا ہوتا ہے۔ چودھری اسے اغوا کروا لیتا ہے لیکن ماہ بانو ایک بار پھر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چودھری افتخار ہر صورت اس سے شادی کرنا چاہتا ہے مگر ماہ بانو شادی سے قبل ہی اپنی بہن زہرہ کے تعاون سے گھر سے بھاگ نکلتی ہے اور شہریار سے جا ملتی ہے۔ شہریار اسے اپنی گاڑی میں چھپا کر پیرآباد سے نکال دیتا ہے اور دارالامان بھجوا دیتا ہے لیکن چودھری کے آدمی وہاں بھی پہنچ جاتے ہیں لیکن دارالامان کے چوکیدار کی مداخلت کی وجہ سے وہ ماہ بانو کو لے جانے میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔ شہریار ماہ بانو کو دارالامان سے چودھری کے سابق دوست موتی والا کی کوٹھی پر بھجوا دیتا ہے۔ چودھری غداری کرنے کے جرم میں موتی والا اور اس کی بیوی کو مروا دیتا ہے۔ کوٹھی کی انیکسی میں مقیم ماہ بانو موتی والا کے ڈرائیور سرمد کی مدد سے فرار ہو کر اس کے ایک دوست عامر کے گھر پہنچ جاتی ہے۔ عامر کے گھر ایک ایسی لڑکی کا آنا جانا ہوتا ہے جو درحقیقت تیسری صنف سے تعلق رکھتی ہے۔ خواجہ سراؤں کا ایک گروہ اس لڑکی کے پیچھے پڑ جاتا ہے اور لڑکی کو بچانے کے چکر میں ماہ بانو خود اس گروہ کے ہاتھ لگ جاتی ہے۔ خواجہ سراؤں کا گرو الماس بطور سزا اس سے وہی کام لیتا ہے جو اس کے گرگے کرتے ہیں۔ ایک روز الماس اسے لے کر ایک ہندو سیٹھ کی کوٹھی پہنچتا ہے۔ راستے میں ٹیکسی والے کی بدتمیزی کی وجہ سے ماہ بانو زخمی ہو جاتی ہے۔ کوٹھی میں اسے ایک حیرت انگیز منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔ کوٹھی کے تہ خانے میں کئی خواجہ سرا جمع ہوتے ہیں جن کی موجودگی میں ان کا مہا گرو ایک نوجوان لڑکی کو ایک مورتی کے قدموں میں بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ وہ گرو الماس کے ساتھ واپس ٹھکانے پر آتی ہے اور وہاں ایک نیک فطرت خواجہ سرا نگار کو اس راز میں شریک کر لیتی ہے۔ انہی دنوں گرو انہیں ایک شادی پر بھیجتا ہے۔ وہاں ماہ بانو کو پتا چلتا ہے کہ دلہن نیلم وہی ہے جسے موتی والا کا ڈرائیور سرمد پسند کرتا ہے اور لڑکی کی سوتیلی ماں اس کی زبردستی ایک بوڑھے سے شادی کروانے پر بضد تھی۔ وہ نیلم کو اپنے کپڑے پہنا کر نگار کے ساتھ وہاں سے نکال دیتی ہے۔ صبح شادی والے گھر پر چھاپا پڑتا ہے اور وہ ماہ بانو کو عزت کے ساتھ تھانے لے جایا جاتا ہے جہاں شہریار کے ماموں زاد بھائی ڈی آئی جی سجاد رانا سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ سجاد رانا کو اپنی بیٹی حنا کی تلاش ہوتی ہے جسے خواجہ سراؤں کے ایک گروہ نے اغوا کر لیا تھا۔ چنانچہ جب انہیں یہ اطلاع ملتی ہے کہ خواجہ سراؤں کے ایک گروہ میں ایک لڑکی دیکھی گئی ہے تو وہ اسے اپنی بیٹی سمجھ کر بازیافت کروانے کی کوشش کرتا ہے اور نتیجے میں ماہ بانو آزاد ہو جاتی ہے۔ ماہ بانو کو وہ اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاتا ہے جہاں شہریار بھی موجود ہوتا ہے۔ وہیں وہ حنا کی تصویر دیکھتی ہے اور شہریار کو بتاتی ہے کہ اس لڑکی کو ہندو سیٹھ کی کوٹھی میں ایک دیوی کے قدموں میں بھینٹ چڑھایا جا چکا ہے۔ ہندو سیٹھ کی کوٹھی پر چھاپا مارا جاتا ہے لیکن وہاں سے سیٹھ اور حنا کو اغوا کرنے والے خواجہ سراؤں کی لاشوں کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ سجاد رانا کو اپنی بیٹی کے قاتلوں کی تلاش تھی اور یہ تلاش اس کی را کے ایجنٹوں سے مڈبھیڑ کروا دیتی ہے جس کا حتمی نتیجہ اس کے قتل کی صورت میں نکلتا ہے۔ چودھری، ماہ بانو کی سجاد رانا کے گھر موجودگی کی بھنک پا کر اسے وہاں سے اغوا کروانے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہ کوشش ناکام ہو جاتی ہے اور شہریار اپنے ڈرائیور مشابرم خان کے مشورے پر ماہ بانو کو کاغان منتقل کر دیتا ہے۔ کاغان سے ماہ بانو مشابرم خان کے بھائی اکرم خان اور ماں کے ساتھ ہوتے ہوئے ایک شادی میں شرکت کے لیے جاتی ہے اور وہاں کی کیمپنگ سائٹ پر ایک گورے کی ہوس کا نشانہ بننے سے بچ جاتی ہے لیکن وہ ماہ بانو کو اغوا کراتا ہے اور اس کارروائی میں اکرم خان مارا جاتا ہے۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ ماہ بانو کے بارے میں ساری معلومات حاصل کر لیتا ہے اور یہ جاننے کے بعد کہ چودھری ماہ بانو کی تلاش میں ہے، ایک منصوبہ تشکیل دیتا ہے۔ پیرآباد سے متصل جنگل کو اس کے مخصوص ماحول کی وجہ سے پوست کی کاشت کے لیے استعمال کرنا اس کے منصوبوں میں سے ایک ہے جس کے لیے وہ ماہ بانو کا لالچ دے کر چودھری کو اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ چودھری کے ظلم و جبر کی ایک نشانی فریدہ ہے۔ وہ نور پور گاؤں کے چودھری مختار کی بہن ہے۔ شہریار اور چودھری کے درمیان مخاصمت اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ چودھری ڈاکٹر ماریہ نامی ایک لڑکی کے ساتھ اس کی قابل اعتراض تصویریں اتار کر اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ڈاکٹر ماریہ کے تعاون کی وجہ سے شہریار وہ تصویریں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور چودھری کی چال سے بچ نکلتا ہے۔ کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ اس کا آفتاب کے دوست افضل اور اس کی بیوی کے ذریعے فرار ممکن ہوتا ہے۔ ادھر کشور کے غائب ہونے سے حویلی میں کھلبلی مچ جاتی ہے اور کشور کے غیاب پر وہاں کی ملازمائیں زیرِ عتاب آ جاتی ہیں۔ خاص طور پر کشور کی ملازمہ خاص رانی۔ ادھر ماہ بانو اس برف زار سے فرار ہونے کی کوشش کرتی ہے اور وہاں موجود عمران نامی لڑکے کے ساتھ بھاگ نکلتی ہے مگر عمران ایک جگہ ایوالانچ کی زد میں آ جاتا ہے۔

ابھی کچھ دیر قبل وہ جس ایوالانچ کو پہاڑ سے برف کے سفید بہتے آبشار کی طرح گرتے دیکھ کر محوِ حیرت تھی، وہ اسے کسی سفید اژدہے کے مانند عمران کو نگلتے دیکھ کر خوف کی شدت سے چیخنا بھی بھول گئی۔ سفید سفید برف نے عمران کے فرار کی کوشش کو ناکام بنا کر لمحوں میں اسے آلیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا وجود اس برف کے نیچے دب گیا تھا۔ ایک انسانی جان کی بھینٹ لینے کے بعد وہ شور مچاتا برفیلا اژدہا خاموش ہوا تو یوں لگا کہ جیسے کچھ دیر قبل یہاں کچھ ہوا ہی نہ ہو لیکن یہ ماہ بانو تھی جو محسوس کر سکتی تھی کہ کیا ہو گیا ہے۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک بہت پیارا نوجوان جسے ایک حادثے نے کچھ عرصے کے لیے راہِ راست سے بھٹکا دیا تھا، وجود سے عدم ہو گیا۔ اس نوجوان کو اپنی ماہیت قلبی کے بعد جانے کون کون سے کام کرنے تھے؟ وہ اس برف زار سے نکل کر پُرحرارت زندگی کی رونقوں میں شامل ہو کر کچھ کر دکھانا چاہتا تھا لیکن یکدم ہی اس کا وجود زمین سے غائب ہو گیا۔ اس کا غائب ہونا ماہ بانو کو اس برف زار کی ویرانیوں میں بالکل تنہا کر گیا۔ وہ پیارا لڑکا جس نے اسے دیکھ کر کہا تھا کہ وہ اسے بالکل اپنی بہن جیسی لگتی ہے جو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اسے اس کے قید خانے سے نکال لایا تھا، یکدم ہی اس سے جدا ہو گیا تھا۔

”عمران کے بغیر میں تنہا اس برف زار میں کیسے سفر کروں گی؟“ پھنکاریں مارتا ہوا یہ خیال اس کے ذہن میں آیا تو وہ جو کہ صدمے سے منجمد ہو گئی تھی، سامان کا تھیلا ایک طرف پھینکا اور اس طرف بھاگی جہاں اس نے آخری بار عمران کو دیکھا تھا۔

”عمران... عمران...“ برف ہٹاتے ہوئے وہ دیوانہ وار اسے آوازیں دے رہی تھی لیکن اس کی ہر صدا مایوس ہو کر واپس پلٹ آتی تھی۔ وہ برف ہٹانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے زار و قطار رو بھی رہی تھی لیکن خود اسے اپنے آنسوؤں کے بہنے کا احساس نہیں تھا۔ اس وقت وہ صرف ایک بات سوچ رہی تھی کہ اسے کسی طرح عمران کو اس برف کے نیچے سے نکالنا ہے۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ اس کوشش میں ناکام ہیں تو وہ واپس پلٹ کر اپنے سامان کے تھیلے کی طرف گئی۔ اس تھیلے میں اسٹیل کے ایک بڑے چمچے اور ایک چھری کے سوا ایسا کچھ نہیں تھا جس سے وہ برف کی کھدائی کر سکتی۔ شاید عمران کے تھیلے میں ایسی کچھ چیزیں موجود ہوں لیکن اس کا تھیلا اس کے ساتھ ہی ایوالانچ کی نذر ہو چکا تھا۔ ماہ بانو اسٹیل کا چمچہ اور چھری لے کر واپس اس مقام پر آئی جہاں وہ کچھ دیر قبل اپنے ہاتھوں سے برف کھودنے کی کوشش کر رہی تھی۔ چمچے اور چھری کی مدد سے اس نے برف کو کھرچنے اور کھودنے کی سرتوڑ کوشش شروع کر دی۔ اس کوشش میں اس کے دونوں بازو شل ہو گئے لیکن بہت مضبوطی سے بلاک کی طرح جم جانے والی برف کی تہ کو چند انچ سے زیادہ کھودنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ بالآخر اسے احساس ہو گیا کہ وہ ایک سعیٔ لاحاصل میں مصروف ہے۔ اول تو وہ اس برف کو کھود نہیں سکے گی اور اگر ایک طویل جدوجہد کے بعد کھودنے اور ہٹانے میں کامیاب ہو بھی جاتی ہے تو اتنی دیر بعد عمران کا وہاں سے زندہ نکلنا ممکن نہیں ہوگا۔ ناکامی کے اس احساس نے اس کی ہمت توڑ دی اور وہ وہیں برف پر گر کر بے بسی سے رونے لگی۔ اس رونے میں عمران جیسے پُرخلوص نوجوان کی ناگہانی موت کا غم بھی شامل تھا اور اپنی تنہائی کا خوف بھی۔ کافی دیر تک وہ ان دونوں احساسات کے تلے برف پر چت لیٹی آنسو بہاتی رہی۔

”انشاء اللہ ہم یہاں سے ضرور نکلنے میں کامیاب ہوں گے۔ تمہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسے اللہ تمہیں پہلے ہر مصیبت سے بچاتا رہا ہے، ویسے ہی یہاں سے بھی بچا کر نکال دے گا۔“ روتے روتے اس کے ذہن میں عمران کے الفاظ گونجے۔ بہت زیادہ وقت تو نہیں گزرا تھا عمران کو اس سے یہ الفاظ کہے ہوئے۔ ابھی مشکل سے چند گھنٹے ہی تو گزرے تھے اور اس کے ان الفاظ کے ادا کرنے کے بعد اگلے ہی لمحے اللہ نے اس کے ان الفاظ کی تصدیق بھی کر دی تھی۔ ایک دراڑ اسے نگلنے کو ہی تھی جب عمران نے یکدم اسے پیچھے کی طرف کھینچ کر گرنے سے بچا لیا تھا۔ وہ نہ تو اس دراڑ میں گر کر منجمد ہوئی تھی، نہ ہی زندگی میں پہلی بار بھگتی جانے والی برف باری نے اسے کچھ کیا تھا۔ یہ بھی ایک اتفاق ہی تھا کہ وہ ایوالانچ آنے کے وقت سامان کی زیادتی کی وجہ سے عمران کے بالکل ہم قدم چلنے کے بجائے اس سے کافی پیچھے چل رہی تھی ورنہ دوسری صورت یہ بھی تو ہو سکتی تھی کہ وہ عمران کے ساتھ ہی اس منوں برف کے نیچے دفن ہو جاتی اور اس کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہتا۔ پھر کسے خبر ہوتی کہ پنجاب کے میدانوں میں رہنے والی ماہ بانو جو اپنی بقا کی جدوجہد کرتے کرتے اس برف زار میں پہنچ گئی تھی، برف تلے کہاں اور کس مقام پر خود بھی برف ہو گئی ہے۔ عمران نے یقیناً صحیح کہا تھا، اللہ ہر ہر مقام پر ہر ہر لمحے اس کی حفاظت ہی تو کر رہا تھا پھر وہ کیوں مایوسی کا شکار ہو کر کفرانِ نعمت کی مرتکب ہو رہی تھی۔

اسے تو اللہ کی ان مہربانیوں کے جواب میں شکر ادا کرنا چاہیے تھا۔

"یہاں بیٹھ کر اپنی موت کا انتظار کرنے سے بہتر ہے کہ آخری سانس تک جدوجہد کی جائے۔" یہ الفاظ بھی کچھ دیر قبل عمران نے کہے تھے۔ یہ بات کہتے ہوئے اس کی حالت کتنی خراب تھی۔ گولی کی تکلیف اور بخار کی شدت کے باوجود وہ مایوس ہونے کے لیے راضی نہیں تھا تو پھر وہ کیسے اپنے صحیح و سالم ہاتھ پیروں کے ساتھ ہمت چھوڑ سکتی تھی۔ اسے بھی سفر جاری رکھنا تھا۔ اس وقت تک کوشش کرنی تھی جب وہ یا تو اس برف زار سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی یا پھر عمران ہی کی طرح مشیت ایزدی اسے اس برف زار کا پیوند بنا دیتی۔ آنے والا وقت پردۂ غیب سے کیا سامنے لانے والا تھا، اس کا علم تو اس عالم الغیب کے علاوہ کسی کو نہیں تھا لیکن بندۂ خدا ہونے کی حیثیت سے اس پر اپنی جان کی حفاظت فرض تھی۔ اس فرض کا احساس دل میں جاگتے ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور سامان کا تھیلا شانوں پر لادتے ہوئے ایک بار پھر ایک نئے عزم سے چلنے لگی۔ لیکن اس کی آنکھیں پُرنم تھیں... اپنے اس ساتھی کے لیے جسے وہ اس برف زار میں منوں برف کے نیچے تنہا چھوڑ کر جارہی تھی۔

☆☆☆

آذر کے گھر سے نکلنے کے بعد مشاہرم خان نے اسپتال کا رخ کیا۔ رات ہو چکی تھی اور وہ صغیر بیگ کے بیان کی تصدیق کے لیے کسی سے ملنے نہیں جا سکتا تھا۔ صغیر بیگ نے نیاز علی کی کارروائیوں کی طرف سے مکمل لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے اسے بتایا تھا کہ وہ نیاز علی کو پرانا ڈرائیور ہونے کی وجہ سے خصوصی رعایت دیتا تھا اور اکثر اوقات کسی ایکسپی ڈیشن ٹیم کو واپس لینے جانے سے ایک رات قبل ہی نیاز علی جیپ اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاتا تھا۔ ان حالات میں بہت ممکن تھا کہ نیاز علی جو کچھ کرتا رہا تھا، اس سے صغیر بیگ واقف نہ ہو سکا ہو۔ بہرحال اسے صغیر بیگ کے اس بیان کی تصدیق کرنی تھی اور تصدیق کے لیے صبح کا انتظار لازمی تھا۔ چنانچہ اس نے وہ وقت ماں کے پاس اسپتال میں گزارنا مناسب سمجھا۔ وہ اسپتال پہنچا تو نائٹ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر ماں کا معمول کا چیک اپ کرنے میں مصروف تھا۔

"آپ کیا کہتے ہیں ڈاکٹر صاحب! کیسی حالت ہے ان کی؟" اس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"وہی پہلے جیسی۔ ان کے جسم کے سارے اعضا درست کام کر رہے ہیں لیکن ذہن کو لگنے والے شاک کی وجہ سے خود ان کے اپنے اندر جاگنے اور آنکھیں کھولنے کی خواہش پیدا نہیں ہو پا رہی۔ اس قسم کے مریضوں کے بارے میں کوئی بھی حتمی بات کہنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ چند دنوں میں بھی ہوش میں آسکتی ہیں اور کئی سال بھی لگ سکتے ہیں۔ بعض اوقات ایسے مریض اسی حالت میں موت سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔" ڈاکٹر نے بہت صاف گوئی کے ساتھ اس کے سوال کا جواب دیا۔ وہ خود بھی اس حقیقت سے واقف تھا لیکن بس ایک بے نام سی امید تھی جو اسے بار بار ڈاکٹروں سے سوال کرنے پر اکساتی تھی۔

"اگر میں انہیں اسلام آباد یا لاہور کے کسی اسپتال لے جاؤں تو کوئی فرق پڑ سکتا ہے؟"

"ایز یو وش لیکن میرے خیال میں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا البتہ کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔" ڈاکٹر نے شانے اچکاتے ہوئے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔ مشاہرم خان تھکے تھکے انداز میں ماں کے بستر کے قریب رکھی کرسی پر آنکھیں موند کر بیٹھ گیا۔

اس کیفیت میں بیٹھے اسے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ یونہی اس کے دل میں اپنا موبائل چیک کرنے کا خیال آیا۔ خیال آنے پر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل نکالنا چاہا لیکن موبائل موجود نہیں تھا۔ وہ بے چین سا ہو کر کھڑا ہو گیا اور اپنی ساری جیبیں ٹٹولنے لگا لیکن کسی بھی جیب سے موبائل برآمد نہ ہو سکا۔ یہ ایک پریشان کن صورت حال تھی۔ وہ ذہن پر زور دینے لگا کہ موبائل کہاں رہ سکتا ہے؟ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ صغیر بیگ کے پیچھے روانہ ہونے سے قبل اس نے اپنے موبائل سے جیپ کے لیے کال کی تھی۔ یعنی اس وقت تک موبائل اس کے پاس موجود تھا۔ اب دو ہی صورتیں ممکن تھیں یا تو موبائل اس وقت جبکہ وہ صغیر بیگ کو بے ہوش کرنے کے بعد اپنی جیپ میں منتقل کر رہا تھا، جائے وقوعہ پر ہی گر گیا تھا یا پھر آذر کے گھر پر رہ گیا تھا۔ اگر آذر کے گھر میں رہ گیا تھا تو خیر تھی لیکن جائے وقوعہ پر گر جانے کی صورت میں اسے ایک بار پھر پولیس کی تفتیش کا سامنا کرنا پڑتا۔ نیاز علی والے معاملے میں اس کی پوزیشن پہلے ہی کچھ مشکوک تھی، اب صغیر بیگ کے اغوا کیے جانے کے مقام پر اس کا موبائل پولیس کو مل جاتا تو اس کے لیے دامن بچانا مشکل ہو جاتا۔

وہ پریشان سا ہو کر اسپتال سے نکلا۔ کرائے کی جیپ اب بھی اس کے پاس موجود تھی لیکن جیپ استعمال کرنے کے بجائے اس نے پیدل جانا مناسب سمجھا۔ اگر موبائل سڑک پر کہیں گرا تھا تو اسے پیدل چل کر تلاش کرنا زیادہ بہتر ہوتا کیونکہ اس طرح اس کے نظر میں آجانے کے زیادہ امکانات ہوتے۔ کشمکش اور الجھن کا شکار وہ پیدل چلتا ہوا اس سڑک پر

پہنچ گیا جہاں سے اس نے صغیر بیگ کی جیپ رکوا کر اسے اغوا کیا تھا۔ سڑک پر قدم رکھتے ہی اسے ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔ عموماً ویران پڑا رہنے والا وہ راستہ اس وقت ویران نہیں تھا اور وہاں پولیس کے چند سپاہی نظر آرہے تھے جو اپنے ہاتھوں میں روشن ٹارچیں تھامے اردگرد کا جائزہ لے رہے تھے۔ اس جگہ بہت زیادہ لوگوں کا گزر نہ ہونے کی وجہ سے یقیناً پولیس کو دیر سے وقوعہ کی اطلاع ملی تھی اس لیے وہ لوگ اس وقت کارروائی کر رہے تھے۔ پولیس کی موجودگی میں اس کا وہاں جانا خطرناک ثابت ہوتا چنانچہ وہ الٹے پیروں پلٹ گیا اور راستہ بدل کر آذر کے گھر کا رخ کیا۔ اب وہ اس امید پر ہی تکیہ کر سکتا تھا کہ اس کا موبائل آذر کے گھر پر مل جائے تا کہ وہ پولیس کی گرفت میں آنے سے محفوظ رہ سکے۔

پریشانی کے عالم میں وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آذر کے گھر پہنچا۔ صغیر بیگ رسیوں سے بندھا اسی حالت میں پڑا تھا جس حالت میں وہ اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کی آمد کو محسوس کر کے صغیر بیگ کا جسم ذرا سا کسمسایا لیکن مضبوط بندشوں کی وجہ سے نہ تو وہ حرکت کر سکا اور نہ ہی مشاہرم خان نے اس کی آواز نکالنے کی گنجائش چھوڑی تھی۔ چنانچہ بے چارہ بے بسی سے بس کسمسا کر ہی رہ گیا۔

مشاہرم خان اسے نظر انداز کرتے ہوئے اپنا موبائل تلاش کرنے لگا۔ پہلے اس نے کمرے کی تلاشی لی پھر وہاں سے مایوس ہونے کے بعد کچن میں جا کر اٹھا پٹخ کرنے لگا۔ بہت باریک بینی سے کسی سوئی کے مانند پورے گھر میں اپنا موبائل تلاش کرنے کے بعد بھی اس کے ہاتھ ناکامی ہی آسکی۔ اپنی جیپ کی وہ اسپتال سے روانہ ہوتے وقت اچھی طرح تلاشی لے چکا تھا چنانچہ اب صرف یہی امکان رہ گیا تھا کہ اس کا موبائل جائے وقوعہ پر ہی کہیں گر گیا تھا اور وہاں پولیس پہنچ چکی تھی... اور چنانچہ اس بات کا سو فیصد امکان تھا کہ موبائل پولیس کو مل جاتا اور اس کے بعد اسے صغیر بیگ کے اغوا کے معاملے میں شامل تفتیش کر لیا جاتا۔ وہ اپنے ذہن میں اس متوقع تفتیش سے نمٹنے کی ترکیبیں سوچتا ہوا ایک بار پھر آذر کے گھر سے نکل کر اسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔

موجودہ حالات میں ضروری تھا کہ وہ آذر کے گھر سے دور کسی پبلک پلیس پر رہتا تا کہ کچھ ایسے گواہ مل جاتے جو پولیس کو یہ بتا سکتے کہ اس نے آج کے دن اور رات کا زیادہ تر حصہ اپنی ماں کے ساتھ اسپتال میں گزارا ہے۔ اسپتال پہنچ کر ماں کے بستر کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ کر اس نے سوتی جاگتی کیفیت میں رات گزاری۔ ہر لمحہ اسے ایسا لگتا تھا کہ ابھی پولیس کا کوئی اہلکار وہاں پہنچ جائے گا لیکن صبح تک ایسا کچھ نہ ہوا تو وہ خود الجھن کا شکار ہو گیا۔ بہرحال، اسپتال میں بیٹھ کر پولیس کا انتظار کرتے رہنا بھی ممکن نہیں تھا چنانچہ وہ وہاں سے نکلا اور سیدھا اس چائے خانے تک پہنچا جو صغیر بیگ کی ٹورسٹ کمپنی کے عین سامنے تھا۔ کئی دن سے مسلسل وہاں ناشتا کرتے رہنے کی وجہ سے اس کی حیثیت ایک مستقل گاہک کی سی ہو گئی تھی اور کافی لوگ اسے پہچاننے لگے تھے۔ وہ ان لوگوں میں شامل ہو گیا۔ ان کے درمیان دو موضوع زیر بحث تھے۔ ایک کل رات صغیر بیگ کا ہونے والا اغوا اور دوسرا ایک ایکسپی ڈیشن ٹیم کے ساتھ لوٹنے والے پورٹرز کی یہ اطلاع کہ انہوں نے پہاڑوں میں کہیں فائرنگ کی آوازیں سنی ہیں۔

"میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں یار! ہم لوگوں نے خود پہاڑوں پر فائرنگ کی آواز سنا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ دو گروپ آپس میں مقابلہ کر رہے ہوں۔" واپس لوٹنے والے پورٹرز میں سے ایک اس وقت بھی یہاں موجود تھا اور بڑے جوش سے بتا رہا تھا۔ وہ یقیناً آج صبح سویرے ہی واپس لوٹا تھا۔ سفر کی تھکن اس کے جسم سے ٹپکی پڑ رہی تھی اور آنکھیں نیند سے بے حال تھیں لیکن شاید اپنے پاس موجود ایک سنسنی خیز اطلاع کی بے چینی نے اسے گھر جا کر آرام نہیں کرنے دیا تھا۔

"ہو سکتا ہے کہ پاکستان اور بھارت کی فوجیں آپس میں فائرنگ کر رہی ہوں۔ کبھی کبھی دونوں فوجوں کے درمیان ایسی جھڑپ ہو جاتی ہے۔" مشاہرم خان نے تفصیلات جاننے کے لیے ایسے ہی ایک نکتہ بیان کیا ورنہ وہ خود فائرنگ کی اطلاع سن کر چونک گیا تھا۔ اس کے ذہن میں پوری طرح یہ بات موجود تھی کہ کچھ لوگ ہیں جو پہاڑوں پر خفیہ طور پر بسیرا کیے ہوئے ہیں۔ جس طرح ان لوگوں نے اکرم خان کو قتل اور ماہ بانو کے اغوا کی کارروائی کی تھی، اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کوئی پُرامن یا بے ضرر لوگ نہیں ہیں۔ اگر انہوں نے دنیا سے کٹ کر برف پوش پہاڑوں میں اپنا ٹھکانا بنایا تھا تو یقیناً ان کے کچھ ایسے مذموم مقاصد تھے جنہیں وہ سب سے چھپا کر رکھنا چاہتے تھے۔ پہاڑوں سے واپس لوٹنے والے پورٹر کی سنائی گئی اطلاع پر اس کا ذہن لامحالہ ان لوگوں کی طرف چلا گیا۔

"پاک بھارت فوج کا جہاں ایک دوسرے سے واسطہ پڑتا ہے، وہ پوزیشن الگ ہے۔ ہم نے جس طرف سے فائرنگ کا آواز سنا ادھر تو سرے سے کوئی جاتا ہی نہیں۔ پاک فوج کا بھی ادھر کوئی کیمپ نہیں ہے۔ ہم نے جس طرف سے فائرنگ کا آواز سنا وہ جگہ تو ہمارے ٹریک سے بھی بہت

ہمت کرتا تھا۔ ہمیں بھی بس دور کی ہی آواز سنائی دی تھی، پر وہ اتنی دور کی بھی آواز نہیں تھی کہ ہم اسے پاک بھارت فوج کی جھڑپ سمجھتے۔" پورٹر نے کچھ خفگی کے ساتھ اس کے سوال کا جواب دیا۔

"اچھا، یہ تو بڑی حیرت کی بات ہے۔ ذرا لوکیشن تو بتاؤ تا کہ ہمیں بھی کچھ اندازہ ہو سکے کہ یہ سب کس طرف ہوا؟" مشابرم خان نے تجسس سے پوچھا۔ جواباً پورٹر نے اسے لوکیشن کی تفصیل کہہ سنائی۔

"میرے خیال میں اس طرف پاک آرمی نے اپنا کوئی نیا یونٹ قائم کیا ہوگا اور وہ لوگ اپنی کوئی مشق کر رہے ہوں گے۔ اس طرف حکومت کی کوئی نہ کوئی خفیہ کارروائی چلتی ہی رہتی ہے۔ وہ تو اتفاق تھا کہ تم لوگوں نے فائرنگ کی آواز سن لی ورنہ نہ جانے پہاڑوں میں کہاں کہاں آرمی نے اپنے ٹھکانے بنا رکھے ہیں۔" محفل میں شامل ایک شخص نے خیال آرائی کی جس سے دوسرے افراد نے بھی اتفاق کیا۔ وہ لوگ اس حیرت انگیز فائرنگ کی کوئی دوسری توجیح پیش کرنے کے قابل بھی نہیں تھے۔

"نہ جانے یہاں کیا کیا ہونے لگا ہے ورنہ ہمارے علاقے سے زیادہ پُرامن جگہ تو کوئی دوسری تھی ہی نہیں۔ اب صغیر بیگ صاحب کے اغوا کا معاملہ ہی لے لو۔ کل سے اب تک ان کی کوئی اطلاع نہیں ہے۔ بے چارے اچھے، نیک اور شریف آدمی ہیں۔ پتا نہیں کس مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ پہلے ان کا ڈرائیور نیاز علی اپنی جان سے گیا اور اب وہ خود غائب ہیں۔"

ایک شخص کے اس تبصرے پر مشابرم خان چور سا بن گیا۔ ان دونوں معاملات سے ہی اس کا براہِ راست تعلق بنتا تھا لیکن شکر ہے کہ وہاں موجود افراد میں سے کسی کو اس بات کی خبر نہیں تھی کہ نیاز علی اپنی موت کے وقت اسی کے ساتھ تھا۔ وہ لوگ اس حقیقت سے بے خبر اپنے تبصروں میں مصروف رہے۔

"صحیح کہہ رہے ہو بھائی۔ صغیر بیگ صاحب تو خیر آدمی ہی بہت اچھے ہیں لیکن مجھے تو نیاز علی کا بھی دلی افسوس ہے۔ وہ جیسا بھی تھا اور ہم سے کتنی ہی بداخلاقی سے پیش آتا تھا لیکن اس کے بیوی بچوں کا سوچ کر دکھ ہوتا ہے۔ اس کے بعد کون ان لوگوں کا خیال رکھے گا۔" ایک شخص اسی دردمندی سے کہہ رہا تھا جو ان پہاڑی بودوباش رکھنے والوں کی ازلی خاصیت ہے۔

"اس بات کا تو سب کو افسوس ہے لیکن سنا ہے کہ نیاز علی کچھ غلط کام کرنے لگا تھا اور اس کے پاس پیسا بھی بہت آ گیا تھا۔ غلط دھندے میں پڑنے والوں کے ساتھ کب کیا ہو جائے، کچھ معلوم نہیں ہوتا۔" وہ لوگ تبصرے کر رہے تھے جنہیں مشابرم خان دھیان سے سن رہا تھا۔

"کیا صغیر بیگ صاحب کو نہیں معلوم تھا کہ نیاز علی غلط کام کرنے لگا ہے؟ وہ تو سنا ہے اس پر بہت اعتماد کرتے تھے..." صغیر بیگ کے کردار کے تعین کے لیے اس نے یہ سوال کیا۔

"اپنے بیگ صاحب تو اللہ والے بندے ہیں۔ انہیں کسی پر شک وشبہ کرنا آتا ہی نہیں۔ ہر ایک کو اپنی طرح سمجھ کر اس پر بھروسا کر لیتے ہیں۔ نیاز علی کے بارے میں بھی اگر کچھ سنا ہوگا تو نظرانداز کر دیا ہوگا۔" اس جواب نے مشابرم خان کو احساس دلایا کہ وہ ایک بڑی غلطی کر چکا ہے۔ صغیر بیگ کے شاملِ جرم ہونے کے شک کی وجہ سے اس نے نہ صرف اسے اغوا کیا تھا بلکہ حقائق اگلوانے کے چکر میں کافی زدوکوب بھی کیا تھا۔ اب بھی وہ بے چارہ آذر کے گھر میں بھوکا پیاسا رسیوں سے بندھا بے بس پڑا ہوا تھا۔ اپنی زیادتی کا احساس ہونے پر وہ چائے کی پیالی خالی کیے بغیر عجلت میں وہاں سے اٹھ گیا۔ کرائے کی جیپ اب بھی اس کے پاس تھی۔ اس جیپ میں ہی وہ آذر کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ روانگی سے قبل اس نے اپنے ساتھ کھانے پینے کی کچھ چیزیں بھی لے لی تھیں۔ ان چیزوں کے ساتھ وہ آذر کے گھر پہنچا تو صغیر بیگ کو اسی طرح بندھی ہوئی حالت میں پڑا ہوا پایا۔ اس کی سانسوں کا زیروبم ظاہر کر رہا تھا کہ وہ نیند کی حالت میں ہے۔ مشابرم خان نے اسے دھیرے سے ہلا کر جگایا اور ساتھ ہی اس کے منہ میں ٹھنسا کپڑا بھی باہر نکال دیا۔

"اٹھ کر ناشتا کریں بیگ صاحب... پھر میں آپ کو آپ کے دفتر یا کسی دوسری مناسب جگہ پہنچا دوں گا۔"

افسوس اور شرمندگی کی ملی جلی کیفیت میں اس نے صغیر بیگ سے کہا تو وہ حیران رہ گیا پھر اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"مجھے حاجت محسوس ہو رہی ہے اگر پہلے تم مجھے باتھ روم لے چلو تو تمہاری مہربانی ہوگی۔"

"ٹھیک ہے۔" مشابرم خان نے مختصر سا جواب دیا اور اس کے ہاتھ پیروں کی بندشیں کھولنے لگا۔ اب آنکھوں پر بندھی پٹی کے سوا وہ بالکل آزاد تھا۔

"میں آپ کو آزاد کر رہا ہوں بیگ صاحب لیکن یہ پٹی اس وقت تک آپ کو اپنی آنکھوں پر باندھنی پڑے گی جب

تک ہم ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو جاتے۔ یاد رکھیں، آنکھوں پر بندھی یہ پٹی آپ کی زندگی کی ضمانت ہے۔ آپ مجھ سے انجان رہیں اسی میں آپ کی سلامتی ہے۔" خوفناک لہجے میں صغیر بیگ کو یہ دھمکی دینے کے بعد اس نے باتھ روم کی طرف اس کی راہنمائی کی۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد اس نے صغیر بیگ کو ناشتا کروایا اور پھر اسے جیپ میں بٹھا کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ روانہ ہونے سے پہلے اس نے اس کے ہاتھ ایک بار پھر احتیاطاً باندھ دیے تھے۔ اس کی فرماں برداری کے باوجود وہ خود اپنے لیے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اگر صغیر بیگ اسے شناخت کر لیتا اور بعد میں پولیس کو بتا دیتا تو وہ مشکل میں پڑ جاتا جبکہ ابھی اسے بہت سے اہم کام سرانجام دینے تھے اور وہ پولیس کے چکروں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ صغیر کو جیپ کی پچھلی نشستوں کے درمیان لیٹنے کا حکم دے کر وہ اسے ساتھ لے کر روانہ ہوا اور کم ہجوم والے راستوں سے گزار کر ایک بالکل ویران جگہ پر لے جا کر جیپ روک دی۔

"اٹھ جایئے بیگ صاحب! ہمارا ساتھ یہیں تک تھا۔ اب آپ آزاد ہیں۔ رخصت ہونے سے پہلے میں آپ سے اس تکلیف کے لیے معافی چاہتا ہوں جو آپ کو اٹھانی پڑی۔" وہ بہت سنبھل کر اور اپنا لہجہ قدرے بدل کر صغیر بیگ سے مخاطب تھا جو آزادی کی نوید پا کر خوش ہو گیا تھا۔ پشت پر بندھے ہوئے ہاتھوں کی وجہ سے اگرچہ اسے نشستوں کے درمیان سے اٹھنے میں مشکل پیش آئی لیکن پھر بھی اس نے ممکنہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جیپ چھوڑ دی۔ اس کے جیپ سے اترتے ہی مشابرم خان نے ایکسلریٹر پر دباؤ ڈالا اور ہوا ہو گیا۔ صغیر بیگ کے بارے میں اسے معلوم تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح آبادی تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ خود اسے اب ایک نئے سفر پر روانہ ہونے کی جلدی تھی۔ اسے ان پہاڑوں کا سفر اختیار کرنا تھا جن سے اس کی ماں نے اسے ہمیشہ دور رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن پہاڑوں کے بیٹے کو کب تک ان کے پاس جانے سے روکا جا سکتا ہے۔ اسے بھی پہاڑ پکار رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ہمارے پاس آؤ، ہم تمہیں اکرم خان کے قاتلوں اور ماہ بانو کے اغوا کاروں کا پتا بتائیں گے۔ اسے جلد از جلد اس سمت روانہ ہونا تھا جہاں سے آج صبح واپس لوٹنے والی ایکسپی ڈیشن ٹیم میں شامل پورٹر کے بیان کے مطابق فائرنگ کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ وہ صرف آوازیں نہیں تھیں، وہ ایک سراغ تھا جس کے سہارے وہ اپنے مجرموں تک پہنچ سکتا تھا۔

☆☆☆

حویلی کی فضا پر دہشت سی طاری تھی۔ چودھری افتخار نیو یارک سے واپس آ گیا تھا اور اس کیفیت میں آیا تھا جیسے کوئی شیر شکاری کی بندوق سے نکلنے والی گولی کا زخم کھا کر زندہ بچ گیا ہو اور تکلیف کی شدت سے بے حال ہر ایک کو چیر پھاڑ کر رکھ دینا چاہتا ہو۔ نوکروں چاکروں کا کیا ذکر دونوں چودھرائنیں بھی اس سے سخت خوف زدہ تھیں۔ وڈی چودھرائن کو اگر اپنی انتظامی صلاحیتوں کی ناکامی پر احتساب کا سامنا کرنا تھا تو چودھرائن ناہید کے حصے میں کشور کی ماں ہونے کا جرم آیا تھا۔ وہ دونوں ہی چودھری کے مقابل اس سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھیں۔ کشور کے غیاب سے ناواقف ملازمین کو بھی اتنا اندازہ بہرحال ہو چکا تھا کہ حویلی میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آ گیا ہے جس کی وجہ سے حویلی کے مالکان بری طرح پریشان اور گھبرائے ہوئے ہیں۔ ان میں ہمت نہیں تھی کہ اس واقعے کے بارے میں جاننے کے لیے کھوج لگانے کی کوشش کرتے لیکن وہ سب اپنی اپنی جگہ بے حد محتاط ہو گئے تھے کہ کہیں ذرا سی کوتاہی انہیں حویلی والوں کے غضب کا نشانہ نہ بنا دے۔ اتنی احتیاط کے باوجود بھی کئی ملازمین بہانے بہانے سے زیرِعتاب آ چکے تھے۔ کسی کو برتن صاف نہ دھونے پر سزا ملی تھی تو کسی کے صاف کیے ہوئے غلے میں کنکر باقی رہ گئے تھے۔ ان معمولی غلطیوں کی پاداش میں بے چارے مظلوم ملازمین کو سخت سزا سہنی پڑی تھی۔ سزا سہنے والوں میں شادو اور رجّی کی ماں رحمتے بھی شامل تھی۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے دودھ گرم کرتے ہوئے تھوڑا سا دودھ ابال دیا تھا۔ اس جرم کی پاداش میں اسے نوکروں سے پٹوا کر حویلی سے نکال باہر کیا گیا تھا۔

رحمتے جو اپنی بیٹیوں کے اچانک منظر سے غائب ہو جانے پر پہلے ہی پریشان تھی، اس نئی افتاد پر مزید گھبرا گئی۔ بڑی مشکلوں اور منتوں سماجتوں کے بعد اسے ایک نوکرانی کے ذریعے یہ اطلاع ملی کہ اس کی دونوں بیٹیوں کو کشور بی بی کے ساتھ لاہور والی کوٹھی میں بھیج دیا گیا ہے۔ حویلی کے نوکروں میں یہی مشہور بھی کیا گیا تھا۔ اصل حقیقت سے کوئی بھی واقف نہیں تھا۔ رحمتے کے پاس اس خبر پر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا البتہ اس نے یہ کوشش ضرور کی تھی کہ کسی طرح وڈی چودھرائن سے مل کر معافی تلافی کر ڈالے اور اپنی چرب زبانی و خوشامد سے دوبارہ خود پر حویلی کے دروازے کھلوا لے لیکن اسے کامیابی نہیں ہو سکی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ وڈی چودھرائن خود اس سے خوف زدہ ہے اور نہیں چاہتی کہ رحمتے

جیسی ہوشیار اور چالاک عورت حویلی کے اندر قدم رکھے اور اپنی فطرت کی وجہ سے اصل حالات کھوج لگا لے۔ رحیمے کی جس فطرت کا وڈی چودھرائن خود ہمیشہ فائدہ اٹھاتی رہی تھی، آج اسی سے خوف زدہ ہو کر اپنی چہیتی ملازمہ کو حویلی سے دور رکھنے پر مجبور تھی۔ ویسے ملازمین کا چہیتا ہونا حویلی کے مکینوں کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ جب تک کوئی ملازم ان کے کام کا رہتا، وہ اسے اہمیت دیتے اور پھر صورتِ حال بدلنے پر آنکھیں پھیرنے میں دیر نہیں لگاتے۔ وڈی چودھرائن نے بھی رحیمے اور اس کی دونوں بیٹیوں کے ساتھ یہی کیا تھا۔ اور شادو کو البتہ وہ اب تک یہ جھانسا دے کر کہ میں رانی سے اگل دینے کی صورت میں تمہاری چودھری صاحب سے سفارش کروں گی، اپنی مطلب برآری کے لیے استعمال کررہی تھی۔ اس کے حکم پر ان دونوں بہنوں نے مل کر رانی پر بے پناہ تشدد کیا تھا۔ اسے چمڑے کے بیلٹ سے پیٹنے اور زخموں میں نمک مرچ بھر دینے کے علاوہ جلتی لکڑی سے داغا بھی گیا تھا۔ اس بہیمانہ تشدد سے رانی ادھ موئی ہو گئی لیکن اس نے سچ نہیں اگلا تھا۔ جھنجلائی ہوئی چودھرائن نے غصے میں آکر اس کا کھانا پینا بھی بالکل بند کر دیا تھا لیکن اپنے مقصد کے حصول میں بالکل ناکام تھی اور اب اسی ناکامی کے ساتھ اسے چودھری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

”ملکن، ناکارہ ہو گئی ہے تو۔ ایک نوکرانی سے سچ نہیں اگلوا سکی۔ تو نے ٹوٹے ٹوٹے کر کے رکھ دیے ہوتے تو دیکھ کیسے نہیں بولتی فیر وہ۔“ وہ وڈی چودھرائن پر بگڑ رہا تھا۔

”مار کھا کھا کر ادھ مری ہو گئی ہے وہ چودھری صاحب فیر بھی زبان بند کر کے بیٹھی ہے۔ اب تو مجھے خود شک پڑنے لگا ہے کہ شاید اسے کچھ علوم ہی نہیں ہے پر فیر یہی خیال آتا ہے کہ کسی کی مدد کے بغیر کشور بی بی کچھ کیسے کر سکتی ہے۔ رانی ہی تھی جو ہر جگہ اس کے ساتھ رہتی تھی۔ مجھے تھوڑا سا شک پڑ گیا تھا کہ یہ مالکن اور نوکرانی کی آپس میں اتنی کیوں گھٹ رہی ہے اس لیے میں نے رانی کو کشور سے الگ کر کے لاہور والی کوٹھی پر چھوڑ دیا تھا۔ اب جانے کشور نے کیسے راہ نکالی کہ رانی کے بغیر بھی ہماری آنکھوں میں دھول جھونک گئی۔ خیر، یہ تو الگ گل ہے پر مجھے شک ہے کہ جو بھی چکر تھا، اس کا رانی کو چنگی طرح پتا ہے۔ بس ڈھیٹ بنی ہوئی ہے اور سچ اگل کر نہیں دے رہی۔“ اس نے چودھری کے سامنے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”پچھلی واری کشور لاہور گئی تھی تو اس کے ساتھ ڈرائیور کون اشرف تھا نا؟“ چودھری نے اس کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک بالکل مختلف سوال کیا۔

”ہاں جی، وہی تھا۔“ وڈی چودھرائن نے جواب دیا۔ چودھری سے گفتگو کا بوجھ فی الحال اسی کے سر پر تھا۔ چودھرائن ناہید تو حسبِ معمول ایک طرف سر تھامے بیٹھی ہوئی تھی۔

”میں ذرا اس کو دیکھ لوں فیر رانی سے بھی نمٹتا ہوں۔ وہ نمک حرام ہماری عزت پر ہاتھ ڈال کر خود ہونٹ سی کر کیسے بیٹھ سکتی ہے۔ میں تو اس کے حلق میں ہاتھ ڈال کر سچ اگلوا لوں گا۔ حویلی کی عزت سے کھیلنا کوئی معمولی گل نہیں ہے۔ جس کسی نے یہ حرکت کی ہے اور میری دھی کو ورغلایا ہے، میں اس کا ایسا انجام کروں گا کہ اس کی نسل ہی مٹ جائے گی۔“ غیظ و غضب میں بھرا ہوا چودھری زنان خانے سے نکل کر اپنے مخصوص ملاقاتی کمرے میں پہنچا اور اشرف ڈرائیور کو طلب کیا۔ اس طلبی کے جواب میں اشرف فوراً ہی حاضر ہو گیا۔

”کشور بی بی کے ساتھ آخری واری لاہور تم گئے تھے نا؟“ اس نے اشرف کو گھورتے ہوئے اس سے استفسار کیا۔

”جی سرکار!“ اس نے مؤدبانہ جواب دیا لیکن اندر سے وہ بُری طرح پریشان تھا کہ چودھری صاحب کو وطن واپس لوٹتے ہی اس قسم کی تحقیقات کی ضرورت کیوں پیش آ گئی۔

”کشور بی بی نے تیری شکایت کی ہے کہ تُو ان کا حکم ٹھیک طرح سے نہیں مانتا تھا اور وہ کہیں جانے کو کہتی تھیں تو آنا کانی کرتا تھا۔“ وہ بہت ہوشیاری سے اشرف کو گھیرنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ اس سے اگلوا سکے کہ کشور اپنے لاہور میں قیام کے عرصے میں کہاں کہاں اور کس کس سے ملنے گئی تھی۔ براہِ راست سوال کرنے کی صورت میں ڈرائیور مشکوک ہو جاتا کہ دال میں کچھ کالا ہے اس لیے اس نے یہ لائحہ عمل اختیار کیا تھا۔

”میری کیا مجال سرکار کہ میں مالکن کے حکم کی خلاف ورزی کروں۔ فیر بھی اگر انہیں کوئی شکایت ہو گئی ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔“ ڈرائیور بے چارہ گھبرا گیا اور فوراً دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

”کوئی تو ایسی گل ہوئی ہو گی جو بی بی نے شکایت کی ہے۔ تُو مجھے بتا کہ تُو اسے لے کر کہاں کہاں گیا تھا؟“ اب چودھری نے اپنے مطلب کا سوال کیا۔

”لاہور میں تو بی بی بس ایک ہی جگہ جاتی ہیں۔ انہیں کتابوں کا شوق ہے نا تو بس لبرٹی میں کتابوں کی دکان پر ہی زیادہ تر جاتی ہیں۔ ہاں، اس واری وہ دو بار بیوٹی پالر (بیوٹی پارلر) اور ایک واری لائبریری بھی گئی تھیں۔ میں حیران تو ہو

تھا، پر میں نے انہیں وہاں لے جانے سے انکار کی جرأت نہیں کی جی۔‘‘ ڈرائیور نے رپورٹ پیش کی۔

’’تو نے کچھ تو غلطی کی ہوگی جو اسے شکایت ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تو اسے چھوڑ کر خود سیر سپاٹے کرنے نکل جاتا ہو، ہو را سے واپسی کے لیے تیرا انتظار کرنا پڑتا ہو؟‘‘ چودھری بہت چالاکی سے اس سے معلومات حاصل کر رہا تھا۔ خوف زدہ و پریشان ڈرائیور کے لیے اس کی اس چالاکی کو سمجھنا ممکن ہی نہیں تھا۔

’’نہیں سرکار! اپنی مرضی سے تو میں کبھی کہیں نہیں گیا۔ ایک واری بی بی نے پارلر سے خود ہی واپس بھجوا دیا تھا کہ مجھے دیر لگے گی، تم کوٹھی واپس چلے جاؤ... بعد میں آ کر لے جانا۔ اس کے علاوہ تو میں کبھی انہیں تنہا چھوڑ کر نہیں ہٹا۔ بی بی جہاں بھی جاتی تھیں، میں باہر ہی گڈی لے کر کھڑا رہتا تھا۔‘‘ وہ بے چارہ گھبرایا ہوا اپنی صفائیاں پیش کر رہا تھا۔

اس کی باتوں سے چودھری نے اندازہ لگا لیا کہ جب کشور پارلر گئی تھی تو یقیناً ڈرائیور کو واپس کوٹھی بھجوا کر درمیان میں خود کہیں غائب ہوگئی تھی لیکن ظاہر ہے ڈرائیور کو اس کا علم نہیں ہو سکتا تھا۔

’’ٹھیک ہے ابھی تو میں تجھے کچھ نہیں کہہ رہا، بعد میں رانی سے پوچھوں گا۔ اسے بھی تو سب پتا ہوگا کہ تو کتنی دیر لگا کر واپس بی بی کو لینے جاتا تھا۔ وہ بھی تو بی بی کے ساتھ ہی ہوتی تھی۔ اب ... کوٹھی پر رہ جاتی تھی۔‘‘ اب وہ اس معاملے میں رانی کے کردار کا تعین کر رہا تھا۔

’’زیادہ تر تو بی بی کے ساتھ ہی رہتی تھی، بس جب بی بی بیوٹی پارلر گئی تھیں تو تب انہوں نے رانی کو بھی میرے ساتھ واپس کوٹھی بھجوا دیا تھا۔‘‘ ڈرائیور کے اس بیان نے رانی کی بے پناہ مشکوک محسوس ہونے والی حیثیت کو ذرا سا سنبھالا دیا لیکن وڈی چودھرائن کی طرح چودھری کو بھی کچھ یقین سا تھا کہ کشور اکیلی کوئی چکر نہیں چلا سکتی۔ یقیناً رانی اس کی رازداں ہوگی کیونکہ اونچی دیواروں والے محلوں اور حویلیوں میں جہاں قدم قدم پر پہرے ہوں، ہمیشہ قریبی ملازمین ہی چور راستوں تک راہنمائی کرتے ہیں۔

’’چل ٹھیک ہے تو جا، میں رانی سے پوچھتا ہوں۔‘‘ چودھری نے اسے چلتا کیا۔ بے پناہ ذہنی دباؤ اور غصے میں ہونے کے باوجود اس پوری گفتگو کے دوران اس نے بڑے تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔ اپنے رویے سے وہ ڈرائیور کو کسی شک میں مبتلا ہونے کا موقع نہیں دے سکتا تھا۔ ڈرائیور کو رخصت کرنے کے بعد وہ واپس زنان خانے میں آیا۔

’’کسی کو بھیج کر رانی کی ماں اور چھوٹے بھرا کو حویلی بلوا لے۔‘‘ اپنے ذہن میں پلتے منصوبے کے پیشِ نظر اس نے چودھرائن کو حکم دیا۔

’’ہلاں چودھری صاحب!‘‘ وہ فوراً حکم کی تعمیل کے لیے لپکی۔ رانی کی ماں بھی ان ملازماؤں میں شامل تھی جو اس کے زیرِ عتاب آئی تھیں۔ اسے بھی اس نے ایک معمولی غلطی پر سخت سزا دی تھی اور ساتھ ہی حویلی میں داخلے پر پابندی لگا دی تھی۔ حویلی والوں کے ظلم و ستم کے باوجود یہ پابندی ملازمین پر سخت گزرتی تھی کیونکہ حویلی آ کر وہاں کے مکینوں کی خدمت نہ کرنے کا مطلب تھا کہ خود ان کے اپنے گھر کا چولہا ٹھنڈا پڑ جائے۔ جہاں خدمات کا معاوضہ ہی مشکل سے ملتا ہو وہاں سے بغیر خدمت کے کچھ ملنا بھلا کیسے ممکن تھا۔ رحمتے کی طرح رانی کی ماں کے حویلی میں داخلے پر پابندی لگانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے بارے میں کچھ نہ جان سکے۔ اب چودھری نے اسے حویلی بلوایا تھا تو اس کے پیچھے یقیناً کوئی خاص مقصد ہی تھا۔ اس کا یہ مقصد چودھرائن کو اس وقت سمجھ آیا جب وہ چودھری کے ساتھ تہ خانے میں پہنچی۔ تہ خانے میں رانی اس حال میں فرش پر پڑی تھی کہ اس کا پورا جسم زخموں سے چور تھا اور وہ ذرا سی کروٹ بھی لیتی تھی تو منہ سے کراہیں نکل جاتی تھیں۔ اس کے لیے ہلنا جلنا محال ہو گیا تھا۔ خون کے اخراج، تکلیف کی شدت اور غذا کی کمی نے مل کر اس کی ساری توانائیاں نچوڑ ڈالی تھیں۔ چہرے کی حالت اتنی بری تھی کہ اس کے اصل نقش و نگار مٹ گئے تھے۔ نیل کے نشانوں اور سوجن نے مل کر اس کا چہرہ ناقابلِ شناخت بنا دیا تھا۔ چودھری اور وڈی چودھرائن وہاں پہنچے تو وہ آنکھیں بند کیے تقریباً نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑی ہوئی تھی۔

’’اسے اٹھاؤ۔‘‘ چودھری نے وہاں موجود پھپھی اور شادو کو حکم دیا تو پھپھی نے اس کے چہرے پر پانی کا پورا جگ الٹ دیا اور پھر دونوں بہنوں نے اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے دیوار سے لگا کر بٹھا دیا۔ اس نے اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں سے سامنے موجود چودھری کو دیکھا اور اپنے درماندہ جسم پر مزید ظلم و ستم سہنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ چودھرائن نے ایک عورت ہو کر اس پر تشدد کے متعدد طریقے آزما ڈالے تھے۔ چودھری کا قہر و ظلم مشہور تھا، جانے کون سی انتہا کر دیتا۔ اس انتہا کا سوچ کر ہی اس کی جان نکلنے لگی لیکن زبان نہ کھولنے کا ارادہ اپنی جگہ مستحکم تھا۔

’’تجھ سے سچ اگلوانے کے لیے بہت تشدد کیا جا چکا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اب میں نے بھی تیرے ساتھ مار پیٹ کی تو تو سہہ نہیں سکے گی اور مر جائے گی اس لیے میں اب تیرے ساتھ کوئی مار پیٹ نہیں کروں گا۔‘‘ چودھری کے نہایت سرد لہجے میں کہے ہوئے الفاظ اس کی سماعتوں سے ٹکرائے تو وہ الجھن و حیرت میں مبتلا ہوگئی۔ چودھری نے اسے مزید تشدد نہ کیے جانے کا مژدہ سنایا تھا لیکن اس کے لہجے کی کاٹ ایسی تھی جو ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑا دیتی تھی۔

’’میں نے تیری ماں اور بھرا کو حویلی بلوایا ہے۔ اب تیری جگہ ان دونوں کو رسیوں سے باندھ کر ان کے ساتھ تیرا والا سلوک کیا جائے گا۔ تیری زبان نہیں کھلی تو میں ان دونوں کی کھال کھچوا ڈالوں گا۔ فیر میں دیکھتا ہوں کہ تو کیسے برداشت کرتی ہے۔‘‘ قہر آلود لہجے میں دی گئی اس دھمکی نے رانی کی روح کو کپکپا ڈالا۔ اپنی بے قصور ماں اور چھوٹے معصوم بھائی کے اس ظالمانہ تشدد سے گزرنے کا تصور ہی جس سے وہ خود گزری تھی، اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ اس وحشت ناک تصور نے اس کے نڈھال پڑے ہوئے جسم میں جنبش پیدا کی اور وہ خود کو بہ مشکل گھسیٹتی ہوئی چودھری کے قدموں تک پہنچ گئی۔

’’رحم کر دیں سرکار! میں سچ کہتی ہوں کہ مجھے کچھ خبر نہیں کہ کشور بی بی کس کے ساتھ اور کہاں گئی ہیں۔ آپ کو میری گل کا بھروسا نہیں تو بے شک میری کھال ادھیڑ ڈالیں لیکن میری ماں اور بھرا کو کچھ نہ کہیں۔ وہ بے قصور ہیں۔‘‘ چودھری کے پیر تھامتے ہوئے اس نے اس سے درخواست کی۔ جواباً اسے اپنے سر پر ایک زوردار ٹھوکر سہنی پڑی۔

’’پرے ہٹ، میرے ساتھ مکر کرتی ہے۔ میں جانتا ہوں تجھے سب خبر ہے، پر تو جان کر اپنی زبان نہیں کھول رہی۔ کوئی گل نہیں۔ تھوڑی دیر میں تیری ماں اور بھرا آ جائیں، فیر میں دیکھتا ہوں کہ تو ان کی چیخیں سننے کے بعد بھی کیسے اپنی زبان بند رکھے گی۔‘‘

’’میری ماں اور بھرا کو کچھ مت کہنا چودھری صاحب۔ ان بے چاروں کی کوئی غلطی نہیں ہے۔‘‘ رانی جو ٹھوکر کھا کر پیچھے الٹ گئی تھی، ایک بار پھر خود کو سنبھالتی ہوئی اٹھی اور چودھری کے پیر تھام کر اپنی درخواست دہرائی لیکن اس بار اس کے لہجے میں لجاجت سے زیادہ جنون تیزی تھی۔ چودھری جیسا ہوشیار بندہ اس تبدیلی کو محسوس نہیں کر سکا اور اس کے قدموں سے لپٹی رانی بے انتہا زخمی ہونے کے باوجود حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی قمیص کا دامن تھام کر یک دم ہی اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی اور اس نے ہولسٹر میں موجود ریوالور کھینچ لیا۔ رانی کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر چودھری گھبرا سا گیا اور اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ پیر چلانے کی کوشش کی مگر اگلے پل نے اسے احساس دلایا کہ اسے اپنا بچاؤ کرنے کے لیے کوئی کوشش کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ رانی کا ہدف وہ نہیں، خود اپنی ذات تھی۔ اس نے ریوالور کی نال اپنی کنپٹی پر رکھ کر ٹریگر دبا دیا تھا اور تیورا کر زمین پر گر گئی تھی۔ شاید اس کا یہ فیصلہ بالکل بروقت اور درست تھا۔ اپنی زندگی کے بارے میں تو وہ جانتی ہی تھی کہ اب اس کا بچنا ممکن نہیں ہے، چنانچہ وہ اپنے گھر والوں کو بچانے کے لیے یہ حرکت کر گزری تھی۔ اب چودھری اس سے سچ اگلوانے کے لیے کوئی ترکیب نہیں لڑا سکتا تھا۔ وہ چاہتی تو گولی کا نشانہ چودھری کو بھی بنا سکتی تھی لیکن اس سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ اس جرم کی پاداش میں اس سمیت اس کے پورے خاندان کو نیست و نابود کر دیا جاتا۔ اب کم از کم یہ امید تو وہ اپنے ساتھ لے کر دنیا سے گئی تھی کہ اس کی قربانی اس کے گھر والوں کو بچا لے گی۔

’’مر گئی نمک حرام۔ نمک حراموں کے نصیب میں مرنا ہی لکھا ہوتا ہے۔ تم دونوں بھی اب مزید زندہ نہیں رہ سکتیں۔‘‘ چودھری جو کچھ دیر کے لیے تو رانی کی خودکشی پر ششدر رہ گیا تھا، زمین پر گرا اپنا ریوالور اٹھاتا ہوا نفرت سے بولا اور دھائیں دھائیں دو فائر اس ساری صورت حال کو پھٹی ہوئی آنکھوں سے دیکھتی پھپھی اور شادو پر داغ دیے۔ ان دونوں کو اس اچانک دبوچ لینے والی موت نے یوں ساکت کیا کہ وہ حلق سے چیخ بھی نہیں نکال سکیں اور اپنی تمام تر مکاری، چالاکی، مطلب پرستی اور لالچ سمیت دوسرے جہاں سدھار گئیں۔

’’بالے! دو بندے لے کر حویلی کے تہ خانے میں پہنچ۔ وہاں تین لاشیں پڑی ہیں، انہیں اٹھا کر کہیں بھی لے جا کر پھینک دے۔‘‘ وہیں کھڑے کھڑے چودھری نے اپنے موبائل سے بالے کا نمبر ملایا اور اسے حکم دینے کے بعد پُر رعونت چال چلتا ہوا واپسی کے راستے کی طرف بڑھ گیا۔ وڈی چودھرائن بھی خاموشی سے اس کے پیچھے تھی۔ تمام تر تکبر اور رعونت کے باوجود ان دونوں کے چہروں پر وہ ناکامی لکھی ہوئی تھی جس سے رانی نے انہیں دوچار کیا تھا۔

☆☆☆

’’میری وزیر صاحب سے بات ہوگئی ہے۔ انہوں نے یقین دہانی کروائی ہے کہ بہت جلد نور پور میں بجلی کی فراہمی کو ممکن بنا دیا جائے گا۔ آپ کے ذہن میں کھریلو

صنعتوں سے متعلق جو منصوبے ہیں، آپ اس کی تیاری رکھیں تاکہ بجلی پہنچتے ہی آپ کے منصوبوں پر کام شروع ہو سکے۔" گزشتہ روز نور پور کا دورہ ملتوی ہونے کے بعد شہریار آج وہاں پہنچا تھا اور چودھری بختیار کے سامنے بیٹھا اس سے باتیں کررہا تھا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ اے سی صاحب! یہ آپ کی مہربانی ہے کہ ہمارے صرف نام کے نور پور کہلانے والے گاؤں میں بھی کچھ روشنی کی امید پیدا ہوئی ہے۔ بجلی آنے سے گھروں میں بلب کی روشنی جو پھیلے گی سو پھیلے گی، مجھے تو سب سے زیادہ اسکول کی تعمیر کی خوشی ہے جس سے ہماری نئی نسل کا ذہن علم کے نور سے منور ہوگا تب ہی نور پور صحیح معنوں میں نور پور کہلا سکے گا۔" چودھری بختیار نے اس کی دی ہوئی اطلاع پر خوشی کا اظہار کیا لیکن وہ دیکھ رہا تھا کہ چودھری بختیار پہلے کے مقابلے میں بہت کمزور ہو چکا ہے۔ پہلے وہ جب بھی اس سے ملا تھا، وہ اپنی معذوری کے باوجود بہت پُرجوش اور باہمت محسوس ہوا تھا لیکن اب اسے دیکھنے کے ساتھ ہی کسی ٹوٹے ہوئے انسان کا خیال آرہا تھا۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا چودھری صاحب! کافی کمزور لگ رہے ہیں؟" اس نے ہمدردی سے پوچھا۔

"ٹھیک ہی ہوں۔ جی رہا ہوں اور اس وقت تک جینا چاہتا ہوں جب تک اپنے گاؤں کے لوگوں کے لیے کچھ کر نہیں لیتا۔ یہ مظلوم لوگ اپنے ہر دکھ کے مداوے کے لیے میری ہی طرف دیکھتے ہیں اس لیے تو دل پر بڑے سے بڑا گھاؤ سہہ کر بھی خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوں اور اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔" چودھری بختیار نے بے حد سنجیدگی سے اس کے سوال کا جواب دیا۔ یہ جواب دیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ہلکی سی نمی بھی جھلک پڑی تھی۔

"آپ کے دل پر جو تازہ گھاؤ لگا ہے، اس سے میں بھی واقف ہوں لیکن وجہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ آپ کو چودھری افتخار کے سامنے اس طرح شکست تسلیم نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ایک ہوش مند لڑکی کی کسی ذہنی معذور لڑکے سے شادی کر دینا اتنا بڑا ظلم ہے کہ میں آپ سے اس ظلم میں شامل ہونے کی ایک فیصد بھی امید نہیں رکھتا تھا۔" وہ خود بہت عرصے سے فریدہ اور بہزاد شاہ کی بے جوڑ شادی کی وجہ سے الجھن کا شکار تھا اس لیے موقع ملتے ہی اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا۔ اس وقت چونکہ عبدالستان ٹھیکے دار کے ساتھ مصروف تھا اور وہ اور چودھری بختیار تنہا ہی تھے، اس لیے اس موضوع پر گفتگو کی گنجائش نکالی جا سکتی تھی۔

"ظلم میں نے نہیں خود فریدہ نے اپنے آپ پر کیا تھا۔ وہ اگر چودھری کے دادا کی درگاہ پر نہ پہنچتی تو اس مشکل میں گرفتار نہیں ہوتی۔ چودھری نے اسے اپنی قید میں رکھ لیا تھا اور دھمکی دی تھی کہ اگر میں اس رشتے پر راضی نہ ہوا تو وہ فریدہ کو کسی لائق نہیں چھوڑے گا۔ اس کی عزت اور جان دونوں جائیں گی۔ میں نے سوچا مرتو وہ ایک طرح گئی ہے کیوں نہ رہی سہی عزت بچالوں۔ اس فیصلے پر پہنچنے سے پہلے میں چودھری سے اجازت لے کر فریدہ سے ملا اور اس نے بھی مجھ سے یہی درخواست کی کہ میں چودھری کی بات مان لوں۔ بس تو پھر میرے پاس ہتھیار پھینکنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہا۔" چودھری بختیار نے تھکے تھکے لہجے میں اپنی مجبوری کی داستان سنائی۔

"آپ کو معلوم ہے کہ فریدہ وہاں کیوں اور کس کے ساتھ گئی تھی؟" اس نے ایک نہایت نازک اور چبھتا ہوا سوال کیا جس کے جواب میں پل بھر کو چودھری خاموش ہو گیا اور پھر آہستہ سے گردن کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے بولا۔

"مجھے علوم ہے۔ وہ ہمارے دشمن کے بیٹے قربان کے ساتھ اس کے کہنے پر چودھری کی پناہ لینے وہاں گئی تھی۔ قربان کا بڑا بھائی سبحان اس روز مجھ سے ملنے آیا تھا اور بڑی دھمکیاں دے کر گیا تھا کہ اگر فریدہ اور قربان کا بیاہ ہوا تو وہ دونوں میں سے ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس روز پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ میری بہن قربان کو پسند کرنے لگی ہے اور اس سے چھپ چھپ کر ملتی ہے۔ میں جو فریدہ کے غائب ہونے سے پہلے ہی پریشان تھا، یہ جان کر بہت دکھی ہوا پھر بھی میں نے یہی سوچا کہ کاش فریدہ مجھ سے چھپانے کے بجائے مجھے بتا دیتی تو میں یا تو اسے سمجھاتا یا پھر کچھ ایسا بندوبست کرتا کہ دونوں کا جلد از جلد نکاح ہو جاتا لیکن وہ تو عشق میں اندھی ہو کر قربان کے کہنے پر میری عزت خاک میں ملا کر اس کے ساتھ پیر آباد جا پہنچی۔ وہاں جانے کیا کھیل کھیلا گیا کہ قربان کو تو چودھری نے چھوڑ دیا اور فریدہ کو اپنے قبضے میں رکھ لیا۔ ان حالات میں میرے پاس چودھری کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ فریدہ کے ایک غلط قدم نے اسے بھی نقصان پہنچایا اور میں بھی زندگی بھر کے پچھتاووں میں گھر گیا۔ ویسے مجھے یقین نہیں ہے کہ قربان اس کے ساتھ مخلص تھا۔ اگر مخلص ہوتا تو فریدہ کے بیاہ کے ہفتے بھر بعد ہی اپنی بچپن کی منگ کو بیاہ کر اپنے گھر نہ لے آتا۔ میرے جاننے والوں نے بتایا ہے کہ قربان کے بیاہ پر بڑی رونق تھی۔ خوب ڈھول تاشوں اور پٹاخوں کے ساتھ ان لوگوں نے جشن منایا اور خود قربان نے بڑھ چڑھ کر ہر رسم میں حصہ ڈالا۔ اگر اسے فریدہ سے محبت ہوتی تو کیا اس طرح سے بیاہ کرتا؟ مجھے یقین ہے کہ اس نے صرف میری پگ اچھالنے کے لیے فریدہ سے محبت کا ناٹک کیا تھا جسے وہ بے وقوف لڑکی سمجھ نہ سکی۔"

چودھری بختیار شہریار کے انداز سے سمجھ گیا تھا کہ وہ حالات سے کافی واقف ہے اس لیے کھل کر اس کے سامنے گفتگو کررہا تھا۔ شاید اسے اپنا یہ غم کہنے کے لیے کسی غمگسار کی ضرورت بھی تھی۔ اپنے گاؤں کا چودھری اور سب سے عزت دار شخص ہونے کے ناتے وہ کسی اور کے ساتھ تو یہ سب شیئر نہیں کر سکتا تھا چنانچہ اب موقع ملا تھا تو نم آنکھوں کے ساتھ سب کہتا جا رہا تھا۔ قربان کی شادی کا سن کر خود شہریار کو بھی جھٹکا لگا۔ ایک بار نور پور سے واپسی میں اس نے قربان اور فریدہ کو درختوں کے ایک جھنڈ میں اس طرح ساتھ دیکھا تھا کہ انہیں قربان کے بڑے بھائی سبحان نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر گھیر رکھا تھا اور فریدہ کی جان کے درپے تھا۔ اس وقت قربان نے بڑے بھائی کے سامنے بھرپور مزاحمت کی تھی پھر شہریار کی مداخلت کی وجہ سے اس وقت وہ جھگڑا ختم ہو گیا تھا۔ لیکن اسی قربان کے بارے میں جو کبھی فریدہ پر اپنی جان نچھاور کرنے کے لیے تیار تھا، یہ جان کر کہ اس نے فریدہ کی شادی کے محض ہفتے بھر بعد بڑی دھوم دھام سے خود بھی شادی کر لی تھی، اسے بڑا دکھ ہوا تھا۔ جس شخص کی محبت کے سہارے فریدہ اپنے محبت کرنے والے بھائی کو ہمیشہ کا دکھ دے گئی تھی، اس نے چند دن بھی اس کی جدائی کا غم نہ منایا تھا اور اپنی نئی دنیا بسا بیٹھا تھا۔

"میں معذرت چاہتا ہوں چودھری صاحب! میں نے آپ کا اتنا ذاتی معاملہ چھیڑ کر آپ کو دکھی کر ڈالا لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے فریدہ کی اس طرح ایک ذہنی معذور شخص سے شادی کیے جانے پر بہت افسوس ہے۔ ایسی شادی انسانی حقوق کی پامالی کے برابر ہے اور ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ فریدہ کو مزید یہ رشتہ نبھانے پر مجبور نہیں کیا جانا چاہیے۔"

"اس رشتے کو ختم کرنا بھی آسان نہیں۔ جتنا میں فریدہ کو بیاہتے ہوئے مجبور تھا، اتنا ہی اب بھی مجبور ہوں۔ میں نے اگر فریدہ کا نکاح ختم کروانے کی کوئی کوشش کی تو چودھری افتخار اسے اپنی عزت پر حملہ سمجھے گا اور فی الحال میں چودھری سے کوئی دشمنی نہیں پالنا چاہتا۔ میں اپنے لوگوں کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں اور اس کام کے لیے ضروری ہے کہ میں کسی ذاتی دشمنی میں خود کو نہ الجھاؤں۔" چودھری بختیار کا لہجہ بے لچک تھا۔ شہریار سمجھ گیا کہ فریدہ نے اپنے بھائی کو جس عظیم دکھ سے دوچار کیا ہے، اس کے بعد وہ اندر سے بری طرح ٹوٹ پھوٹ گیا ہے اور فی الحال اپنے دل میں اتنی گنجائش نہیں پاتا کہ بہن کے ساتھ کوئی ہمدردی کر سکے۔

چودھری بختیار کی دلی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اس نے اس موضوع پر اس وقت خاموشی اختیار کرنا مناسب سمجھا اور دوسرے موضوعات کو ڈسکس کرنے لگا۔ نور پور سے واپسی میں وہ وہاں کی صورتِ حال پر کافی مطمئن تھا۔ اسکول اور مرکزِ صحت کی تعمیر کے کام آخری مراحل میں تھے اور جلد دونوں جگہ پر عوام الناس کی فلاح کا سلسلہ شروع ہو جاتا لیکن اس ایک اطمینان کے علاوہ اس کے ذہن پر بہت سارے بوجھ بھی تھے۔ ایک طرف سجاد رانا کے قاتلوں تک رسائی حاصل نہیں کی جاسکی تھی تو دوسری طرف ماہ بانو ہنوز لاپتا تھی۔ اس کی تلاش پر مامور مشابرم خان بھی یک دم غائب ہو گیا تھا۔ سمندر خان نامی جس لڑکے کے پاس مشابرم خان کا موبائل تھا، اس سے اس نے فون پر بات چیت کر کے کچھ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن سمندر خان کے مطابق اسے مشابرم خان کہیں نہیں ملا تھا۔ اس لڑکے کی طرف سے مایوس ہو کر اس نے بلتستان میں موجود اپنے ہم منصب سے رابطہ کیا اور اس سے مشابرم خان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی درخواست کی تو اس کی طرف سے یہ اطلاع فراہم کی گئی کہ مشابرم خان پولیس کو مطلع کیے بغیر اسکردو سے غائب ہے اور اس کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ وہ ایک ٹورسٹ کمپنی سے طویل عرصے کے لیے جیپ کرائے پر لے کر روانہ ہوا ہے لیکن اس نے کسی کو یہ نہیں بتایا کہ وہ کہاں اور کتنے دن کے لیے جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کی خواہش پر اس کے ہم منصب نے وعدہ کیا تھا کہ وہ جیپ کی مدد سے جلد از جلد مشابرم خان کا کھوج لگانے کی کوشش کرے گا۔ ویسے وہ خود یہ محسوس کر رہا تھا کہ مشابرم خان کو شاید ماہ بانو کا کوئی سراغ مل گیا تھا چنانچہ وہ اس کے پیچھے جلدی میں روانہ ہو گیا تھا۔ بہرحال اس کی پریشانی تو اپنی جگہ تھی۔ ایک طرف اگر اسے ماہ بانو کی فکر تھی تو دوسری طرف وہ وفادار مشابرم خان کو بھی کھونا نہیں چاہتا تھا۔

"ابھی ہمارے پاس کچھ وقت ہے۔ ایسا کرتے ہیں کہ تھانے کی طرف چلتے ہیں۔ ذرا اس اتائی ڈاکٹر سے بھی ملاقات ہو جائے گی جس نے ایک معصوم بچے کو موت کے منہ میں پہنچا دیا تھا۔" گاڑی نور کوٹ کی حدود میں داخل ہوئی تو اس نے اپنی خواہش ظاہر کی۔ بچے کے بارے میں اسے علم ہو گیا تھا کہ وہ اب خطرے سے باہر ہے اور اسپتال میں اس کا

مناسب علاج کیا جارہا ہے لیکن وہ ذاتی طور پر اس شخص سے ملنے کا خواہش مند تھا جس کی بے حسی اور دھوکا دہی نے ایک انسانی جان کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ اس کی خواہش پر ڈرائیور نے گاڑی کا رخ تھانے کی طرف کردیا۔ تھانے میں اس کی آمد کی وجہ سے حسب معمول ہلچل مچ گئی۔ اس نے سکون سے اس ہلچل کے تھمنے کا انتظار کیا اور پھر تھانے دار کو ملزم سے اپنی ملاقات کروانے کا حکم دیا۔ اس کے حکم کی تعمیل میں اس موٹے اور بدہیت اتائی کو اس کے سامنے پیش کردیا گیا۔ وہ متاثرہ بچے کے ماموں کے بیان کردہ حلیے پر پورا اترتا تھا اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے جھانکتی چالاکی اور خباثت صاف پڑھی جاسکتی تھی۔

''ہاں تو مسٹر! آپ کس کی اجازت سے بغیر کسی ڈگری اور پرمٹ کے لوگوں کا علاج بلکہ ان کی زندگیاں برباد کر رہے تھے؟'' اس شخص کا بغور جائزہ لینے کے بعد اس نے ذرا سخت لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

''میں نے کسی کی زندگی برباد نہیں کی۔ رہی اجازت کی بات تو میں وہاں لوگوں کی خدمت کررہا تھا اور خدمت کے لیے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی۔'' اس نے نہایت بے نیازی سے شہریار کے سوال کا جواب دیا۔

''خوب... آپ کی وجہ سے ایک معصوم بچہ موت کے منہ میں پہنچ گیا اور آپ کہتے ہیں کہ آپ وہاں لوگوں کی خدمت کررہے تھے؟'' شہریار نے طنز و غصے سے ملی جلی کیفیت میں پوچھا۔

''اس طرح کے واقعات تو ہو ہی جاتے ہیں۔ ڈاکٹر کا کام علاج کرنا ہے، آگے صحت اور زندگی دینا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔'' اس کی بے نیازی اسی طرح قائم تھی۔

''بہت ہی خوب۔ یعنی آپ جناب ڈاکٹر ہونے کے دعوے دار ہیں۔ ذرا اپنی ڈگری تو چیک کروائیں۔ میں بھی تو دیکھوں کہ کس میڈیکل کالج نے آپ کو ایم بی بی ایس کی ڈگری عطا کی ہے؟'' شہریار کے اس مطالبے پر اس شخص نے نظریں چرالیں۔

''میں اچھی طرح جانتا ہوں مسٹر کہ تم قطعی کوئی ڈگری یافتہ ڈاکٹر نہیں ہو۔ تم ان اتائیوں میں سے ایک ہو جو گلی محلوں میں اپنی دکانیں کھول کر چند روپوں کے لیے لوگوں کی زندگیوں سے کھیلتے ہیں۔ تمہارے خلاف سخت ایکشن لیا جائے گا۔'' اس کے نظریں چرانے پر شہریار نے اسے دھمکی آمیز لہجے میں مطلع کیا۔

''آپ میرے ساتھ زیادتی کررہے ہیں اے سی صاحب! میں اتائی نہیں عطائی ہوں اور عطائی وہ ہوتا ہے جسے طب کا علم عطا کیا جاتا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' اس کی اس عجیب منطق پر شہریار حیران ہوا۔

''دیکھیں، جیسے کسی بزرگ، کسی ولی کی صحبت میں رہ کر اس کے مرید روحانی علم حاصل کرتے ہیں اور بعد میں خود بھی اس جیسے مقام پر فائز ہوجاتے ہیں، بالکل اسی طرح میں نے بھی ایک ڈاکٹر کے ساتھ کافی عرصے اس کے کمپاؤنڈر کے طور پر کام کیا ہے اور اس تجربے کی وجہ سے مجھے بیماریوں اور ان کے علاج کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہیں۔ اب اگر میں اپنے اس علم کی روشنی میں کسی کا علاج کرتا ہوں تو آپ کو کیا اعتراض ہے؟ اس ملک میں جہاں ڈاکٹروں کی اتنی کمی ہے مجھ جیسے لوگوں کی تو بہت زیادہ قدر کرنی چاہیے لیکن آپ نے مجھے پکڑ کر تھانے میں بند کروادیا ہے اور اب برے انجام کی دھمکی بھی دے رہے ہیں۔'' اس شخص کی اتنی محیرالعقل دلیل نے شہریار کا دماغ گھما کر رکھ دیا۔ وہ شخص ایک جرم کرنے کے بعد اس پر شرمندہ ہونے کے بجائے خود کو درست ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ اس ڈھٹائی کے مظاہرے پر اس شخص کو کوئی جواب دیتا، تھانے کی حدود میں بڑی غیر معمولی سی ہلچل محسوس ہوئی۔ ایسا لگتا تھا کہ کچھ افراد زبردستی اس طرف آنے کی کوشش کررہے ہیں اور پولیس کے سپاہی انہیں روک رہے ہیں۔

''دیکھو! میری تم لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں۔ مجھے صرف اس خبیث سے نمٹنا ہے جس نے میرے پتر کی جان لینے کی کوشش کی تھی۔ تم لوگوں نے اگر زبردستی مجھے روکنے کی کوشش کی تو خوامخواہ مجھے تم پر بھی ہاتھ اٹھانا پڑے گا۔'' آوازوں کے ہجوم میں سے یہ بلند آواز ان لوگوں کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ ان الفاظ پر شہریار کو فوراً ہی اندازہ ہوگیا کہ یوں زبردستی تھانے میں گھسنے کی کوشش کرنے والا کون ہوسکتا ہے۔ جب وہ لوگ متاثرہ بچے کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر اسپتال کی طرف لے جارہے تھے تو بچے کے ماموں نے کہا تھا کہ بچے کا باپ بہت خطرناک اور جھگڑالو آدمی ہے۔ یقیناً اس شخص کو اپنے بچے کی بیماری اور جعلی ڈاکٹر کی گرفتاری کی اطلاع مل گئی تھی چنانچہ وہ سیدھا تھانے اٹھ آیا تھا۔

''اس آدمی کو ذرا آرام سے اندر لے آئیں۔'' شور سن کر اپنی کرسی سے کھڑے ہونے والے تھانے دار کو اس نے حکم دیا تو وہ اپنی پینٹ سنبھالتا ہوا تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔

''اوئے چھوڑ دو اسے اور اندر آنے دو۔'' باہر جا کر اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا جو اندر بھی سنا گیا۔

''یہ ٹھیک نیت سے ادھر نہیں آیا ہے سر جی! اس کی وجہ سے کوئی بڑا لفڑا بھی ہوسکتا ہے۔'' کسی سپاہی نے تھانے دار کو مطلع کرنا ضروری سمجھا۔

''نہیں کرتا لفڑا۔ تم اسے اندر آنے دو اور اس کے باقی ساتھیوں کو باہر ہی روک کر رکھو۔ اسے اے سی صاحب نے اندر بلانے کو کہا ہے۔'' تھانے دار نے قدرے سخت لہجے میں اپنے سپاہی کو جواب دیا تو وہاں خاموشی چھا گئی اور چند لمحوں بعد ہی ایک لمبا تڑنگا بڑی بڑی مونچھوں والا آدمی تھانے دار کے ساتھ اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے ایک زوردار سلام کیا اور شہریار اور عبدالمنان کو جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ شاید وہ اندازہ کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ ان دونوں میں سے اسسٹنٹ کمشنر کون ہے؟ تھانے دار نے اسے اس مشکل سے نکال دیا اور تعارف کرواتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ ''یہ اے سی شہریار عادل صاحب اور ان کے پی اے ہیں۔ اے سی صاحب کی سفارش پر ہی تمہیں میں سپاہیوں کی گرفت سے چھڑوا کر اندر لایا ہوں ورنہ اس وقت تم اور تمہارے ساتھی تھانے پر بلوے کے الزام میں سلاخوں کے پیچھے ہوتے۔''

''جانے دیں تھانے دار صاحب! ہمیں سلاخوں کے پیچھے پہنچانا اتنا آسان نہیں ہے۔ یہ تو سمجھیں کہ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ اس وقت اے سی صاحب یہاں موجود ہیں۔'' اس آدمی نے تمسخرانہ انداز میں تھانے دار کی بات کا جواب دیا اور اس کے چہرے کے بگڑتے ہوئے تاثرات سے بے نیاز شہریار کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''میں یہاں سے فارگ (فارغ) ہوکر آپ کی خدمت میں ہی حاضر ہونے والا تھا۔ آپ نے میرے پتر کو وقت پر اسپتال پہنچا کر ہم پر جو احسان کیا ہے، وہ میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ آپ سمجھیں کہ اس احسان کے بدلے میں آپ نے جگو کو خرید لیا ہے۔ آج سے جگو آپ کا گلام ہے۔ آپ دن رات کے جس پہر میں یاد کریں گے اور مجھے کوئی حکم دیں گے، میں فوراً اسے پورا کرنے کے لیے حاضر ہوجاؤں گا۔'' وہی شخص جو ابھی لمحہ بھر پہلے تھانے دار سے تمسخرانہ لہجے میں بات کررہا تھا، اب سراپا نیاز مند بنا شہریار سے مخاطب تھا۔

''تمہاری اس آفر کے بارے میں تو میں بعد میں سوچوں گا لیکن پہلے تم یہ بتاؤ کہ تھانے میں داخل ہونے کا یہ کون سا طریقہ تھا؟ اگر تمہیں یہاں کوئی کام تھا تو تم آرام سے بھی آکر بات کرسکتے تھے۔'' شہریار نے اسے ٹوکا۔ اسے جگو کے چند جملے سن کر ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ کوئی پہنچی ہوئی چیز ہے جو بہرحال کوئی شریفانہ زندگی نہیں گزار رہا ہے لیکن اپنی ذات کے لیے اس کا غیر مضر ہونا بھی وہ بھانپ چکا تھا۔ اس کے برعکس تھانے دار کافی تناؤ کا شکار تھا اور اس نے اپنا دایاں ہاتھ یوں ریوالور کے دستے پر رکھا ہوا تھا کہ جگو اگر ذرا سی بھی غلط حرکت کرتا تو وہ اسے نشانہ بنالیتا۔

''معافی چاہتا ہوں سر جی! مجھے ملوم ہوتا کہ آپ ادھر ہیں تو ایسی گلطی (غلطی) نہ کرتا۔ میں تو یہاں اس خبیث کا ٹینٹوا دبانے آیا تھا جس کی وجہ سے میرا پتر اسپتال پہنچ گیا۔'' اس نے مستقل مزاجی سے غین کی جگہ گاف کا استعمال کرتے ہوئے اپنا ارادہ بتایا تو شہریار نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ اس نے تھانے دار کے کمرے سے باہر نکلتے ہی وہاں موجود سپاہی کے ذریعے اس جعلی ڈاکٹر کو واپس لاک اپ میں بھجوادیا تھا ورنہ ہوسکتا تھا کہ اس کی موجودگی کے باوجود وہاں صورتِ حال بگڑ جاتی۔

''تم جانتے ہو کہ یہ کھلی بدمعاشی ہے۔ مجرموں سے نمٹنا پولیس کا کام ہے۔ اگر اس طرح ہر شخص اپنا حساب برابر کرنے نکل کھڑا ہو تو قانون اور پولیس کے محکمے کی تو ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ لوگ ایک دوسرے کو خود ہی بدلوں اور سزاؤں کا شکار بناتے رہیں گے اور انسانی بستیوں میں جنگل کی فضا قائم ہوجائے گی۔'' اس نے سخت لہجے میں جگو کو اس کے غلط رویے کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

''پولیس اور قانون کا بھروسا ہی کہاں ہے سر جی! اگر یہ لوگ مجرموں کو پکڑ کر سزائیں دینے والے ہوتے تو ہر طرف اتنی ناانصافی اور ظلم کیوں نظر آتا؟'' جگو نے دھیمے لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ اس نے محض شہریار کے لحاظ میں اپنی آواز پست کر رکھی ہے ورنہ پولیس والوں کی اس کی نظر میں کوئی عزت و وقعت نہیں۔

''اور کسی کو بھروسا ہو یا نہ ہو، تمہیں بھروسا کرنا چاہیے کیونکہ تمہارا مجرم بروقت پکڑا گیا ہے اور جب ہم نے اسے گرفتار کیا ہے تو پھر اسے اس کے جرم کی سزا بھی دلوائیں گے۔'' جگو کو یہ جواب دیتے ہوئے شہریار کی آواز کافی بلند تھی۔

''معافی چاہتا ہوں سر جی! یہ تو آپ کا احسان ہے کہ مجرم پکڑا گیا ہے اور میں آپ کے آگے بحث بھی نہیں کرسکتا۔ بس اتنا کہوں گا کہ میں نے ایک عمر پولیس کے ساتھ آنکھ مچولی

کرتے ہوئے گزاری ہے اس لیے میں ان لوگوں کی رگ رگ سے واقف ہوں۔" اس کی بلند آواز کے ردِعمل میں بھی جگو کا لہجہ پست ہی رہا اور اس نے شہریار کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے عاجزی سے جواب دیا۔ اس بار شہریار اسے کچھ کہہ نہیں سکا۔ جگو کی شخصیت سے وہ یہ اندازہ تو پہلے ہی قائم کر چکا تھا کہ اس شخص کی زندگی شریفانہ سرگرمیوں میں نہیں گزری ہے۔ اب اس نے واضح طور پر اس بات کا اظہار بھی کر دیا تھا کہ پولیس تھانہ اس کے لیے کوئی نئی یا انجان چیز نہیں ہیں۔

"یہ میرا فون نمبر ہے۔ اگر کبھی آپ ضرورت محسوس کریں تو بس ایک فون کر دیجیے گا، میں سر کے بل چلا آؤں گا۔" وہ کاغذ کی ایک پرچی پر لکھا اپنا فون نمبر اسے تھما کر سلام کرتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔ شہریار اپنے ہاتھ میں تھمائی گئی پرچی اور جاتے ہوئے جگو دونوں پر ایک ایک نظر ڈالتا جہاں کا تہاں بیٹھا رہ گیا۔

☆☆☆

مشابرم خان نے اپنے شانے سے لٹکا بھاری رک سیک نیچے پھینکا اور خود ایک بڑے سے پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ گہرے گہرے سانس لے کر اپنے پھیپھڑوں میں زیادہ سے زیادہ آکسیجن جمع کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت اس نے ایک کافی کٹھن چڑھائی طے کی تھی اور اس کٹھنائی کی وجہ سے ہی اس کا سانس پھول گیا تھا۔ پھولی ہوئی سانس پر قابو پا کر اسے ہموار کرنے کے بعد اس نے تھرماس نما بوتل نکالی اور اس کا ڈھکن کھول کر پانی کے بڑے بڑے گھونٹ پینے لگا۔ یہ نمکول ملا پانی تھا جس نے اس کے تھکے ماندے جسم کو فوری توانائی مہیا کی۔ ماں کی خواہش کے احترام میں پہاڑوں کی زندگی ترک کر کے ڈرائیوری کا پیشہ اختیار کرنے والے مشابرم خان کو پہاڑوں کے مزاج سے خوب آشنائی تھی۔ اس نے آنکھ کھولتے ہی اپنے گھر میں ایسا ماحول دیکھا تھا کہ اس کے لیے پہاڑوں سے یکسر انجان رہنا ممکن ہی نہیں تھا۔ اس کا باپ اور بڑا بھائی ہر وقت سفر میں رہتے تھے۔ انہوں نے غیر ملکی ٹیموں کے ساتھ کئی اونچی اونچی چوٹیوں کو سر کیا تھا۔ مشابرم خان کا باپ اپنے تینوں بیٹوں کو بھی اسی پیشے میں دیکھنا چاہتا تھا چنانچہ وہ وقتاً فوقتاً انہیں ٹرکی باتیں بتاتا رہتا تھا۔ مشابرم خان نے اپنے باپ کے ساتھ ایک دو نسبتاً چھوٹی مہمات میں حصہ بھی لیا تھا پھر اس کا باپ حادثے کا شکار ہو گیا اور اس کے بعد بڑا بھائی بھی۔ ان دو حادثات نے اس کی ماں کو اتنا خوف زدہ کیا کہ اس نے زندہ رہ جانے والے اپنے باقی دونوں بیٹوں کو بلندی کے سفر سے روک دیا۔ دونوں نے ہی ماں کی اس خواہش کا احترام کیا۔ اکرم خان نے خود کو صرف اسکردو سے ہوشے تک محدود کر لیا اور وہ خود رزق کے حصول کے لیے پہاڑی وادیاں چھوڑ کر میدانی علاقوں میں چلا گیا۔ اس کی یہ ہجرت رزق کے حصول سے زیادہ اپنے شوق کو قابو میں رکھنے کے لیے بھی تھی۔ درحقیقت وہ پہاڑوں کا عاشق تھا اور اسے معلوم تھا کہ وہ اکرم خان کی طرح خود کو محدود رکھ کر یہاں نہیں رہ سکتا۔ اس کی مہم جو فطرت کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ کسی ایکسپی ڈیشن ٹیم کو ہوشے کی کیمپنگ سائٹ پر چھوڑ کر خود واپس آ جاتا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ وہاں تک جائے گا تو پھر اس سے آگے جانے سے خود کو ہرگز بھی نہیں روک پائے گا اور اس صورت میں وہ ماں کی نافرمانی و دل آزاری کا مرتکب ہو سکتا تھا لہٰذا اس نے خود کو پہاڑوں سے دور رکھنا ہی مناسب سمجھا مگر شاید اس کی پہاڑوں سے محبت یک طرفہ نہیں تھی۔ خود پہاڑ بھی اس سے ملاقات کے مشتاق تھے جو انہوں نے خود اسے پکار لیا اور وہ یہ سفر اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا۔ محدود تجربے کے باوجود اس نے اب تک کا سفر کامیابی سے طے کیا تھا اور اپنے اندازے کے مطابق اس مقام کے قریب پہنچ چکا تھا جس کی نشان دہی سفر سے واپس آنے والے ایک پورٹر نے کی تھی۔ پورٹر نے بتایا تھا کہ اس نے اس جگہ پر فائرنگ کی آوازیں سنی تھیں اور مشابرم خان کے دل نے گواہی دی تھی کہ اس فائرنگ کا تعلق ان لوگوں سے ہے جن کی اسے تلاش ہے۔ چنانچہ وہ زیادہ سوچ بچار کیے بغیر روانہ ہو گیا تھا اور نہایت کامیابی سے سفر کر کے اتنی دور تک پہنچ کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ مچھلی کے بچے کو کسی سے تیرنا سیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ سفر کے لیے جو لوازمات درکار تھے، ان کے سلسلے میں بھی اسے کوئی پریشانی نہیں اٹھانی پڑی تھی۔ کاندے میں موجود اس کے گھر میں ایک لکڑی کا صندوق طویل عرصے سے ان لوازمات کو اپنے سینے میں سمو کر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ صندوق اور اس میں موجود سامان اس کے باپ کی نشانی تھی۔ کوہ پیمائی میں استعمال ہونے والی یہ اشیا ایک جرمن کوہ پیما نے اس کے باپ کی خدمات پر خوش ہو کر اسے عنایت کی تھیں۔ وہ چاہتا تو ان اشیا کو بیچ کر اچھی خاصی رقم کما سکتا تھا لیکن وہ لالچ و طمع سے پاک ایک وضع دار آدمی تھا جس نے تحفے کو تحفہ ہی سمجھا تھا اور بڑی محبت سے سنبھال کر رکھا تھا۔ آج یہ سنبھال کر رکھا گیا تحفہ مشابرم خان کے کام آ رہا تھا۔ اپنی مہم پر روانہ ہونے کے لیے اسے صرف خور و نوش کی اشیا کا انتظام کرنا پڑا تھا۔ کرائے کی جیپ بھی اس نے کاندے تک کے لیے اپنے پاس رکھی تھی اور پھر ٹورسٹ کمپنی کے ایک نمائندے کے ذریعے واپس بھجوا دی تھی۔

آگے کا سفر اس نے کاندے سے ہوشے تک کا دن میں کئی بار پھیرا لگانے والی جیپوں میں سے ایک پر کیا تھا اور اس سے آگے تو پھر ہر ایک کو ہی پیدل مسافت طے کرنی پڑتی ہے۔ بڑی بڑی عالی شان گاڑیوں میں سفر کرنے والے بھی پہاڑوں کے سامنے سرنگوں ہو کر پیدل سفر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور یہ مجبوری ایسی ہوتی ہے جسے بندہ اپنے شوق اور خواہش سے اپناتا ہے۔ مشابرم خان کا معاملہ ذرا سا مختلف تھا۔ پہاڑوں کو سر کرنے کا شوق اور خواہش تو وہ بھی اپنے دل میں رکھتا تھا لیکن موجودہ سفر اس نے کسی خواہش اور شوق کی تکمیل کے لیے نہیں بلکہ مقصد کے تحت اختیار کیا تھا۔ اپنے مقصد میں کامیابی کی بظاہر کوئی امید نہیں تھی۔ اس سفر کو اختیار کر کے اس نے ایک طرح سے بلائنڈ چال چلی تھی لیکن بس یہ اس کے اندر کی آواز تھی جسے سن کر وہ چل پڑا اور اب انسانی آبادی سے بہت دور اس ویران برف زار میں موجود تھا۔

وہ جس جگہ بیٹھا تھا وہاں سے اسے اونچے اونچے برف پوش پہاڑوں اور بڑے بڑے پتھروں کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس پورے علاقے میں اس کے سوا کوئی دوسرا شخص موجود نہیں تھا اور یہ تنہائی اسے سوچنے پر مجبور کر رہی تھی کہ اگر وہ اس ویرانے میں کہیں مر جائے تو کسی کو خبر بھی نہیں ہوگی کہ وہ کس انجام سے دوچار ہوا ہے۔ اس کی جان پہچان والے اسے ہمیشہ ایک گمشدہ شخص ہی سمجھتے رہیں گے، خاص طور پر شہریار کو اس کی گمشدگی پر ضرور ہی تشویش ہوتی۔ اس نے مشابرم خان پر اعتماد کرتے ہوئے اسے چند ذمے داریاں سونپی تھیں، وہ خلوص دل سے اس کے لیے کام کرتا بھی رہا تھا لیکن اپنی جذباتیت کی وجہ سے یہ غلطی کر بیٹھا تھا کہ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے شہریار کو اطلاع نہیں دی تھی۔ اس کا اچانک غیاب یقیناً شہریار کے لیے پریشانی کا باعث بنا ہو گا لیکن مجبوری یہ تھی کہ اب کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

وہ اس وقت زمین کے جس خطے پر موجود تھا، وہاں سے کسی سے رابطے کی کوئی صورت نہیں تھی چنانچہ اپنی غلطی کے ازالے کے لیے اسے اب یہی کرنا تھا کہ کسی طرح کوئی بڑی کامیابی حاصل کر کے واپس لوٹے اور کامیابی کا دار و مدار بڑی حد تک قسمت پر تھا۔ قسمت اسے کہاں لے جانے والی تھی، وہ نہیں جانتا تھا لیکن اسی پر بھروسا کر کے کچھ دیر سستانے اور سانس ہموار کرنے کے بعد اپنی جگہ سے اٹھا اور ایک بار پھر رک سیک کو شانے سے لٹکا کر چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ اس کی نظر کافی فاصلے پر موجود کسی سیاہ چیز پر پڑی۔ دور سے دیکھنے پر وہ سفید برف پر موجود کوئی سیاہ دھبا محسوس ہوا تھا اور اتنا نمایاں تھا کہ اس کا اس کی طرف متوجہ ہونا لازمی تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا اس سیاہ دھبے کی طرف بڑھنا شروع ہو گیا۔ جیسے جیسے فاصلہ سمٹتا جا رہا تھا، منظر زیادہ واضح ہوتا جا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ کوئی بہت بڑا سا سیاہ پتھر ہے جسے برف نے ڈھانپ لیا ہے اور اس کا صرف ایک حصہ برف کے لباس سے باہر نکل کر جھانک رہا ہے۔ مشابرم خان شاید اسے کوئی پتھر سمجھ کر نظر انداز کر دیتا لیکن اس علاقے میں سفر کرتے ہوئے اس نے اب تک ایک بھی اس نوعیت کا پتھر نہیں دیکھا تھا چنانچہ تجسس کی انگلی تھامے وہ اس برف کے ڈھیر کے پاس پہنچ گیا اور ہاتھ بڑھا کر اس کے سیاہ حصے کو انگلیوں کی مدد سے چھوا۔ فوری طور پر اس کے جسم میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اس کا اندازہ بالکل درست تھا۔ دور سے پتھر دکھائی دینے والا وہ ڈھیر واقعی پتھر نہیں تھا بلکہ کسی جانور کا مردہ جسم تھا جس کی کھال سردی سے سخت ضرور ہو گئی تھی لیکن بہرحال یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کوئی پتھر نہیں ہے۔

اپنے تجربے کی بنیاد پر مشابرم خان یہ قیاس کر سکتا تھا کہ اس جثے کا جانور یاک کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اپنے اندازے کی درستی کو جانچنے کے لیے اس نے بغور اس ڈھیر کا جائزہ لیا اور پھر اپنے سامان میں سے ایک کھرپی سی نکال کر احتیاط سے برف کو ہٹانے لگا۔ برف کی وہ تہ بہت گہرائی نہیں تھی اس لیے اسے بہت زیادہ محنت نہیں کرنی پڑ رہی تھی۔ بالآخر پانچ چھ منٹ کی کوشش کے بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا اندازہ بالکل درست تھا۔ برف کی تہ میں سے جو چہرہ باہر نکلا تھا، وہ سو فیصد ایک یاک کا تھا جس کی موت کی وجہ کا تعین کرنے میں اسے بالکل بھی دقت پیش نہیں آئی۔ یاک کی کھوپڑی میں موجود گولی کا سوراخ بے حد نمایاں تھا۔ مشابرم خان ایک گہرا سانس لیتا ہوا سیدھا کھڑا ہو گیا۔ قسمت نے اب تک اس کا خوب ساتھ نبھایا تھا۔ گولی سے ہلاک شدہ اس یاک کا مردہ جسم گواہ تھا کہ وہ اس جگہ پر پہنچ گیا ہے جس کی اسے تلاش تھی۔ یاک کی کھوپڑی میں موجود سوراخ کا قطر ظاہر کر رہا تھا کہ اس کی موت کا سبب بننے والی گولی کسی رائفل سے نکلی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس مقام پر رائفل کا استعمال کرنے والے لوگ وہی ہو سکتے ہیں جنہوں نے اکرم خان کو ہلاک کیا تھا اور ماہ

بانو کو اغوا کر کے ان پہاڑوں میں کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ اپنے دشمنوں کی کہیں قریب ہی موجودگی کے خیال سے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا لیکن فی الحال اسے وہاں کسی انسان کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ فائرنگ کا واقعہ ان کے ٹھکانے سے دور پیش آیا ہو اور وہ یہاں سے کہیں دور موجود ہوں۔ حقیقت جو بھی تھی، ابھی تک پردے میں ہی تھی اور وہ جس طرح قسمت اور اپنی لگن پر بھروسا کر کے یہاں تک آیا تھا، اسی طرح آگے کا سفر بھی جاری رکھنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن اب وہ محتاط ہو گیا تھا اور پہلے کی طرح بے خطر سفر کرنے کے بجائے خود کو چٹانوں اور پتھروں کی آڑ میں چھپا کر سفر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنے وجدان کے سہارے خود ہی ایک سمت کا تعین کر لیا تھا اور اس سمت میں بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ سفر کا یہ پُرامید مرحلہ شروع ہوئے ابھی مشکل سے آدھا گھنٹا ہی گزرا تھا کہ اس نے زمین میں دھمک سی محسوس کی۔ اس دھمک کو سن کر وہ اپنی جگہ ساکت ہو گیا اور اپنے اطراف کا چوکنا نظروں سے جائزہ لینے لگا۔ جلد ہی اس کے سامنے سنائی دینے والی دھمک کی وجہ آ گئی۔ وہ ایک قوی الجثہ یاک تھا جو اس کی نظروں کے سامنے سے بڑی شان سے گزرتا ہوا اسی سمت جا رہا تھا جس سمت میں وہ خود بھی سفر کر رہا تھا۔ یاک کی پشت پر اسلحہ بردار دو آدمی سوار تھے۔ اگر مشابرم خان ایک بڑے پتھر کی آڑ میں نہ چھپا ہوا ہوتا تو ان کی نظروں کی زد میں آ سکتا تھا لیکن خیر گزری اور وہ یاک سوار اس کے سامنے سے گزرتے چلے گئے۔ وہ آگے نکلے تو مشابرم خان بھی اپنی اتھل پتھل ہوتی دھڑکنوں کو سنبھالتا ہوا ان کے پیچھے چل پڑا۔ وہ جس اندھے راستے پر چل رہا تھا، اس پر ان یاک سواروں کا نظر آ جانا کسی غیر متوقع مشعل کے جل اٹھنے کے برابر تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر ایک تو اسے یہ تقویت حاصل ہوئی تھی کہ اس کا اب تک کا سفر رائگاں نہیں گیا، دوسرے اب وہ ان کے نقشِ پا پر چلتا ہوا ان کے ٹھکانے تک بھی پہنچ سکتا تھا۔

بے حد احتیاط پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے تعاقب شروع کر دیا لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ پیدل چل کر ان کا تعاقب جاری نہیں رکھ سکتا۔ ان کی تیز رفتار سواری بہت جلد انہیں اس کی نظروں سے اوجھل کر دے گی۔ اس مسئلے کے حل کے لیے اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور وہ ان کے تعاقب میں ان کے پیچھے پیچھے چلنا ترک کر کے ایک قریبی نسبتاً اونچی پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ یہ چڑھائی کچھ مشکل نہیں تھی اس لیے جلد ہی وہ بلندی پر پہنچ گیا۔ اب شمال کی طرف جانے والا یاک اور اس کے سوار اس کی نظروں کے سامنے تھے۔ تاحدِ نگاہ پھیلے ہوئے منظر میں وہ انہیں سفر کرتا ہوا دیکھتا رہا، یہاں تک کہ محوِ سفر یاک کی متحرک تصویر لحہ بہ لحہ چھوٹی ہوتے ہوتے پہلے ایک سیاہ نقطے میں ڈھلی پھر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ یاک کے نظروں سے اوجھل ہو جانے کے بعد وہ ایک گہرا سانس لیتا ہوا پہاڑی سے نیچے اتر آیا اور خود بھی اسی سمت میں چلنا شروع کر دیا۔ جہاں تک اس کی نظروں نے ساتھ دیا تھا، وہاں تک کا راستہ اس کے لیے واضح تھا۔ اس کے بعد آگے شاید اسے پہلے ہی کی طرح قسمت پر بھروسا کرنا تھا۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی، یہ سوچ کر وہ چل پڑا۔ یاک نے جو فاصلہ نہایت قلیل وقت میں طے کر لیا تھا اُسے طے کرنے میں اس کا اچھا خاصا وقت اور توانائی خرچ ہوئی۔ اس مسافت کی تھکن اتارنے اور توانائی بحال کرنے کے لیے وہ کچھ دیر کے لیے بیٹھ گیا۔ ذرا سا ستا لینے اور پانی کے گھونٹ حلق میں انڈیل لینے کے بعد اس نے اردگرد کا جائزہ لینا شروع کیا تاکہ آگے کے سفر کے لیے سمت کا تعین کر سکے۔ اس جائزے نے اسے ایک بار اپنی خوش قسمتی کا احساس دلایا۔ وہ اس وقت جس جگہ موجود تھا، وہاں سے آگے بڑھنے کی صرف ایک ہی راہ تھی جو سیدھی جا رہی تھی۔ اس راستے کے علاوہ دائیں بائیں بالکل عمودی چٹانیں کھڑی ہوئی تھیں چنانچہ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ یاک سوار سیدھے جانے کے بجائے کسی اور سمت میں نکل گئے ہوں۔ وہ تہِ دل سے اللہ کا شکر ادا کرتا ہوا ایک بار پھر چل پڑا۔ اس بار مسافت خاصی مختصر ثابت ہوئی لیکن اس مسافت کے اختتام پر سامنے آ جانے والی پہاڑیاں اس کی خوش قسمتی کے لیے تازیانہ ثابت ہوئیں۔ ان پہاڑیوں کی نوعیت و ساخت کچھ اس طرح کی تھی کہ انہیں عبور کرنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن عقل یہ بھی کہتی تھی کہ یاک اور اس کے دونوں سوار اسی طرف آئے تھے۔ اگر وہ یہاں آئے تھے اور آگے کا سفر کیا تھا تو یہ بات یقینی تھی کہ انہوں نے کسی طرح ان پہاڑیوں کو عبور کیا تھا۔ اسے وہ مقام کھوجنا تھا جہاں سے دوسری طرف پہنچا جا سکتا۔ اس تجسس اور کھوج میں وہ اس طرح مگن ہوا کہ ساری احتیاط بھول کر اردگرد کے ماحول سے غافل ہو گیا۔ اس کی اس غفلت نے رنگ دکھایا اور اسے علم ہی نہیں ہو سکا کہ کب وہ تین عدد بندوق بردار اچانک آ کر اس کے سر پر سوار ہو گئے ہیں۔ وہ تو ان کی طرف اس وقت متوجہ ہوا جب ایک بندوق کی نال اس کی کنپٹی سے آ لگی اور اسے غراتی ہوئی آواز میں دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھا لینے کا حکم دیا گیا۔

☆☆☆

"کیا حال ہیں چودھری صاحب! آپ تو ایسے واپس گئے کہ پلٹ کر ہمیں پوچھا ہی نہیں۔ لنڈا ابھی شکایت کر رہی تھی کہ چودھری صاحب نے ایک فون کال تک نہیں کی، وہاں جا کر ہمیں بھول گئے۔" چودھری نے نیویارک سے آنے والی ڈیوڈ کی کال ریسیو کی تو اس نے چودھری کے ہیلو کہتے ہی شکوے شروع کر دیے۔

"ایسی کوئی بات نہیں مسٹر ڈیوڈ! آپ لوگ مجھے وڈی چنگی طرح یاد ہیں۔ بس میں واپس آتے ہی کچھ ایسے مسئلوں میں الجھ گیا کہ آپ کو یا لنڈا کو کال کرنے کا وقت ہی نہیں نکال سکا۔" چودھری نے لہجے میں مصنوعی بشاشت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ڈیوڈ کی بات کا جواب دیا۔

درحقیقت وہ آج کل بہت پریشان تھا۔ رانی کے مرنے کے بعد اس کے پاس کشور کا سراغ لگانے کے لیے کوئی کلیو نہیں رہا تھا اور معاملہ ایسا تھا کہ وہ کھل کر اپنے بندوں کو اس کام پر بھی نہیں لگا سکتا تھا۔ اپنے ہی ملازمین کے سامنے یہ اعتراف کرنا کہ اس کی یعنی چودھری افتخار عالم شاہ کی بیٹی بھاگ گئی ہے، بڑی ذلت کی بات تھی اور وہ یہ ذلت برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے ابھی تک کشور کی تلاش کا کام بھی ڈھنگ سے شروع نہیں ہو سکا تھا۔ لے دے کر وہ اس کے قریبی ملازمین کو ہی ٹٹول سکتا تھا اور اس مقصد کے لیے لاہور تک چلا گیا تھا تاکہ اگر وہاں کے ملازمین کی نظر میں کچھ آیا ہو تو ان سے معلوم کر سکے۔ وہاں سے اسے صرف وہی باتیں معلوم ہوئیں جو کسی حد تک وڈی چودھرائن نے بھی بتا دی تھیں۔ لاہور کی کوٹھی پر موجود ملازمہ حاجرہ نے اسے کشور کے بیوٹی پارلر جانے اور دلہنوں جیسی تیاری کرنے کے بارے میں جھجکتے ہوئے بتایا تھا لیکن اس سے زیادہ وہ بھی کچھ نہیں جانتی تھی کہ کشور رانی کے علاوہ کسی دوسرے ملازم کو زیادہ قریب آنے کا موقع ہی نہیں دیتی تھی اور رانی نے حاجرہ کو یہی بتایا تھا کہ کشور کی ذہنی حالت کچھ ٹھیک نہیں ہے اس لیے وہ ایسی الٹی سیدھی حرکتیں کرتی رہتی ہے۔ اس بیان سے

چودھری سمجھ گیا کہ بیٹی اپنی ملازمۂ خاص کی مدد سے بہت صفائی سے سب کو بے وقوف بناتی رہی ہے۔

وہ بہت دنوں سے ہی کسی کے چکر میں تھی لیکن تھوڑی بہت مشکوک حرکات کے سوا اس نے اتنی چالاکی کا مظاہرہ کیا کہ کسی کو اس شخص کے بارے میں بھنک بھی نہیں لگنے دی جس کے عشق کے سہارے وہ باپ کے اونچے شملے کو ٹھوکر لگا کر حویلی سے بھاگ نکلنے کی ہمت کر سکی تھی۔ اس شخص کے بارے میں یقینی طور پر رانی کو معلوم تھا لیکن اس نے بھی جان دینا منظور کر لیا، پر زبان نہیں کھولی۔ اب وہ رانی کی روح سے تو معلومات حاصل نہیں کر سکتا تھا چنانچہ پیچ و تاب کھاتا کبھی بیویوں پر اپنا غصہ نکالتا اور کبھی نوکروں کی شامت آجاتی لیکن مسئلہ اس طرح تو حل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی جگہ ہنوز اسی طرح موجود تھا۔

''کیسے مسئلے چودھری صاحب! آپ کو اگر کوئی پریشانی تھی تو مجھ سے شیئر کرنی چاہیے تھی۔ آخر آپ اور ہم دوست ہیں۔ ہم آپ کو پریشان کیسے دیکھ سکتے ہیں؟'' ڈیوڈ نے اسے کریدنے کی کوشش کی۔

''آپ کے خلوص کا شکریہ مسٹر ڈیوڈ لیکن اصل میں کل یہ ہے کہ مسئلہ ذرا ذاتی نوعیت کا ہے اس لیے میں نے اسے کسی بھی دوست یا ہمدرد سے شیئر کرنا مناسب نہیں سمجھا اور پھر آپ تو ہیں بھی بہت دور۔ آپ میری کیا مدد کر سکتے ہیں؟''

''یہ کیسی بات کر دی آپ نے چودھری صاحب! ہم دور ہیں تو کیا آپ کی طرف سے غافل بھی ہو جائیں گے۔ آخر کو آپ سے دوستی کا ہاتھ ملایا ہے اور دوستوں کے حال سے باخبر رہنا ہماری دوستی کا اولین اصول ہے۔'' چودھری کی بات کے جواب میں کہی گئی ڈیوڈ کی بات خاصی معنی خیز تھی۔ ایک طرح سے وہ دعویٰ کر رہا تھا کہ سات سمندر پار بیٹھ کر بھی وہ واقف ہے کہ چودھری کی حویلی میں کون سا واقعہ پیش آچکا ہے۔ اس کے اس انداز پر چودھری چونک پڑا۔

''کیا مطلب؟'' کچھ بے یقینی کے عالم میں اس نے یہ دو لفظی سوال کیا۔

''مجھے آپ کے مسئلے کی نوعیت کا علم ہے چودھری صاحب! آپ اپنی بیٹی کے اچانک حویلی سے غائب ہو جانے کی وجہ سے پریشان ہیں اور ابھی تک اس کا کوئی سراغ نہیں لگا سکے ہیں۔'' ڈیوڈ کے جواب نے چودھری کو لمحہ بھر کے لیے سن کر دیا۔ وہ جس بدنامی کی خبر کو اپنے سائے سے بھی چھپانے کی کوشش کر رہا تھا، وہ خبر اڑ کر نیو یارک تک جا پہنچی تھی۔

''آپ خود مجھے اپنا مسئلہ بتاتے تو مجھے خوشی ہوتی۔ بہر حال، میں نے اپنی طرف سے دوستی نبھانے کی پوری کوشش کی ہے اور آپ کے لیے ایک ایسا کلیو تلاش کیا ہے جس سے یقیناً آپ کو بہت مدد ملے گی۔'' اس کی اندرونی کیفیت سے بے خبر ڈیوڈ اپنی ہی بولے جا رہا تھا لیکن اس کی یہ بات ایسی تھی جس نے چودھری کے اندر زندگی جگا دی۔

''کیسا کلیو؟ پلیز... مجھے تفصیل سے بتائیں مسٹر ڈیوڈ! اگر آپ کی مدد سے میں اپنے مجرم تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تو سمجھیں یہ آپ کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا جسے میں کبھی نہیں بھولوں گا۔'' اس کی اس بے تابی پر لائن کی دوسری طرف موجود ڈیوڈ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ وہ جس قوم کا نمائندہ تھا، وہ کسی پر احسان کرتے ہی اس لیے تھے کہ اس سے سود سمیت فائدہ حاصل کیا جائے۔ چودھری نے ہمیشہ اس کے احسان کو یاد رکھنے کا دعویٰ کیا تھا۔ حقیقتاً اگر کبھی چودھری اس احسان کو بھولنے بھی لگتا تو وہ اسے یاد دلا دیتا اور ہرگز بھی بھولنے نہ دیتا۔

''میری درخواست پر میرے چند دوستوں نے اس واقعے کی تحقیقات کی ہیں اور کچھ شکوک کا اظہار کیا ہے۔ اب ان شکوک کی تصدیق کر کے آگے کی کارروائی کرنا آپ کی ذمے داری ہے۔''

''میں سب دیکھ لوں گا۔ آپ بس مجھے اس بندے کا نام بتائیں جس نے ہماری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔'' چودھری جو پہلے ہی غصے سے بھرا بیٹھا تھا، کوئی سراغ مل جانے کی امید بندھنے پر بے تابی سے بولا۔

''بندے کا نام سننے سے پہلے آپ کو واقعات کو سمجھنا ہوگا۔ مجھ تک جو اطلاعات پہنچی ہیں، ان کے مطابق آپ کی بیٹی جمعرات کی شام درگاہ گئی تھی۔ اس کے بعد اسے کسی نے نہیں دیکھا یعنی وہ اس شام درگاہ سے ہی غائب ہو گئی تھی۔'' ڈیوڈ کا انداز ایسا تھا جیسے وہ چودھری سے اپنی بات کی تصدیق چاہتا ہو۔ چودھری نے اس کی تائید کی۔

''ہاں! اس کی ملازمہ جو اس کے ساتھ گئی تھی، وہ یہی اطلاع لے کر حویلی آئی تھی کہ کشور بی بی درگاہ کے اندر سے اچانک ہی غائب ہو گئی ہیں اور پچھلی طرف درگاہ کا ایک خادم بے ہوش پڑا ہے۔''

''بالکل صحیح۔ اب آگے سنیں۔ یہ جمعرات کے دن کی ہی بات ہے کہ آپ کے گاؤں میں میڈیا سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگ آئے ہوئے تھے۔ بظاہر ان کا مقصد یہی تھا کہ وہ پیر آباد اور ارد گرد کے دیہاتوں میں جاری ترقیاتی کاموں کے بارے میں رپورٹ تیار کر کے اپنے چینل پر چلائیں۔ انہوں نے یہ کام کیا بھی لیکن ان افراد میں سے افضل نام کا ایک صحافی ایسا تھا جو پورا وقت اپنی ٹیم کے ساتھ نہیں رہا۔ وہ اپنی بیوی کو اپنے ساتھ لے کر آیا تھا اور اچانک ہی اس کی طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کر کے واپس شہر لوٹ گیا۔''

''یہ سب تو مجھے بھی معلوم ہے۔ میرے بندے اتنے بے خبر نہیں رہتے کہ گاؤں میں آنے جانے والوں کے بارے میں رپورٹ نہ رکھیں۔'' چودھری نے ڈیوڈ کی بات کاٹتے ہوئے اپنے باخبر ہونے کی اطلاع دینا ضروری سمجھا۔

''بے شک آپ کے بندوں نے آپ کو یہ ساری رپورٹ دی ہوگی لیکن ایک بات انہیں نہیں معلوم تھی اس لیے انہوں نے آپ کو بھی نہیں بتائی ہوگی۔''

''وہ کیا؟'' ڈیوڈ کے سنسنی خیز انداز پر چودھری نے بے ساختہ ہی پوچھا۔

''وہ یہ کہ افضل آپ کے دشمنوں میں سے ایک ماسٹر آفتاب کا گہرا دوست ہے۔ اب آپ سوچیے کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ اس وقت جبکہ گاؤں کے بیشتر افراد کی توجہ میڈیا والوں کی طرف تھی اور افضل اپنی بیوی کے ساتھ قبل از وقت اپنے ساتھیوں کو کام کرتا چھوڑ کر گاؤں سے نکل گیا تھا، وہ جاتے جاتے آپ کی بیٹی کو بھی اپنے ساتھ اپنی گاڑی میں بٹھا کر لے گیا ہو؟'' ڈیوڈ کا پیش کردہ تجزیہ واقعی بڑا غور طلب تھا۔ چودھری جوں جوں سوچ رہا تھا، اسے ڈیوڈ کی بات بالکل صحیح محسوس ہو رہی تھی۔ حویلی کے ملازمین اور گاؤں کے نوجوانوں میں سے کسی کی اتنی جرأت نہیں ہو سکتی تھی کہ چودھری افتخار کی بیٹی کے قریب پھٹک بھی سکیں پھر کشور کا اپنا بھی ایک مزاج تھا۔ وہ نفاست پسند اور پڑھنے لکھنے سے شغف رکھنے والی لڑکی تھی جس کا ماسٹر آفتاب جیسے شخص سے متاثر ہو جانا بعید از امکان نہیں تھا۔ آفتاب وہ شخص تھا جو گاؤں میں بھی سرگرم رہتا تھا اور اس کا شہر بھی آنا جانا لگا رہتا تھا۔ بہت ممکن تھا کہ گاؤں میں نہ سہی شہر میں اس کی کشور سے کہیں ملاقات ہو گئی ہو اور اس ملاقات نے محبت کا روپ دھار کر کشور کو بغاوت پر اکسایا ہو۔ حقیقت جو بھی تھی، نہ تو وہ اپنی باغی بیٹی کو معاف کر سکتا تھا اور نہ ہی اسے بغاوت کی راہ پر چلانے والے کو۔

''بہت شکریہ مسٹر ڈیوڈ! آپ کی دی ہوئی انفارمیشنز یقیناً میرے بہت کام آئیں گی اور میں آپ کے... فی الحال مجھے اجازت دیں تاکہ میں اس معاملے کو نمٹا لوں۔'' عجلت میں یہ چند جملے کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ وہ کسی زخمی درندے کی طرح اپنے حریف پر ٹوٹ پڑنے کے لیے بے چین تھا اس لیے فی الحال باتوں میں زیادہ وقت خرچ کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

بے سمت چلتے چلتے اسے کتنا وقت گزر گیا تھا وہ اندازہ لگانے سے قاصر تھی۔ اس برف زار میں پہر، گھنٹے، دن سب کی پہچان مٹ گئی تھی۔ بس کچھ سمجھ آتا تھا تو وہ یہ کہ ایک مسافت ہے جو جاری ہے اور جس کی انتہا کا کچھ معلوم نہیں کہ کب یہ ختم ہوگی اور منزل ملے گی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ منزل مرے سے ملتی ہی نہیں اور وہ یونہی چلتے چلتے عمران کی طرح موت کی آغوش میں جا پہنچتی۔ تنہائی، تھکن اور موسم کی سختی نے مل کر اسے نڈھال کر دیا تھا لیکن وہ کوشش کر رہی تھی کہ ان سب چیزوں کو اپنے اعصاب پر حاوی نہ ہونے دے۔ اگر وہ اپنی کیفیات کو اپنے اعصاب پر حاوی ہونے دیتی تو پھر اس کا نتیجہ شدید مایوسی کی صورت میں ہی نکلتا اور مایوسی موت کی دوسری صورت ہے۔ مایوس انسان سانسوں کی گنتی ختم ہونے سے قبل ہی عملاً مردہ ہو چکا ہوتا ہے جو نہ تو اپنے لیے کچھ کر سکتا ہے اور نہ ہی دوسروں کے کام آسکتا ہے۔

وہ کئی بار مشکل حالات سے بہ خیر و عافیت بچ نکلی تھی اور اس کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہو گیا تھا کہ اللہ اسے بار بار بچاتا ہے تو اس لیے کہ اسے اس کی زندگی منظور ہے اور وہ اللہ کی عطا کردہ اس زندگی کو کسی خاص مقصد کے لیے استعمال کر سکتی ہے چنانچہ وہ اپنی طاقت کا خزانہ ختم ہونے تک اللہ کی

مطلوبہ کتاب

لندن میں ایک خاتون نے ایک کتاب فروش سے کوئی ایسی کتاب ڈھونڈنے کو کہا جس میں موٹاپا کم کرنے کے طریقے اور دوائیں درج ہوں۔ کچھ عرصے بعد وہ خاتون اسی دکان میں گئیں تو کتب فروش خوش ہو کر کہنے لگا۔ ''یہ لیجیے آپ کی مطلوبہ کتاب مگر آپ تو پہلے سے خاصی دبلی نظر آرہی ہیں؟''

''جی ہاں...'' خاتون بولیں۔ ''میرے شوہر گم ہو گئے ہیں اور میں اسی پریشانی میں دبلی ہو گئی ہوں۔''

''اوہ۔'' دکان دار نے فکرمند لہجے میں کہا۔ ''آپ نے پولیس کو بھی اطلاع دی کہ نہیں؟''

''جی نہیں! میں چاہتی ہوں، تھوڑی سی اور دبلی ہو جاؤں پھر پولیس کو اطلاع دوں۔''

(مرسلہ: تنزیل احمد۔ کراچی)

اس نعمت کو بچانے کی جدوجہد کرنا چاہتی تھی لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، اس کے لیے بقا کی جدوجہد جاری رکھنا دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی جسمانی طاقت کے مسلسل زائل ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے پاس موجود خوراک اور ایندھن کا ذخیرہ بھی ختم ہونے کو تھا۔ اس پر سے مستزاد یہ کہ آج صبح سے اسے بخار بھی ہو گیا تھا۔ بخار کے علاج کے لیے اس نے اپنے پاس بچ جانے والی آخری گولی فوراً ہی کھالی تھی۔ گولی کھانے سے اسے وقتی طور پر افاقہ بھی ہوا تھا لیکن چند گھنٹوں بعد ہی ایک بار پھر بخار نے اسے آدبوچا اور اب یہ بخار لحہ بہ لحہ تیز ہوتا جا رہا تھا جس کے علاج کے لیے اس کے پاس اب کوئی دوا بھی باقی نہیں بچی تھی۔ وہ لوگ فرار ہوتے وقت اپنے ساتھ دواؤں کا جو ذخیرہ لے کر چلے تھے، اس میں موجود بخار کی گولیاں وہ مسلسل عمران کو کھلاتی رہی تھی اسی لیے اب اس کے پاس بخار سے بچاؤ کی کوئی دوا باقی نہیں رہی تھی۔ یہ برف زار جہاں چلنا پھرنا یوں بھی بہت دشوار تھا، بخار کی شدت کے باعث اس کے لیے اور بھی زیادہ دشوار گزار ہو گیا تھا۔ جسم کی سلب ہوتی توانائیاں لحہ بھر کو بھی اسے مایوسی کی طرف بھی دھکیلنے کی کوشش کرتیں لیکن پھر اسے عمران کی بات یاد آجاتی۔ اس نے کہا تھا۔ ”تمہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسے اللہ تمہیں پہلے ہر مصیبت سے بچاتا رہا ہے ویسے ہی یہاں سے بھی بچا کر نکال دے گا۔“ اللہ نے فوری طور پر عمران کے اس یقین کی تصدیق بھی کی تھی اور اسے ایک کھائی میں گرنے سے بچا لیا تھا۔ عمران کا کہا وہ جملہ اور حادثے سے محفوظ رہ جانے کا واقعہ اس کے دل پر نقش ہو گیا تھا چنانچہ وہ اس انتہائی خراب صورت حال میں بھی ہمت ہارنے کے بجائے گرتی پڑتی ہی سہی چلتی جا رہی تھی۔ ایک ایسی راہ پر جس کے بارے میں اسے یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ اسے کسی منزل تک لے بھی جائے گی یا نہیں لیکن وہ حرکت میں برکت ہے والے مقولے پر عمل کرتے ہوئے چل رہی تھی۔

چلتے رہنے کی صورت میں یہ امید تھی کہ شاید کسی طرح وہ اس برف زار کی بول بھلیوں سے نکل جائے۔ رک جانے اور ایک جگہ بیٹھ جانے کی صورت میں یہ امید بھی ہاتھ سے نکل جاتی۔ امید کا دامن تھام کر چلتے چلتے جب اس نے محسوس کیا کہ اب اس کے قدموں میں مزید چلنے کی سکت نہیں رہی ہے اور اسے تھوڑی دیر ستا لینے کے ساتھ کچھ کھا پی بھی لینا چاہیے تو وہ رک گئی اور اپنے شانے پر لٹکا تھیلا اتار کر اس میں باقی بچ جانے والی کھانے پینے کی اشیا کا جائزہ لینے لگی۔ اس کے پاس موجود خوراک کے ذخیرے میں خشک ڈبل روٹی کے پاپے، بسکٹوں کا ایک ڈبا، تلی ہوئی مونگ پھلی کا آدھا پیکٹ اور تھوڑی سی کافی بچی تھی۔ اختتام کے بالکل قریب پہنچ جانے والی یہ خوراک کی مقدار ایک بار پھر خوف کا دیو بن کر اس کے دل کو مسلنے اور ڈرانے لگی لیکن پھر اس نے اللہ پر بھروسا کرتے ہوئے سر جھٹکا اور کافی بنانے کے خیال سے برتن میں تھوڑی سی برف ڈال کر اسے پگھلانے کے لیے اسٹوو پر رکھا۔ اسٹوو بہت ہی دھیما جل رہا تھا۔ پھر ابھی مشکل سے برف پگھلی ہی تھی کہ یک دم بجھ گیا۔ اس نے کوشش کی کہ کسی طرح دوبارہ اسے جلا سکے لیکن کوشش کے نتیجے میں اس پر انکشاف ہوا کہ اس کے سامان میں موجود ایندھن کا ذخیرہ ختم ہو چکا ہے اور اب اس کے لیے کافی بنانا بھی ممکن نہیں۔ یہ ایک لرزہ خیز بات تھی جسے اس نے کسی نہ کسی طرح ذہن سے جھٹکا اور بسکٹوں کا ڈبا کھول کر اس میں سے چند بسکٹ نکال کر کھانے کے ساتھ مٹھی بھر مونگ پھلیاں بھی چبا ڈالیں۔ بخار کی وجہ سے منہ کا ذائقہ عجیب سا ہو رہا تھا اس لیے اس کے لیے اس سے زیادہ کچھ حلق سے نیچے اتارنا ممکن بھی نہیں تھا۔ دوسرے اب اسے یہ محدود خوراک ہی بہت سنبھال کر استعمال کرنی تھی تاکہ شدید بھوک لگنے کی صورت میں کفایت سے اسے استعمال کر سکے۔

کھانے اور تھوڑی دیر ستا لینے کے بعد اس نے ایک بار پھر سفر شروع کر دیا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس محدود خوراک کے ساتھ وہ بہت زیادہ وقت اس برف زار میں نہیں گزار سکے گی اس لیے یہی مناسب تھا کہ زیادہ سے زیادہ چلتی اور یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتی۔ انکل بچو سے ایک سمت کا تعین کرتی ہوئی وہ اس جانب چلنے لگی لیکن تھوڑی ہی دیر میں موسم کے تیور بگڑنے لگے۔ آسمان جو کچھ دیر قبل صاف لگ رہا تھا، تیزی سے سیاہ بادلوں کے پیچھے چھپنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان بادلوں نے نیلے آسمان کے وجود پر سیاہ نقاب تان کر سورج کی روشنی کے نیچے پہنچنے کا راستہ بند کر دیا۔ اس اندھیرے میں آگے بڑھنا خاصا مشکل تھا۔ اس پر شروع ہو جانے والی بارش نے بھی راستے میں رکاوٹ پیدا کر ڈالی۔ بارش کا پانی بہت ٹھنڈا تھا اور اس کے بخار سے جلتے وجود کو کپکپا ڈال رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بارش کے یہ قطرے مزید سرد ہونے لگے۔ اس نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اب آسمان سے بارش کے قطرے نہیں بلکہ نرم نرم سی برف گر رہی ہے۔ وہ جو پہلے ہی کسی پناہ گاہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑا رہی تھی اور منظر واضح نہ ہونے کی وجہ سے ابھی تک کامیاب نہیں

ہو سکی تھی، مزید گھبرا گئی اور گھبراہٹ میں ایک طرف بڑھنے کی کوشش کی تو بری طرح پھسلی۔ پھسلنے کے بعد اسے یوں لگا تھا کہ جیسے وہ بہت دور تک برف پر اسی طرح پھسلتی جائے گی اور بالآخر کسی کھائی میں جا گرے گی لیکن قدرت ایک بار پھر اس کی مدد کے لیے آگے بڑھی اور اس کے دونوں ہاتھ جو اضطراری طور پر آگے کی طرف پھیلے ہوئے تھے، ایک بڑے پتھر سے ٹکرائے۔ اس نے بے اختیار خود کو روکنے کے لیے اس پتھر کو تھام لیا۔ پتھر کافی بڑا تھا جس نے اس کے پھسلتے وجود کو روک لیا لیکن چونکہ وہ کافی رفتار سے پھسلتی ہوئی آرہی تھی اس لیے خود کو پتھر سے ٹکرانے سے بچا نہیں سکی اور کوشش کے باوجود اس کی تھوڑی زد میں آگئی۔ اسے فوراً ہی وہاں خون کی چپچپاہٹ کا احساس ہوا لیکن بہرحال پھر بھی خاصی بچت ہوگئی تھی۔ خصوصاً آگے کی طرف پھیلے ہوئے ہاتھوں کی وجہ سے وہ کافی محفوظ رہی تھی لیکن اس بچت کے ساتھ ہی اسے دو نقصانات مزید سہنے پڑے تھے۔ پھسلنے کے دوران اس کے ہاتھ میں موجود اسنو اسٹک کا کام دینے والی رائفل چھوٹ کر کہیں گر گئی تھی اور دوسرا نقصان یہ ہوا تھا کہ اس کے دائیں پیر کا جوتا بھی نکل گیا تھا۔ رائفل کے بغیر تو پھر گزارا ہو جاتا لیکن جوتے کے بغیر وہ آگے کا سفر جاری نہیں رکھ سکتی تھی۔ وہاں اتنی سردی تھی کہ اس کا پیر فوراً ہی اسنو بائٹ کا شکار ہو جاتا۔ خود اسے ابھی اپنے اس نقصان کا ادراک نہیں ہو سکا تھا اور وہ ہاتھوں کو لگنے والے جھٹکے اور تھوڑی کے زخم میں ہی الجھی ہوئی تھی۔ کسی کھائی میں گرنے سے محفوظ رہنے کے بعد اس نے اپنے جسم کو سیدھا کیا اور جس پتھر نے اسے سہارا دیا تھا، اسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ بیٹھنے کے دوران اسے احساس ہوا کہ پتھر سے ٹکراؤ کے نتیجے میں صرف ہاتھ اور تھوڑی ہی متاثر نہیں ہوئے ہیں بلکہ باقی جسم کو بھی کافی زور کا جھٹکا لگا ہے اور فی الحال وہ فوری طور پر کھڑی ہو کر چلنے کے لائق نہیں ہے۔ اگر لائق ہوتی بھی تو مسلسل جاری برف باری اس کی راہ میں حائل ہو جاتی۔ اس انتہائی بے بس کر دینے والی صورت حال میں وہ پتھر سے ٹیک لگائے خود بھی کسی پتھر کی مورتی کی طرح بیٹھی رہ گئی۔ آسمان سے گرنے والی برف آہستہ آہستہ اس کے اپنے وجود کو بھی ڈھانپنے لگی لیکن اس کے پاس بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ اب تک اپنے اعصاب کو مضبوط رکھنے کی جو جدوجہد کرتی آرہی تھی، وہ اس موجودہ لمحے میں یک دم ہی دم توڑ گئی تھی اور شاید خود پر آہستہ آہستہ جمتی برف کی تہ کے نیچے وہ خود بھی کسی لمحے دم توڑ دیتی... بالکل ویسے ہی جیسے اسے زندگی کی امید دلانے والا عمران موت سے ہار کر ایک ایوالانچ کا شکار ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اپنی ذات کو شک سے بالاتر رکھنے کے لیے آفتاب مسلسل گاؤں میں ہی موجود تھا۔ کشور سے اس کی فون پر بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ وہ افضل کے گھر میں اس کی بیوی بچوں کے ساتھ خوش ہونے کے باوجود آفتاب کے لیے پریشان تھی اور اس کا خیال تھا کہ آفتاب کو بھی اب گاؤں سے نکل جانا چاہیے لیکن اس نے کشور کو سمجھا دیا تھا کہ وہ اگر اچانک غائب ہو گیا تو شک کی زد میں آسکتا ہے اس لیے بہتر ہے کہ معمول کے مطابق گاؤں میں ہی رہ کر اپنے فرائض انجام دیتا رہے۔

کشور کو اس نے چند دن بعد لاہور آنے کی یقین دہانی کروائی تھی البتہ دونوں کا ٹیلی فونک رابطہ مسلسل قائم تھا۔ فون پر اس سے گفتگو کرتے ہوئے کشور اکثر اس بات کا اظہار کرتی تھی کہ وہ دونوں پیر آباد سے کہیں دور کسی پُرامن جگہ پر اپنا گھر بنا کر وہاں سکون سے رہیں گے۔

آفتاب اس کے ان خیالات کو سن کر فی الحال خاموش رہتا تھا لیکن اندرونی طور پر وہ اس بات کے لیے راضی نہیں تھا۔ وہ پیر آباد میں ایک مشن کے تحت کام کر رہا تھا۔ اس کی مستقل مزاجی اور استقامت کے باعث اب کہیں جا کر وہ وقت آیا تھا کہ اسکول باقاعدہ اور منظم طریقے سے کام کرنے لگا تھا۔ ایسی صورت میں وہ یہاں سے چلا جاتا تو ساری محنت ضائع ہونے کا خطرہ تھا۔ اس کے بعد جانے دوسرے لوگ اتنی جرأت کر بھی پاتے یا نہیں کہ چودھری کی مخالفت کے باوجود کام کرتے رہتے لیکن دوسری طرف وہ کشور کو بھی آخر

ایک سردار جی انگلستان تشریف لے گئے۔ کچھ دنوں بعد ان کا دل گُرما کھانے کو چاہا۔ اب ان کی سمجھ میں یہ نہ آئے کہ ”گُرما“ کی انگریزی کیا ہوگی۔ خوب سوچنے کے بعد آخر کار دکان پر گئے اور دکان دار سے کہا کہ مجھے "HOTA" چاہیے۔ دکان دار غریب پریشان کہ "HOTA" کیا ہوتا ہے۔ وہ ڈکشنری کھول کر بیٹھ گیا۔ اسی اثنا میں دوسرے سردار صاحب بھی وہاں آگئے۔ پہلے سردار نے ان سے گُرما کے بارے میں پوچھا تو وہ ایک قہقہہ مار کر ہنس پڑے اور بولے۔ ”میں نے ایک سال سے "COLDA" مانگا ہوا ہے، وہ نہیں ملا تو "HOTA" کہاں سے مل جائے گا۔“

(ج۔ احمد۔ پشاور)

کتنا عرصہ افضل کے گھر چھوڑ سکتا تھا۔ اس نے آفتاب کی رفاقت کے لیے ہی حویلی چھوڑنے کا پُرخطر فیصلہ کیا تھا اور اسے یہ رفاقت میسر نہ آتی تو یقیناً وہ مایوس ہوتی۔

آفتاب بڑی الجھن میں تھا۔ ایک طرف اس کا مشن تھا تو دوسری طرف وہ لڑکی جس کی تندوتیز محبت نے اس کی ایک مخصوص دائرے میں گھومتی زندگی میں ہلچل سی مچا کر رکھ دی تھی۔ عشق کا جادو کچھ اس طرح سر چڑھ کر بولا تھا کہ وہ سب کچھ جانتے بوجھتے ایسے خطرے مول لیتا چلا گیا تھا جن کے بارے میں عام حالات میں اس جیسے آدمی سے توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ وہ خود اکثر حیران رہ جاتا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے اور کیونکر ہوگیا؟ وہ جو شہر کا پروردہ تھا اور جس کے لیے عورت کے وجود میں کبھی بھی بہت زیادہ کشش نہیں رہی تھی کہ وہ شروع سے ہی ذرا مختلف مزاج کا کچھ انقلابی سا لڑکا تھا اور ہمیشہ یہ خواب دیکھتا تھا کہ عام لوگوں کی طرح کمانے کھانے اور بیوی بچوں کو پالنے میں ہی عمر کاٹنے کے بجائے کچھ مختلف طریقۂ زندگی اپنائے گا، اچانک ہی کشور کی محبت میں مبتلا ہوکر وہ سب کچھ کرتا چلا گیا جس کی اسے خود بھی اپنے آپ سے توقع نہیں تھی۔ لیکن اب جبکہ یہ سب کچھ ہوچکا تھا تو اسے اپنی ذمے داریوں کو نبھانا بھی تھا۔ ذمے داری کے احساس نے ہی اسے کشور کو فوری طور پر حویلی سے نکال کر شہر پہنچانے پر مجبور کیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر کسی کو حویلی میں بھنک بھی پڑ گئی کہ کشور ماں بننے والی ہے تو اس کی زندگی ختم کردی جائے گی۔ کشور کی زندگی محفوظ رکھنے کے خیال نے اسے اپنے سارے منصوبوں سے صرفِ نظر کر کے خطرہ مول لینے پر مجبور کردیا تھا۔ لیکن فی الحال وہ گاؤں چھوڑ کر جانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ یہاں رہ کر حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اگر حالات موافق رہتے تو وہ یہاں سے جانے کے بجائے کشور کو کسی قریبی شہر میں منتقل کردیتا اور وقتاً فوقتاً اس سے ملنے کے لیے جاتا رہتا۔ اپنے اس خیال کا اس نے کشور کے سامنے اظہار نہیں کیا تھا۔

وہ حالات کا جائزہ لے رہا تھا اور چودھری کے امریکا سے واپس لوٹ آنے کے سوا اسے کوئی بہت بڑی تبدیلی نظر نہیں آئی تھی۔ اس کے خاص ملازمین بھی معمول کے مطابق ہی کام کرتے نظر آتے تھے اور ان کی حرکات وسکنات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ اس بات سے اس نے اندازہ لگایا تھا کہ چودھری نے کشور کے غیاب کا معاملہ بدنامی کے خوف سے بے حد خفیہ رکھا ہوا ہے اور اگر اسے تلاش کرنے کے لیے کوئی کوشش کی بھی جارہی ہے تو کھل کر کارروائی نہیں کی جارہی۔ جو بھی تھا، اس کے لیے راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا اور کسی نے بھی اب تک اس کی طرف رخ نہیں کیا تھا۔

یہ احساس ہونے کے بعد کہ اس کی ذات شک سے بالاتر ہے، وہ کافی مطمئن ہوگیا تھا اور اگلے دو تین دن میں لاہور جاکر کشور سے ملاقات کرنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن اس کا یہ اطمینان اس روز شام کے وقت رخصت ہوگیا۔ وہ معمول کے مطابق اپنے کمرے میں رائٹنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھا کچھ لکھنے پڑھنے کا کام کر رہا تھا کہ اچانک ہی منیب اس کے کمرے میں چلا آیا۔ یہ ایک خلافِ معمول بات تھی۔ اس کے ساتھ اس مکان میں رہائش پذیر اساتذہ جانتے تھے کہ جس وقت وہ اپنے کمرے میں بند ہوتا ہے تو کوئی نہ کوئی تخلیقی کام کر رہا ہوتا ہے اس لیے کوئی بھی ان اوقات میں اسے ڈسٹرب نہیں کرتا تھا۔ لیکن آج منیب کی آمد اور اس کے چہرے پر موجود تاثرات دیکھ کر اسے اندازہ ہوا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے جس کی وہ اسے اطلاع دینا چاہتا ہے۔

''خیریت ہے منیب! کچھ پریشان لگ رہے ہو؟'' اپنے ہاتھ میں موجود قلم کو قلم دان میں رکھتے ہوئے اس نے منیب سے پوچھا۔

''خیریت نہیں ہے اور جو اطلاع اس وقت مجھے ملی ہے اسے سن کر مجھے لگتا ہے کہ تم کسی بڑی مشکل میں پھنسنے والے ہو۔''

''کیوں کیا ہوا؟'' وہ فوراً پریشان ہوا تھا۔

''جنگل سے تین لڑکیوں کی لاشیں ملی ہیں۔ انہیں کسی نے زمین کھود کر ایک ہی گڑھے میں دفن کیا تھا۔ جنگلی جانوروں نے زمین کھود کر لاشیں باہر نکال لیں اور ان کا اچھا خاصا حصہ کھا گئے لیکن اس کے باوجود لاشیں ناقابلِ شناخت نہیں ہیں۔ لواحقین نے انہیں پہچان لیا ہے۔ وہ گاؤں کی ہی تین لڑکیاں، مُنّی، شادو اور رانی ہیں جن کی لاشوں کا سرسری جائزہ لینے کے بعد ہی پولیس نے یہ جان لیا ہے کہ تینوں لڑکیوں کو گولیاں مار کر ہلاک کیا گیا ہے۔'' منیب جو خبر لایا تھا وہ واقعی نہایت بُری تھی۔ مرنے والی لڑکیوں میں رانی کا نام سن کر آفتاب کے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ رانی لاہور کی کوٹھی میں رہ رہی تھی اس لیے وہ اور کشور دونوں ہی اسے بھولے ہوئے تھے لیکن چودھری اسے نہیں بھولا تھا۔ بظاہر جو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ کشور کو ڈھونڈنے کے لیے کوئی کارروائی نہیں کی جارہی تو درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ چودھری نے نہایت چالاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کشور کی سب سے خاص ملازمہ رانی کو اپنے قبضے میں لے کر یقیناً اس سے

معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی اور پھر اسے ہلاک کردیا تھا۔ رانی کے ساتھ مُنّی اور شادو کیوں ماری گئیں، یہ بات اسے سمجھ نہیں آئی تھی اور نہ ہی سمجھنے کی فرصت تھی۔ رانی کی موت پر افسوس کے ساتھ اسے یہ فکر لاحق ہوگئی تھی کہ مرنے سے پہلے نہ جانے اس سے کیا کیا معلومات حاصل کی گئی ہوں گی۔ اگر اس نے زبان کھول دی ہوگی تو یقیناً آفتاب کا نام سامنے آگیا ہوگا۔

''کیا سوچ رہے ہو آفتاب؟ مجھے تو لگتا ہے کہ ان تینوں لڑکیوں کی موت کے پیچھے کوئی اہم وجہ ہے۔ خاص طور پر اس لڑکی رانی کا نام سن کر میں کافی پریشان ہوگیا ہوں۔ رانی ہی وہ لڑکی ہے نا جو تمہارے اور کشور بی بی کے درمیان رابطے کا ذریعہ تھی؟ ہوسکتا ہے اس نے یہ بات ان دونوں لڑکیوں کو بتادی ہو اور ان کے ذریعے حویلی والوں میں سے کسی کو پتا چل گئی ہو چنانچہ بدنامی سے بچنے کے لیے ان لوگوں نے ان لڑکیوں کو ٹھکانے لگا دیا ہو اور اب تمہیں نشانہ بنانے کا سوچ رہے ہوں۔ یہ سب باتیں ہیں تو میرا قیاس لیکن نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا ہے کہ تمہارے لیے حالات کچھ مناسب نہیں ہیں اور تمہیں کچھ دنوں کے لیے اصل حالات سامنے آنے تک یہاں سے غائب ہوجانا چاہیے۔''

منیب کی آواز نے اسے اپنے خیال سے چونکایا۔ منیب کو کشور کے پیرآباد سے غائب ہونے کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا لیکن چونکہ وہ ان دونوں کی محبت اور نکاح سے واقف تھا اس لیے اس کا دماغ خودبخود ہی ایک اندازہ لگانے میں کامیاب ہوگیا تھا جسے کسی حد تک درست بھی کہا جاسکتا تھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجھے واقعی فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے۔'' وہ حالات کو منیب سے زیادہ بہتر طریقے سے سمجھ رہا تھا چنانچہ فوراً ہی اس کی تجویز سے اتفاق کیا اور اسی وقت اپنی کرسی چھوڑ کر پھرتی سے ایک بیگ میں اپنی ضروری اشیا بھرنے لگا۔ منیب بھی اس کا ساتھ دے رہا تھا۔

''ٹھیک ہے دوست! چلتا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو ہم دوبارہ ضرور ملیں گے۔'' دس منٹ سے بھی کم وقت میں اپنی تیاری مکمل کر کے وہ منیب سے گلے ملتے ہوئے بولا۔

''انشاء اللہ۔'' منیب مسکرایا۔ آفتاب کی پھرتی دیکھ کر اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ معاملہ واقعی گڑبڑ ہے اور اس کی قیاس آرائی کے علاوہ بھی کوئی ایسی بات ہے جس نے آفتاب کو فوری طور پر اس کی تجویز پر عمل کرنے پر مجبور کیا ہے۔ لیکن آفتاب اتنی عجلت میں تھا کہ وہ اس سے کوئی سوال نہیں کرسکتا تھا۔

''خیریت سے پہنچ جاؤ تو مجھے فون پر اطلاع دے دینا۔'' آفتاب کمرے سے باہر نکل رہا تھا جب اس نے پیچھے سے آواز دے کر اسے ہدایت کی۔ وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کا رخ گاؤں سے باہر جانے والے راستے کی طرف تھا۔ بس اڈے پہنچ کر وہ روانگی کے لیے تیار کسی بھی روٹ کی بس میں بیٹھ جاتا پھر وہاں سے لاہور چلا جاتا۔ اس وقت تو یہی سب سے ضروری تھا کہ وہ کسی طرح جلد از جلد یہاں سے نکل جائے۔ جلدی کے خیال سے ہی اس کے قدم بہت تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ یک دم ہی اس نے اپنے پیچھے کسی گاڑی کی آواز سنی۔ یہ آواز اس کے لیے خطرے کی گھنٹی تھی لیکن اس کی بے بسی یہ تھی کہ وہ اس گھنٹی کو سن کر اپنے بچاؤ کے لیے کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ بس اس خیال کے تحت کہ پیچھے سے آنے والی گاڑی کہیں اسے روندتی ہوئی ہی نہ گزر جائے، وہ راستہ چھوڑ کر ذرا سائڈ میں ہوگیا۔ چند سیکنڈوں میں ہی گرد وغبار کا طوفان اڑاتی گاڑی اس کے قریب سے گزری اور پھر یک دم ہی ذرا آگے جاکر ایک جھٹکے سے رک گئی۔

''کہاں جارہے ہو ماسٹر! آؤ ہم تمہیں چھوڑ دیں۔'' ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ موجود گاڑی کی اگلی کھڑکی سے جھانک کر چودھری کے چیلے بالے نے اس سے پوچھا۔

''شکریہ، میں پیدل ہی چلا جاؤں گا۔'' آفتاب نے انکار کیا۔

''ایسا تو نہیں ہوسکتا ماسٹر! ہم تمہارے لیے یہ گڈی لے کر نکلے ہیں اور تم ہی اس میں نہ بیٹھو، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' بالا گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا تھا اور نہایت معنی خیز لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اس کے لہجے کی معنی خیزی کو محسوس کرتا آفتاب اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر سوچتا اس سے قبل ہی گاڑی کی پچھلی نشست سے اترنے والوں نے اسے گھیر لیا۔ وہ سب اسلحے سے لیس تھے اور انہوں نے اس طرح اس کے گرد گھیرا ڈالا تھا کہ اس کے لیے کوئی جائے فرار نہیں رہی تھی۔ اگلے ہی لمحے اسے گاڑی میں منتقل کیا جاچکا تھا اور گاڑی چل پڑی تھی۔ شاید موت کی طرف جانے والے راستے پر...

☆☆☆

''تو تم یہاں تک پہنچ ہی گئے۔'' مشاہرم خان کو رائفلوں کے سائے میں جس شخص کے سامنے پہنچایا گیا، اس نے بغور اس کا جائزہ لیتے ہوئے طنز سے کہا۔

''صرف میں نہیں پہنچا ہوں میرے ساتھ تمہاری موت بھی پہنچی ہے۔'' مشاہرم خان نے ترکی بہ ترکی جواب دیا جسے سن کر وہ زوردار قہقہہ لگا کر ہنسا اور پھر اپنے ساتھیوں سے

مخاطب ہو کر بولا۔

''لگتا ہے بھائی کی موت نے سچ مچ بے چارے کا دماغ الٹ دیا ہے جب ہی ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔'' اپنے کمانڈر کی بات سن کر مشابرم خان کو زد میں لیے کھڑے لوگ مسکرانے لگے۔ ایک شخص جو خود ہتھیاروں کی زد میں کھڑا ہو، اس کا یہ دعویٰ پاگل پن ہی لگتا تھا۔

''یہ مت سمجھنا کہ ہم تمہاری سرگرمیوں سے واقف نہیں تھے۔ اسکردو میں موجود ہمارے ساتھی دیکھ رہے تھے کہ تم کس طرح اپنے بھائی کے قاتلوں کو ڈھونڈنے کے لیے بے چین ہو۔ اگر ہمیں منظور ہوتا تو تمہارا وہاں بہت آسانی سے خاتمہ کیا جا سکتا تھا لیکن یہی سوچا گیا کہ جانے دو، بے چارہ خود ہی تھک ہار کر بیٹھ جائے گا۔ خوامخواہ کی قتل و غارت سے ہمارا یہاں بنا بنایا سیٹ اپ ڈسٹرب ہو سکتا تھا۔ تمہارے بھائی کو بھی ہم نے مجبوراً ہی مارا تھا۔ اگر وہ اس لڑکی کو خاموشی سے میرے ساتھیوں کے حوالے کر دیتا اور مزاحمت نہیں کرتا تو اسے کچھ نہیں کہا جاتا لیکن اس نے راستے کی دیوار بننے کی کوشش کی تھی اس لیے اپنی جان سے گیا۔ تمہیں بھی اپنے لیے بے ضرر سمجھ کر اب تک ڈھیل دی جاتی رہی تھی۔ تمہارا پہاڑوں کی طرف آنکلنا بھی میرے ساتھیوں کی نظر سے پوشیدہ نہیں تھا لیکن یہی خیال تھا کہ تم ہمارے اس ٹھکانے تک نہیں پہنچ سکو گے اور ادھر اُدھر ٹکٹ ٹوئیاں مار کر یا تو واپس چلے جاؤ گے یا یہیں کہیں مر مرا جاؤ گے لیکن تم تو یہاں تک آ پہنچے... اور یقین جانو یہاں پہنچ کر تم نے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے۔ اب جبکہ تم ہمارا یہ خفیہ ٹھکانا دیکھ چکے ہو تو ہمارے لیے تمہیں مزید زندہ رکھنا ممکن نہیں۔'' کمانڈر بہت پُرسکون لہجے میں موسم کی خبریں سنانے کے انداز میں اسے اطلاع دے رہا تھا۔ اس کی باتیں سن کر بھی مشابرم خان کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور وہ اسی طرح نفرت بھری نظروں سے کمانڈر کو گھورتا رہا اور پھر دانت بھینچتے ہوئے پوچھا۔

''ماہ بانو کہاں ہے؟ تم نے کیوں اس معصوم لڑکی کو اغوا کروایا تھا؟''

''افسوس! میرے پاس تمہارے دونوں ہی سوالوں کا جواب نہیں ہے۔ البتہ ایک عنقریب مر جانے والے انسان کی کچھ نہ کچھ تسلی کے لیے میں تھوڑی بہت وضاحت کر سکتا ہوں۔ پہلے تمہارے دوسرے سوال کا جواب، میں نے اس لڑکی کو کیوں اغوا کروایا تھا اس کی وجہ مجھے خود بھی نہیں معلوم۔ مجھے اوپر سے حکم ملا اور میں نے تعمیل کی۔ ہم سپاہی لوگ ہیں جو صرف حکم کی تعمیل کرنا جانتے ہیں اور کیوں... کس لیے جیسے سوالوں میں نہیں الجھتے۔ رہی یہ بات کہ ماہ بانو کہاں ہے؟ تو یہ تو خود مجھے بھی نہیں معلوم۔ میرے ایک ساتھی کی غداری کی وجہ سے وہ یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی اور اب ان دونوں کو تلاش کیا جا رہا ہے۔ ابھی تمہیں جن افراد نے گرفتار کیا ہے وہ ان دونوں کی تلاش کی مہم پر ہی گئے ہوئے تھے۔ تم کہاں سے ان کے پیچھے لگے، انہیں اندازہ نہیں ہوا لیکن ٹھکانے پر پہنچنے سے قبل انہوں نے تمہیں دیکھ لیا تھا چنانچہ جب تم پہاڑوں میں یہاں آنے کا راستہ تلاش کر رہے تھے تو انہوں نے تمہیں گھیر لیا۔ ماہ بانو اور اپنے غدار ساتھی کو بھی ہم اسی طرح پکڑ لیں گے۔ اگر وہ دونوں گرفتار نہیں کیے جا سکے تب بھی ان پہاڑوں میں ہی بھٹک بھٹک کر مر جائیں گے۔ ان پہاڑوں سے نکلنا اتنا آسان نہیں ہے۔'' کمانڈر بولتا جا رہا تھا۔ مشابرم خان کو احساس ہوا کہ وہ ذہنی انتشار کا شکار ہے اور اس کی وجہ یقیناً ماہ بانو کا فرار تھا جسے اس نے اپنے اوپر والوں کے حکم پر اغوا کروایا تھا اور اب لازماً اسے اس کے فرار ہو جانے پر اوپر والوں کو جواب دینا تھا۔ خود مشابرم خان کو ماہ بانو کے یہاں سے فرار ہو جانے کا سن کر خوشی ہوئی تھی لیکن ساتھ ہی وہ پریشان بھی ہوا تھا کہ واقعی ان پہاڑوں سے نکل جانا کسی انجان شخص کے لیے بہت ہی دشوار تھا۔ بس یہی امید تھی کہ ماہ بانو کو اپنے ساتھ لے کر فرار ہونے والا شاید راستوں سے واقف ہو۔

''جب تمہارا ساتھی اس کے ساتھ گیا ہے تو وہ اسے یہاں سے نکال کر کسی آبادی میں بھی پہنچا دے گا۔'' اس نے کمانڈر کے سامنے اپنے ذہن میں آنے والے خیال کا اظہار کیا۔

''وہ...'' کمانڈر استہزائیہ لہجے میں ہنسا۔ ''وہ تو خود یہاں کے راستے نہیں جانتا۔ ہم نے تو اس کے لیے جنت کا راستہ منتخب کیا تھا لیکن بے وقوف اس راستے کو چھوڑ کر پہاڑوں میں بھٹک کر مرنے کے لیے چلا گیا۔''

''جنت کا راستہ...؟'' مشابرم خان حیران ہوا۔

''ہاں، جنت کا راستہ۔ یہاں تمہیں جتنے بھی لوگ نظر آ رہے ہیں، یہ سارے کے سارے مجاہد ہیں جو سب کچھ پیچھے چھوڑ کر جنت کے راستے پر جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ان میں سے جس کا اس راستے پر چلنے کے لیے جتنی جلدی انتخاب ہو گیا، وہ اتنا ہی خوش قسمت ہو گا۔'' وہ جو باتیں کر رہا تھا، مشابرم خان کو الجھا رہی تھیں لیکن اس کے اردگرد کھڑے لوگوں کے چہروں پر اپنے کمانڈر کے الفاظ سے چمک آگئی تھی۔ وہ اتنی عقیدت سے اپنے کمانڈر کو دیکھ رہے تھے جیسے جنت میں پلاٹوں کی الاٹمنٹ کا ٹھیکا اللہ تعالیٰ نے اسی کے ہاتھ میں دے رکھا تھا۔

''کیسا جنت کا راستہ...؟ میں اب بھی تمہاری بات نہیں سمجھا ہوں۔'' کمانڈر کو گفتگو کے موڈ میں دیکھ کر اس نے وضاحت طلب کی۔

''یہ لوگ اللہ کے سپاہی ہیں جو بدی کو ختم کرنے کے لیے عملی جدوجہد کر رہے ہیں۔ ان کا کام ایسے سارے افراد کو صفحۂ ہستی سے مٹانا ہے جو کفر و الحاد اور بے حیائی کے کاموں میں مبتلا ہیں۔ اس کام کے لیے اگر انہیں اپنی جان سے بھی گزرنا پڑے تو یہ گریز نہیں کرتے۔ ان میں سے ہر ایک اتنا بلند حوصلہ ہے کہ اپنے جسم سے بم باندھ کر بھی اس مشن کو انجام دے سکتا ہے۔'' کمانڈر کی بلند آواز وہاں موجود افراد کے چہروں پر جوش کی سرخی پھیلا رہی تھی اور گندی میل بھری آنکھوں میں چمک لہرانے لگی تھی۔

مشابرم خان کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ اسے نور پور میں ہونے والا بم دھماکا یاد آیا۔ اس دھماکے میں خودکش بمبار کا کردار ادا کرنے والے نوجوان عبدالحسین کو بھی تو وہاں جعلی مدرسہ کھول کر بیٹھے شاہنواز نے اسی طرح کی باتیں کر کے راہ سے بھٹکایا تھا۔ شہریار کے ڈرائیور کے فرائض انجام دینے کی وجہ سے اسے اس بات کا بھی علم تھا کہ شاہنواز کے غیر ملکی جاسوس ہونے کا قیاس لگایا گیا تھا۔ یہاں موجود افراد بھی یقیناً اسی کیٹیگری سے تعلق رکھتے تھے۔ انہیں بھی معصوم عبدالحسین کی طرح راہ سے بھٹکا کر معاشرے کے لیے ناسور بنایا جا رہا تھا۔ ملک کے طول و عرض میں آئے دن ہونے والے بم دھماکے جن میں کئی لوگ مارے جاتے تھے، اور کتنے ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے معذور ہو جاتے تھے عموماً کسی خودکش بمبار کا ہی کارنامہ ہوتے تھے۔ اپنی زندگی کی بازی لگا کر دوسروں کو موت سے ہمکنار کرنے والے یہ کج روی کا شکار انسان اسی طرح کا لالچ دے کر ہی تو اتنی شقی القلبی کے لیے تیار کیے جاتے ہوں گے۔ کسی بہت بڑے جرم کو اگر نیکی کا پُرفریب جامہ پہنا دیا جائے تو جرم کرنے والے کو وہ جرم، جرم لگتا ہی نہیں۔ ان برف پوش پہاڑوں میں بھی یقیناً ایسے ہی افراد کو تیار کیا جا رہا تھا۔

''میرے خیال میں تمہارے سارے سوالات ختم ہو گئے ہیں اس لیے اب تمہیں مرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔'' سوچ میں ڈوبے مشابرم خان کو خاموش پا کر کمانڈر نے اس سے کہا اور پھر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر ان سے بولا۔ ''دیکھ کیا رہے ہو بھئی۔ پہنچا دو اسے اس کے بھائی کے پاس۔ کب سے بے چارہ اس کے لیے تڑپتا پھر رہا ہے۔''

کمانڈر کے ان الفاظ پر وہاں موجود افراد کی رائفلیں فوراً فائرنگ کی پوزیشن میں آگئیں لیکن مشابرم خان نے ان سے کہیں زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ نتیجہ یہ تھا کہ جب فضا میں فائرز کی آواز گونجی تو وہ اپنی جگہ سے تقریباً اڑتا ہوا کمانڈر تک پہنچ چکا تھا اور اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اسے اس طرح چھاپ لیا تھا کہ وہ خود مکمل طور پر کمانڈر کے پیچھے محفوظ تھا اور کمانڈر کی گردن اس کے بائیں بازو کے حلقے میں پھنسی ہوئی تھی۔ اس پر فائرنگ کرنے والے جہاں اس کی پھرتی پر ششدر رہ گئے، وہیں اپنے کمانڈر کو اس کے قبضے میں دیکھ کر اپنی جگہ گنگ سے ہو گئے۔ اب اگر وہ مشابرم خان کو نشانہ بنانے کی کوشش کرتے تو ان کا اپنا کمانڈر مارا جاتا۔

دوسری طرف مشابرم خان نے کمانڈر کو صرف ڈھال بنانے پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ اس کے ہولسٹر میں لٹکتا لمبی نال والا خوفناک پسٹل بھی کھینچ لیا تھا۔ خود اس کے پاس موجود اسلحہ تو یہاں پکڑے جانے کے ساتھ ہی تلاشی کے دوران اس سے چھین لیا گیا تھا۔ کمانڈر سے ہونے والی گفتگو کے دوران وہ مسلسل اس امکان کا ہی جائزہ لیتا رہا تھا کہ اپنی جان بچانے کے لیے اسے کیا قدم اٹھانا پڑے گا اور اسے یہی بات سمجھ آئی تھی کہ کمانڈر کو قابو میں کر لیا گیا تو بڑی حد تک بچاؤ کی صورت نکل سکتی ہے۔ چنانچہ موت کو اپنی طرف لپکتے دیکھ کر وہ فوراً ہی اپنی سوچی ہوئی تدبیر پر عمل پیرا ہو گیا۔ پسٹل ہاتھ میں آتے ہی اس نے اسے سیدھا کیا اور خود کو یہاں لانے والے تینوں افراد کو نشانہ بناتا چلا گیا۔ وہ جو حیران پریشان کھڑے تھے، کٹے ہوئے شہتیروں کی طرح گرتے چلے گئے۔ البتہ ان میں سے ایک نے گرنے سے پہلے اضطراری طور پر فائر کر ڈالا تھا۔ اس کی رائفل سے نکلنے والی گولی منطقی طور پر مشابرم خان کے لیے ڈھال کا کام انجام دینے والے کمانڈر کو لگی اور اس کی دائیں ٹانگ کی ران سے بھل بھل خون بہنے لگا۔ فائرنگ کی آواز وہاں کوئی بھونچال سا لے آئی اور مشابرم خان کے دیکھتے ہی دیکھتے کئی لوگ بھاگتے ہوئے ایک غار سے باہر نکلنے لگے۔ نکلنے والا ہر شخص مسلح تھا اور یقیناً وہ اتنے ڈھیر سارے لوگوں کا مقابلہ تنہا نہیں کر سکتا تھا البتہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ ان کا کمانڈر کسی ترپ کے پتے کی طرح اس کے قبضے میں تھا۔

''ان سب سے کہو کہ ہتھیار پھینک دیں اور ایک طرف قطار بنا کر کھڑے ہو جائیں ورنہ میں ابھی تمہاری گردن توڑ دوں گا۔'' اس نے کمانڈر کو دھمکی دی۔

''تم یہاں سے بچ کر نہیں جا سکو گے۔ اتنے سارے

لوگوں سے تنہا مقابلہ کرنا تمہارے لیے ممکن نہیں ہو گا۔" کمانڈر نے اسے ڈرانے کی کوشش کی۔

"میں تنہا کہاں ہوں۔ میرا ساتھ دینے کے لیے تم جو ہو۔ تم وہی کرو گے جو میں کہوں گا اور تمہارے آدمی یقیناً تمہاری زندگی کی حفاظت کے لیے تمہاری ہدایات پر عمل کریں گے۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو بھی میرا کچھ نہیں جائے گا۔ میں تو پہلے ہی جان ہتھیلی پر رکھ کر نکلا تھا اس لیے ہر لمحہ مرنے کے لیے تیار ہوں۔ البتہ مجھے لگتا ہے کہ تمہیں مرنا کچھ خاص پسند نہیں ہے اس لیے تم مجھ سے تعاون کرو گے۔" اس نے کمانڈر کی گردن پر اپنے بازو کا حلقہ مزید تنگ کرتے ہوئے اسے جواب دیا تو وہ جو پہلے ہی ٹانگ پر لگنے والی گولی کے زخم سے تڑپ رہا تھا، مزید بلبلا اٹھا۔

"بھائی صاحب کو چھوڑ دو... بدلے میں ہم تمہاری ہر بات ماننے کے لیے تیار ہیں۔" غار سے باہر آنے والوں میں سے ایک آدمی جو کہ نائب کمانڈر تھا، دو قدم آگے بڑھ کر بلند آواز میں بولا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ تم ایسا کرو کہ خود کو گولی مار لو۔" مشابرم خان نے اسے جواب دیا جسے سن کر وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ خود اپنے آپ کو گولی مارنے کی ہمت یقیناً اس میں نہیں تھی۔

"تم سب اپنے ہتھیار پھینک کر ہاتھ سر سے اوپر اٹھا لو۔" مشابرم خان نے خود ہی بلند آواز میں اب تک ہتھیار سنبھالے وحشت زدہ سے نظر آنے والے افراد کو حکم دیا۔ اس حکم کو سن کر وہ تذبذب میں پڑ گئے لیکن جب کمانڈر نے بھی سر کو جنبش دیتے ہوئے اس کے حکم کی توثیق کی تو ناچار ان لوگوں کو ہتھیار پھینکنے پڑے۔

"اب تم سب اسی طرح ہاتھ اوپر اٹھا کر غار کے اندر واپس چلے جاؤ۔" مشابرم خان نے انہیں دوسرا حکم دیا۔ "تم بھی مسٹر۔" ان لوگوں کو بادل ناخواستہ اپنے حکم کی تعمیل کرتے دیکھ کر اس نے ابھی تک اپنی جگہ کھڑے نائب کمانڈر کو مخاطب کیا تو وہ بھی ناچار مڑنے لگا۔

"یہاں پیٹرول یا مٹی کا تیل تو ضرور ہو گا۔ ذرا اندر جا کر اس کا ایک کنستر تو لے آؤ۔" مڑتے ہوئے نائب کمانڈر کو اس نے پیچھے سے حکم دیا۔ اسے اندازہ تھا کہ یہاں اس مقام پر اپنے کھانے پینے کا انتظام کرنے کے لیے ان لوگوں کو ایندھن کی ضرورت پڑتی ہو گی اس لیے اس نے یہ مطالبہ کیا تھا۔ وہ جن لوگوں کے درمیان آ پھنسا تھا ان سے بچاؤ کے لیے اس کے ذہن نے ایک تدبیر سوچ لی تھی اگر اس کی یہ تدبیر کامیاب ہو جاتی تو وہ یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا۔ اس وقت اس کی اصل طاقت یہ تھی کہ ان کا کمانڈر اس کے قبضے میں تھا لیکن اگر وہ لوگ بدک جاتے اور کمانڈر کی پروا کرنا چھوڑ کر اس پر جھپٹ پڑتے تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایسا وقت آنے سے پہلے ہی وہ خود تیزی سے اپنی ترکیب پر عمل کر گزرنا چاہتا تھا۔

"سنا نہیں تم نے کہ میں نے کیا کہا ہے؟" نائب کمانڈر اس کا حکم سن کر رک گیا تھا۔ اس نے اسے جھاڑتے ہوئے سخت لہجے میں کہا تو وہ حرکت میں آ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے مشابرم خان بھی زخمی کمانڈر کو دھکیلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ وہ غار سے اپنا فاصلہ کم کرنا چاہتا تھا لیکن اس حرکت کے دوران بھی اس نے پورا خیال رکھا تھا کہ اس کا جسم کمانڈر کے جسم کی آڑ میں ہی رہے۔ کمانڈر کا بھاری ڈیل ڈول اس کی اس کوشش کو کامیاب بنا رہا تھا۔ کمانڈر کو ڈھال بنائے بنائے وہ غار کے دہانے کے قریب پہنچ گیا لیکن دہانے کے بالکل سامنے کھڑے ہونے کے بجائے ایک جانب ہو کر اس طرح کھڑا ہو گیا کہ اندر سے آنے والا تو اس کی نظروں میں آ جائے لیکن خود اندر موجود افراد اسے نہیں دیکھ سکیں۔

"تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" ابھی تک اس کے بازو کی گرفت میں موجود کمانڈر نے بھنچی ہوئی آواز میں اس سے سوال کیا۔

"تھوڑی دیر میں تم خود دیکھ لو گے۔" مشابرم خان نے بے نیازی سے جواب دیا۔ اس دوران نائب کمانڈر ایک کین لے کر باہر آ چکا تھا۔

"اس کا ڈھکن کھول کر یہاں رکھ دو اور تم خود اندر چلے جاؤ۔" مشابرم خان نے اسے حکم دیا جسے سن کر اس کی آنکھوں میں تشویش کے سائے لہرانے لگے اور وہ بجائے اس کے حکم کی تعمیل کرنے کے جوں کا توں کھڑا رہا۔

"سنا نہیں تم نے میں کیا کہہ رہا ہوں؟" مشابرم خان چیخا، ساتھ ہی اس نے کمانڈر کی گردن پر بازو کا مزید دباؤ ڈالا۔

وہ جو پہلے ہی ٹانگ میں لگنے والی گولی کی وجہ سے تکلیف میں تھا، بلبلا اٹھا مگر اس کے نائب نے پروا نہیں کی اور خوفناک انداز میں بولا۔ "کمانڈر کی زندگی ہمیں عزیز ہے لیکن اس ایک زندگی کو بچانے کے لیے ہم اپنا اتنی محنت سے جمایا گیا سیٹ اپ تباہ نہیں کر سکتے۔ کمانڈر کو اس سب کو بچانے کے لیے قربانی دینی ہو گی۔" ان الفاظ کو ادا کرنے کے ساتھ ہی اس نے پھرتی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کا ہاتھ جیب سے باہر آیا تو اس میں ایک ہینڈ گرینیڈ موجود تھا۔ مشابرم خان نے جو اپنی تمام تر حسیات کے ساتھ پہلے ہی ہر طرح کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ہوشیار تھا، اس کے ہلاکت خیز ہاتھ کے حرکت میں آنے سے پہلے ہی اپنے ہاتھ میں موجود پسٹل کا ٹریگر دبایا۔ پسٹل کی نال نے یکے بعد دیگرے دو شعلے اگلے۔ ایک شعلے نے نائب کمانڈر کو نشانہ بنایا جبکہ دوسرے نے کین میں سوراخ کر دیا۔ ہونے والے سوراخ سے مٹی کا تیل تیزی سے باہر نکلنے لگا اور اگلے ہی لمحے ایک دھماکا سا ہوا۔ کین میں داخل ہونے والی گولی نے مٹی کے تیل میں آگ لگا دی تھی۔ دوسری طرف نائب کمانڈر عین دل پر گولی کھا کر مٹی کے بے جان مجسمے کی طرح ڈھے گیا تھا۔ گرتے ہوئے اس کے ہاتھ میں موجود ہینڈ گرینیڈ چھوٹ کر زمین سے گرا۔ دوسرا دھماکا اس ہینڈ گرینیڈ کے پھٹنے کا تھا جس سے پہاڑیاں گونج سی گئیں۔ غار میں موجود افراد نے بھی یہ دھماکے سنے تھے چنانچہ وہ تیزی سے باہر کی طرف لپکے لیکن اس دوران دھماکا خیز مواد اور مٹی کے تیل نے مل کر جو کام کر دکھایا تھا، اس کے باعث غار کے دہانے کے آگے آگ کی ایک دیوار سی بن گئی تھی۔ پورے غیظ و غضب سے بھڑکتی اس آگ سے گزر کر باہر نکلنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ باہر آنے کے خواہش مندوں کے قدم ٹھٹک گئے لیکن آگ جس تیزی سے پھیل رہی تھی، دیکھتے ہی دیکھتے غار کے دہانے سے اندر بھی داخل ہونے لگی۔ ٹھٹک جانے والے قدم اس صورت حال پر ایک بار پھر حرکت میں آئے اور موت سے ہر دم برسرِ پیکار رہنے والے زندگی کی چاہ میں ایک دوسرے کو دھکے دیتے گرتے پڑتے کھلی فضا میں پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس کوشش میں ان میں سے کئی کے جسم سے آگ کے شعلے لپٹ گئے۔ وہ چیختے پکارتے اس آگ کو بجھانے کی کوشش میں ہلکان ہونے لگے۔ وہاں گویا قیامت صغریٰ کا منظر تھا۔ ہر شخص ٹوٹنے والی افتاد سے خود کو بچانے کی فکر میں دوسرے سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

اس قیامت کی شدت اس وقت اور بھی زیادہ بڑھ گئی جب بہتے ہوئے مٹی کے تیل کے ساتھ سفر کرتی ہوئی آگ نے غار کے اندر تک کا فاصلہ طے کر لیا۔ یہاں بہت سا اسلحہ بھی تھا اور دھماکا خیز مواد بھی جو آگ کی لپیٹ میں آتے ہی پھٹنا شروع ہو گیا۔ یکے بعد دیگرے ہونے والے ان دھماکوں سے صدیوں سے خاموشی کی چادر اوڑھ کر سونے والے پہاڑ گونج اٹھے۔ یہ گونج ایسی نہیں تھی جو وہیں ختم ہو جاتی۔ اس گونج کی بازگشت بہت دور تک سنی جاتی تھی اور ان ذمے داروں کو جگانے والی تھی جو اپنی کوئی بھی ذمے داری ادا کرنے کے بجائے سب ٹھیک ہے کا الاپ الاپتے غفلت کی نیند سوئے رہتے تھے۔ ان میں سے یقیناً کوئی بھی اس قابل نہیں تھا کہ اچانک منظر پر آ جانے والے پہاڑوں میں قائم دہشت گردوں کے اس ٹھکانے کے وجود سے اپنی لاعلمی کا جواز پیش کر سکے۔

☆☆☆

رسیوں کی مدد سے کرسی کے ساتھ جکڑا آفتاب کمرے میں تنہا تھا۔ اسے زبردستی اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر لانے والوں نے اسے گاڑی میں بٹھاتے ہی اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی چنانچہ وہ نہیں جانتا تھا کہ اسے کس جگہ لایا گیا ہے۔ البتہ اتنا اندازہ لگانے میں ضرور کامیاب ہو گیا تھا کہ اسے پیر آباد سے باہر نہیں لے جایا گیا۔ گاڑی نے جو مختصر سفر طے کیا تھا، وہ پیر آباد سے باہر کہیں جانے کے لیے ناکافی تھا یعنی وہ پیر آباد کی حدود میں ہی کہیں موجود تھا اور یقینی طور پر چودھری کی ہی گرفت میں تھا۔

منیب نے اسے رانی کی موت کی اطلاع دیتے ہوئے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ رانی کے ذریعے اس کے اور کشور کے تعلق کا علم چودھری کو ہو گیا ہے، وہ کافی حد تک ثابت ہوتا نظر آ رہا تھا۔ پیر آباد کی حدود میں اسے اتنی دیدہ دلیری سے اغوا کرا لانے والے چودھری کے گرگوں کے سوا بھلا اور کون ہو سکتے تھے؟ اپنے اس اندازے کی تصدیق کے لیے اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کرسی سے بندھا وہ اپنے قید خانے کا کام انجام دینے والے کمرے کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس آواز پر اس نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا۔ کھلے دروازے سے چودھری افتخار اپنے اونچے تنومند وجود کو سنبھالتا اندر داخل ہو رہا تھا۔ اندر آنے کے بعد وہ آفتاب کے عین مقابل ایک اونچے صوفے پر بیٹھ گیا اور کچھ دیر تک زبان سے کوئی لفظ نکالے بغیر اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورتا رہا۔

"مجھے اس طرح یہاں بلوانے کا کیا مقصد ہے چودھری صاحب! اگر آپ کو مجھ سے کوئی بات کرنی تھی یا کوئی شکایت تھی تو پیغام بھیج کر بلوا لیا ہوتا؟" آخر آفتاب نے ہی پہلے گفتگو کا آغاز کیا۔

"کس کام کے لیے کیا طریقہ کار استعمال کرنا ہے، یہ ہم بہتر جانتے ہیں۔ البتہ تم یوں انجان بننے کی جو کوشش کر رہے ہو وہ ہمیں بالکل بھی پسند نہیں آئی۔ تمہیں وڈی چنگی طرح علوم ہے کہ تمہیں یہاں کیوں لایا گیا ہے۔" چودھری نے ایک ایک لفظ چبا کر ادا کرتے ہوئے آفتاب کی بات کا جواب دیا۔

"میں درست وجہ کا تعین کیسے کر سکتا ہوں؟ آپ کو تو مجھ سے کئی شکایات ہیں۔ میرا یہاں رہنا، اسکول چلانا، بچوں کے ذہنوں کو روشن کرنا... آپ کو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ آپ

ان میں سے کسی بھی بات پر ناراض ہو کر جب چاہیں مجھے اپنے آدمیوں سے زخمی بھی کروا سکتے ہیں اور آج کی طرح اغوا بھی۔'' وہ سمجھ رہا تھا کہ اسے یہاں کیوں بلایا گیا ہے اس کے باوجود تجاہل برتتا بے خوفی سے بول رہا تھا۔

''افضل جو صحافی ہے... تمہارا دوست ہے نا؟'' اس کی باتوں پر کان نہ دھرتے ہوئے چودھری نے سوال کیا۔

''بالکل... اور میرے خیال میں یہ کوئی ایسی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔'' آفتاب نے جواب دیا۔

''وہ اپنی بیوی اور دوسرے ساتھیوں کے ساتھ یہاں کیوں آیا تھا؟'' چودھری نے کٹیلے لہجے میں پوچھا۔

''میرے خیال میں آپ اس کی آمد سے واقف ہیں تو وجہ بھی جانتے ہوں گے۔ وہ لوگ اپنے چینل کے لیے ایک رپورٹ تیار کرنے آئے تھے اور پیر آباد کے علاوہ انہوں نے اردگرد کے دوسرے دیہاتوں کا بھی وزٹ کیا تھا۔'' چودھری کے سوال نے درحقیقت اسے ششدر کر دیا تھا اور اس خیال سے کہ چودھری نے ان کے سارے منصوبے کو سمجھ لیا ہے، اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا تھا لیکن اپنی اس کیفیت کو وہ چودھری پر عیاں نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''وزٹ صرف افضل کے ساتھیوں نے کیا تھا۔ خود وہ اور اس کی بیوی فوراً ہی واپس چلے گئے تھے اور جاتے جاتے وہ ہماری بہت قیمتی شے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ ہمیں تم سے اس شے کا پتا چاہیے۔'' چودھری غرایا۔

''آپ کس شے کی بات کر رہے ہیں چودھری صاحب... میں سمجھا نہیں۔ اول تو افضل ایسا آدمی نہیں کہ کسی کی چیزیں چراتا پھرے لیکن اگر اس نے ایسی کوئی حرکت کی بھی ہے تو میں اس سے قطعی لاعلم ہوں۔'' اس کے دل کی دھڑکن ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی پھر بھی وہ خود کو انجان ظاہر کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ تم مت بتاؤ۔ میں تو چاہتا تھا کہ اس بند کمرے میں ہمارے اور تمہارے درمیان بغیر کسی تشدد کے اس مسئلے پر سیٹل منٹ ہو جائے لیکن تم راضی نہیں ہو تو مجھے اپنے آدمیوں کو ہی زحمت دینی پڑے گی۔ تم کتنی ہڈیاں تڑوانے کے بعد اپنی زبان کھولنے پر راضی ہوتے ہو، یہ تمہاری برداشت پر ہے۔ میرے آدمی بہرحال تمہاری ہڈیوں کا سرمہ بننے تک بھی نہیں تھکیں گے۔ تمہاری برداشت کی حد جہاں ختم ہو جائے مجھے پیغام بھجوا دینا۔ اگر تم نے جلدی ہار مان لی تو میں غور کروں گا کہ تمہارے جرم کے مقابلے میں تمہیں کتنی آسان موت کی سزا دی جا سکتی ہے۔'' اس کا جواب سن کر چودھری غضب ناک لہجے میں بولا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی آفتاب کو اغوا کر کے لانے والے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں کچھ نہ کچھ موجود تھا اور یہ تمام چیزیں ہی بہت مہلک تھیں۔ آفتاب کے جسم پر سب سے پہلی ضرب بالے نے لگائی۔ لوہے کی زنجیر پوری قوت سے آ کر اس کے شانے سے ٹکرائی تو وہ اپنی کراہ کو روک نہیں سکا۔ اس کے بعد تو مسلسل ضربوں کا ایک سلسلہ تھا جن کے ساتھ اس کی بے اختیار چیخوں کا سلسلہ بھی جاری ہو گیا تھا۔

☆☆☆

''ہے لیڈی! ہو آر یو؟'' ماہ بانو اپنی آنکھیں کھولنے کی جدوجہد کر رہی تھی کہ اس کے کانوں سے کسی کا یہ جملہ ٹکرایا۔ اس آواز کو سن کر اس نے بہ مشکل اپنی آنکھیں کھولیں۔ اس کی نظریں ایک غیر ملکی چہرے سے ٹکرائیں۔ نقش و نگار سے وہ شخص اسے کوئی جاپانی لگا جو اپنے چہرے پر ڈھیروں حیرت اور تشویش لیے اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ ماہ بانو فوری طور پر اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دے سکی اور اپنی نظروں کا زاویہ بدل کر اردگرد دیکھنے لگی۔ وہ نیلے رنگ کا ایک خیمہ تھا جس میں وہ ایک آرام دہ سلیپنگ بیگ میں لیٹی ہوئی تھی۔ اسے سلیپنگ بیگ میں لٹانے سے قبل گرم اونی سویٹر بھی پہنایا گیا تھا۔ سویٹر یقیناً اس شخص کا تھا جس کے خیمے میں وہ اس وقت موجود تھی۔ جاپانی مرد عموماً زیادہ تجیم نہیں ہوتے اس کے سامنے موجود شخص بھی گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا لیکن اس کے باوجود ماہ بانو کے نازک جسم پر اس کا سویٹر ڈھیلا ہی تھا۔ سویٹر اور سلیپنگ بیگ کی فراہم کردہ خوش گوار حرارت کو محسوس کرتے ہوئے ماہ بانو کو یک دم ہی وہ لمحہ یاد آ گیا جب وہ ایک ڈھلوان پر پھسل گئی تھی اور پھسلنے کے بعد بے بسی کے عالم میں ایک جگہ بیٹھی خود پر گرتی برف میں اپنے آپ کو دفن ہوتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ سردی کی شدت، بخار اور کمزوری نے مل کر اسے ہوش و خرد سے بیگانہ کر دیا تھا۔ برف کی سرد قبر میں اپنے زندہ وجود کو دفن ہوتے محسوس کرتے ہوئے وہ اس وقت جو بے ہوش ہوئی تھی تو اب اس آرام دہ خیمے میں آنکھ کھلی تھی۔ اسے بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے اللہ کی طرف سے نئی زندگی عطا کی گئی ہے۔

''تمہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسے اللہ تمہیں پہلے ہر مصیبت سے بچاتا رہا ہے، ویسے ہی یہاں سے بھی بچا کر نکال دے گا۔'' عمران کے الفاظ ایک بار پھر اس کے ذہن میں گونجے اور ان الفاظ کے یاد آتے ہی احساس تشکر سے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ برف تلے دبے ہوئے اسے یہی تو لگا تھا کہ اب اس کے حصے کی سانسیں ختم ہونے والی ہیں لیکن اللہ نے اس ویران برف زار میں بھی اپنے ہونے کو ثابت کر دیا تھا اور اسے اس طرح سے مدد پہنچائی تھی کہ خود اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

''میں کلائمبر ہوں اور ہمیشہ سولو کلائمبنگ کرتا ہوں۔ اس بار میں کے ٹو کے بیس کیمپ تک جا کر واپس آ رہا ہوں۔ تین چار گھنٹے پہلے ہونے والی اسنو فال کی وجہ سے مجھے اپنا سفر روک کر خیمہ نصب کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ خیمہ لگا کر میں ٹیلی اسکوپ سے اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ اسنو فال کی وجہ سے منظر صاف نہیں تھا لیکن مجھے ایسا لگا کہ قریب ہی کوئی موجود ہے اور اسنو فال کی وجہ سے مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ میں اپنے خیمے سے نکل کر پھنسنے والے کی مدد کے خیال سے چل پڑا۔ قریب پہنچ کر جب میں نے تمہیں دیکھا تو مجھے اپنا خیمہ چھوڑ کر باہر نکلنے کا فیصلہ ٹھیک لگا۔ تم پر اچھی خاصی برف گر چکی تھی اور تم بے ہوش تھیں۔ میں بڑی مشکل سے تمہیں برف کے نیچے سے نکال کر یہاں تک لایا اور تمہیں ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ اصل میں تم بری طرح سردی کا شکار ہو گئی تھیں۔ تمہیں ہوش میں لانے کے لیے مجھے پورے چار گھنٹے خرچ کرنے پڑے ہیں لیکن اچھی بات یہ ہے کہ میری محنت ضائع نہیں گئی اور تم ہوش میں آ گئیں۔''

ماہ بانو اس کے سوال کا جواب نہیں دے سکی تھی جس کی اس نے پروا بھی نہیں کی تھی اور خود ہی ٹھہر ٹھہر کر اس کے اپنے خیمے میں پہنچنے کا پورا قصہ سنانے کے بعد مسکرانے لگا تھا۔ اس کے بات کرنے کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ انگریزی پر مکمل عبور نہیں رکھتا اس لیے اسے تھوڑا ٹھہر کر اور آسان الفاظ میں گفتگو کی ضرورت پیش آ رہی ہے۔ خود ماہ بانو کی انگریزی بھی بہت عمدہ نہیں تھی لیکن بہرحال اس نے اس جاپانی کو وہ پیا کی بات کا مفہوم سمجھ لیا تھا۔

''تھینک یو ویری مچ مسٹر...'' اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے جاپانی سے کہا۔

''فان... تم مجھے فان کہہ سکتی ہو۔ یہ میرا نک نیم ہے اور زیادہ تر لوگ مجھے اسی نام سے پکارتے ہیں۔'' اسے اٹھ کر بیٹھتے دیکھ کر جاپانی نے ایک فلاسک سے گرما گرم کافی کا کپ بھر کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔ ماہ بانو نے شکریے کے ساتھ کپ تھام لیا اور ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرا۔ خوشبودار، خوش ذائقہ اور گرما گرم کافی کے اس گھونٹ نے اس کے اندر تک راحت دوڑا دی۔

''میں ماہ بانو ہوں۔ میں اور میرا ایک ساتھی ان پہاڑوں میں سفر کر رہے تھے۔ بدقسمتی سے میرا ساتھی ایک ایوالانچ کا شکار ہو گیا اور میں راستہ بھٹک جانے کی وجہ سے مشکل میں پڑ گئی۔ موسم کی شدت اور تھکن کی وجہ سے مجھے بخار بھی ہو گیا تھا لیکن یہ ایک اور بدقسمتی تھی کہ میرے پاس موجود خوراک اور دواؤں کا ذخیرہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ پھر میں اس اسنو فال میں پھنس گئی اور بیلنس بگڑ جانے کی وجہ سے پھسل گئی۔ وہ تو خدا نے کرم کیا کہ تم پہنچ گئے ورنہ یقیناً میں یہیں برف کے نیچے دب کر مر جاتی۔'' اپنی پوری داستان سنانے کے بجائے اس نے مختصراً فان کو اپنے حالات بتائے۔

''اوہ... ویری سیڈ۔ یقیناً پھسلنے کی وجہ سے ہی تمہارے پیر سے جوتا نکل گیا تھا۔ میں نے تمہارے پیر کو چیک کیا ہے۔ کھلی حالت میں برف میں دبے رہنے کی وجہ سے پیر کا پنجہ متاثر تو ہوا ہے لیکن کوئی تشویش ناک بات محسوس نہیں ہو رہی۔'' فان نے اپنی طرف سے اسے خوش خبری سنائی جبکہ ماہ بانو کو پہلی بار احساس ہوا کہ اس کی دائیں ٹانگ کچھ سن سی ہے۔ یقیناً یہ برف میں دبے رہنے کا نتیجہ تھا۔

''تھینکس فان! یہ واقعی میری خوش قسمتی ہے کہ تم مجھے مل گئے ورنہ یقیناً میرا بہت برا انجام ہوتا۔'' اس کے لہجے میں حقیقی احسان مندی تھی۔ فان کے لیے بھی اور اللہ کے لیے بھی جس نے فان کو اس کا نجات دہندہ بنا کر اس ویرانے میں بھیج دیا تھا۔

''اور اس سے بھی بڑی تمہاری خوش قسمتی یہ ہے کہ میں اوپر جانے کے بجائے واپس آ رہا ہوں۔ اگر میں اوپر جا رہا ہوتا تو میرے لیے تمہاری مدد کے لیے رکنا مشکل ہوتا۔ میرے لیے پہاڑوں کی بلندیاں کسی محبوبہ کی طرح ہیں اور جب میں اپنی اس محبوبہ سے ملنے جا رہا ہوتا ہوں تو مجھے اپنے اردگرد کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ ہو سکتا ہے کہ اگر تم اوپر جاتے ہوئے مجھے نظر آتیں تو میں تمہیں نظرانداز کر کے گزر جاتا لیکن اب تم میرے ساتھ واپس چل سکتی ہو اور میرا سامان بھی شیئر کر سکتی ہو۔ خود تمہارا اپنا سامان تو تمہارے پاس رہا نہیں لیکن میرے پاس کافی کچھ ہے۔ خاص طور پر میرے سامان میں موجود جوتوں کا فاضل جوڑا اس وقت تمہاری سب سے بڑی خوش قسمتی ہے... جوتوں کے بغیر تو تم یہاں چند قدم بھی نہیں چل سکتیں۔'' اس نے نہایت صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے یہ تو بتا دیا تھا کہ اگر وہ اوپر جا رہا ہوتا تو ہرگز بھی اس کے لیے زحمت نہ کرتا لیکن ساتھ ہی اسے اپنے ساتھ واپس لے جانے کی بھی آفر کر دی تھی۔

ماہ بانو کو اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ جتنا نرم مزاج انسان لگ رہا ہے اس کے لیے اوپر جاتے وقت بھی یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ کسی کو مرنے کے لیے چھوڑ کر اپنا آگے کا سفر جاری رکھ سکتا۔ بہرحال حقیقت جو بھی تھی اس کے لیے تو سب سے اہم بات یہ تھی کہ اسے ایک اچھا ہم سفر میسر آ گیا تھا اور اس بات کے لیے وہ اللہ کی جتنی بھی شکر گزار ہوتی، وہ کم ہی تھا۔ ایک ایسے وقت میں جبکہ عمران کی موت کے بعد وہ بالکل تنہا رہ گئی تھی اور اس کے پاس سامانِ سفر بھی نہیں رہا تھا، اللہ نے اس ویرانے میں ایک ایسا شخص بھیج دیا تھا جو اپنی تجربہ کاری اور مہیا سہولیات کی وجہ سے اس کے لیے عمران سے کئی گنا زیادہ مفید ثابت ہو سکتا تھا۔ عمران تو خود راستوں سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ اِدھر اُدھر بھٹکتا پھر رہا تھا جبکہ فان کے لیے یہ راستے پوری طرح آشنا تھے۔ گویا وہ کہہ سکتی تھی کہ فان، عمران کا بہتر نعم البدل ہے اور اس نعم البدیل کو دیکھ کر اس کے ذہن میں کلام پاک کی یہ آیت گونجنے لگی تھی۔

”اور تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔“

ناشکری اور ناامیدی نعمتوں کو جھٹلانے کی ہی ایک شکل ہے۔ آئندہ زندگی میں ماہ بانو اس غلطی کی مرتکب نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ تجربات نے اسے سکھا دیا تھا کہ اللہ اس پر بہت مہربان ہے۔

☆☆☆

”سر! پیر آباد سے ماسٹر منیب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“ شہریار ایک فائل کے مطالعے میں مصروف تھا کہ انٹر کام بجا اور اسے اطلاع دی گئی۔

”ماسٹر منیب...“ وہ حیرت سے بڑبڑایا۔ منیب نے کبھی اسے فون نہیں کیا تھا اس لیے اس کی کال خلافِ معمول ہونے کی وجہ سے اس کے لیے حیرت کا باعث تھی۔

”بات کروائیں۔“ دل میں کچھ تشویش محسوس کرتے ہوئے اس نے اجازت دی۔

”سر! میں منیب بات کر رہا ہوں۔ آفتاب کا دوست اور ساتھی ٹیچر۔“ لائن ملتے ہی منیب کی آواز سنائی دی۔

”میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ فرمائیے آپ نے کیسے فون کرنے کی زحمت کی؟“ آفتاب کے مشن میں اس کا ساتھ دینے کی وجہ سے منیب کے لیے بھی اس کے دل میں بڑی قدر تھی چنانچہ اخلاق سے دریافت کیا۔

”میں نے آپ کو آفتاب کی وجہ سے فون کیا ہے۔ اس کی جان خطرے میں ہے۔“

”کیا مطلب؟“ منیب کی دی اطلاع سن کر وہ بُری طرح چونکا۔

”آفتاب شہر جانے کے لیے گھر سے نکلا تھا لیکن راستے میں ہی اسے چودھری کے آدمیوں نے گھیر کر اپنی گاڑی میں بٹھا لیا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ یہ واقعہ تانگا چلانے والے ایک لڑکے اکو نے دیکھا تھا۔ اس نے آکر مجھے اطلاع دی اور میری سمجھ میں یہی آیا کہ میں آپ کو بتا دوں تو آفتاب کے لیے کچھ نہ کچھ کیا جا سکے گا۔“ منیب نے اسے بتایا۔

”میں آفتاب کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ چودھری کے آدمیوں نے اس طرح اچانک اسے اغوا کیوں کر لیا؟ اب تو اسکول والے معاملے میں بھی چودھری نے بہت عرصے سے خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔“ منیب کی اطلاع نے اسے الجھن میں مبتلا کر دیا۔

”اصل میں معاملہ کچھ اور ہے سر! عام حالات میں، میں آپ کو یہ بات کبھی نہیں بتاتا لیکن اب آفتاب کی زندگی کی خاطر میں آپ پر اس کا ایک اہم راز کھولنے پر مجبور ہوں۔ اصل میں بات یہ ہے کہ آفتاب اور چودھری افتخار کی صاحب زادی کشور ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ انہوں نے خفیہ طور پر نکاح بھی کر رکھا ہے۔ کشور کی خاص ملازمہ رانی ان کے اس راز میں شریک تھی۔ آج جنگل سے رانی سمیت حویلی کی دو اور ملازماؤں کی لاشیں ملی ہیں۔ رانی کی لاش ملنا ایک تشویش ناک اطلاع تھی اس لیے میں نے آفتاب کو مشورہ دیا کہ وہ فی الحال کچھ عرصے کے لیے گاؤں سے کہیں چلا جائے۔ بعد میں اگر حالات سازگار ہوں تو واپس آجائے۔ میرے اس مشورے پر وہ فوری طور پر اپنا ضروری سامان لے کر شہر جانے کے ارادے سے گھر سے نکل پڑا لیکن راستے میں ہی اسے چودھری کے آدمیوں نے گھیر لیا۔ آپ جانتے ہیں کہ گاؤں میں چودھری کا راج ہے اور گاؤں کا کوئی فرد اس طرح کا کوئی واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ لیکن اکو کا معاملہ ذرا مختلف ہو جاتا ہے۔ وہ رانی کا منگیتر ہے اور کشور بی بی نے کئی بار آفتاب سے ملاقات کے لیے آنے کے لیے اس کا تانگا استعمال کیا تھا۔ رانی کی لاش ملنے کے بعد اس نے جب آفتاب کو اغوا ہوتے ہوئے دیکھا تو یقیناً سمجھ گیا ہوگا کہ رانی کس جرم میں ماری گئی۔ شاید اپنی منگیتر کے قتل نے ہی اسے یہ جرأت بخشی کہ زبان بند رکھنے کے بجائے اس نے مجھ تک اطلاع پہنچا دی۔“

منیب نے اسے پوری تفصیل بتا ڈالی۔ وہ خود بھی کشور اور آفتاب کے تعلقات سے واقف تھا اور اس تعلق میں رانی کا کردار بھی اس پر ظاہر تھا لیکن نکاح والی بات اس کے علم میں نہیں تھی۔ منیب نے حالات کی جو تفصیل اسے سنائی تھی، اس کے بعد وہ خود بھی پُر یقین تھا کہ چودھری کو کسی طرح اپنی صاحبزادی اور آفتاب کے مابین تعلق کی بھنک پڑ گئی ہوگی اور وہ غضب ناک ہو کر ایکشن میں آ گیا ہوگا۔ اس کہانی کے ایک کردار رانی کو تو اس نے انجام سے دوچار کر دیا تھا۔ آفتاب اغوا ہو چکا تھا البتہ کشور کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا کہ اس پر کیا گزری ہوگی۔

”اکو نے یہ دیکھا تھا کہ آفتاب کو اغوا کر کے کہاں لے جایا گیا ہے؟“ آفتاب کی زندگی خطرے میں محسوس کر کے وہ بے حد مضطرب ہو گیا تھا لیکن بظاہر خود کو پُرسکون رکھتے ہوئے سوال کیا۔

”اکو کا کہنا ہے کہ آفتاب کو ڈیرے پر لے جایا گیا ہے۔“ منیب نے بتایا۔

”ٹھیک ہے، میں کچھ کرتا ہوں۔“ شہریار نے فون بند کر دیا اور آپریٹر کو تارڑ کی جگہ آنے والے نئے ایس پی کا نمبر ملانے کا حکم دیا۔

”ایس پی صاحب! ہمیں ایک بندے کو بازیافت کروانے کے لیے پیر آباد کے چودھری افتخار کے ڈیرے پر ریڈ کرنا ہے۔ آپ فوری طور پر اس کام کے لیے پارٹی تیار کروائیں۔ میں خود آپ لوگوں کے ساتھ چلوں گا۔“ ایس پی کے لائن پر آتے ہی اس نے اِدھر اُدھر کی کوئی بات کیے بغیر اس سے ڈائریکٹ کہا۔

”چودھری افتخار کے ڈیرے پر ریڈ سر...؟ چودھری تو اس ایکشن پر طوفان اٹھا دے گا۔“ اس کا حکم سن کر ایس پی گھبرا گیا اور تشویش کا اظہار کیا۔

”دس از مائی آرڈر مسٹر ایس پی! اور جب میں کہہ رہا ہوں کہ میں خود پولیس پارٹی کے ساتھ چلوں گا تو آپ کو پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟“ شہریار نے جھنجلا کر بلند آواز میں جواب دیا۔ عام حالات میں شاید وہ بھی چودھری کے ڈیرے پر پولیس ریڈ کروانے سے پہلے کچھ دیر سوچتا لیکن یہ آفتاب کی زندگی کا معاملہ تھا اس لیے وہ خطرہ مول لینے کے لیے بھی تیار ہو گیا تھا۔

”او کے سر! میں آدھے گھنٹے کے اندر پولیس پارٹی تیار کروا کر آپ کو اطلاع دیتا ہوں۔“ اس کے لہجے کی وجہ سے ایس پی اس سے مزید بحث کرنے کی جرأت نہیں کر سکا۔ خود شہریار کا یہ عالم تھا کہ اس کے لیے انتظار کا آدھا گھنٹا گزارنا بھی مشکل ہوا جا رہا تھا۔ آدھا گھنٹا گزرنے کے بعد جیسے ہی اس کے پاس ایس پی کی کال آئی، وہ اپنے دفتر سے نکل پڑا۔ ڈرائیور کو پیر آباد جانے کے لیے تیار رہنے کا وہ پہلے ہی حکم دے چکا تھا۔ اس کے گاڑی میں بیٹھتے ہی ڈرائیور نے گاڑی چلا دی۔ پولیس پارٹی بھی ان کے ساتھ ہی روانہ ہوئی تھی لیکن شہریار کی گاڑی سب سے آگے اڑی جا رہی تھی۔ پیر آباد تک کا طویل فاصلہ انہوں نے خلافِ معمول بہت کم وقت میں طے کر لیا۔ پہلے شہریار کی گاڑی ڈیرے کے سامنے رکی پھر یکے بعد دیگرے ان کے ساتھ آنے والی دونوں پولیس کی جیپیں بھی پیچھے آرکیں۔ ڈیرے کے دروازے پر کھڑا چودھری کا کارندہ جس کے شانے سے جدید ساخت کی رائفل لٹک رہی تھی، گاڑیوں کو رکتا دیکھ کر دوڑتا ہوا نزدیک آیا اور شہریار کی گاڑی کے قریب پہنچ کر رک گیا۔

”سلام صاحب۔“ اسے شناخت کر کے اس نے زوردار سلام جھاڑا لیکن نگاہوں میں یہ سوال بھی موجود تھا کہ اس طرح یہاں آنے کا کیا مقصد ہے؟

”گیٹ کھولو۔ پولیس ڈیرے کی تلاشی لے گی۔“ اس کے سلام کا جواب دینے کے بجائے شہریار نے حکم دیا۔ وہ ابھی تک اپنی گاڑی سے نیچے نہیں اترا تھا۔

”ڈیرے کی تلاشی... وہ کیوں صاحب؟“ چوکیدار نے حیرت سے سوال کیا۔

”کیوں کا جواب تمہیں دینا ضروری نہیں ہے۔“ اس نے سختی سے جواب دیا۔

”معاف کرنا صاحب! آپ کہتے ہیں تو میں دروازہ کھول دیتا ہوں۔“ حیرت انگیز طور پر چوکیدار نے زیادہ مزاحمت نہیں کی اور جس طرح دوڑتا ہوا آیا تھا، اسی طرح دوڑتا ہوا واپس گیا اور بڑا سا گیٹ پوری طرح وا کر دیا۔ شہریار کا اشارہ پا کر اس کے ڈرائیور نے گاڑی کھلے گیٹ سے اندر داخل کر دی۔ پیچھے منتظر کھڑی پولیس کی جیپیں بھی حرکت میں آئیں اور اندر داخل ہو گئیں۔ یہ کافی وسیع احاطہ تھا جس میں تین گاڑیوں کے داخل ہو جانے کے باوجود بہت سی کھلی جگہ باقی تھی۔ احاطے میں پہنچنے کے بعد شہریار اپنی گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ اس کی تقلید میں ایس پی اور دیگر پولیس والے بھی نیچے اتر آئے۔ اس عرصے میں چوکیدار اندر جا کر منشی اللہ رکھا کو بلا لایا تھا۔

”یہ میں کیا سن رہا ہوں سر! آپ اس جگہ کی یعنی چودھری عالم شاہ کے ڈیرے کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ چودھری صاحب ایک عزت دار آدمی ہیں اور اس طرح یہاں کی تلاشی لے کر آپ ان کی توہین کریں گے۔“ منشی کی یہ خوبی تھی کہ جب وہ چاہتا تھا، دیگر لوگوں کی طرح دیہاتی لب و لہجے میں بات کرتا تھا اور جب ضرورت محسوس کرتا، اچھی اردو دانی کا مظاہرہ کرنے لگتا تھا۔

"میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ چودھری افتخار عالم شاہ کا ڈیرا ہے اسی لیے مجھے خود پولیس پارٹی کے ساتھ آنا پڑا ہے۔" شہریار نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔

"کیا آپ بتائیں گے کہ آپ کو کس چیز کی تلاش ہے؟" منشی نے حجت جاری رکھی۔

"ہمیں کسی چیز کی نہیں بلکہ ایک بندے کی تلاش ہے۔"

"بندہ... کون سا بندہ؟" منشی نے حیرانی سے پوچھا۔

"ماسٹر آفتاب..." شہریار نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔ منشی جس طرح بے نیازی کا مظاہرہ کررہا تھا، اس پر اسے غصہ آرہا تھا۔

"ماسٹر آفتاب... اور یہاں؟ آپ مذاق تو نہیں کررہے سر... بھلا اس معمولی اسکول ٹیچر کو ہمیں یہاں لاکر چھپانے کی کیا ضرورت پڑی ہے؟"

"ضرورت کا علم ہوسکتا ہے تمہیں نہ ہو لیکن میں جانتا ہوں کہ تمہارے چودھری صاحب کی ماسٹر آفتاب سے کیا دشمنی ہے۔ اور ہاں... اب تم یہ لاعلمی کا ڈراما بند کرو۔ میں جانتا ہوں کہ آفتاب کو یہیں لایا گیا ہے، میرے پاس عینی شاہد موجود ہے۔" وہ اس ساری بحث سے اچھا خاصا جھنجلا چکا تھا چنانچہ ذرا سختی سے بولا۔

"ٹھیک ہے سر! اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو پورا ڈیرا آپ کے سامنے ہے، آپ تلاشی لے سکتے ہیں۔ اگرچہ اس طرح ڈیرے کی تلاشی لینا ہمارے لیے بے عزتی کا سبب بنے گا لیکن اپنے قانون پسند ہونے کا ثبوت دینے کے لیے ہم یہ بے عزتی سہنے کو تیار ہیں۔" اس کے مقابلے میں منشی کا لہجہ بہت پُرسکون تھا۔ اس کا یہ سکون شہریار کو کھٹکا گیا۔

منشی کے اتنی آسانی سے تلاشی دینے کے لیے تیار ہوجانے کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا تھا کہ آفتاب اب ڈیرے پر موجود نہ ہو اور اسے یہاں سے کہیں اور شفٹ کردیا گیا ہو۔ دوسرا امکان اس سے بھی زیادہ برا اور تشویشناک تھا۔ ہونے کو تو یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اب تک اس کا کام ہی تمام کردیا گیا ہو اور اس کی لاش جنگل میں کہیں پڑی ہو۔ بہرحال جو بھی صورت حال تھی، وہ پولیس پارٹی لے کر یہاں تک آیا تھا، اب تلاشی لیے بغیر تو واپس جا نہیں سکتا تھا۔ امید کی کرن بہت مدھم پڑ جانے کے باعث اس نے ذرا ڈھیلے سے انداز میں ایس پی کو اشارہ کیا کہ تلاشی کا کام شروع کیا جائے۔ اس کی اور منشی کی بحث کے دوران خاموش تماشائی بن کر کھڑا رہنے والا ایس پی یہ اشارہ پاکر حرکت میں آگیا اور اپنے ماتحتوں کو ہدایات دینے لگا۔ اس مرحلے پر شہریار نے خود بھی غیر فعال رہنا پسند نہیں کیا اور تہ خانے کی تلاشی کے لیے جانے والے سپاہیوں کے ساتھ خود بھی نیچے اتر گیا۔

اس جگہ شہریار پہلے بھی آچکا تھا، جب اپنے پاگل بیٹے بہزاد شاہ کے ولیمے کے موقع پر چودھری نے اسے دھوکے سے نشہ آور کھانا کھلا کر اس کی ڈاکٹر ماریا کے ساتھ قابلِ اعتراض تصاویر کھینچ لی تھیں۔ ان تصویروں کے ذریعے وہ اسے بلیک میل کرکے اپنے اشاروں پر نچانے کا خواہش مند تھا۔ خاص طور پر اس سے ماہ بانو کا پتا اگلوانے کے لیے چودھری نے یہ حرکت کی تھی لیکن اس وقت ڈاکٹر ماریا نے اس سے تعاون کیا اور یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوگئی کہ چودھری نے وہ تصاویر کہاں رکھی ہیں۔ شہریار کے لیے تصاویر کا معاملہ بہت نازک تھا چنانچہ اس موقع پر وہ خود حرکت میں آیا اور رات کے اندھیرے میں چودھری کے ڈیرے میں گھس کر وہ تصویریں حاصل کرلیں۔

ایک گھنٹے کی مکمل تلاشی کے بعد بھی وہ ڈیرے میں سے کہیں سے آفتاب کو تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔

ایک گھنٹے بعد جب پولیس پارٹی اپنی ناکامی تسلیم کرنے کے بعد وہاں سے روانگی کی تیاری کررہی تھی تو چودھری افتخار کی لینڈ کروزر ڈیرے کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ شہریار اس وقت تک اپنی گاڑی میں نہیں بیٹھا تھا چنانچہ چودھری لینڈ کروزر سے اتر کر اس کی طرف بڑھا تو اسے رکنا پڑا۔

"آپ سے ہمیں یہ امید نہیں تھی اے سی صاحب! چھوٹے موٹے اختلافات اپنی جگہ لیکن میں یہ امید نہیں کرسکتا تھا کہ آپ کبھی اس طرح پولیس پارٹی لے کر میرے ڈیرے پر چڑھائی کردیں گے۔ اب جبکہ آپ تلاشی میں ناکام ہوکر یہاں سے واپس جارہے ہیں تو میں یہ حق رکھتا ہوں کہ چاہوں تو آپ پر عدالت میں ہتک عزت کا کیس دائر کردوں۔" ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولتے چودھری کے چہرے پر بے حد غضب تھا۔

"آپ اپنے فیصلوں میں آزاد ہیں، چاہیں تو یہ شوق پورا کرلیں لیکن یہ بات یاد رکھیے گا کہ جب عدالت میں اس مقدمے کی کارروائی شروع ہوگی تو یہ سچ بھی سامنے آئے گا کہ آپ پر ماسٹر آفتاب کو اغوا کرنے کا شک کیوں ظاہر کیا گیا۔ حویلی کی ملازمہ رانی کے قتل کا معاملہ بھی اس موقع پر اٹھ سکتا ہے لہٰذا میرا آپ کو مشورہ ہے کہ ہتک عزت کا مقدمہ دائر کرتے وقت ذرا اچھی طرح سوچ بچار کرلیجیے گا... کہیں یہ نہ ہو کہ مقدمے کے بعد آپ کی عزت زیادہ خطرے میں پڑ جائے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ میڈیا والوں کو اس طرح کی

کہانیوں کی کتنی تلاش رہتی ہے اور وہ ایسی خبریں کس طرح مرچ مسالا لگا کر پھیلاتے ہیں۔"

وہ چودھری کی دھمکی سے مرعوب ہوئے بغیر دو بدو بولا تو چودھری کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔ اسے شہریار کی بات سن کر ہی خیال آیا تھا کہ وہ کشور کے حویلی سے غائب ہو جانے والی بات سے واقف ہے، حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ اس نے تو صرف کشور اور آفتاب کے تعلق کی بنیاد پر یہ دھمکی دی تھی۔ کشور حویلی چھوڑ کر جا چکی ہے، اس بات کا اسے قطعی علم نہیں تھا۔

"میں جانتا ہوں چودھری صاحب کہ آفتاب کو آپ کے ہی حکم پر آپ کے آدمیوں نے اٹھایا ہے۔ میرے پاس عینی شاہد موجود ہے جو میرے کہنے پر کہیں بھی یہ بیان دینے کے لیے تیار ہو جائے گا کہ آپ کے کن کن آدمیوں نے کب اور کہاں سے آفتاب کو اغوا کیا تھا۔ چنانچہ بہتر ہے کہ آپ میرے کسی گواہ کے میڈیا کے سامنے زبان کھولنے سے پہلے ہی آفتاب کو رہا کر دیں ورنہ نتائج کے لیے میں ذمے دار نہیں ہوں گا۔" وہ گویا اس وقت چودھری سے براہِ راست جنگ کے موڈ میں آ گیا تھا اور ہر طرح کی احتیاط کا دامن چھوڑ بیٹھا تھا۔

"بس کر دو اے سی! میں اب تک تمہارے ماموں سے تعلق کی وجہ سے تمہیں چھوڑ تا رہا ہوں ورنہ تم جیسے چھوٹے افسر کی میرے سامنے اوقات کیا ہے۔ جس کرسی کے بل پر تم اتنا زور دکھا رہے ہو، میں اس کرسی سے پہلے بھی کئی سرکشوں کو اٹھا کر پھینک چکا ہوں۔" چودھری دہاڑا۔

"چلیں تو اس بار یہ کوشش کر دیکھیں۔ آپ کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ آپ میں کتنا زور ہے۔" چودھری کے غصے کے پیچھے چھپی بے بسی کو محسوس کر کے شہریار چڑانے والے انداز میں بول کر مسکرایا اور متوازن قدم اٹھاتا اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے پیچھے چودھری ایس پی کی گوشمالی کر رہا ہو گا لیکن ظاہر ہے ایس پی کے پاس بھی یہ عذر ہو گا کہ وہ اے سی صاحب کے حکم کے آگے مجبور تھا۔ بہر حال، چودھری کو جواب دینا ایس پی کا اپنا مسئلہ تھا۔ خود شہریار کو اس وقت اصل میں آفتاب کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ وہ کسی صورت آفتاب جیسے مخلص آدمی کو کھونا نہیں چاہتا تھا چنانچہ جب گاڑی میں بیٹھ کر ڈیرے سے روانہ ہوا تو اس کی پیشانی پر تفکر کا جال سا بچھا ہوا تھا۔

☆☆☆

"آفتاب سے میرا رابطہ نہیں ہو پا رہا بھابی! میں اتنی دفعہ ٹرائی کر چکی ہوں لیکن ہر بار ان کا فون بند ہی مل رہا ہے۔" ہاتھ میں موبائل تھامے پریشانی سے بولتی کشور، مہتاب کے برابر میں آ بیٹھی۔

"وہ کسی کام میں مصروف ہو گا اس لیے ڈسٹرب ہونے سے بچنے کے لیے موبائل آف کر دیا ہو گا۔ ابھی تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ وہ کام کے معاملے میں کتنا کریزی آدمی ہے۔ خاص طور پر جب کچھ لکھنے کے لیے بیٹھ جائے تو پھر اسے ساری دنیا بھول جاتی ہے۔ تم فکر نہیں کرو اور ایک آدھ گھنٹے بعد پھر ٹرائی کر کے دیکھو، انشاء اللہ بات ہو جائے گی۔" مہتاب نے اسے تسلی دی۔

"ہو سکتا ہے آپ کا اندازہ ٹھیک ہو لیکن میں مطمئن نہیں ہوں۔ میں نے اور آفتاب نے یہ وقت ایک دوسرے سے بات کرنے کے لیے مقرر کر رکھا ہے اس لیے مجھے یہ امید نہیں ہے کہ آفتاب ان اوقات میں اپنا موبائل آف کر کے کسی دوسرے کام میں مصروف ہو گئے ہوں گے۔" مہتاب کی تسلی کے باوجود اس کی پریشانی ہنوز اپنی جگہ قائم تھی اور یہ پریشانی بے وجہ بھی نہیں تھی۔ افضل اور مہتاب کی مدد سے وہ خود تو پیر آباد سے نکل آئی تھی لیکن جب تک آفتاب وہیں تھا، اس کی جان سولی پر ہی اٹکی رہتی۔ وہ کئی بار آفتاب پر زور بھی دے چکی تھی کہ اسے پہلی فرصت میں پیر آباد چھوڑ دینا چاہیے لیکن ہر بار وہ اسے ٹال جاتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کی ذات پر ابھی تک کوئی شک ظاہر نہیں کیا گیا ہے تو پھر کیوں وہ اچانک پیر آباد چھوڑ کر خود کو مشکوک ظاہر کرے۔

کشور کو اس کی یہ دلیل ٹھیک لگی تھی پھر وہ آفتاب کی اسکول سے وابستگی سے بھی واقف تھی۔ وہ اپنے اسکول کے پروجیکٹ کے معاملے میں بہت جذباتی تھا اور اس کے لیے اس پروجیکٹ سے الگ ہونا آسان ثابت نہیں ہوتا چنانچہ کشور نے خاموشی اختیار کر لی لیکن آفتاب کی ہی زبانی اسے یہ اطلاع بھی مل چکی تھی کہ چودھری افتخار امریکا سے واپس آ چکا ہے اس لیے اب آفتاب کا موبائل بند جا رہا تھا تو اسے تشویش نے گھیر لیا تھا۔

وہ اپنے باپ سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس کے غائب ہونے کی اطلاع ملنے پر ہی امریکا سے فوری طور پر واپس آیا ہو گا اور اب پوری شد و مد سے اسے تلاش کر رہا ہو گا۔ اس تلاش کے دوران وہ آفتاب تک بھی پہنچ سکتا تھا بلکہ اسے ڈر تھا کہ شاید وہ پہنچ ہی چکا ہے جب ہی اس کا آفتاب سے رابطہ نہیں ہو پا رہا۔ چودھری کے آفتاب تک پہنچ جانے کا خیال اتنا لرزہ خیز تھا کہ وہ اپنے اس خیال کو کئی بار واہمہ قرار دینے کی کوشش کے باوجود بری طرح بے کل تھی اور اب اپنی اس پریشانی کو لے کر مہتاب کے پاس چلی آئی تھی۔

"تم پریشان مت ہو۔ اللہ نے چاہا تو سب خیر ہو گی۔ میں ایسا کرتی ہوں کہ افضل کو فون کر دیتی ہوں۔ وہ اپنے کسی ذریعے سے آفتاب کے بارے میں معلوم کر کے بتا دیں گے۔" اس کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے مہتاب نے پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور خود اپنے موبائل کی تلاش میں ادھر اُدھر نظریں گھمانے لگی۔ ایک تپائی پر اسے موبائل رکھا ہوا نظر آ گیا۔

"بچے کیا کر رہے ہیں؟ کافی دیر سے ان کی آواز نہیں سنائی دے رہی۔" مہتاب فون بک کھول کر اس میں سے افضل کا نمبر ڈائل کرنے جا رہی تھی جب کشور نے اس سے پوچھا۔

"دونوں کو زبردستی پڑھنے کے لیے بٹھا کر آئی ہوں۔ پرسوں سے امتحان شروع ہونے والے ہیں لیکن شیطانوں کا آج کل تمہارے ساتھ اتنا دل لگا ہوا ہے کہ پڑھنے بیٹھنے کے لیے راضی ہی نہیں ہوتے۔ ابھی بھی یہی ضد تھی کہ دلہن چچی کے ساتھ باتیں کرتے ہیں لیکن میں نے ڈانٹ کر مشکل سے دونوں کو قابو میں کیا ہے۔" مہتاب نے اسے جواب دیا اور خود دوسری طرف جاتی گھنٹی کی آواز سننے لگی جبکہ اس کا جواب سن کر کشور کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ مہتاب کے دونوں بچے بہت پیارے تھے اور اس کے ساتھ اتنا زیادہ مل گئے تھے کہ اسکول سے آنے کے بعد مشکل سے ہی اس کو چھوڑنے کے لیے راضی ہوتے تھے۔ وہ خود بھی ان کی چھوٹی چھوٹی شرارتیں اور معصومیت بھری باتیں انجوائے کرتی تھی۔ ان دونوں کے ساتھ مصروف رہتے اکثر اسے اپنے وجود میں پلتے اس بچے کا خیال آ جاتا تھا جو اس کی اور آفتاب کی محبت کی نشانی تھا۔ مہتاب کے بچوں کی شرارتوں سے لطف اندوز ہوتے اس کے ذہن کی اسکرین پر اپنے بچے کا تصور ابھر آتا اور وہ اسے اپنے سامنے کھیلتا کودتا، شرارتیں کرتا نظر آنے لگتا۔ اس پریشان کن صورتِ حال میں بھی اس کے دل میں ایسا ہی خیال ابھرا تھا اور بے اختیار اس کے ہونٹ مسکرانے پر مجبور ہو گئے تھے۔

"جی افضل! میں نے آپ کو اس لیے فون کیا ہے کہ یہ کشور آفتاب کے لیے بہت پریشان ہو رہی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ بہت دیر سے آفتاب سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن اس کا موبائل مسلسل آف جا رہا ہے۔ پلیز! آپ ذرا کسی طرح معلوم تو کریں کہ کیا مسئلہ ہے تاکہ اس پاگل لڑکی کو سکون آئے۔" مہتاب کی آواز نے اسے اپنے خیالات کی دنیا سے باہر نکالا اور وہ اس گفتگو کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"جی میں نے اسے تسلی دی ہے لیکن وہ پھر بھی پریشان ہی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ خود کسی طرح آفتاب سے رابطہ کریں اور اس سے کہیں کہ اپنی بیگم صاحبہ کو فون کر لے ورنہ تو محترمہ اپنی جان ہلکان کرتی رہیں گی۔" اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر مہتاب نے مسکراتے ہوئے افضل سے یہ بات کہی اور پھر اس کا جواب سن کر فون بند کر دیا۔

"میں نے افضل سے کہہ دیا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ کشور سے کہو پریشان نہ ہو، میں ابھی آفتاب سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" موبائل کو ایک سائڈ پر رکھتے ہوئے اس نے کشور کو بتایا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا لیکن اس کا دل جس بُری طرح بے چین تھا، اس کیفیت کا خاتمہ آفتاب کی آواز سنے بغیر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

"ایسا کرو تم بچوں کے کمرے میں چلی جاؤ۔ ذرا ان کی نگرانی کر لینا کہ صحیح سے پڑھ بھی رہے ہیں یا آپس میں جوتیوں لڑانے میں لگے ہوئے ہیں۔ میں اتنی دیر میں کچن دیکھ لیتی ہوں۔ کھانا تقریباً تیار ہی ہے۔ بس صرف روٹیاں پکانی ہیں۔ وہ پکا کر میں کھانا لگا دیتی ہوں تاکہ بچے کھا پی کر جلدی سو جائیں۔ رات کو دیر سے سوتے ہیں تو پھر صبح اسکول جانے کے لیے اٹھنے میں تنگ کرتے ہیں۔" مہتاب بھی سمجھ رہی تھی کہ وہ کس کیفیت کا شکار ہے اس لیے اسے بچوں کے ساتھ مصروف کر دینا مناسب سمجھا۔ یہ بات اسے بھی اچھی طرح معلوم تھی کہ بچوں کے ساتھ وہ بہل جاتی ہے۔ کشور نے اس کے مشورے پر عمل کیا اور واقعی کسی حد تک بہل بھی گئی۔ البتہ جب مہتاب نے کھانا لگایا اور اس سے بھی کھانے کے لیے کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ اس کے انکار پر مہتاب نے خود بھی بہت زیادہ اصرار نہیں کیا اور دونوں بچوں کو کھانا کھلا کر ان کے دانت وغیرہ صاف کروانے کے بعد سونے کے لیے کمرے میں بھیج دیا۔ ان دونوں میں یہی طے ہوا تھا کہ وہ بعد میں افضل کے آنے کے بعد اس کے ساتھ ہی کھانا کھائیں گی اور افضل کا فی الحال کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ بچوں کو سونے کے لیے بستر پر لٹایا گیا تو انہوں نے کشور سے کہانی سنانے کی فرمائش کر ڈالی۔ بچوں کی فرمائش پر وہ ان کے ساتھ ہی بستر پر لیٹ کر کہانی سنانے لگی۔ مہتاب اس دوران باورچی خانہ سمیٹنے کا کام کر رہی تھی۔ کہانی سنتے سنتے دونوں بچے نیند کی آغوش میں چلے گئے تو وہ بھی آنکھیں موند کر لیٹ گئی۔ مہتاب نے اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد بچوں کے کمرے میں جھانکا تو اسے یہی گمان گزرا کہ کشور بھی سو چکی ہے۔ وہ آہستگی سے دروازہ بند کر کے واپس پلٹ گئی۔ ابھی وہ لاؤنج میں

جا کر بیٹھی ہی تھی کہ ڈور بیل بجی۔ ساتھ ہی افضل کی گاڑی کا مخصوص ہارن بھی سنائی دیا۔ اس نے جھٹ جا کر گیٹ کھولا۔ افضل گاڑی اندر لے آیا۔ اس کی گاڑی کے پیچھے گیٹ بند کر کے مہتاب واپس پلٹی تو افضل گاڑی سے اتر چکا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر مہتاب چونک گئی۔ وہ بہت سنجیدہ اور پریشان نظر آ رہا تھا۔

''سب ٹھیک تو ہے افضل! آپ مجھے پریشان لگ رہے ہیں؟'' اس نے تشویش سے سوال کیا۔

''کچھ اچھی اطلاع نہیں ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ کشور کہاں ہے؟'' اس کے ساتھ اندر کی طرف بڑھتے ہوئے افضل نے گمبھیر لہجے میں سوال کیا۔

''بچوں کے کمرے میں ہے۔ ان کی فرمائش پر انہیں کہانی سنا رہی تھی۔ کہانی سنتے سنتے بچے بھی سو گئے اور خود اس کی بھی آنکھ لگ گئی... لیکن آپ یہ تو بتائیں کہ بات کیا ہے؟ آفتاب کے بارے میں کوئی خبر ملی یا نہیں؟'' اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے مہتاب نے پریشانی سے پوچھا۔ اس وقت وہ لوگ لاؤنج میں پہنچ چکے تھے اور افضل ایک صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا تھا۔

''میں اسی کے لیے پریشان ہوں۔ اس کی طرف سے بالکل بھی اچھی اطلاعات نہیں ہیں۔ میں نے اس کے ساتھی نیچر منیب سے رابطہ کیا تھا۔ اس نے بتایا کہ آفتاب لاہور آنے کے ارادے سے گاؤں سے نکل ہی رہا تھا کہ راستے میں اسے چودھری کے کارندوں نے اٹھا لیا۔ منیب نے اس واقعے کی اطلاع اے سی شہریار عادل کو دی جس نے فوری طور پر ایکشن لیتے ہوئے چودھری کے ڈیرے پر اپنی نگرانی میں پولیس ریڈ کروایا لیکن اس ایکشن کا کوئی فائدہ نہیں ہو سکا۔ پولیس اپنی پوری کوشش کے باوجود آفتاب کو ڈیرے سے بازیافت کروانے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ میں نے منیب سے بات کرنے کے بعد اے سی شہریار کو بھی کال کی تھی۔ وہ خود آفتاب کے لیے پریشان ہے اور مجھے یقین دلایا ہے کہ اس سلسلے میں جو کچھ ممکن ہو سکا، وہ ضرور کیا جائے گا۔ اے سی اچھا بندہ ہے۔ مجھے اس کی بات پر یقین بھی ہے لیکن چودھری جیسے بندے کا کوئی بھروسا نہیں۔ اس کی پہنچ بھی بڑی ہے اور وہ بدخصلت بھی بہت زیادہ ہے۔ اب یہی دیکھ لو کہ شہریار عادل کو کنفرمڈ اطلاع ملی تھی کہ آفتاب کو اغوا کرنے کے بعد ڈیرے پر لے جایا گیا ہے لیکن اسے ڈیرے سے بازیافت نہیں کروایا جا سکا۔ اس کا یہی مطلب لیا جا سکتا ہے کہ پولیس والوں میں بھی اس کے پٹھو موجود ہیں جنہوں نے پولیس فورس کے ڈیرے پر پہنچنے سے پہلے ہی چودھری کو خبردار کر دیا اور چودھری نے آفتاب کو کہیں اور شفٹ کر دیا۔ بس اب تم بھی دعا کرو کہ آفتاب جہاں بھی ہو، صحیح سلامت ہو ورنہ چودھری کا کیا بھروسا ہے، وہ تو کسی خوں خوار بھیڑیے کی طرح ہے جس کے نزدیک کسی کی جان لینا ذرا بھی مشکل نہیں۔ منیب بتا رہا تھا کہ حویلی کی تین ملازماؤں کی جنگل سے لاشیں ملی ہیں۔ وہ لڑکیاں کیسے مریں اور ان کی لاشیں جنگل میں کیسے پہنچیں، کسی کو نہیں معلوم... لیکن سمجھتے سب ہیں کہ ان لڑکیوں کی موت کے پیچھے چودھری کے سوا کسی کا ہاتھ نہیں ہو سکتا۔'' افضل نے اسے ساری تفصیل کہہ سنائی۔

''او مائی گاڈ! یہ سب تو بہت خوفناک ہے۔ کشور کو اگر یہ ساری باتیں معلوم ہو گئیں تو اس کی بہت بُری حالت ہو گی۔'' تفصیل سن کر مہتاب پریشانی سے بولی۔ اسے علم نہیں تھا کہ کشور یہ ساری باتیں سن رہی ہے۔ وہ اسے سویا ہوا سمجھی تھی لیکن درحقیقت تو وہ جاگ ہی رہی تھی اور بیل کی آواز سن کر کمرے سے باہر بھی آ گئی تھی۔ افضل اور مہتاب نے آپس میں جو بھی گفتگو کی اس نے لاؤنج کے دروازے پر کھڑے ہو کر حرف بہ حرف سنی تھی اور یہ سب سن کر اس کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ افضل نے چودھری کے بارے میں جو رائے دی تھی، اس سے وہ پوری طرح متفق تھی بلکہ افضل تو پھر چودھری کو اتنی اچھی طرح نہیں جانتا تھا جتنی اچھی طرح وہ واقف تھی، اس لیے اسے اندازہ تھا کہ اگر آفتاب اس وقت زندہ ہے تو بہت تکلیف میں ہو گا۔ اس کی تکلیف کا سوچ کر کشور کا دل ڈوبنے لگا اور اسے زمین و آسمان اپنے گرد گھومتے ہوئے نظر آنے لگے۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش میں اس نے دروازے کے پٹ کا سہارا لینا چاہا لیکن اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکی اور دھڑام سے نیچے گر گئی۔ افضل اور مہتاب جو اسے بچوں کے کمرے میں سویا ہوا سمجھ کر بنا کسی احتیاط کے گفتگو کر رہے تھے، اس کے گرنے کی آواز پر چونکے۔

''یا اللہ! یہ کیا ہوا؟'' مہتاب بولتی ہوئی تیزی سے اس کی طرف بڑھی اور پھر چوکھٹ پر پڑا خون دیکھ کر مزید گھبرا گئی۔ گرنے پر کشور کا سر چوکھٹ سے ٹکرایا تھا اور اب اس سے خون بہہ رہا تھا۔

''کشور... کشور!'' مہتاب اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر اسے آوازیں دینے لگی لیکن اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ مکمل طور پر بے ہوش تھی۔

''تم اس کے سر پر کوئی پٹی باندھ دو تاکہ خون کا اخراج کم ہو سکے۔ میں گاڑی نکالتا ہوں تاکہ اسپتال جایا جا سکے۔'' افضل جو خود بھی قریب آ کھڑا ہوا تھا مہتاب سے بولا۔ کشور کی حالت نے اسے بھی تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ ماں بننے کے نازک مرحلے سے گزر رہی تھی۔ اس پر اسے ملنے والا ذہنی صدمہ اور یہ چوٹ خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔

''بچے گھر پر اتنی رات کو اکیلے نہیں رہ سکتے اس لیے مجھے اکیلے ہی اسپتال جانا ہو گا۔ تمہیں میں فون پر صورتِ حال بتا دوں گا۔'' اس کے حسبِ ہدایت مہتاب نے کشور کے سر پر پٹی باندھ دی تو افضل نے اس کی مدد سے کشور کو اپنی گاڑی کی پچھلی نشست پر لٹا دیا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے اس کے ستے ہوئے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ مہتاب نے تفہیمی انداز میں سر ہلا دیا۔ خواہش تو اس کی یہی تھی کہ وہ کشور کے ساتھ خود بھی اسپتال جائے لیکن مجبوری ایسی تھی کہ وہ بے بس ہی ہو گئی تھی۔ اگر دن کا وقت ہوتا تو وہ اپنی کام والی ماسی کو بچوں کے پاس چھوڑ دیتی لیکن رات کو تو ماسی بھی نہیں ہوتی تھی اس لیے اس کے ہاتھ پیر بالکل بندھے ہوئے تھے۔ وہ افضل کی گاڑی روانہ ہونے کے بعد گیٹ بند کر کے اندر آ گئی اور خلوصِ دل سے کشور کے لیے دعا کرنے لگی۔ ساتھ ہی ساتھ آفتاب کی خیر و عافیت کے لیے بھی دعاؤں کا سلسلہ جاری تھا۔

دوسری طرف افضل کشور کو لے کر ایک نجی اسپتال پہنچا۔ صحافت کے شعبے سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اس کی بہت لوگوں سے جان پہچان تھی اور یہ جان پہچان اکثر نازک مواقعوں پر کام بھی آ جاتی تھی۔ اس اسپتال کے عملے نے بھی اس سے بھرپور تعاون کیا اور وہ کشور کو اپنی سالی کی حیثیت سے متعارف کروا کر اسے فرضی نام سے یہاں ایڈمٹ کروانے میں کامیاب ہو گیا۔

''میں نے آپ کی سسٹر ان لا کو چیک کر لیا ہے مسٹر افضل! ان کے سر پر لگنے والی چوٹ خطرناک نہیں ہے۔ معمولی سا زخم ہے جس کی بینڈیج کر دی گئی ہے۔ چند دن میں زخم بالکل ٹھیک ہو جائے گا لیکن ان کی بے ہوشی کے سلسلے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ خاتون شاک کی حالت میں ہیں۔ ہم کوشش کر رہے ہیں، دیکھیں کب انہیں ہوش آتا ہے۔ اصل میں خاتون کے پریگنیٹ ہونے کی وجہ سے مسئلہ زیادہ نازک ہو گیا ہے۔ ماں کی یہ کنڈیشن بچے کو بھی متاثر کر سکتی ہے۔'' کشور کو اندر لے جائے جانے کے بعد وہ ویٹنگ روم میں بیٹھا انتظار کر رہا تھا جب ڈاکٹر نے آ کر اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ صورتِ حال کو جاننے کے بعد افضل مزید پریشان ہونے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔

''آپ پریشان نہ ہوں، کوئی نہ کوئی بہتری کی صورت نکل آئے گی۔'' اس کی پریشانی دیکھ کر ڈاکٹر نے اسے تسلی دی۔

''پریشانی کی بات تو ہے ڈاکٹر! یہ میرے گھر مہمان آئی ہوئی تھیں۔ اگر خدانخواستہ انہیں کچھ ہو گیا تو میں ان کے شوہر اور سسرال والوں کو کیا جواب دوں گا۔'' افضل نے اپنی پریشانی کا روایتی سا جواز پیش کیا۔ درحقیقت وہ پہلے ہی آفتاب کی وجہ سے بہت پریشان تھا، اس پر سے کشور کی ایسی حالت نے اس کی پریشانی مزید بڑھا دی تھی۔

''یہ پرابلم تو ہماری سوسائٹی میں ہر شخص کو قدم قدم پر فیس کرنے پڑتے ہیں۔ میکے والوں کو موقع بے موقع دباؤ میں مبتلا کرنا سسرال والے اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ ویسے بائی دا وے آپ مجھے یہ بتائیں گے کہ محترمہ اس حالت کو پہنچیں کیسے؟'' ڈاکٹر بھی اچھا خاصا باتونی شخص تھا جو باتوں ہی باتوں میں اس سے سب تفصیلات جان لینے کا خواہش مند نظر آتا تھا۔

''میں صحیح سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میری مسز کے مطابق یہ فون پر اپنے کسی سسرالی عزیز سے بات کر رہی تھیں، فون بند کیا اور اس کے بعد چکرا کر گر پڑیں۔'' افضل نے ایسا بہانہ گھڑا جو اس باتونی ڈاکٹر کے دل کو بھا سکے۔

''ویری سیڈ! یقیناً وہاں سے انہیں کچھ ایسا کہا گیا ہو گا جو ان سے برداشت نہیں ہو سکا۔ آپ کو چاہیے کہ ان کے شوہر کو فون کر کے ساری صورتِ حال سے آگاہ کریں۔ یوں بھی اس وقت آپ کی جگہ انہیں ہی اپنی بیوی کے پاس اسپتال میں موجود ہونا چاہیے تھا۔'' افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر نے اسے مشورہ دیا۔

''وہ آج کل ملک سے باہر ہیں اور میرے پاس ان کا فون نمبر نہیں۔'' افضل نے اپنی جان چھڑانی چاہی۔

''پھر بھی آپ کوشش کریں کہ کسی طرح ان سے رابطہ ہو جائے۔ یہ معاملات بڑے نازک ہوتے ہیں۔ آپ کتنی ہی بھاگ دوڑ کر لیں لیکن ذرا بھی اونچ نیچ ہو گئی تو آپ کے سر ہی الزام آئے گا۔ میں خود چھ بہنوں کا اکلوتا بھائی ہوں اس لیے اس قسم کی صورتِ حال کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔'' ڈاکٹر نے اس پر زور دیتے ہوئے آخر میں جو بات کہی، اسے سن کر افضل کو اندازہ ہوا کہ یہ ڈاکٹر اتنا باتونی اور گھریلو معاملات میں اتنا ایکسپرٹ کیوں ہے۔ بے چارہ یقیناً اکلوتے بھائی کی حیثیت سے چھ بہنوں کے سسرالی مسائل بھگتاتے بھگتاتے پریشان ہو گیا تھا۔ چنانچہ جس کسی کو بھی اس طرح کی مشکل میں دیکھتا تھا اس سے دلی ہمدردی محسوس کرنے لگتا تھا۔

''مشورے کا شکریہ ڈاکٹر صاحب! میں اپنی وائف

سے کہوں گا کہ وہ اس سلسلے میں کچھ کریں۔ فی الحال تو رات کا وقت ہے اور کسی کو بھی ڈسٹرب نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس وقت کسی سے رابطہ کرنا مناسب ہوتا تو میرے ساتھ میری واقف بھی اسپتال آتیں لیکن ہماری مجبوری تھی کہ گھر پر بچے اکیلے تھے اور ان کے ساتھ کسی بڑے کا ہونا لازمی تھا۔ خیر، صبح ہوگی تو دیکھا جائے گا کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔ اس وقت تو آپ ہی تعاون کریں اور اپنے اسٹاف کے ساتھ مل کر میری سسٹر ان لا کی دیکھ بھال کریں۔" افضل نے بہت شائستگی سے ڈھکے چھپے لفظوں میں ڈاکٹر کو جتا دیا کہ اس وقت اس کی یہاں کے بجائے کشور کے پاس موجودگی زیادہ ضروری ہے۔

"بالکل جناب! آپ بے فکر رہیں۔" ڈاکٹر نے اس کا اشارہ سمجھ لیا اور وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد افضل نے مہتاب کا نمبر ملایا اور اسے صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔

"یہ تو بہت پریشانی کی بات ہے۔ پہلے ہی آفتاب کی وجہ سے دل اتنا گھبرا رہا ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ اسے کس طرح سے چودھری کے چنگل سے بچایا جائے۔ اس پر سے کشور کی یہ حالت۔" وہ صورتِ حال جان کر پریشان ہوگئی۔

"اللہ سے اچھی امید رکھو۔ ہمارے اختیار میں جو کچھ ہوا، ضرور کریں گے۔ میں اپنے چند ساتھیوں سے مشورہ کر کے دیکھتا ہوں پھر ہم مل کر طے کریں گے کہ آفتاب کو آزاد کرنے کے لیے چودھری کو کس طرح مجبور کیا جائے۔ اصل میں یہ روایتی جاگیردار اور وڈیرے مغرور بہت ہوتے ہیں اور اپنی اکڑ کی وجہ سے مشکل سے قابو میں آتے ہیں لیکن تم ہم صحافیوں کو بھی جانتی ہو۔ کسی کے بارے میں جاننے پر آئیں تو گڑے مردے بھی اکھاڑ ڈالتے ہیں۔ چودھری کا بھی کوئی نہ کوئی ویک پوائنٹ ثبوتوں کے ساتھ ہمارے ہاتھ آ جائے گا جس کے سامنے آنے پر چودھری کو ہمارے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔" افضل نے بیوی کو تسلی دی۔

"انشاءاللہ!" مہتاب نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔

"تم کوشش کرو کہ تھوڑی دیر سو جاؤ۔ صبح بچوں کو اسکول بھجوانے کے بعد تم یہاں اسپتال آ جانا تاکہ میں باہر نکل کر کچھ ہاتھ پیر مار سکوں۔" افضل نے اسے مشورہ دے کر فون بند کر دیا اور اپنے قریبی صحافی دوستوں سے مشورے کے لیے انہیں فون کرنے لگا۔ دوستوں سے جاری اس ٹیلی فونک گفتگو کے علاوہ وہ وقتاً فوقتاً کشور کے بارے میں بھی معلوم کر لیتا تھا۔ وہ ہنوز پہلے والی حالت میں ہی تھی البتہ ڈاکٹر نے اسے ڈرپ کے ساتھ ملا کر ایسی ادویات دے دی تھیں جو بچے کو کوئی نقصان پہنچنے سے بچا سکیں۔ افضل کی درخواست پر اس نے اپنی دوست ایک مشہور گائناکولوجسٹ کو بھی کچھ دیر کے لیے اسپتال بلوا کر کشور کا چیک اپ کروایا تھا۔ گائناکولوجسٹ نے اپنی طرف سے مشورے دینے کے ساتھ ساتھ یہ تسلی بھی دی تھی کہ بچہ بالکل محفوظ ہے اور فی الحال اسے کوئی خطرہ نہیں۔

افضل کی پوری رات اسپتال میں جاگتے ہوئے گزری۔ صبح کی روشنی پھیلی تو وہ ڈیوٹی اسٹاف کو اپنے تھوڑی دیر کے لیے گھر جانے کا بتا کر اسپتال سے نکل پڑا۔ اس کا ارادہ تھا کہ گھر جا کر مہتاب کو لے آئے گا اور اسے یہاں چھوڑنے کے بعد خود آفتاب کی بازیابی کے لیے بھاگ دوڑ کرے گا۔ گھر کے گیٹ پر پہنچ کر اس نے حسبِ عادت گاڑی کا ہارن بجایا۔ مہتاب ہارن کی آواز پہچانتی تھی اور اسے سن کر فوراً ہی گیٹ کھولنے کے لیے دوڑی چلی آتی تھی لیکن آج جانے کیا بات تھی کہ وہ گیٹ کھول ہی نہیں رہی تھی۔ افضل نے غور کیا تو اسے اندازہ ہوا کہ ذیلی گیٹ اندر سے لاک نہیں ہے اور یونہی بھڑا ہوا ہے۔ وہ کچھ تشویش کے عالم میں گاڑی سے اتر کر گیٹ کی طرف بڑھا اور ذیلی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ گھر کے اندر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ یقیناً بچے جو کہ اسکول دور ہونے کی وجہ سے صبح جلدی ہی روانہ ہو جاتے تھے، جا چکے تھے اور مہتاب شاید رات بھر جاگنے کی وجہ سے اتنی تھکی ہوئی تھی کہ بچوں کے روانہ ہونے کے بعد اسے پیچھے سے دروازہ بند کرنے کا خیال ہی نہیں آیا اور وہ یونہی سو گئی۔

دل ہی دل میں قیاس آرائی کرتے ہوئے اس نے اپنے بیڈروم کا رخ کیا۔ اس کے اندازے کے مطابق مہتاب کو یہیں ہونا چاہیے تھا لیکن وہاں مہتاب کی موجودگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ یہاں تک کہ بستر کی چادر بھی اس طرح بے شکن تھی کہ صاف سمجھ آ رہا تھا کہ مہتاب پل بھر کے لیے بھی اس بستر پر نہیں لیٹی ہے۔ وہ بیڈروم کا دروازہ کھلا چھوڑ کر بچوں کے کمرے کی طرف بڑھا۔ اپنے کمرے کے بعد دوسری جگہ یہی تھی جہاں مہتاب کے پائے جانے کا امکان تھا۔ بچوں کے کمرے کے سامنے پہنچ کر اس نے ہاتھ سے بند دروازے کو دھکیلا، اس کا اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔ مہتاب یہیں بچوں کے بستر پر ہی لیٹی ہوئی تھی بلکہ اندازے کے برخلاف دونوں بچے بھی اس کے پہلو میں ہی موجود تھے مگر اس منظر میں کچھ ایسا بھی شامل تھا جس نے افضل کے سامنے زمین و آسمان کو گھما ڈالا۔ وہ جو ایک صحافی ہونے کے ناتے بہت مضبوط اعصاب کا مالک تھا، اپنے قدموں پر کھڑا رہنے کی ہمت نہیں کر سکا اور نیچے زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

حادثات و سانحات کی شکار۔ پناہ کی تلاش میں سرگرداں
ماہ بانو کی داستانِ حیات کے واقعات اگلے ماہ پڑھیے

سولہویں قسط

اسماقادری

ہمارے سماج میں قانون کتابوں
میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور بااثر
سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی
بدل کے رہ جاتے ہیں۔ مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون
کے بھی کئی رخ ہیں، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل
تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے...... یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں
تحریر ہوتی ہے...... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں
بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور
مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو
روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا
انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت
اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی
بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں..... کبھی بازی
پلٹ بھی جاتی ہے۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے...... اس
وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسرشاہی، جاگیرداری
اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل...... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی!

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیر نگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیرآباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہوجاتا ہے۔ چودھری ظالم و جابر اور عیاش تھا۔ شہریار اس کے ناجائز کاموں میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ پیرآباد کا رہائشی ماسٹر آفتاب جو عرصے سے گاؤں کے پرائمری اسکول کی ترقی کا خواہش مند ہوتا ہے، شہریار کا سہارا پاکر مکمل کرانے مشن پر کام کرنے لگتا ہے۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب کو دیکھتی ہے تو اس کی محبت میں مبتلا ہوجاتی ہے۔ اس کی محبت کی شدت کو دیکھتے ہوئے آفتاب کو اسے اپنے دل میں جگہ دینی پڑتی ہے اور دونوں کے درمیان ہونے والی چوری چھپے کی ملاقاتیں خفیہ نکاح تک جا پہنچتی ہیں۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیرآباد سے ہے۔ اس کے والدین بچپن میں ہی اسے اس کے خالہ خالو کو دے دیتے ہیں جن کے ساتھ وہ فیصل آباد میں رہتی تھی لیکن والدین اور بھائی بہنوں سے ملاقات کے لیے اس کا پیرآباد آنا جانا رہتا تھا۔ چودھری افتخار پیری مریدی کے چکر میں اپنے مرحوم دادا کا عرس بڑی شان و شوکت سے مناتا ہے۔ عرس کے دنوں میں جبراً حویلی کے کاموں کے لیے بلوائی جانے والی ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آجاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکل کر بھاگ جانے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ اگلی بار اس کا اپنی بہن کی شادی میں دوبارہ پیرآباد آنا ہوتا ہے۔ چودھری اسے اغوا کروالیتا ہے لیکن ماہ بانو ایک بار پھر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ چودھری افتخار ہر صورت اس سے شادی کرنا چاہتا ہے مگر ماہ بانو شادی سے قبل ہی اپنی بہن زہرا کے تعاون سے گھر سے بھاگ نکلتی ہے اور شہریار سے جا ملتی ہے۔ شہریار اسے اپنی گاڑی میں چھپا کر پیرآباد سے نکال دیتا ہے اور دارالامان بھجوا دیتا ہے لیکن چودھری کے آدمی مستقل اس کے پیچھے رہتے ہیں پھر ماہ بانو مشکلات سے گزرتی ہوئی خواجہ سراؤں کے ہتھے لگ جاتی ہے۔ خواجہ سراؤں کا گرو الماس بطور سزا اس سے وہی کام لیتا ہے جو اس کے گرگے کرتے ہیں۔ ایک روز الماس اسے لے کر ایک ہندو سیٹھ کی کوٹھی پہنچتا ہے۔ راستے میں ٹیکسی والے کی بدتمیزی کی وجہ سے ماہ بانو زخمی ہوجاتی ہے۔ کوٹھی میں اسے ایک حیرت انگیز منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔ کوٹھی کے تہ خانے میں کئی خواجہ سرا جمع ہوتے ہیں جن کی موجودگی میں ان کا مہا گرو ایک نوجوان لڑکی کو ایک مورتی کے قدموں میں بھینٹ چڑھا دیتا ہے پھر ایک چھاپے کے دوران ماہ بانو کو تھانے لے جایا جاتا ہے۔ سجاد رانا کو اپنی بیٹی شینا کی تلاش ہوتی ہے جسے خواجہ سراؤں کے ایک گروہ نے اغوا کرلیا تھا۔ چنانچہ جب انہیں یہ اطلاع ملتی ہے کہ خواجہ سراؤں کے ایک گروہ میں ایک لڑکی دیکھی گئی ہے تو وہ اسے اپنی بیٹی سمجھ کر بازیافت کروانے کی کوشش کرتا ہے اور نتیجے میں ماہ بانو آزاد ہوجاتی ہے۔ ماہ بانو کو شہریار کا ماموں زاد بھائی سجاد رانا اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاتا ہے جہاں شہریار بھی موجود ہوتا ہے۔ وہیں وہ شینا کی تصویر دیکھتی ہے اور شہریار کو بتاتی ہے کہ اس لڑکی کو ہندو سیٹھ کی کوٹھی میں ایک دیوی کے قدموں میں بھینٹ چڑھایا جاچکا ہے۔ ہندو سیٹھ کی کوٹھی پر چھاپا مارا جاتا ہے لیکن وہاں سے سیٹھ اور شینا کو اغوا کرنے والے خواجہ سراؤں کی لاشوں کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ سجاد رانا کو اپنی بیٹی کے قاتلوں کی تلاش تھی اور یہ تلاش اس کی را کے ایجنٹوں سے مڈبھیڑ کروا دیتی ہے جس کا حتمی نتیجہ اس کے قتل کی صورت میں نکلتا ہے۔ چودھری ماہ بانو کی سجاد رانا کے گھر موجودگی کی بھنک پاکر اسے وہاں سے اغوا کروانے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہ کوشش ناکام ہوجاتی ہے اور شہریار اپنے ڈرائیور مشابرم خان کے مشورے پر ماہ بانو کو کاندے منتقل کردیتا ہے۔ کاندے سے ماہ بانو مشابرم خان کے بھائی اکرم خان اور ماں کے ساتھ ہوتے ایک شادی میں شرکت کے لیے جاتی ہے اور وہاں کی کیمپنگ سائٹ پر ایک گورے کی ہوس کا نشانہ بننے سے بچ جاتی ہے لیکن وہ ماہ بانو کو اغوا کراتا ہے اور اس کارروائی میں اکرم خان مارا جاتا ہے۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ ماہ بانو کے بارے میں ساری معلومات حاصل کرلیتا ہے اور یہ جاننے کے بعد کہ چودھری، ماہ بانو کی تلاش میں ہے، ایک منصوبہ تشکیل دیتا ہے۔ پیرآباد سے متصل جنگل کو اس کے مخصوص ماحول کی وجہ سے پوست کی کاشت کے لیے استعمال کرنا اس کے منصوبوں میں سے ایک ہے جس کے لیے وہ ماہ بانو کا لالچ دے کر چودھری کو اپنے ساتھ ملالیتا ہے۔ چودھری کے ظلم و جبر کی ایک نشانی فریدہ ہے۔ وہ نور پور گاؤں کے چودھری مختار کی بہن ہے۔ شہریار اور چودھری کے درمیان مخاصمت اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ چودھری ڈاکٹر ماریا نامی ایک لڑکی کے ساتھ اس کی قابل اعتراض تصویریں اتار کر اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ڈاکٹر ماریا کے تعاون کی وجہ سے شہریار وہ تصویریں حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور چودھری کی چال سے بچ نکلتا ہے۔ کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ اس کا آفتاب کے دوست افضل اور اس کی بیوی کے ذریعے فرار ممکن ہوتا ہے۔ ادھر کشور کے غائب ہونے سے حویلی میں کھلبلی مچ جاتی ہے اور کشور کے غیاب پر وہاں کی ملازمائیں زیر عتاب آجاتی ہیں۔ خاص طور پر کشور کی ملازمہ خاص رانی۔ ادھر ماہ بانو اس برف زار سے فرار ہونے کی کوشش کرتی ہے اور وہاں موجود عمران نامی لڑکے کے ساتھ بھاگ نکلتی ہے مگر عمران ایک جگہ ایوالانچ کی زد میں آجاتا ہے اور اس میں دب کر اپنی جان گنوا بیٹھتا ہے۔ ماہ بانو تنہا اس برف زار میں بھٹکنے لگتی ہے۔ ادھر چودھری افتخار نیویارک سے واپس آکر بہانے سے اپنے ملازموں سے کشور کے غیاب کی تفتیش کرتا ہے اور رانی پر بے انتہا تشدد کرتا ہے مگر رانی موقع پاکر چودھری کے ریوالور سے خود کو ختم کرلیتی ہے۔ شہریار نور پور سے واپسی پر تھانے جاتا ہے جہاں ایک اتائی ڈاکٹر سے تفتیش کے دوران موت کے منہ میں چلے جانے والے بچے کا باپ جگول جاتا ہے اور وہ شہریار کا احسان مند ہوتے ہوئے اسے اپنا موبائل نمبر دے کر اپنی خدمات پیش کرنے کی آفر کرتا ہے۔ ادھر مشابرم خان ماہ بانو کی تلاش میں اس برف زار تک پہنچ جاتا ہے اور دشمنوں کا پتا لگالیتا ہے مگر وہ اسے بھی آدبوچتے ہیں مگر مشابرم خان موقع پاکر ان سے بھڑ جاتا ہے اور اس نتیجے میں وہاں آگ لگ جاتی ہے اور پہاڑوں میں موجود دھماکا خیز مواد پھٹ پڑتا ہے جس میں کافی ہلاکتیں ہوتی ہیں۔ چودھری افتخار کو کشور کے حوالے سے ڈیوڈ کی زبانی آفتاب اور افضل سے متعلق اطلاعات ملتی ہیں کہ ان افراد کی شخصیت مشکوک ہے۔ چودھری افتخار ماسٹر آفتاب کو اغوا کرالیتا ہے۔ شہریار کو جب اس کی اطلاع ملتی ہے تو وہ ڈیرے پر ریڈ کرتا ہے مگر آفتاب کو بازیاب نہیں کراپاتا۔ ماہ بانو برف زار میں بھٹکتے بھٹکتے بے ہوش ہوجاتی ہے اور اس دوران اسے ایک مہربان شخص مل جاتا ہے جو کلاشنبر ہوتا ہے وہ اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ ادھر کشور کو جب آفتاب کے اغوا کی خبر ملتی ہے تو وہ بے ہوش ہوجاتی ہے۔ افضل اسے اسپتال لے کر جاتا ہے۔ واپسی پر جب وہ اپنے گھر پہنچتا ہے تو ایک ایسا منظر دیکھتا ہے جس کے بعد اس میں کھڑے رہنے کی ہمت نہیں رہتی۔

اس نے اپنی صحافتی زندگی میں بے شمار ایسے مناظر دیکھے تھے جو دل کو دہلا ڈالتے تھے اور وہ ایک دردمند انسان ہونے کی وجہ سے متاثر بھی ہوتا تھا لیکن یہ منظر تو ایسا تھا کہ لگتا تھا دل دھڑکنا ہی بند کردے گا۔ سامنے بیڈ پر اس کی عزیز از جان بیوی اور معصوم بچوں کی خون میں نہائی ہوئی لاشیں پڑی تھیں۔ مہتاب نے دونوں بچوں کے گرد اپنے بازو اس طرح لپیٹ رکھے تھے جیسے انہیں اپنی آغوش میں چھپالینا چاہتی ہو لیکن ظالم موت نے کچھ اس طرح سے وار کیا تھا کہ ماں کی آغوش بھی معصوم جانوں کو پناہ فراہم نہیں کرسکی تھی۔ افضل کچھ دیر زمین پر بے حس و حرکت بیٹھا پتھرائی ہوئی آنکھوں سے یہ منظر دیکھتا رہا پھر یک دم اس کے دل میں اس امید نے سر اٹھایا کہ شاید ان تینوں میں سے کسی کے بدن میں ابھی زندگی کی رمق باقی ہو۔ اس امید کا سہارا لے کر وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور ڈگمگاتے قدموں سے بیڈ کے قریب پہنچا۔ قریب پہنچ کر اس نے باری باری مہتاب اور دونوں بچوں کی نبضیں چیک کیں لیکن وہاں جامد خاموشی تھی اور حرارت سے عاری قدرے اکڑ جانے والے بدن گواہی دے رہے تھے کہ روح اور جسم کا رشتہ ٹوٹے کافی دیر گزر چکی ہے۔ اس کی پیاری بیوی مہتاب جسے اس نے بڑی دعاؤں کے بعد حاصل کیا تھا اور جس کی آغوش میں پلتے اپنے ننھے تاروں کو دیکھ دیکھ کر جیا کرتا تھا... کسی چاند کی طرح اچانک بدلی میں چھپ گئی تھی اور ساتھ ہی ننھے تاروں کو بھی لے گئی تھی۔

مہتاب اور بچوں کے جسم میں پیوست گولیاں کن ظالم ہاتھوں میں تھمے ہتھیاروں سے نکلی تھیں، وہ نہیں جانتا تھا۔ ان بے گناہوں کو اس انجام تک پہنچانے والے چودھری افتخار کے گرگے بھی ہوسکتے تھے۔ افضل نے آفتاب سے دوستی نبھاتے ہوئے چودھری کی بیٹی کو فرار کروانے کا ناقابل معافی جرم جو کیا تھا اور برسوں سے مہتاب کی تلاش میں بھٹکتا اس کا سابقہ منگیتر بھی اپنی نارسائی کا انتقام لینے کے لیے یہ حرکت کرسکتا تھا۔ دشمنوں میں سے کس دشمن نے یہ وار کیا ہے، فی الحال افضل یہ تجزیہ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ ابھی تو وہ اپنے پیاروں کی لاشوں کے سرہانے بیٹھا زار و قطار رو رہا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن پر اس کی کل کائنات مشتمل تھی اور اس سے اچانک ہی اس کائنات کو چھین لیا گیا تھا۔ اپنی اس تہی دامنی کا وہ جتنا بھی سوگ مناتا، کم تھا لیکن پھر اسے ہوش آگیا۔ بیوی بچوں کی لاشوں کے سرہانے بیٹھ کر رونے سے اسے کچھ نہیں ملنے والا تھا۔ یہ غم زندگی بھر کا تھا اور اسے زندگی بھر اس غم کو سینے سے لگا کر جینا تھا لیکن وقت کا تقاضا تھا کہ وہ حرکت میں آجائے اور وہ کرے جو اس وقت ضروری تھا۔ سب سے پہلے اس نے قریبی پولیس اسٹیشن فون کرکے اپنے اوپر گزرنے والے حادثے کی اطلاع دی پھر ایک قریبی دوست کا نمبر ملایا۔

"بابر! مہناز کے نام سے میری ایک عزیزہ سٹی اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔ تمہیں اسے بہت خاموشی اور رازداری کے ساتھ کسی دوسرے اسپتال شفٹ کروانا ہے۔ جتنی جلدی ہوسکے یہ کام کردو اور پلیز خیال رکھنا کہ اس بات کا تمہارے سوا کسی دوسرے کو علم نہ ہونے پائے۔" اس نے ابھی تازہ ترین دشمنی چودھری ہی کی پالی تھی اس لیے منطقی طور پر یہی خیال آیا تھا کہ جو کچھ ہوا ہے، اس کے پیچھے چودھری کا ہاتھ ہے۔ بہت ممکن تھا کہ اس نے آفتاب کو اغوا کروانے کے بعد اس سے تشدد کے زور پر یہ حقیقت اگلوالی ہو کہ کشور، افضل کے گھر میں مقیم ہے۔ یہ جاننے کے بعد چودھری نے اپنے بندوں کو افضل کے گھر دوڑا دیا ہوگا لیکن جب انہوں نے یہاں کشور کو نہیں پایا تو طیش میں آکر مہتاب اور بچوں کو ہلاک کر ڈالا۔ ان حالات میں ضروری تھا کہ کشور کو فوری طور پر کسی دوسری جگہ منتقل کردیا جائے ورنہ جب میڈیا پر یہ خبر آتی کہ نامور صحافی افضل کی اہلیہ اور بچوں کو رات کے کسی پہر قتل کردیا گیا تو ممکن تھا کہ اسپتال کے عملے میں سے جن لوگوں نے اسے دیکھا تھا، وہ کسی کے سامنے اس بات کا اظہار کردیں کہ جس وقت افضل کے بیوی بچے قتل ہوئے، وہ ایک خاتون کے ساتھ اسپتال میں تھا۔ یہ خبر کسی طرح چودھری تک بھی پہنچ سکتی تھی۔ چنانچہ کشور کی اسپتال سے منتقلی ضروری تھی۔ غم سے نڈھال افضل نے اپنی زندگی کے نازک ترین لمحات میں بھی دوستی کے تقاضوں کو یاد رکھا تھا اور دوست کی امانت کی حفاظت کا انتظام مقدم جانتے ہوئے اتنی بے غرضی کا مظاہرہ کیا تھا کہ اپنے صحافی دوست بابر کو اپنے ساتھ بیتنے والے حادثے کی اطلاع بھی نہیں دی تھی کہ مبادا وہ اس کے معاملے میں الجھ کر کشور کو اسپتال سے منتقل کروانے میں کسی تاخیر کا مرتکب ہوجائے۔

☆☆☆

مشابرم خان جانتا تھا کہ وہ اتنے بہت سارے مسلح افراد کا تنہا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ آدمیوں کی اتنی بڑی جماعت سے نمٹنے کے لیے طاقت کے بجائے حکمت کی ضرورت تھی چنانچہ اس نے ان افراد کے کمانڈر کو قابو میں کرنے کے بعد انہیں غار میں چلے جانے پر مجبور کردیا تھا لیکن اسے یہ بھی

معلوم تھا کہ جیسے ہی وہ یہاں سے نکلنے کی کوشش کرے گا، وہ لوگ بھی اس کے پیچھے تعاقب میں نکل کھڑے ہوں گے اور ظاہر ہے وہ اتنے بہت سارے لوگ مل کر اسے آسانی سے چھاپ سکتے تھے۔ انہیں اپنے تعاقب میں آنے سے روکنے کے لیے اس نے یہ ترکیب سوچی تھی کہ غار کے دہانے کے آگے آگ لگا دے گا تا کہ اندر موجود لوگ باہر نہ نکل سکیں لیکن نائب کمانڈر عین وقت پر سرکشی پر اتر آیا اور اس نے کمانڈر کی زندگی کی پروا نہ کرتے ہوئے مشابرم خان کے خلاف ہتھیار اٹھالیا۔ مجبوراً مشابرم خان کو بھی فوراً ایکشن لینا پڑا۔ اس کی چلائی گئی گولیوں میں سے ایک نائب کمانڈر کو لگی جبکہ دوسری نے مٹی کے تیل کے کین میں سوراخ کر دیا۔ فوراً ہی وہاں آگ بھڑک اٹھی۔ اس پر سے نائب کمانڈر نے اس پر پھینکنے کے لیے جو ہینڈ گرینیڈ نکالا تھا، وہ بھی پھٹ گیا۔ گرینیڈ پھٹنے سے آگ اور بھی شدت سے بھڑک اٹھی۔ ادھر کین سے نکل کر بہنے والے تیل نے غار کے اندر تک راستہ بنا لیا اور اس آگ اور تیل نے مل کر غار میں ذخیرہ شدہ ہتھیاروں اور دھماکا خیز مواد تک رسائی حاصل کر لی۔ نتیجہ پے در پے دھماکوں کی صورت میں نکلا۔ ان دھماکوں نے پہاڑوں کو تھرا کر رکھ دیا اور ٹوٹے ہوئے چٹانوں کے ٹکڑے اور پتھر ادھر اُدھر اڑنے لگے۔ غار میں موجود بہت سے افراد تو آگ کی لپیٹ میں آچکے تھے۔ ان میں سے چند جو کسی نہ کسی طرح بچ کر نکلنے میں کامیاب ہوئے، وہ ان اڑتے ہوئے پتھروں کی زد میں آ گئے۔ مشابرم خان خود ہینڈ گرینیڈ پھٹتے ہی کمانڈر کی گردن ایک جھٹکے سے توڑ کر بھاگ پڑا تھا لیکن اسے زیادہ دور تک جانے کا موقع نہیں ملا اور ایک نکیلا پتھر آ کر اس کی کنپٹی سے ٹکرایا۔ پتھر کی ضرب اتنی زوردار تھی کہ اس کے حواس جواب دے گئے اور وہ ایک قدم بھی مزید آگے بڑھانے میں ناکام ہو کر زمین پر آ رہا۔ زمین پر گرنے کے بعد اس کی آنکھوں نے جو آخری منظر دیکھا، وہ قیامت کے منظر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ دھماکوں سے اڑتے پہاڑ کے ٹکڑے اور پناہ کے لیے چیختے پکارتے انسانوں کے لیے کہیں کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔ تمام تر صورتحال قیامت کی بیان کردہ نشانیوں ہی کی تو منظر کشی کر رہی تھی۔

زخمی مشابرم خان کی آنکھیں چند لمحوں سے زیادہ یہ منظر نہیں دیکھ سکیں اور اس کے دماغ پر تاریکی کی چادر تن گئی۔ اس تاریکی میں ڈوبتے ہوئے اس کے ذہن میں یہی خیال آیا تھا کہ اس کا آخری وقت آچکا ہے اور اب جب بھی اس کی آنکھ کھلے گی تو وہ دوسرے جہان میں ہوگا مگر اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ معلوم نہیں کتنے گھنٹوں کے بعد جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ اسی جگہ موجود تھا اور دو افراد اسے اسٹریچر پر ڈال کر ایک ہیلی کاپٹر کی طرف لے جا رہے تھے۔ ہیلی کاپٹر کی مخصوص رنگت اور اسٹریچر اٹھانے والے آدمیوں کا یونیفارم دیکھ کر اس نے جان لیا کہ پاکستان آرمی وہاں پہنچ چکی ہے۔ ظاہر ہے وہاں جتنے زوردار دھماکے گونجے تھے اس کے بعد آرمی والوں کا متوجہ نہ ہونا ممکن نہیں تھا۔ انہیں اس جگہ پہنچ کر کارروائی شروع کرنے میں کافی وقت تو ضرور لگا ہوگا لیکن بہرحال اب وہ وہاں موجود تھے اور مشابرم خان کی آنکھیں دیکھ سکتی تھیں کہ وردی پوش فوج کے جوان اِدھر اُدھر پھیلے بری طرح مصروف تھے۔ وہ کوشش کر رہے تھے کہ زندہ بچ جانے والے افراد کو طبی امداد فراہم کی جا سکے لیکن وہاں مشابرم خان جیسے خوش نصیب شاذ و نادر ہی تھے۔ ان میں سے بیشتر کو موت نے آ دبوچا تھا۔ کچھ آگ میں جل کر مرے تھے، کچھ پتھروں کی زد میں آئے تھے اور کچھ جو صرف زخمی ہوئے تھے دھماکے کی وجہ سے اپنی جگہ چھوڑ دینے والی برف تلے آ کر دب گئے تھے۔ مشابرم خان کی خوش نصیبی تھی کہ وہ صرف زخمی ہوا تھا اور پتھروں اور برف میں دبنے سے بچ گیا تھا۔ اسے فرسٹ ایڈ دینے والوں نے اس کے زخم پر پٹی باندھ دی تھی اور وہ جو اپنا آخری وقت سمجھ رہا تھا، ایک اسٹریچر پر لدا زندہ سلامت ہیلی کاپٹر میں سوار تھا۔ اس ہیلی کاپٹر میں اس کے سوا تین زخمی اور بھی تھے۔ اس کے علاوہ ایک ڈاکٹر بھی تھا جو زخمیوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھا۔ مشابرم خان کو ہیلی کاپٹر میں سوار کرنے کے بعد اس کا دروازہ بند کر دیا گیا اور ذرا دیر بعد ہیلی کاپٹر حرکت میں آ گیا۔ متحرک ہیلی کاپٹر اپنی منزل پر پہنچا، اس سے قبل ہی مشابرم خان پر ایک بار پھر غنودگی سی چھا گئی۔ دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو وہ کسی اسپتال میں تھا۔

''اسے ہوش آ گیا ہے۔ میجر صاحب کو اطلاع دے دو۔'' اسے آنکھیں کھول کر دیکھتا پا کر وہاں موجود ڈاکٹر نے کسی سے کہا اور خود اس کا معائنہ کرنے لگا۔

''تم کیسا محسوس کر رہے ہو مسٹر؟'' معائنے کے دوران میں اس نے مشابرم خان سے سوال کیا۔

''میرے سارے جسم میں شدید درد ہے، خاص طور پر سر تو درد سے پھٹا جا رہا ہے۔'' مشابرم خان نے اپنی کیفیت سے آگاہ کیا۔

''تمہیں کافی چوٹیں آئی ہیں اس لیے درد تو ہوگا۔ شکر کرو کہ تمہاری ہڈیاں سلامت ہیں ورنہ تمہارے ساتھ جو دوسرے زخمی لائے گئے ہیں، ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جس کی کوئی ہڈی نہ ٹوٹی ہو، سب کے سب شدید زخمی ہیں۔ بہرحال، میں تمہیں پین کلر لگا رہا ہوں اس سے تم اپنے درد میں کافی کمی محسوس کرو گے۔'' ڈاکٹر نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے اپنے قریب کھڑی نرس سے انجکشن تیار کرنے کو کہا۔ ڈاکٹر انجکشن لگا کر فارغ ہوا ہی تھا کہ قدموں کی آواز ابھری اور سادہ لباس میں ملبوس دو افراد کمرے میں داخل ہوئے۔ سادہ لباس میں ہونے کے باوجود ان دونوں کا مخصوص ہیئر اسٹائل چغلی کھا رہا تھا کہ ان کا تعلق فوج سے ہے۔ ان دونوں کے اندر داخل ہوتے ہی ڈاکٹر اور نرس باہر نکل گئے جبکہ ان دونوں نے مشابرم خان کے بیڈ کے ساتھ رکھی کرسیاں سنبھال لیں۔

''تمہارا نام؟'' ان میں سے ایک نے جس کے چہرے پر نسبتاً زیادہ رعب و دبدبہ محسوس ہو رہا تھا، مشابرم خان کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے گمبھیر لہجے میں پوچھا جبکہ اس کا ساتھی قلم اور نوٹ پیڈ سنبھالے یقیناً اس کے جوابات نوٹ کرنے کے لیے تیار تھا۔

''مشابرم خان۔''

''کہاں کے رہنے والے ہو؟'' فوراً ہی دوسرا سوال داغا گیا۔

''کاغان کا لیکن کافی عرصے سے ملازمت کے سلسلے میں پنجاب میں رہ رہا ہوں۔'' مشابرم خان جانتا تھا کہ وہ جو اتنا بڑا حادثہ پیش آچکا ہے، اس کے بعد یہ تفتیش لازمی ہے اس لیے سب کچھ سچ بتا دینے کا فیصلہ کرتے ہوئے اس آدمی کے سوالوں کا جو اس کے اندازے کے مطابق میجر تھا، جواب دینے لگا۔

''کہاں اور کس قسم کی ملازمت کرتے ہو؟'' سوالات کا سلسلہ آگے بڑھا۔

''میں ڈرائیور ہوں اور آج کل اسسٹنٹ کمشنر شہریار عادل کے ڈرائیور کے طور پر کام کر رہا ہوں۔'' اس کا جواب سن کر میجر نے اس کی مدت ملازمت، تعیناتی کے اضلاع اور کام کی نوعیت کے متعلق متعدد سوالات کر ڈالے۔ مشابرم خان ہر سوال کا جواب سچائی کے ساتھ دیتا رہا۔

''ویل مسٹر مشابرم خان...'' میجر نے کرسی پر اپنا انداز نشست ذرا سا تبدیل کیا۔ ''اب یہ بتاؤ کہ تم یہاں کس سلسلے میں آئے تھے اور پھر پہاڑوں پر اس جگہ کیسے جا پہنچے جہاں سے آرمی والے تمہیں اٹھا کر لائے ہیں؟'' مشابرم خان کا پورا پس منظر جان لینے کے بعد وہ اصل واقعات کی تحقیق کی طرف آیا۔

''میں یہاں اپنے بھائی کے قاتلوں کی تلاش میں آیا تھا اور ان قاتلوں کو تلاش کرتا کرتا وہاں پہنچ گیا۔''

''مطلب؟ ذرا کھل کر اور تفصیل سے ساری بات بتاؤ؟'' میجر نے اسے حکم دیا۔

''یہ تفصیل تھوڑی سی طویل ہے سر! بہرحال میں آپ کو ذرا مختصر کر کے سنانے کی کوشش کرتا ہوں۔'' وہ میجر کو اپنی ملازمت، شہریار کی فطرت، اس کے اور چودھری کے درمیان جاری مخاصمت سے لے کر ماہ بانو کے قصے سمیت ایک ایک بات بتاتا چلا گیا۔ اس نے اکرم خان کے قتل اور ماہ بانو کے اغوا کے بعد! سے بلتستان پہنچنے سے لے کر مجرموں کی تلاش میں کی جانے والی اپنی ساری جدوجہد کی تفصیل بھی کہہ سنائی۔ میجر نہایت سنجیدگی اور غور سے اس کی داستان سنتا رہا۔ اس کی ایکسرے جیسی نگاہیں مشابرم خان کے چہرے پر یوں گڑی ہوئی تھیں جیسے وہ اس کے اندر تک جھانک کر سب سچ جھوٹ جان لینے کا خواہش مند ہو۔ اس کا ساتھی البتہ بغیر نظر اٹھائے تیزی کے ساتھ نوٹس لینے میں مصروف تھا۔ مشابرم خان نے دیکھا کہ اس شخص کے پاس قلم اور نوٹ پیڈ کے علاوہ ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر بھی موجود ہے جس میں یقینی طور پر اس کا ہر ہر لفظ ریکارڈ ہو رہا تھا۔ وہ کسی بھی قسم کا خوف دل میں لائے بغیر سچ بتاتا رہا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی ذرا سی غلط بیانی سے ان عناصر کے خلاف تحقیقات میں کوئی رکاوٹ کھڑی ہو جو پہاڑوں میں موجود خفیہ پناہ گاہ میں یقینی طور پر وطن دشمن سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ اس سے قبل اس نے ذاتی طور پر بھائی کا انتقام لینے کے چکر میں پولیس والوں کو اس معاملے میں ملوث نہیں کیا تھا لیکن اب بات دوسری تھی۔ پولیس کے مقابلے میں اسے آرمی کی کارکردگی پر زیادہ بھروسا تھا اور اس کے سینے میں جلتی انتقام کی آگ بھی سرد پڑ چکی تھی۔ اکرم خان کے وجود میں گولیاں اتارنے والا شخص کون تھا، یہ تو اسے نہیں معلوم تھا لیکن وہ یہ جانتا تھا کہ اس نے اس جرم میں ملوث پورے گروہ کو ہی نادانستہ طور پر ہی سہی اذیت ناک موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ بھڑکتی آگ اور پتھروں کی بارش کی زد میں آ کر مرنے والے اس سارے دہشت گرد گروہ کے افراد نے یقیناً مرتے وقت ایک بار تو ضرور یہ سوچا ہوگا کہ انہیں قیامت کی گھڑیوں نے گھیر لیا ہے۔ وہ سب جوان پہاڑوں پر بیتا تھا کسی آسمانی عذاب سے کم تو نہیں تھا اور آسمانی عذاب بھی کسی مومن و مجاہد پر نہیں آیا کرتا۔ تو وہ سب جو اس عذاب کی زد میں آ کر مارے گئے تھے... کیا مرتے وقت انہیں یہ

اور اک نہ ہوا ہوگا کہ وہ گمراہی میں مبتلا تھے؟

☆☆☆

"سوری سر! لیکن میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ نے جذبات میں آکر چودھری افتخار کے ڈیرے پر ریڈ کروا کر بہت بڑی غلطی کی۔ آپ کو پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا کہ اس طرح پولیس ریڈ کروانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ پولیس اور چودھری کا گٹھ جوڑ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ چودھری کے کسی چیلے نے ریڈ سے پہلے ہی اسے اطلاع دے دی ہوگی چنانچہ اس نے پولیس کے پہنچنے سے پہلے ہی آفتاب کو وہاں سے ہٹا لیا۔ اس ریڈ سے آپ کے ہاتھ ناکامی اور چودھری کی مخالفت کے سوا کچھ نہیں آیا۔" وہ ڈیرے پر ناکام ریڈ کے بعد واپس اپنے دفتر پہنچا تو عبدالمنان نے سارا واقعہ جاننے کے بعد نہایت صاف گوئی سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اس کی یہ صاف گوئی اس اعتماد اور آزادی کا نتیجہ تھی جو شہریار کی طرف سے اسے حاصل تھی۔ اگر شہریار کوئی روایتی افسر ہوتا تو وہ ہرگز اس کے سامنے اتنی صاف گوئی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کا آفیسر سچ سننے اور اپنی غلطی قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جس وقت شہریار کے پاس منیب کا فون آیا اور اس نے ڈیرے پر ریڈ کا فیصلہ کیا عبدالمنان دفتر میں موجود نہیں تھا۔ وہ اپنے کسی نجی کام کے سلسلے میں دفتر سے چند گھنٹوں کی چھٹی لے کر گیا ہوا تھا۔ واپس آیا تو سارا قصہ معلوم ہوا جسے جان کر اسے سخت افسوس ہوا۔

"تم صحیح کہہ رہے ہو۔ میں نے صرف اس بنیاد پر کہ اس تانگے والے اکو نے چودھری کے بندوں کو آفتاب کو ڈیرے پر لے جاتے ہوئے دیکھا ہے، پورے اعتماد سے ڈیرے پر ریڈ کروا دیا۔ اس وقت میں یہ بات بھول گیا تھا کہ پولیس والوں میں بھی چودھری کے مخبر موجود ہیں۔ اصل میں تم جانتے ہی ہو کہ میں آفتاب کو اس کی ہمت اور لگن کی وجہ سے کتنا پسند کرتا ہوں۔ وہ میری ٹیم کا بہت اہم کارکن ہے جسے میں کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا۔" اس نے اپنی غلطی کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہوئے اس کی توجیہہ بھی پیش کی۔

"یہ بات تو میں بھی اچھی طرح سمجھتا ہوں سر! ہم یقیناً اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ اگر ہم نے آفتاب کو کھو دیا تو اس جیسا کوئی دوسرا بندہ ملنا بہت مشکل ہے۔ وہ اس وقت بھی پیرآباد میں چودھری کے خلاف ڈٹا ہوا تھا جب اسے آپ کی سپورٹ حاصل نہیں تھی بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ پیرآباد کا اسکول اگر کھلا رہا تو اس کے پیچھے صرف اور صرف آفتاب کا حوصلہ اور مستقل مزاجی تھی۔ میں خود اس کے اغوا کا سن کر بہت پریشان ہوں اور ہر حال میں اسے چودھری کے چنگل سے نکالنا چاہتا ہوں لیکن اس مقصد کے لیے ہمیں قانونی طریقہ کار اختیار کرنے کے بجائے کوئی اور راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔"

"مطلب...؟" شہریار اس کی بات سن کر چونکا۔

"مطلب یہ کہ جب گھی سیدھی انگلیوں سے نہ نکلے تو انگلیاں ٹیڑھی کرنی پڑتی ہیں۔ آپ نے ڈیرے پر پولیس ریڈ کروا کر دیکھ لیا، اس ریڈ کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اب ہم ایسا کوئی ذریعہ استعمال کریں گے کہ کام صفائی سے ہو جائے اور کوئی چودھری کو قبل از وقت خبردار کرنے والا بھی نہ ہو۔" عبدالمنان کا انداز معنی خیز تھا۔

"پہیلیاں مت بجھواؤ... کھل کر بتاؤ کہ تمہارے ذہن میں کیا ہے؟" شہریار نے اسے ٹوکا۔

"آپ کو جگو تو یاد ہوگا سر! اس بچے کا باپ جو نور پور جاتے ہوئے ہمیں شدید بیمار حالت میں ملا تھا اور آپ نے اپنا نور پور جانا کینسل کر کے اس بچے کو اپنی گاڑی میں فوری طور پر اسپتال پہنچانے کے ساتھ ساتھ اس اتائی ڈاکٹر کو بھی گرفتار کروا ڈالا تھا جس کی غلط دوا نے بچے کو اس حال کو پہنچایا تھا۔ آپ کے اس عمل سے بچے کا باپ جگو آپ کا کتنا احسان مند ہوا تھا اور اس نے آپ کو اپنا فون نمبر دیتے ہوئے کہا تھا کہ آپ جب چاہیں اسے کسی بھی کام کے لیے یاد کر سکتے ہیں۔ تو میرا خیال ہے ہم آفتاب کی بازیابی کے لیے جگو کی خدمات حاصل کریں۔ مجھے پوری امید ہے کہ وہ یہ کارنامہ انجام دے دے گا۔" عبدالمنان نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

"میرا تو جہاں تک اندازہ ہے جگو کوئی عام سا غنڈہ ہے جو چودھری سے ٹکر لینے کی ہمت نہیں کرے گا۔" عبدالمنان کا منصوبہ سن کر اس نے اعتراض کیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے سر! جب جگو نے اپنا فون نمبر آپ کو دے کر اپنی خدمات کی پیشکش کی تھی تو میں نے اسے کام کا بندہ جان کر اس کے بارے میں معلومات حاصل کرلی تھیں۔ وہ اتنا معمولی غنڈا بھی نہیں ہے۔ اس کی ایک بڑی سیاسی جماعت کے ساتھ وابستگی ہے جس کے لیے کام کرنے والے غنڈوں میں جگو کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ جگو چاہے تو اپنے بچے اور بیوی کو شہر میں رکھ کر انہیں بہت اچھی زندگی دے سکتا ہے لیکن اس نے شہر میں ایک اور شادی کی ہوئی ہے اور اپنی طرح دار شہری بیوی کی وجہ سے گاؤں والی کو شہر نہیں لے جاتا ہے۔" عبدالمنان نے اسے جو رپورٹ پیش کی اسے سن کر وہ حیران رہ گیا۔ اس کا پی اے واقعی ایک بیدار مغز

آدمی تھا جو موقع بے موقع اس کے کام آ کر اس پر اپنی اہمیت ثابت کر دیتا تھا۔

"اگر تم کہتے ہو تو جگو سے رابطہ کر کے دیکھ لیتے ہیں۔" شہریار نے گویا اسے اجازت دی۔ اس کی طرف سے اجازت ملتے ہی عبدالمنان جگو سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ دو تین گھنٹیوں کے بعد دوسری طرف سے کال ریسیو کر لی گئی اور جگو کی سخت آواز سنائی دی۔

"میں اسسٹنٹ کمشنر شہریار عادل کا پی اے عبدالمنان بات کر رہا ہوں۔ آپ مسٹر جگو ہی ہیں نا؟" عبدالمنان نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"بالکل جناب! فرمائیے آپ نے کیسے مجھے یاد کیا؟ اپنے اے سی صاحب تو خیریت سے ہیں نا؟" تعارف سنتے ہی جگو کا سخت لہجہ خوشگوار ہو گیا اور وہ بڑی عاجزی سے پوچھنے لگا۔

"الحمدللہ اے سی صاحب بالکل ٹھیک ہیں بس ایک کام کے سلسلے میں ہمیں تمہارے تعاون کی ضرورت تھی اسی لیے انہوں نے تمہیں یاد کیا ہے۔"

"بالکل جناب! یہ تو میری خوش نصیبی ہے کہ اے سی صاحب نے مجھے یہ موقع دیا۔ میں ان کے کام آ کر دلی خوشی محسوس کروں گا۔" جگو نے خوش دلی سے جواب دیا۔

"تو ایسا کرو تم اے سی صاحب سے ہی بات کر لو۔" عبدالمنان نے فون شہریار کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"سلام سر جی! حکم کریں کہ کیا کام ہے؟ جگو اپنے وعدے کے مطابق آپ کی ہر خدمت انجام دینے کو تیار ہے۔" اس کے "ہیلو" بولتے ہی جگو نے فدویانہ لہجے میں کہا۔

"سوچ لو جگو، کام ذرا مشکل ہے اور جس بندے کے خلاف کرنا ہے اس سے دشمنی مول لینے کی جرأت شاید تم میں نہ ہو۔" اصل بات کرنے سے پہلے شہریار نے اسے جانچ لینا مناسب سمجھا۔

"دشمنیوں سے جگو نہیں ڈرتا سر جی! جگو پہلے ہی اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتا ہے اس لیے اگر اس کا ایک دشمن اور بھی بن گیا تو پروا نہیں۔ آپ بس حکم کرو کہ کس کے خلاف کارروائی ڈالنی ہے۔" جگو کے لہجے سے ایسا لگتا تھا کہ اس نے باقاعدہ سینہ ٹھونک کر یہ بات کی ہوگی۔ شہریار کے ہونٹوں پر اس کے انداز پر دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اس بندے کا نام ہے چودھری افتخار عالم شاہ..." آخر اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں جگو کو بتا ہی دیا۔ دوسری طرف پل بھر کے لیے خاموشی چھائی پھر جگو کی مضبوط لہجے والی آواز سنائی دی۔

"حکم کریں سر کہ چودھری کا کیا کرنا ہے؟ اگر آپ کو اس کی لاش دیکھنی ہے تو بھی میں اس کا بندوبست کر دوں گا۔"

"ایسا کچھ نہیں کرنا ہے۔ میرا ایک اہم بندہ چودھری نے اغوا کروا لیا ہے۔ اس بندے کو چودھری کے چنگل سے چھڑوانا ہے۔" شہریار نے اسے بتایا۔

"بندے کا حدود اربع بتائیں؟" جگو نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"اس کا نام آفتاب ہے۔ پیرآباد کے اسکول میں پڑھاتا ہے۔ چودھری نے اپنے بندوں کے ذریعے اسے اغوا کروایا ہے اور ایک عینی شاہد کے مطابق اغوا کے بعد اسے چودھری کے ڈیرے پر لے جایا گیا تھا لیکن ہم پولیس ریڈ کروا کر بھی ڈیرے سے اسے بازیافت نہیں کروا سکے۔ تمہیں اس بندے کا پتا بھی معلوم کرنا ہے اور اسے آزاد بھی کروانا ہے۔ کیا تم یہ کام کر لو گے؟" شہریار نے اسے مختصراً بتاتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

"کسی فکر نہ کرو سر جی! رب نے چاہا تو آج رات ہی آپ کا بندہ چودھری کی قید سے آزاد ہو جائے گا۔ اگر کچھ دیر بھی لگی تو چوبیس گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لوں گا میں آپ سے۔" جگو نے دعویٰ کیا۔ اس کا اعتماد بتا رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس کے مطابق عمل بھی کرے گا۔ اس سے بات کر کے شہریار نے فون بند کیا تو اس کے دل کو ایک اطمینان سا تھا کہ اگر آفتاب زندہ ہے تو جگو اسے چودھری کی قید سے ضرور آزاد کروا لائے گا۔

"مجھے لگتا ہے کہ میں نے تمہارے مشورے پر عمل کر کے اچھا کیا ہے۔ یہ جگو کافی کام کا بندہ لگتا ہے اگر اس میں صلاحیت نہیں ہوتی تو چودھری کا نام سن کر ہی ہمت چھوڑ دیتا اور پیچھے ہٹ جاتا لیکن اس نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ یہ کام ضرور کر ڈالے گا اب مجھے آفتاب کی طرف سے اچھی امید بندھ گئی ہے۔" فون بند کرنے کے بعد اس نے عبدالمنان کی طرف دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"انشاء اللہ سر! اگر اللہ کو منظور ہوا تو جگو کی طرف سے ہمیں کامیابی ہی کی اطلاع ملے گی۔" عبدالمنان نے بھی خوش امیدی کا اظہار کیا۔ ابھی ان دونوں کے درمیان اس موضوع پر گفتگو جاری ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

عبدالمنان نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف آفتاب کا دوست افضل تھا اور شہریار سے بات کرنے کا خواہش مند تھا۔ شہریار کی طرف سے رضامندی پا کر عبدالمنان نے ریسیور

اسے تھما دیا۔ افضل نے پہلے ایک صحافی اور آفتاب کے دوست کی حیثیت سے شہریار سے اپنا تعارف کروایا پھر اسے آفتاب کے اغوا والے معاملے سے آگاہ کیا۔

”مجھے اس واقعے کا علم ہے اور میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ کسی طرح آفتاب کو بازیافت کروا لیا جائے۔“ شہریار نے اسے جواب دیا اور ساتھ ہی ڈیرے پر پولیس ریڈ کے بارے میں بھی بتا دیا۔ اس ناکام پولیس ریڈ کی اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ اس نے افضل کو یقین دہانی کروائی کہ وہ اپنی پہلی کوشش میں ناکامی کے بعد آرام سے نہیں بیٹھے گا اور آفتاب کی رہائی کے سلسلے میں ہر ممکن اقدامات کرے گا۔ افضل جانے مطمئن ہوا یا نہیں تاہم اس نے شہریار کے اس تعاون کے لیے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔

اس فون کال سے فارغ ہونے کے بعد شہریار نے دفتر سے اٹھنے کا فیصلہ کیا۔ آج ویسے ہی وہ لوگ معمول سے کافی زیادہ وقت دفتر میں ٹھہر گئے تھے۔ دفتر سے اپنے بنگلے پہنچ کر وہ ابھی فریش ہی ہوا تھا کہ آئی جی مختار مراد کی کال آ گئی۔

”تم بہت غیر محتاط ہوتے جا رہے ہو شہریار! آج تم نے چودھری کے خلاف جو کارروائی کی اسے میں محض جذباتیت کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔“ سلام دعا اور خیر خیریت کے بعد انہوں نے اسے تنبیہ کرنے والے لہجے میں ٹوکا۔

”تو آپ تک اطلاع پہنچ گئی ہے؟“ اس نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے سر صوفے کی پشت سے ٹکایا۔

”چودھری نے خود مجھے کال کی تھی اور تمہارے رویے کی شکایت کرتے ہوئے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں تمہیں آئندہ اس طرح کی کوئی حماقت کرنے سے روکوں۔“ انہوں نے کچھ ناراض سے لہجے میں بتایا۔

”وہ حماقت نہیں، میرا فرض تھا۔ چودھری نے ایک پُرامن شہری کو اپنی غنڈا گردی کے بل پر غائب کر ڈالا ہے اور ہر ایک مجھے یہ احساس دلا رہا ہے کہ مجھے اس غنڈا گردی کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لینا چاہیے تھا۔ آپ بتائیں کہ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ ایک شخص دن دہاڑے جرم کرتا ہے اور ہم قانون نافذ کرنے والے اداروں سے تعلق رکھنے کے باوجود اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنے سے صرف اس لیے ڈرتے ہیں کہ کہیں اس کا مزاج برہم نہ ہو جائے۔ میں اس ناانصافی کو نہیں مانتا۔ اگر میرے پاس چودھری سے لے کر اس کے ایک معمولی مزارع تک کسی کے خلاف بھی کمپلین آئے گی تو میں ضرور ایکشن لوں گا۔“ وہ یک دم ہی جھنجلاہٹ کا شکار ہو گیا تھا اس لیے مختار مراد کے سامنے اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتا چلا گیا۔

”تم غلط نہیں ہو لیکن یہاں سسٹم ہی کچھ ایسا ہے کہ سچے آدمی کو ہی زیادہ احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ بہرحال جو ہوا سو ہوا۔ میں نے چودھری کے سامنے تو تمہاری ہی حمایت کی تھی لیکن ایک بزرگ کی حیثیت سے میں تمہیں یہ نصیحت ضرور کروں گا کہ آئندہ محتاط رہنا اور ایسا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے مجھ سے مشورہ لے لینا۔“ مختار مراد نے اس کا موڈ دیکھتے ہوئے بات کو زیادہ طول نہیں دیا اور نرم لہجے میں بولا۔

”سوری انکل! میں کچھ جذباتی ہو گیا تھا۔ اصل میں اغوا ہونے والا اسکول ماسٹر آفتاب مجھے بہت عزیز ہے اس لیے میں ذہنی کافی ڈسٹرب ہوں۔“ ان کے نرم لہجے پر اسے اپنے رویے کا احساس ہوا تو فوراً ان سے معذرت کی۔

”کوئی بات نہیں۔ جوانی میں آدمی ایسا ہی جذباتی ہوتا ہے لیکن ہم بزرگوں کا فرض ہے کہ چھوٹوں کو جوش سے زیادہ ہوش سے کام لینے کی نصیحت کرتے رہیں۔“ انہوں نے گویا بات ہی ختم کر دی۔ ان سے بات کرنے کے بعد شہریار خلافِ معمول جلد اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ آج اس نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا اور صرف ایک گلاس دودھ پر اکتفا کیا تھا۔ بیڈ روم میں آ کر وہ فوری طور پر سونے کے بجائے ایک کتاب کا مطالعہ کرنے لگا۔ مکمل ذہنی یکسوئی حاصل نہ ہونے کے باوجود اس کا ذہن مطالعے کی وجہ سے کچھ نہ کچھ بٹ ہی گیا۔ اس لیے جب بیڈ روم کی مکمل خاموشی میں اس کے موبائل کی گھنٹی بجی تو وہ ذرا سا چونک گیا۔ موبائل اٹھا کر اس نے اسکرین پر آنے والا نام دیکھا۔ جگو کی طرف سے کال کی جا رہی تھی۔ اس نے جگو کو آج ہی کسی ایمرجنسی کی صورت میں رابطے کے لیے اپنا نمبر نوٹ کروایا تھا اور خود اس کا نمبر اپنے موبائل میں فیڈ کر لیا تھا۔ اب جو جگو نے کال کی تو اس کا دل دھڑک اٹھا۔

”ہیلو! ہاں جگو کیا بات ہے؟“ یس کا بٹن پش کرتے ہوئے اس نے جگو سے دریافت کیا۔

”آپ کو اس وقت ڈسٹرب کرنے پر معافی چاہتا ہوں سر! مجھے آپ سے یہ کہنا تھا کہ میں نے کارروائی شروع کر دی ہے۔ اللہ نے چاہا تو آج رات ہی کچھ ہو جائے گا۔ آپ سے بس اتنی درخواست ہے کہ پولیس والوں کو ہدایت کر دیجیے کہ اگر پیر آباد سے کسی ہنگامے کی اطلاع آئے تو وہ اپنے کان بند کر کے بیٹھ جائیں۔ باقی آپ کا کام میرے ذمے ہے۔ وہ ہر حال میں ہو جائے گا۔“

”میں یہ کام کر دوں گا لیکن تم خیال رکھنا کہ کسی بے گناہ انسانی جان کو نقصان نہ پہنچے۔“ شہریار نے مضطرب ہو کر اسے نصیحت کی۔

”آپ فکر نہ کریں سر جی! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“ جگو نے اسے تسلی دی۔ اس سے بات کرنے کے بعد شہریار نے ایس پی کا نمبر ڈائل کیا اور اسے احکامات جاری کیے۔ اس قسم کے احکامات کا ملنا ایس پی کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اپنی مدتِ ملازمت میں اس نے بہت کچھ دیکھا تھا چنانچہ شہریار کو یقین دہانی کروائی کہ اس کے حکم پر عمل ہوگا۔ دوسری طرف شہریار سوچ رہا تھا کہ آخرکار اسے سسٹم کے خلاف لڑنے کے لیے خود بھی ایک ایسا طریقہ اختیار کرنے پر مجبور ہونا ہی پڑا جو کسی بھی طرح اس کے لیے پسندیدہ نہیں تھا لیکن جو جنگ اسے لڑنی پڑ رہی تھی، اس میں کسی اصول پر عمل ہی کب کیا جا رہا تھا جو وہ اپنا طرزِ عمل تبدیل کرنے پر مجبور نہ ہوتا۔ عبدالسنان نے بھی تو اسے انگلی ٹیڑھی کرنے کا ہی مشورہ دیا تھا چنانچہ اب وہ اس مشورے پر عمل پیرا تھا۔

☆☆☆

زخموں سے چور آفتاب فرش پر پڑا سسک رہا تھا۔ اسے اتنی بُری طرح تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ زخم سے خالی نظر نہیں آ رہا تھا۔ مارنے والوں نے اسے جی بھر کر مارا تھا اور کمال یہ تھا کہ اس تشدد کے بدلے میں وہ اس سے کچھ پوچھ بھی نہیں رہے تھے۔ ان میں سے کسی کی زبان پر یہ مطالبہ نہیں آیا تھا کہ وہ انہیں کشور کا پتا بتا دے۔ ان کے سوال نہ کرنے نے آفتاب کو مشکل سے بچا لیا تھا۔ یوں تو وہ کشور کا پتا کسی کو بتانے کا ارادہ بھی نہیں رکھتا تھا لیکن جس طرح کا تشدد اس پر کیا گیا تھا، وہ کوئی معمولی نہیں تھا۔ کیا خبر کہ وہ اس تشدد کے دوران کسی مقام پر اپنی برداشت کی حد سے گزر کر زبان کھول بیٹھتا لیکن جب سوال ہی نہیں ہوا تھا تو جواب دینے کی ضرورت ہی کیسے پیش آتی؟ مارنے والوں کے انداز سے اسے یہی اندازہ ہوا تھا کہ وہ چودھری کے حکم پر اس سے کچھ اگلوانے کے لیے نہیں بلکہ اسے اس کے جرم کی سزا دینے کے لیے اذیت رسانی کر رہے ہیں اور یہ اذیت تو بہرحال اسے سہنی ہی تھی۔ چودھری افتخار عالم شاہ کی بیٹی کی محبت کو قبول کرتے ہوئے اسے اپنے اس انجام کو دھیان میں رکھنا پڑا تھا۔ وہ شروع سے جانتا تھا کہ جب بھی چودھری پر اس کی اور کشور کی محبت کا راز آشکار ہوا تو وہ ان دونوں پر قہر بن کر ٹوٹ پڑے گا۔ آج وہ چودھری کے اس قہر کو سہہ رہا تھا لیکن اسے خوشی تھی کہ کشور اپنے باپ کے ہاتھ نہیں لگ سکی ورنہ شاید اب تک وہ زندہ نہ ہوتی اور چودھری خود اپنے ہاتھ سے اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ آفتاب کو اپنے اب تک زندہ ہونے پر بھی کسی قسم کی خوش فہمی نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ خود اس کا انجام بھی موت ہی ہے لیکن شاید چودھری نے کشور کے مل جانے تک اسے زندہ رکھنا مناسب سمجھا تھا کیونکہ وہی تھا جو اسے کشور کے بارے میں بتا سکتا تھا۔

”کہو ماسٹر! کیا حال ہے؟ ہماری مہمان نوازی پسند تو آ رہی ہے نا یا پھر کوئی کسر باقی ہے؟“ زخموں کی شدت سے بے حال آنکھیں بند کیے تکلیف کو برداشت کرتے آفتاب کو احساس بھی نہیں ہوا کہ کب کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔ وہ تو جب چودھری کی تمسخرانہ آواز کمرے میں گونجی تو وہ متوجہ ہوا اور دونوں آنکھوں پر رکھا بازو بہ مشکل ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس بازو کو بھی بُری طرح تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا اور اسے یہ معمولی سی حرکت دینے میں بھی اسے کافی تکلیف برداشت کرنی پڑی تھی۔

”ہر آدمی اپنے ظرف کے حساب سے دوسرے کو دیتا ہے چودھری صاحب۔ آپ نے ساری زندگی ظلم و ناانصافی کے ساتھ گزاری ہے چنانچہ آپ کے ملازم آپ کے حکم کی تعمیل میں اس شے کو بانٹنے میں کوئی کسر کیسے اٹھا رکھ سکتے ہیں... لیکن اگر آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ اس ظلم کے بدلے میں آپ مجھ سے اپنی مطلوبہ معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے تو ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں اپنی جان تو دے دوں گا لیکن زبان نہیں کھولوں گا۔“

چودھری کے طنزیہ سوالوں کے جواب میں اس نے اپنے عزم کا اظہار کیا۔ اس کے جواب میں چودھری قہقہہ لگا کر ہنس پڑا پھر نفرت سے بولا۔ ”یہ تمہاری بھول ہے ماسٹر کہ ہم تم سے کچھ معلوم کرنے کے لیے تم پر یہ تشدد کروا رہے ہیں۔ ہم اتنے مجبور نہیں ہیں کہ ایک معمولی سی گل معلوم کرنے کے لیے تمہارے محتاج ہوں۔ تمہارے اس صحافی دوست کا پتا ہم تک پہنچ گیا ہے۔ آج کی رات وہ اپنے جرم کی سزا بھی بھگت لے گا اور ہم اپنی چرائی جانے والی چیز بھی حاصل کر لیں گے۔ ہاں البتہ تمہارے لیے ہمارے پاس آسان موت نہیں ہے۔ تمہیں ہم اسی طرح سسکا سسکا کر زندہ رکھیں گے تاکہ تم ہر سانس کے ساتھ یہ گل سمجھ سکو کہ چودھری افتخار عالم شاہ کی عزت پر ہاتھ ڈالنا کیسا بھیانک جرم ہے۔ اگر تمہیں اس سزا سے نجات حاصل کرنی ہو تو گڑگڑا کر خود ہی اپنی موت کی دعا کرتے رہو۔ شاید موت کے فرشتے کو تم پر رحم آ جائے اور وہ تمہیں ہمارے قہر سے بچا کر لے جائے۔ اس کے علاوہ تو تمہارے پاس بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ تمہارے سارے

ہمدردوں کو ہم ایک چٹکی میں اڑا سکتے ہیں۔"

چودھری کی باتیں ہتھوڑے کی طرح آفتاب کے دماغ پر برس رہی تھیں۔ چودھری نے اس پر یہ شک تو پہلے ہی ظاہر کیا تھا کہ اس نے افضل کے ذریعے کشور کو گاؤں سے نکالا ہے۔ اب وہ افضل کا پتا بھی حاصل کر چکا تھا اور آج رات اس کے گھر پر چڑھائی کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اگر چودھری کے کارندے افضل کے گھر پہنچ جاتے تو وہ نہ صرف کشور کو پانے میں کامیاب ہو جاتے بلکہ افضل اور اس کے گھر والوں کے ساتھ بھی کوئی کسی بھی قسم کا سلوک کر سکتے تھے۔ جہاں کشور کا اپنے ظالم باپ کی گرفت میں آجانے کا خیال اس کے لیے سوہانِ روح تھا وہیں وہ افضل اور اس کے گھر والوں پر کوئی آنچ آنے کے خیال سے بری طرح مضطرب ہو گیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح افضل کو یہ اطلاع پہنچا دے تاکہ وہ کشور اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کسی محفوظ مقام پر منتقل ہو جائے مگر اطلاع پہنچانے کا کوئی ذریعہ تھا ہی کہاں؟ اپنا موبائل فون اس نے اسی وقت جیب سے نکال کر پھینک دیا تھا جب چودھری کے کارندوں نے اسے اغوا کیا تھا۔ موبائل میں کشور اور افضل دونوں کے فون نمبرز فیڈ تھے اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان نمبروں کے ذریعے کشور کو ٹریس کیا جا سکے۔ اس کی اس احتیاط کے باوجود چودھری کشور کا پتا معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور وہ اپنے موبائل سے محرومی کے باوجود بھی ناکام رہا تھا... خیر موبائل ہوتا بھی تو اس وقت اس کی دسترس میں نہ ہوتا بلکہ اس کی مدد سے چودھری بہت پہلے کشور تک جا پہنچتا۔

"تیرا وہ ہمدرد اسے ہی بھی تیرے لیے وڈا بے قرار ہے۔ پولیس لے کر ڈیرے پر چڑھ دوڑا تھا پر وچارے کے ہتھ کچھ بھی نہ آیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اس کو نمٹا کر آیا ہوں۔ تیرے نہ ملنے سے وڈا مایوس ہو کر گیا ہے۔ بے وقوف سمجھ رہا تھا کہ تجھے اپنے ساتھ لے کر ہی یہاں سے جائے گا پر اس واری میرا انتظام پکا تھا۔ میں اتنا کچا تو نہیں ہوں ناکہ بار بار دشمن کو اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر کھل کھیلنے کا موقع دے دوں۔" چودھری کے لہجے میں شہریار کے لیے سخت نفرت تھی۔ دراصل اسے اپنی وہ ہزیمت بھولتی نہیں تھی جب شہریار تن تنہا اس کے ڈیرے میں داخل ہو کر اس کے آدمیوں کو قابو میں کرنے کے بعد تہ خانے میں موجود خفیہ سیف سے اپنی وہ تصویریں نکال لے گیا تھا جنہیں چودھری نے بڑی منصوبہ بندی کے بعد حاصل کیا تھا۔

چودھری کی بات سن کر آفتاب کو خیال آیا کہ جب وہ نیم غنودگی کے عالم میں تھا تو اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے کوئی اسے ہاتھ پیروں سے اٹھا کر کسی دوسری جگہ لے جا رہا ہو۔ یقیناً چودھری کو کسی ذریعے سے اطلاع مل گئی ہوگی کہ شہریار آفتاب کی بازیابی کے لیے ڈیرے پر چھاپا مارنے آ رہا ہے چنانچہ اس نے آفتاب کو منظر سے ہٹا دیا۔ اب وہ جس کمرے میں تھا، وہ پہلے والے سے بالکل مختلف تھا۔ جس وقت اسے یہاں منتقل کیا گیا تھا اس کی حالت اتنی ردی ہو رہی تھی کہ وہ آنکھیں کھول کر دیکھنے کی ہمت تک نہیں کر سکا اور اب چودھری کی بات سن کر اس نے غور کیا تھا کہ اسے کہیں اور منتقل کیا جا چکا ہے۔ اب جانے یہ کمرا ڈیرے میں تھا یا کہیں اور کسی جگہ خود اسے جہاں تک یاد پڑتا تھا اس کے مطابق تو اس نے انسانی بازوؤں کے علاوہ کسی اور شے پر فاصلہ طے نہیں کیا تھا چنانچہ یہی قیاس کیا جا سکتا تھا کہ وہ ڈیرے میں ہی کہیں ایسی جگہ موجود ہے جو خفیہ ہونے کے باعث پولیس والوں کی نظر میں نہیں آسکی۔ اس سارے حساب کتاب میں گم وہ گھنٹی بجنے کی آواز پر چونکا۔ یہ چودھری کے موبائل فون کی گھنٹی تھی۔

"ہاں بالے بول کیا گل ہے؟" چودھری نے کال ریسیو کرتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں پوچھا اور دوسری طرف کی بات سننے لگا۔

"تیرا یار کہیں ایسے ہی بھڑک تو نہیں مار رہا۔ اپنا کمیشن بنانے کے چکر میں بھی حرام خور مال کو بڑھا چڑھا کر بتا سکتا ہے۔ تجھے ملوم ہے آج کل میرا مزاج وڈا بگڑا ہوا ہے کوئی ایسی ویسی چیز سامنے آگئی تو متھا بور بھی گھوم جائے گا۔" وہ جانے کس شے کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا، آفتاب اندازہ نہیں لگا سکا۔

"چل تو کہتا ہے کہ سوہنا آئٹم ہے تو میرا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے ہی اسے یہاں لا رہا ہے تو فیر میں دیکھ لیتا ہوں۔ اج رات ویسے ہی میرے کلیجے میں ٹھنڈ پڑنے والی ہے۔ چنگا ہے کہ پہلے ہی جشن کا بندوبست ہو جائے۔"

چودھری کے الفاظ سے اب اسے کسی حد تک اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کسی عورت کے بارے میں بات کر رہا ہے۔ یقیناً وہ کوئی طوائف ہوگی جسے اس کے کارندے نے اپنے آقا کی دل بستگی کے لیے تلاش کیا ہوگا۔ اپنی عزت، اپنی بیٹی کے پیچھے اتاولے ہو جانے والے چودھری کا یہ دہرا معیارِ زندگی آفتاب کے اندر تک تلخی دوڑا گیا۔ اپنے نفس کو کسی آوارہ کتے کی طرح آزاد چھوڑ دینے والا چودھری اپنی بیٹی کو اس کا جائز حق تک دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اگر وہ حقوق ادا کرنے والا آدمی ہوتا تو آج اس پر یہ وقت ہی نہیں آتا کہ اس کی بیٹی حویلی کی چوکھٹ پھلانگنے پر خود کو مجبور پاتی۔ کشور نے جو بھی قدم اٹھایا تھا، اس کے پیچھے اس کی محض خوشی تو بہرحال نہیں تھی۔ وہ بھی ہر لڑکی کی طرح عزت سے بیاہے جانے کے خواب دیکھتی تھی لیکن جس کے ذمے یہ کام تھا اس نے فرسودہ رسموں اور اپنے مفاد کو بیٹی کے جذبات پر مقدم جانا تھا اور آج نتیجے میں تملاتا پھر رہا تھا۔

"چل بھئی ماسٹر! میں تو چلا عیش کرنے۔ تجھ میں ہمت ہوئی تو میں بالے سے کہہ دوں گا کہ تیری آج رات تھوڑی ہور خاطر شاطر کر دے ورنہ تو خیر مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ تجھے میں لمبے عرصے کے لیے اپنا مہمان رکھوں گا۔ خیر تیری خاطریں ہوتی رہیں گی۔" ہوس پرست چودھری کا موڈ "نئے مال" کا سن کر خاصا خوش گوار ہو گیا چنانچہ وہ لہک کر کہتا ہوا وہاں سے واپس چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد آفتاب کے پاس تنہائی میں ڈسنے والے اندیشوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کچھ وہ پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا اور اب چودھری نے بھی اس بات کی تصدیق کر دی تھی کہ وہ اسے ایک بار کے بجائے آہستہ آہستہ سسکا سسکا کر مارنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ آج دوپہر اسے خوراک کے نام پر بدمزہ دلیے کی آدھی پیالی زبردستی کھلائی گئی تھی۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ خوراک کی یہ معمولی مقدار اس کے جسم کو مطلوبہ توانائی تو فراہم نہیں کرے گی لیکن اس کی وجہ سے جسم و جاں کا رشتہ اس طرح جڑا رہے گا کہ وہ خود اپنے مرنے کی تمنا کرے گا۔ ایک طرف اس کے سامنے اپنا یہ لرزا دینے والا انجام تھا تو دوسری طرف کشور، افضل اور اس کے اہلِ خانہ کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ وہ سب اسے بے حد عزیز تھے اور ان میں سے کسی کو بھی گزند پہنچتی تو وہ بے حد تکلیف محسوس کرتا اور یقیناً اس تکلیف کی شدت اس جسمانی تکلیف سے کہیں بڑھ کر ہوتی جو اسے چودھری کی قید میں اٹھانی پڑ رہی تھی۔ افضل جیسے جاں نثار دوست اور کشور جیسی محبوب بیوی کو کوئی نقصان پہنچنے کا خیال ہی سوہانِ روح تھا اور یہاں تو چودھری صاف اپنے عزائم کا اظہار کر کے گیا تھا۔ اس کا اعتماد اور یقین دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اس نے جو کچھ کہا ہے اس کے لیے پورا بندوبست کر چکا ہے۔ یہ بُری گھڑی ٹل جائے اور چودھری کو اپنے ارادوں میں ناکامی حاصل ہو، اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے آفتاب کے پاس دعا کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ دل کی گہرائیوں سے اپنی جگہ لیٹے لیٹے ہی رب العالمین کو پکارنے لگا کہ کسی طرح اس بُری گھڑی کو ٹال دے اور ظالم کی چال خود اس پر ہی الٹ دے۔ ہوش اور نیم بے ہوشی کے دوران اسی طرح گڑگڑاتے ہوئے کتنا وقت گزر گیا، اسے اندازہ نہیں ہو سکا۔

رات کا آخری پہر چل رہا تھا تب اسے کچھ غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ وہ بہت دور سے سنائی دینے والی مدھم آوازیں تھیں جو کسی پُرہنگام جگہ پر شاید اسے سنائی بھی نہ دیتیں لیکن اپنے قید خانے کی تنہائی میں اسے وہ آوازیں سنائی دے گئیں۔ وہ کان لگا کر غور سے ان آوازوں کو سننے لگا۔ یکدم اسے ادراک ہوا کہ وہ فائرنگ کی آوازیں تھیں۔ کہیں مسلسل اور لگاتار فائرنگ کا سلسلہ جاری تھا اور یوں لگتا تھا کہ دو گروہ آپس میں متصادم ہوں۔ چودھری کی عمل داری میں ہونے کی وجہ سے اسے یہ تو سمجھ آ گیا کہ لڑنے والوں میں سے ایک گروہ چودھری کے گرگوں کا ہوگا لیکن دوسرے گروہ کے بارے میں وہ اچنبھے کا شکار تھا۔ چودھری کے علاقے میں گھس کر باقاعدہ اس کے بندوں سے مقابلہ کرنا کسی عام شخص کے بس کی بات نہیں تھی۔ اردگرد کے جتنے بھی زمیندار اور جاگیردار تھے، وہ چودھری سے دبتے تھے اور ان میں سے کسی کی جرأت نہیں تھی کہ وہ اس کے خلاف ہتھیار اٹھا سکیں۔ اب دوسرا امکان یہ تھا کہ پولیس نے اپنی دن والی ناکامی کے بعد رات کو ایک بار پھر چھاپا مارا ہو لیکن یہ بھی کوئی آسان بات نہیں تھی۔ شہریار لاکھ اس کو پسند کرتا تھا لیکن اوپر والوں کو جواب دہی کی تلوار تو اس کے سر پر بھی لٹکتی رہتی تھی۔ ایک بار ڈیرے پر ریڈ میں ناکام ہونے کے بعد وہ بھلا کس چیز کو جواز بنا کر دوبارہ پولیس فورس کے ساتھ وہاں چڑھائی کر سکتا تھا۔ تذبذب میں جتلا آفتاب کان لگائے فائرنگ کی آوازیں سنتا رہا۔ آخر اسے احساس ہوا کہ فائرنگ کی شدت بتدریج کم ہوتی جا رہی ہے۔ آخرکار آہستہ آہستہ فائرنگ کا سلسلہ رک گیا اور کچھ دیر کے لیے بالکل خاموشی چھا گئی پھر کچھ دیر بعد اس خاموشی میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا۔ وہ یقیناً کچھ لوگوں کے بھاگنے دوڑنے اور باتیں کرنے کی آوازیں تھیں جنہیں وہ تقریباً اپنے سر پر محسوس کر رہا تھا۔ ان آوازوں کو سن کر اسے اندازہ ہوا کہ وہ کسی تہ خانے میں ہے یعنی اسے ایک تہ خانے سے نکال کر دوسرے تہ خانے میں ہی منتقل کیا گیا تھا۔ آوازوں کے سنائی دینے کے بعد اسے بہت دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ دو افراد تھے جو پانچ منٹ سے بھی کم وقفے میں اس تک آ پہنچے تھے۔

"تم ماسٹر آفتاب ہو؟" آنے والوں میں سے ایک نے اس سے سوال کیا جس کے جواب میں وہ محض اثبات میں گردن ہی ہلا سکا۔

"ہم تمہیں لینے آئے ہیں۔" اس کی طرف سے

اثبات میں جواب پا کر اس شخص نے بتایا اور پھر آفتاب کی حالت کو دیکھتے ہوئے خود ہی اس کی بغل میں ہاتھ ڈال کر اسے سہارے سے کھڑا ہونے میں مدد دی۔ اس کا دوسرا ساتھی بھی اس کے ساتھ شامل ہو گیا۔ آفتاب کی ٹانگوں پر ڈاکی کی مدد سے اتنی ضربیں لگائی گئی تھیں کہ وہ انہیں ہلا بھی نہیں پا رہا تھا۔ اس کے لیے غیبی امداد بن کر آنے والے دونوں افراد تقریباً اسے اٹھا کر ہی اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔ کمرے سے نکلنے کے بعد وہ لوگ ایک سرنگ نما راستے میں داخل ہوئے۔ یہ راستہ چند فٹ سے زیادہ طویل نہیں تھا جس کے اختتام پر ایک کھلا ہوا راستہ نظر آ رہا تھا۔ اس راستے سے گزر کر وہ لوگ دوسری طرف پہنچے تو اس نے خود کو ایک اسٹور نما جگہ پر پایا۔ یہاں بہت سا کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کاٹھ کباڑ کو یہاں پھینکنے کے لیے آنے کے علاوہ کوئی اس جگہ کا رخ بھی نہ کرتا ہوگا۔ وہ لوگ اس اسٹور نما جگہ سے باہر آئے تو آفتاب کو شناسائی کا احساس ہوا۔ یہ وہی وسیع تہ خانہ تھا جس کے ایک کمرے میں اسے اغوا کر کے لانے کے بعد رکھا گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ معاملہ کیا ہے۔ تہ خانے سے متصل ایک اور خفیہ تہ خانہ بھی بنایا گیا تھا۔ باہر سے کوئی بھی فرد آتا تو وہ بیرونی تہ خانے کو دیکھ کر ہی واپس چلا جاتا۔ شہریار کا پولیس کے ذریعے کروایا گیا ریڈ اسی لیے ناکام ہو گیا تھا کہ پولیس والوں نے اوپر ڈیرے کی عمارت دیکھی اور پھر نیچے تہ خانے کی تلاشی لے کر چلے گئے۔ کاٹھ کباڑ سے بھرے اسٹور روم میں موجود خفیہ راستے، سرنگ اور پھر اس کے ساتھ جڑے دوسرے تہ خانے کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں گیا لیکن یہ نہ جانے کون لوگ تھے جنہوں نے نہ صرف اس خفیہ تہ خانے کو دریافت کر لیا تھا بلکہ اسے رہائی دلوا کر اپنے ساتھ بھی لے جا رہے تھے۔ وہ ان لوگوں سے ان کے بارے میں سوال کرنا چاہتا تھا لیکن وہ جتنی خاموشی کا مظاہرہ کر رہے تھے اس کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ شاید ہی اس کے کسی سوال کا جواب دیں۔ ویسے بھی وہ جتنی عجلت میں تھے ان سے کسی سوال کی گنجائش نکلتی بھی نہیں تھی۔ وہ اسے اٹھائے اٹھائے سیڑھیاں چڑھ کر کھلے حصے میں آ گئے۔ اس حصے میں آتے ہی آفتاب کی نظر زمین پر گرے دو افراد پر پڑی۔ ان دونوں کے لباس خون آلود نظر آ رہے تھے اور حتمی طور پر کہنا مشکل تھا کہ وہ مردہ ہیں یا پھر صرف زخمی ہوئے ہیں البتہ اس نظارے نے اسے یہ ضرور باور کروا دیا تھا کہ وہاں ٹھیک ٹھاک معرکہ ہوا تھا جس میں چودھری کے کارندے کام میں آ گئے تھے۔ اسے حیرت ہوئی کہ یہ سارا ہنگامہ ایک اس کی ذات کے لیے کیا گیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے لیے غیبی امداد بن کر آنے والے یہ ہمدرد کون ہیں؟ وہ ان سے یہ سوال کر بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ لوگ خود بڑی افراتفری میں نظر آ رہے تھے۔ اسے اپنے آدمیوں کے ساتھ تہ خانے سے باہر آتے دیکھ کر احاطے میں اِدھر اُدھر بکھرے افراد نے تیزی سے گاڑیوں میں بیٹھنا شروع کر دیا۔ آفتاب کو بھی انہوں نے ایک آرام دہ گاڑی میں بٹھا دیا۔ اس گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ اگلی نشست پر ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا جبکہ آفتاب کے ساتھ پچھلی نشست پر اسے اپنے ساتھ تہ خانے سے لے کر آنے والوں میں سے ایک براجمان ہو گیا تھا۔

''اس کی مرہم پٹی کر کے کوئی سکون کی گولی کھلا دے شہزاد! بے چارے کی حالت خراب ہے اتنے لمبے سفر میں تکلیف اور بھی ..... بڑھ جائے گی۔'' گاڑی اسٹارٹ ہو کر ابھی احاطے سے نکلی ہی تھی کہ اگلی نشست پر موجود شخص نے آفتاب کے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی کو حکم دیا۔ وہ فوراً ہی سیٹ کے نیچے سے فرسٹ ایڈ باکس نکال کر اس حکم کی پیروی کرنے لگا۔ گاڑی بے حد شان دار تھی چنانچہ تیز رفتاری سے گاؤں کے کچے پکے راستوں سے گزرنے کے باوجود اسے اتنے جھٹکے نہیں لگ رہے تھے کہ شہزاد نامی شخص کو اپنے کام میں دشواری پیش آتی۔ اس نے پہلے آفتاب کو سکون آور گولی کھانے کے لیے دی اور پھر اس کے زخموں کو صاف کر کے ان پر مرہم لگانے لگا۔ جب تک وہ اس کام سے فارغ ہوا وہ لوگ گاؤں کی حدود سے نکل کر پختہ سڑک پر آ چکے تھے۔ پختہ سڑک پر پہنچنے کے بعد گاڑی کی رفتار بالکل ہموار ہو گئی اور وہ جو اکا دکا جھٹکے لگ رہے تھے ان سے بھی نجات مل گئی۔ سبک رفتاری سے چلتی اس گاڑی کی ٹھنڈی فضا میں کب وہ نیند کی آغوش میں جا پہنچا خود اسے بھی خبر نہ ہو سکی۔

☆☆☆

شہریار کے موبائل کی گھنٹی علی الصباح بجی۔ اس نے موبائل اٹھا کر چیک کیا۔ کال جگو کی طرف سے آ رہی تھی۔ اس نے فوراً ریسیو کا بٹن پش کر دیا۔

''آپ کا کام ہو گیا ہے سر جی! آپ کا بندہ چودھری کی قید سے چھڑا لائے ہیں ہم لیکن بے چارہ تھا بہت برے حالوں میں اس لیے میں اسے سیدھا اپنے ساتھ لاہور لے آیا ہوں اور یہاں اپنی جان پہچان کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں داخل کروا دیا ہے۔ اس پر بہت زیادہ تشدد کیا گیا ہے۔ سارا جسم زخموں سے بھرا ہوا ہے دونوں ٹانگوں اور ایک ہاتھ میں فریکچر بھی ہیں۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ وہ بہت لمبے عرصے

تک بستر سے اترنے کے قابل نہیں ہو سکے گا۔'' اس کی ''ہیلو'' سنتے ہی جگو نے اسے رپورٹ پیش کرنا شروع کر دی جسے سن کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ بے شک آفتاب شدید زخمی حالت میں ملا تھا لیکن یہی کیا کم تھا کہ وہ چودھری کی قید سے زندہ واپس آ گیا تھا ورنہ اسے جس جرم کے بدلے اغوا کروایا گیا تھا اس کے بعد تو اسے مسلسل یہی خدشہ ستاتا رہا تھا کہ جانے وہ زندہ بھی ہوگا یا نہیں۔

''تھینک یو جگو! تم نے میرا بہت بڑا کام اتنے کم وقت میں کر کے کارنامہ انجام دیا ہے۔'' اس نے تہ دل سے جگو کا شکریہ ادا کیا۔

''آپ کا مجھ پر احسان ہے اے سی صاحب! آپ نے میرے اکلوتے بیٹے کی جان بچا کر مجھے خرید لیا ہے۔ آپ یہ نہ سمجھیے گا کہ اس ایک کام کو کر کے میں نے آپ کے احسان کا بدلہ چکا دیا ہے۔ میں ساری زندگی کے لیے آپ کا خادم ہوں۔ آپ جب ضرورت محسوس کریں مجھے یاد کر سکتے ہیں جگو کبھی آپ کو 'نہ' نہیں کہے گا۔'' جگو نے عاجزی سے اس کی بات کا جواب دیا۔ اس جواب کو سن کر وہ اللہ کے انوکھے نظام پر ششدر رہ گیا۔ ایک بندہ جو کہ غنڈا تھا اور اپنی سیاسی جماعت کے تھم پر ہر جائز ناجائز کام کرتا پھرتا تھا، جس کے اپنے قریبی رشتے دار اس سے خوف زدہ رہتے تھے، کس طرح اس کا تابع ہو گیا۔ ایک معمولی سے احسان نے جو اس نے احسان سمجھ کر کیا بھی نہیں تھا، بلکہ اپنی دانست میں تو ایک انسانی فریضہ انجام دیا تھا، جگو کو خرید لیا تھا۔ شاید اللہ حق کی راہ پر چلنے والوں کی اسی طرح مدد کیا کرتا ہے۔

''یہ تو تمہارا بڑا پن ہے کہ تم ایسا سوچتے ہو ورنہ سچ یہ ہے کہ میں نے کبھی اس واقعے کا احسان نہیں جانا۔ زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار ایک بیمار بچے کو بروقت اسپتال پہنچانا میرا انسانی فرض تھا۔ بہر حال، یہ تمہاری اپنی مرضی ہے کہ تم اسے احسان جانو ورنہ میری طرف سے کوئی جبر نہیں۔ ہاں اگر تم میرے کہنے پر کبھی میرا کوئی کام کر دو گے تو یہ اطمینان رکھنا کہ وہ بھلائی کا ہی کام ہوگا۔ میں تمہیں تمہاری سیاسی جماعت کے لیڈروں کی طرح اپنے کسی ناجائز مفاد کے لیے ہرگز بھی استعمال نہیں کروں گا۔'' شہریار نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے بتایا۔

''مجھے معلوم ہے سر اور میں خوش بھی ہوں کہ میری گناہوں سے بھری زندگی میں بھی آپ کی بدولت چند ایسے اعمال جمع ہو جائیں گے جنہیں میں نیکی کہہ کر اپنے رب کے حضور لے جا سکوں۔'' جگو کی آواز میں وہی بھیگا پن تھا جو کسی پتھر دل پر ضرب لگنے پر لہجے میں اترتا ہے۔

''خیر ابھی تم ان باتوں کو جانے دو اور فی الحال تو مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے یہ کارنامہ انجام کیسے دیا؟ ہم تو ڈیرے سے ناکام آ گئے تھے۔ تم نے چودھری کا دوسرا ٹھکانا کیسے تلاش کر کے وہاں سے آفتاب کو آزاد کروایا؟'' گفتگو کا رخ تبدیل کرتے ہوئے شہریار نے واقعے کی تفصیل جاننا چاہی۔

''میری کامیابی کی وجہ یہ ہے کہ میں چودھری کی فطرت کو سمجھتا ہوں۔ ایک تو پیر آباد اور میرا گاؤں قریب ہونے کی وجہ سے میں پہلے ہی اسے کافی جانتا تھا پھر آپ کی طرف سے کام ملا تو میں نے اپنے ذریعے سے تھوڑی سی معلومات اور کروا لی۔ چودھری کے بارے میں معلوم پڑا کہ وہ عورتوں کا رسیا ہے بس تو پھر کام آسان ہو گیا۔ ایک اسٹیج ڈانسر ہے نیلی... بڑی طرح دار ہے اور ہمارے کہنے پر ہمارے لیے کام کرتی رہتی ہے۔ میں نے اپنے ایک ذریعے سے اسے چودھری کے خاص گرگے بالے تک پہنچا دیا۔ بالے نے فوراً اسے اپنے آقا کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس کے بعد تو نیلی کے لیے چودھری سے کچھ اگلوا لینا مشکل ہی نہیں تھا۔ چودھری کو شراب اور شباب کے نشے میں ڈبو کر اس نے سب معلوم کر لیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک موبائل فون لے گئی تھی جس کو اس نے آن رکھا تھا۔ اِدھر چودھری اگلتا گیا اُدھر ہم سنتے رہے۔ بندے تو میں نے پہلے ہی تیار کر رکھے تھے جیسے ہی معلوم ہوا کہ اس نے ماسٹر کو کہاں رکھا ہوا ہے میں اپنے بندے لے کر روانہ ہو گیا۔ نیلی کو بھی اندازہ تھا کہ ہم وہاں کتنی دیر میں پہنچ جائیں گے اس لیے وہ پہلے ہی چودھری سے رخصت لے کر وہاں سے نکل گئی تھی۔ خود چودھری بھی حویلی واپس چلا گیا تھا۔ بعد میں ڈیرے پر جو مارا ماری ہوئی اس کے بارے میں تو آپ کو خود ہی رپورٹ مل جائے گی۔'' جگو نے اسے تفصیل سنائی۔

''اس کا مطلب ہے آفتاب ڈیرے پر ہی تھا پھر پولیس اسے کیوں تلاش نہیں کر سکی؟'' جگو کی رپورٹ سن کر وہ حیرت سے بولا۔

''پولیس کا اس میں زیادہ قصور نہیں۔ اگر نیلی نہ ہوتی تو ہم بھی ڈیرے سے ناکام ہی واپس آتے۔ یہ تو نیلی کی وجہ سے ہمیں یہ معلومات مل گئی تھیں کہ چودھری نے تہ خانے کے ساتھ ایک اور نیا خفیہ تہ خانہ بنوایا ہے شاید کچھ عرصے پہلے کوئی ایسا واقعہ پیش آیا تھا جب کوئی تہ خانے کے خفیہ سیف سے کچھ چرا کر لے گیا تھا اور تہ خانے میں آگ لگا دی تھی۔ اس کے بعد چودھری نے جب پرانے تہ خانے کی مرمت کروائی تو ساتھ ہی

ایک اور خفیہ تہ خانہ بھی بنوا ڈالا۔ آفتاب کو اس نے اسی نئے تہ خانے میں رکھا ہوا تھا۔" جگو نے اس کی حیرت دور کی۔

"او کے جگو! تم نے میرا بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا اور ساری الجھنیں بھی دور ہو گئیں۔ اب تم ایسا کرو کہ مجھے اس اسپتال کا نام پتا لکھوا دو جہاں تم نے آفتاب کو ایڈمٹ کروایا ہے اور خود آرام کرو۔ رات بھر تم نے بڑی بھاگ دوڑ کی ہے اس لیے اب آرام ضروری ہے۔" سب جان لینے کے بعد اس نے گفتگو کو سمیٹتے ہوئے کہا تو اس نے بنا تامل اسے اسپتال کا پتا بتانے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔ شہریار کو اسے یہ باور کروانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی کہ وہ اس بارے میں کسی اور کو خبر نہ ہونے دے۔ جگو جس نظام کا حصہ تھا وہاں ایسی احتیاطیں اور رازداریاں تربیت کا لازمی حصہ ہوتی ہیں۔ خود وہ جگو کی کال سے فارغ ہونے کے بعد فریش ہونے کے لیے چلا گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا آج کا دن بہت مصروف گزرنے والا ہے۔ آخر چودھری افتخار عالم شاہ کے ڈیرے پر حملہ ہوا تھا اور ضلع پولیس خاموش تماشائی بنی رہی تھی۔ اب تک تو اس واقعے کے خلاف چودھری نے جانے اپنے کتنے جاننے والے اعلیٰ عہدے داروں کو شکایت نوٹ کروا دی ہو گی۔ آج کا دن شہریار کو چودھری کے ان سارے ہمدردوں کو بھگتنا تھا۔

☆☆☆

سرخ و سنہری خوبانیوں سے لدے درخت، کھیتوں میں ہل چلاتی زوہ کی جوڑی، پانی کا مٹکا سر پر اٹھائے بے وجہ ہنستی ہوئی گھروں کی طرف جاتی لڑکیاں، ادھر ادھر آوارہ کھیلتے بچے، وہ راستے میں پڑنے والے ہر ہر منظر کو ایک عالم حیرت میں دیکھتی ہوئی آ رہی تھی۔ اس کی سیاہ چمکدار آنکھیں یوں نیم وا تھیں جیسے وہ خواب کی کیفیت میں ہو۔ حقیقت میں اسے یہ خواب ہی تو لگتا تھا اور کھلی آنکھوں سے سب کچھ دیکھنے کے باوجود یقین نہیں آتا تھا کہ وہ زندہ صحیح سلامت ان مناظر سے گزر رہی ہے۔ وہ قان کی راہنمائی میں اس برف زار سے جس میں اسے لگتا تھا کہ اس نے صدیاں بھٹکتے ہوئے گزار دی ہوں، نکل آئی تھی لیکن ابھی سفید چمکتی برف کا عکس اور تند ہواؤں کی یخ بستگی اس کے ذہن پر نقش تھی۔ بدن موسم کی ان شدتوں سے رہائی پانے کے باوجود ابھی تک ٹھٹھرا ہوا تھا۔ اس کا ذہن حقیقت کو بھی حقیقت مانتے ہوئے ڈر رہا تھا اور اسے یوں لگتا تھا کہ شاید وہ ان برف پوش پہاڑوں میں بھٹکتے ہوئے کچھ دیر کے لیے سو گئی ہے اور سوتے میں یہ سہانا خواب دیکھ رہی ہے۔ یہ ہنستے مسکراتے انسانی چہرے، یہ لہلہاتے کھیت، زندگی کا جاری کاروبار سب خواب ہی تو لگتا تھا۔ وہ عمران کے ساتھ اپنے قید خانے سے بھاگ نکلنے کے بعد مسلسل ان سب مناظر میں پہنچنے کے لیے سرگرداں رہی تھی اور اب پہنچ گئی تھی تو لگتا تھا کہ اپنی ہی آنکھیں دھوکا دے رہی ہیں۔ قان اس کی اس حالت کو دیکھ اور سمجھ رہا تھا چنانچہ اسے اس کیفیت سے نکالنے کے لیے مسلسل باتیں کرتا رہتا۔ راستے میں پڑنے والے ہر منظر، ہر مقام کے بارے میں اسے آگاہ کرتا رہتا۔ یہ سوچے بغیر کہ وہ اس کی باتوں کا کتنا فیصد حصہ سمجھ رہی ہے اور کتنا اس کے سر کے اوپر سے گزرتا جا رہا ہے۔ اس کی یہ محنت بالکل رائیگاں نہیں گئی تھی۔ آہستہ آہستہ ماہ بانو اس پر اعتماد کرنے لگی تھی اور اس نے ٹوٹے پھوٹے جملوں میں اپنے ساتھ گزرنے والے واقعات کی مختصر روداد اسے سنا ڈالی تھی چنانچہ جب وہ لوگ چھوٹی چھوٹی بستیوں سے گزرنے کے بعد اسکردو پہنچے تو قان اسے کسی ہوٹل میں ٹھہرانے کے بجائے اپنے ایک واقف کار کے گھر لے گیا۔ اس کا یہ واقف کار فوج سے ریٹائرڈ تھا اور اب اپنا ایک جنرل اسٹور چلا رہا تھا۔ قان اور ماہ بانو اس کی رہائش گاہ پر پہنچے تو اس نے گرم گرم قہوے اور خشک میووں سے ان کی خاطر مدارات کی۔ پھر چھٹیاں گزارنے کے لیے گھر آئے ہوئے اپنے ایک دوست کے بیٹے کو جو کہ میڈیکل کالج کے آخری سال میں تھا، بلا کر ماہ بانو کا پیر دکھایا جو کافی دیر تک برف میں کھلا رہنے کی وجہ سے متاثر ہوا تھا۔

"باقی پیر تو ٹھیک ہے لیکن یہ درمیانی انگلی بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ یہ انگلی فراسٹ بائٹ کا شکار ہوئی ہے اور اب اس میں زندگی کے کوئی آثار باقی نہیں ہیں چنانچہ اسے کاٹ کر ان کے پاؤں سے الگ کرنا ہو گا۔" معائنے کے بعد میڈیکل کے اس طالب علم نے اعلان کیا۔ قان اس بات کا پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا لیکن اپنی زبان سے کچھ کہنے کے بجائے اس نے یہی مناسب سمجھا تھا کہ کسی ڈاکٹر کی رائے لے لی جائے۔

"اس کام کے لیے تو اسپتال ہی جانا پڑے گا۔ تمہارا معائنے کے لیے آنے کا بہت بہت شکریہ بیٹے۔" قان کے واقف کار نے اپنے دوست کے بیٹے کو رخصت کر دیا۔

"اسپتال جانے سے پہلے میں اس لڑکی کو کسی ذمے دار شخص سے ملوانا چاہتا ہوں۔ تمہارے پاس آنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ تم اپنی آرمی کی سابقہ ملازمت کی وجہ سے اس کام میں ہماری بہتر مدد کر سکو گے۔ اصل میں یہ لڑکی کچھ ایسی باتیں جانتی ہے جن کا کسی عام فرد کے علم میں آنا شاید تمہارے ملک کے لیے نقصان دہ ہو اور خود یہ بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔" قان بہت زیرک آدمی تھا۔ پاکستان کا باشندہ نہ ہونے کے باوجود وہ صرف یہاں کئی بار آنے کی وجہ سے یہاں کے ماحول کو سمجھتا تھا اس لیے پوری احتیاط برت رہا تھا یہاں تک کہ اس نے اپنے واقف کار کو بھی سارے معاملے سے ابھی تک آگاہ نہیں کیا تھا اور صرف یہ چاہتا تھا کہ ماہ بانو کو کسی محفوظ ہاتھ تک پہنچا دے۔

"اگر معاملہ اتنا ہی حساس ہے تو پھر میرے خیال میں، میں تمہیں اپنے بھتیجے سے ملوا دیتا ہوں۔ وہ آرمی انٹیلی جنس میں میجر کے عہدے پر کام کر رہا ہے اور آج کل یہیں ہے۔ وہ اس لڑکی کی بہتر مدد کر سکے گا۔" ان کے میزبان نے انہیں بتایا اور پھر اپنے بھتیجے کو فون کرنے چلا گیا۔

"میں نے فون کر دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ دو گھنٹے بعد یہاں آ سکے گا۔ اس کے آنے تک تم دونوں آرام کر سکتے ہو۔" واپس آ کر اس نے انہیں اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ ایک پرکشش پیشکش بھی کی۔ لمبی مسافت طے کر کے آنے والے ان مسافروں کو آرام سے بہتر کیا لگ سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے میزبان کے فراہم کردہ آرام دہ بستروں میں محو استراحت تھے۔ ماہ بانو کو کسی گھر کی چار دیواری میں آرام دہ بستر پر سونے کا موقع بہت عرصے بعد میسر آیا تھا۔ وہ تو گویا ایسی کسی عیاشی کے تصور سے بھی تقریباً مایوس ہی ہو گئی تھی چنانچہ اب جو یہ سہولت میسر آئی تو بے ساختہ ہی اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔ نرم و ملائم بستر کی آغوش میں نیند کی وادیوں میں اترتے ہوئے اس کے ذہن میں تواتر سے قرآن کی یہ آیت گونج رہی ہے۔ "اور تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔"

وہ تو ان ان مقامات پر اور ایسی مشکل گھڑیوں میں اپنے رب کی نعمتوں سے سرفراز ہوئی تھی کہ جس کا تصور ہی محال تھا۔ نوازے جانے کے اس احسان کو اپنے دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتے ہوئے وہ ایسی پرسکون نیند میں ڈوبی کہ پھر قان کے پکارنے پر ہی جاگی۔

"میجر ذیشان آ گیا ہے اور تم سے ملاقات کا منتظر ہے۔" اس نے آنکھ کھول کر دیکھا تو قان نے اسے اطلاع دی۔ اس اطلاع پر اس نے فوراً ہی بستر چھوڑ دیا اور لباس کی سلوٹیں دور کرتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ یہ لباس اسے ایک گاؤں سے گزرتے ہوئے قان نے ایک محنت کش عورت سے خرید کر دیا تھا۔ وہ اچھا آدمی تھا اور بہت ترقی یافتہ لیکن ایشیائی ملک کا باشندہ ہونے کی وجہ سے شاید اس میں مشرق کی یہ ادا موجود تھی کہ کسی کو مصیبت میں دیکھ کر بے نیازی سے شانے اچکا کر گزر جانے کے بجائے ممکنہ حد تک اس مصیبت زدہ کی مدد کرے۔ ماہ بانو کم از کم اس کے مہربان رویے کی یہی توجیح کر سکی تھی لیکن اصل بات تو یہ تھی کہ قان فطرتاً ایک اچھا آدمی تھا۔ آدمی فطرت سے اچھا ہو تو پھر مشرق و مغرب کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا اور خراب فطرت اچھے سے اچھے ماحول میں بھی اپنا رنگ دکھا جاتی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو سڑک پر حادثے کا شکار ہو کر بے ہوش ہو جانے والے آدمی کی جیب سے اس کا بٹوا اور موبائل فون نکالے جانے کے مناظر ہمارے ہاں کیونکر دکھائی دیتے؟

"السلام علیکم۔" سنجیدہ چہرے والے مدبر سے میجر کے سامنے پہنچ کر ماہ بانو نے اسے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ بیٹھیں بی بی! اور مجھے بتائیں کہ آپ ایسا کیا جانتی ہیں جس کا کسی انٹیلی جنس کے بندے کے علم میں لایا جانا ضروری ہے لیکن پلیز ذرا وقت کا خیال رکھ کر مختصر بات کیجیے گا۔ میں بہت مصروف ہوں اور زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکوں گا۔" وہ یقیناً اپنے چچا کی مروت میں وہاں تک آ گیا تھا لیکن اس بات کے لیے بھی فکرمند تھا کہ اس کا وقت ضائع نہ ہونے پائے۔ ماہ بانو نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ممکنہ اختصار سے اپنی آپ بیتی سنانی شروع کر دی۔ واقعات سناتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ میجر جو کافی بے دلی سے یہاں تک آیا تھا اب اس کی داستان میں گہری دلچسپی لے رہا ہے اور بغور اس کا ایک ایک لفظ سن رہا ہے۔ کئی جگہ پر اس نے دخل اندازی کرتے ہوئے ماہ بانو سے سوالات بھی کیے۔ نتیجتاً اختصار کی ہدایت کے ساتھ شروع کی جانے والی گفتگو خاصا طول کھینچ گئی۔ اس عرصے میں قان اپنے میزبان کے ساتھ دوسرے کمرے میں بیٹھا شطرنج کھیلتا رہا تھا۔ میجر کی خاطر مدارات کے لیے ایک بار قہوے کے ساتھ نمکین کاجو اور بسکٹ پیش کرنے کے لیے آنے کے سوا ان دونوں کی گفتگو کے دوران کوئی کمرے میں نہیں آیا تھا۔

"تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔ جہاں میں تمہیں لے کر جاؤں گا وہاں تمہارا بیان بھی ریکارڈ ہو گا اور میں تمہاری ایک ایسے شخص سے ملاقات بھی کرواؤں گا جسے دیکھ کر تم یقیناً خوشی محسوس کرو گی۔" گفتگو کے اختتام پر میجر نے اس سے کہا اور پھر اس کا جواب سنے بغیر اپنے چچا کو آواز دینے لگا۔

"میں اس خاتون کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔" چچا کے سامنے آنے پر اس نے اسے مطلع کیا۔

"کھانا کھا کر چلے جانا۔ میں دم کا گوشت بنا رہا تھا جو تمہیں بہت پسند ہے۔"

"پھر بھی سہی۔ ابھی مجھے جلدی ہے۔ اس لڑکی کے علاج اور کھانے پینے کا انتظام بھی میں خود ہی کر دوں گا۔" اس نے عجلت میں جواب دیا اور ماہ بانو کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیے۔ وہ قدرے جھجکتی ہوئی اس کے پیچھے چل پڑی۔ ذاتی سامان تو اس کے پاس کچھ رہا نہیں تھا کہ اسے سمیٹنے کی فکر ہوتی البتہ ایک اجنبی کے ساتھ جانے میں کچھ تامل تھا لیکن پھر اس نے اپنے ہر اندیشے کو جھٹک ڈالا۔ اب تک اس کی زندگی میں آنے والے بیشتر اجنبی اس کے لیے مددگار ہی ثابت ہوئے تھے اور اگر کبھی کسی نے مشکل کھڑی کرنے کی کوشش بھی کی تھی تو اللہ رب العزت تھوڑی سی آزمائش کے بعد اسے اس مشکل سے نکال لایا تھا پھر اسے کیا ضرورت پڑی تھی کہ بہت زیادہ فکر اور اندیشے پالتی۔ وہ تھا تو اس کا مددگار جس کا سہارا اور ساتھ ہر سہارے سے بڑھ کر قابلِ بھروسا تھا۔

☆☆☆

"یہ سب کیا ہو رہا ہے شہر یار؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ اس طرح تو تم اپنے لیے بہت زیادہ مشکلات کھڑی کر لو گے۔ چودھری بہت غضبناک ہے۔ اس کے دو بندے مارے گئے ہیں۔ چار اچھے خاصے زخمی ہیں۔ وہ سب طرف شکایتیں کرتا پھر رہا ہے کہ اس کے ڈیرے پر شب خون مارا گیا اور کہیں سے کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔" یہ مختار مراد تھے۔ اس کے لیے پریشان، فکرمند اور نہایت کے ساتھ خفا ہوتے۔

"کارروائی کیسے ہوتی انکل! جس وقت چودھری کے ڈیرے پر حملہ ہوا اتفاق سے پولیس اسٹیشن کا فون ڈیڈ پڑا ہوا تھا۔ ایس پی صاحب اپنی فیملی کے ساتھ کسی تقریب میں شرکت کے لیے لاہور میں تھے اور میں طبیعت کی خرابی کی وجہ سے ملازمین کو ڈسٹرب نہ کرنے کی ہدایت کر کے جلدی سو گیا تھا۔ اب ہم ان سارے اتفاقات کو چودھری صاحب کی بدقسمتی کہہ کر افسوس کرنے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں۔" اس نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے مختار مراد کو جواب دیا۔

"تم جانتے ہو کہ یہ ساری کہانیاں سنا کر مجھے بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ میں نے پولیس ڈپارٹمنٹ میں ایک عمر گزاری ہے اور میں اس طرح کے سارے کھیل تماشوں سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔" اس کا جواب سن کر انہوں نے ناراضی کا اظہار کیا۔

"میں آپ کی شان میں ایسی گستاخی نہیں کر سکتا انکل! میں جانتا ہوں کہ آپ ہر بات اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن آپ بتائیں کہ کیا اس کے سوا میرے پاس کوئی دوسرا حل تھا؟ ابھی بھی آفتاب جس حالت میں ہمیں ملا ہے، وہ نہایت قابلِ افسوس ہے۔ اتنا تشدد تو پولیس والے بھی کسی خطرناک مجرم سے اقبالِ جرم کروانے کے لیے نہیں کرتے جتنا اس پر کیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک آدھ دن اور گزر جاتا تو وہ بے چارہ اپنی جان سے چلا جاتا اور آپ یقین کریں کہ آفتاب جیسے مخلص، محنتی اور دیانت دار آدمی کی زندگی چودھری کے ان پٹھوؤں سے کہیں زیادہ قیمتی ہے جو اپنے مالک کے حکم پر کمزور اور نہتے لوگوں پر ظلم ڈھاتے پھرتے ہیں۔" اس بار اس نے بھی صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

"تمہاری یہ جذباتیت تمہیں بہت نقصان پہنچائے گی شہر یار!" مختار مراد نے بے بسی سے اسے تنبیہ کی۔

"نقصان اٹھاتے ہوئے مجھے یہ اطمینان تو ہوگا کہ میرے جذبات نے کسی ظالم کا ساتھ نہیں دیا۔" اس نے ترنت جواب دیا۔

"میں رانا صاحب کی وجہ سے تمہیں احتیاط کی نصیحت کرتا ہوں۔ وہ پہلے ہی صاحبِ فراش ہیں اور آج کل عملی طور پر سیاست کے کاموں میں حصہ نہیں لے پا رہے ہیں۔ اس لیے ان تک زیادہ خبریں بھی نہیں پہنچتی ہیں لیکن اگر انہیں یہ معلوم ہو گیا کہ تم کھلم کھلا چودھری سے جنگ شروع کر چکے ہو تو وہ بہت پریشان ہو جائیں گے۔" وہ نرمی سے اسے حالات کا احساس دلانے لگے۔

"آپ فکر نہ کریں انکل... اگر ماموں جان سے بھی کبھی اس موضوع پر بات ہو تو انہیں تسلی دیں کہ چودھری کی مخالفت سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچنے والا۔ چودھری کوئی خدا نہیں ہے کہ اس کی مرضی سے لوگوں کی زندگی اور موت کا فیصلہ ہوتا ہو، اگر اس لڑائی میں میری موت لکھی ہے تو پھر کسی بھی تدبیر سے اسے ٹالا نہیں جا سکے گا۔ اب بھی آپ دیکھ لیں کہ چودھری صرف بلبلانے اور ادھر اُدھر فون گھمانے کے علاوہ کیا کر پا رہا ہے۔ وہ تو کسی ایسے شخص کا نام بھی نہیں لے سکا جس پر اسے شک ہو کہ اس نے یہ حملہ کروایا ہے۔ کم از کم میرا نام تو وہ کسی صورت نہیں لے سکتا۔ اگر لے گا تو اس بات کی وضاحت کیسے کرے گا کہ میری طرف سے یہ حملہ کیوں کروایا گیا؟ کیا وہ قبول کر سکتا ہے کہ اس نے ماسٹر آفتاب کو اپنے ڈیرے کے خفیہ تہ خانے میں حبسِ بے جا میں رکھا ہوا تھا اور اس پر غیر انسانی تشدد کر رہا تھا کہ کوئی اس کے پنجوں سے شکار چھین کر لے گیا۔ یقین کریں وہ تو پولیس کے پوچھنے کے باوجود یہ تک الزام نہیں لگا سکا کہ اس کے ڈیرے سے کچھ چرایا گیا ہے یا وہاں توڑ پھوڑ کی گئی ہے۔ ان حالات میں پولیس

اس کے ڈیرے پر ہونے والے حملے کو ذاتی دشمنی کا نتیجہ قرار دے کر نامعلوم افراد کے نام رپورٹ درج کرنے کے سوا اور کیا کر سکتی تھی اور یہ سب ہی جانتے ہیں کہ ایسے نامعلوم قاتل کبھی نہیں پکڑے جاتے۔ آپ کے پاس پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کے قتل سے لے کر آج تک کوئی ایسی مثال ہے جس میں اصل قاتلوں اور حملہ آوروں تک پہنچا جا سکا ہو؟" وہ بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا اور اس کی ہر بات اتنی صحیح تھی کہ مختار مراد کچھ کہنے کے قابل نہیں تھے۔

"میں آپ سے معافی چاہتا ہوں انکل! ہو سکتا ہے میری باتوں نے آپ کو ہرٹ کیا ہو لیکن میں صرف اپنی کرسی اور جان بچانے کے لیے ظلم کے سامنے اس حد تک نہیں جھک سکتا کہ خود اپنا سامنا کرنے میں بھی مجھے شرمندگی ہو۔ البتہ آپ کی تسلی کے لیے اتنی یقین دہانی ضرور کروا سکتا ہوں کہ میں بلاوجہ خود کو کسی خطرے میں ڈالنے سے حتی الامکان پرہیز کروں گا۔" ان کی خاموشی کو محسوس کر کے اس نے اپنا لہجہ ذرا دھیما کرتے ہوئے ان سے کہا۔

"میں نے تمہاری کسی بات کا برا نہیں مانا بیٹا! میں تمہارے لیے یہی دعا کر سکتا ہوں کہ تمہارا یہ جذبہ ہمیشہ سلامت رہے اور راہ کی مشکلات تمہارے حوصلے کو توڑنے نہ دیں۔ بس یہ یاد رکھنا کہ جو راہ تم نے اپنے لیے منتخب کی ہے، وہ بہت کٹھن ہے۔ اس راہ میں تمہیں اپنے قدموں کے نیچے پھول بچھے کبھی نہیں ملیں گے... ہاں ان کانٹوں سے ضرور ہر قدم پر سامنا ہوگا جو تمہارے تلووں پر لہو کے بیل بوٹے نقش کر دیں گے۔" انہوں نے فون بند کر دیا اور وہ خود کافی دیر تک یونہی گم صم بیٹھا رہا۔

مختار مراد کی کوئی بات غلط نہیں تھی۔ اب تک اس کے پاس کتنے اعلیٰ عہدے داروں کے فون آ چکے تھے جنہوں نے چودھری کے ڈیرے پر ہونے والے حملے کی مذمت کرتے ہوئے اس سے جواب دہی چاہی تھی۔ وزیراعلیٰ تک نے فون کر کے اس صورتِ حال پر ناراضی کا اظہار کیا تھا۔ اگر اس کی پشت پر اتنا مضبوط خاندان موجود نہ ہوتا تو یقیناً اب تک وہ یا تو اپنی ملازمت سے فارغ ہو چکا ہوتا یا پھر کسی دور دراز مقام پر ٹرانسفر کر دیا گیا ہوتا۔ کسی نسبتاً کمزور آدمی کا تو چودھری جیسے جابر کے سامنے ٹھہرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ اپنے ایسے مخالفین کو خس و خاشاک کی طرح اڑا ڈالتا تھا۔

آفتاب کے صحافی دوست افضل کے ساتھ گزرنے والے حادثے کی اطلاع اس تک پہنچ گئی تھی۔ افضل کے بیوی بچوں کو رات کی تاریکی میں جس طرح موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا، وہ نہایت افسوسناک تھا اور خود بخود ہی ذہن میں قاتل کے طور پر چودھری کا نام آ جاتا تھا۔ بے شک یہ قتل اس نے اپنے ہاتھ سے نہیں کیے ہوں گے لیکن حکم تو اسی کا ہوگا۔ ابھی اس کی افضل سے براہِ راست بات نہیں ہو سکی تھی اس لیے اس واقعے پر اس کی رائے کے بارے میں آگاہ نہیں تھا۔ اس نے عبدالمنان کو ہدایت کر رکھی تھی کہ جب بھی ممکن ہو اس کا افضل سے فون پر رابطہ کروا دیا جائے لیکن شاید اپنی بیوی بچوں کی آخری رسومات میں مصروف غم سے نڈھال افضل نے ڈسٹربنس سے بچنے کے لیے اپنا موبائل ہی آف کر رکھا تھا اس لیے متعدد بار کوشش کرنے کے باوجود اس سے رابطہ ممکن نہیں ہو سکا تھا۔ افضل سے رابطہ ہو جاتا تو وہ اس کے ساتھ گزرنے والے حادثے پر تعزیت کرنے کے ساتھ ساتھ اسے آفتاب کے بارے میں بھی بتا دیتا۔ جگنو نے اسے آفتاب کے سلسلے میں پورا اطمینان دلایا تھا لیکن پھر بھی وہ مناسب سمجھتا تھا کہ کوئی ایسا شخص بھی اس کی خیر خبر لینے والا ہو جس سے اس کا قریبی تعلق اور دلی وابستگی ہو۔ افضل لاکھ دکھ اور صدمے کی کیفیت میں ہونے کے باوجود اپنے دوست کی خبر گیری میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھے گا، اس بات کا اسے یقین تھا۔

"سر! اسکردو سے کوئی میجر ذیشان آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔" وہ سوچوں کے تانے بانے میں الجھا ہوا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس کا خیال تھا کہ افضل سے رابطہ ہو گیا ہوگا لیکن فون اٹھانے پر جو اطلاع دی گئی اسے سن کر وہ بری طرح چونک گیا۔ اسکردو میں آج کل مشاہرم خان مقیم تھا جس سے کئی دنوں سے اس کا رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔ وہ مشاہرم خان کے غیاب پر تشویش میں مبتلا تھا اور اس نے وہاں کے ذمے دار افراد سے مشاہرم خان کا کھوج لگانے کے سلسلے میں گزارش بھی کی تھی لیکن فوج سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کا فون کرنا خود اس کے لیے اچنبھے کی بات تھی۔

"بات کروائیں۔" اپنی حیرت اور تشویش کو ظاہر کیے بغیر اس نے جواب دیا۔

"ہیلو اے سی صاحب! میں اسکردو سے میجر ذیشان بات کر رہا ہوں۔" رابطہ ملتے ہی اسے دوسری طرف سے ایک سنجیدہ اور بردبار آواز سنائی دی۔

"جی میجر صاحب! فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" اس نے بھی ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"آپ کو میری درخواست پر یہاں اسکردو تک آنے کی زحمت اٹھانی پڑے گی۔" میجر ذیشان نے اسی سنجیدگی سے اسے جواب دیا۔ اس کے درخواست کا لفظ استعمال کرنے

کے باوجود شہریار پر واضح ہوگیا کہ یہ ایک سرکاری حکم ہے جس پر اسے عمل پیرا ہونا پڑے گا۔ اسے اس حکم کی پیروی میں کوئی عار نہیں تھا لیکن وہ اپنے اس طرح بلائے جانے کی وجہ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔

''میں حاضر ہو جاؤں گا لیکن کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ میری وہاں اس طلبی کا کیا مقصد ہے؟''

''میں بہت کھل کر اس وقت آپ کو سب کچھ نہیں بتا سکتا لیکن دو نام ایسے ہیں جنہیں سن کر یقیناً آپ یہاں آنے میں کوئی تاخیر کرنا پسند نہیں کریں گے۔ آپ کا ڈرائیور مشابرم خان اور پیرآباد کی ماہ بانو دونوں اس وقت میرے پاس ہیں اور ان دونوں افراد نے اپنے بیان میں آپ کا نام لیا ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ سے مل کر ان دونوں کی بہت سی باتوں کی تصدیق کی جاسکے۔'' میجر ذیشان نے اس کے استفسار کے جواب میں دھماکا ہی کر ڈالا۔ وہ تو صرف مشابرم خان کے بارے میں کسی اطلاع کی امید کر رہا تھا لیکن وہاں تو مشابرم خان کے ساتھ ساتھ ماہ بانو کے مل جانے کی خوش خبری بھی اسے سنائی جارہی تھی۔

''میں ان دونوں افراد سے واقف ہوں اور مجھے یقین ہے کہ انہوں نے آپ کو اپنے بارے میں جو کچھ بھی بتایا ہے، اس میں کوئی جھوٹ شامل نہیں ہوگا۔'' اپنے اندر کا ہیجان کو بہ مشکل چھپاتے ہوئے اس نے ہموار لہجے میں میجر ذیشان کو یقین دہانی کروائی۔

''آپ اتنے اطمینان سے یہ بات اس لیے کہہ رہے ہیں کہ آپ حالات سے مکمل طور پر واقف نہیں۔ یہاں بہت حساس نوعیت کے واقعات پیش آچکے ہیں جن کی تحقیق و تفتیش بڑی باریک بینی سے کی جارہی ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں آپ کا تعاون بھی درکار ہے اسی لیے میں نے آپ کو کال کی ہے اور میری خواہش ہے کہ آپ جتنی جلدی ممکن ہو سکے' بنا کسی تاخیر کے یہاں تشریف لے آئیں۔'' میجر ذیشان کے جواب نے اسے الجھن میں ڈال دیا لیکن اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ معاملہ اگر بہت حساس نوعیت کا ہے تو اس کے استفسار کے باوجود میجر ذیشان اسے فون پر مزید کچھ بتانا پسند نہیں کرے گا چنانچہ کوئی سوال کیے بغیر سنجیدگی سے بولا۔

''آپ فکر نہ کریں میجر صاحب! میں فوری طور پر وہاں پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ آپ مجھے اپنا کانٹیکٹ نمبر نوٹ کروا دیں تاکہ میں آپ سے رابطے میں رہ سکوں۔'' اس کی فرمائش پر میجر ذیشان نے اسے کانٹیکٹ نمبر نوٹ کروا دیا۔

''عبدالستار! چیک کرو کہ اسکردو جانے والی فرسٹ فلائٹ کب کی ہے۔ اس فلائٹ پر میرے لیے ایک سیٹ بک کروا دو۔'' فون سے فارغ ہونے کے بعد اس نے انٹرکام پر عبدالستار کو حکم دیا۔

''اوکے سر! میں دیکھتا ہوں۔'' یقیناً وہ بھی اس کا یہ اچانک پروگرام سن کر حیران ہوا تھا لیکن کوئی سوال کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ عبدالستار کو ہدایت دینے کے بعد گھر پر اپنے بیٹ مین کو تیاری کے سلسلے میں احکامات دینے لگا۔ دفتری امور کے سلسلے میں اہم نوعیت کی ہدایات اور احکامات جاری کرنے تک بیٹ مین اس کے حسب ہدایت اس کا سامان تیار کر کے بھجوا چکا تھا جو گاڑی کی ڈکی میں رکھا تھا اور وہ ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں لاہور کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ لاہور سے اسے بذریعہ ہوائی جہاز اسلام آباد جانا تھا جہاں عبدالستار کی کوششوں سے اسکردو جانے والی فلائٹ میں اس کے لیے بکنگ ہو چکی تھی۔ نورکوٹ سے لاہور ائرپورٹ تک کا طویل سفر طے کر کے وہ ڈپارچر لاؤنج میں پہنچا تو عبدالستار نے اسے افضل سے رابطہ ہو جانے کی اطلاع دی۔

''ٹھیک ہے تم میری طرف سے اس سے تعزیت کرو اور اسے آفتاب کے بارے میں بتا دو۔'' اس نے مختصر احکامات جاری کیے۔ وہ بالکل عین وقت پر ائرپورٹ پہنچا تھا اور اس کے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ وہ رک کر افضل سے بات کرسکتا۔ یوں بھی اسے جس دیار کی طرف جانا تھا وہاں سے خوشبوئے یار آرہی تھی اور بہت عرصہ فرائض و حقوق کی ادائیگی میں الجھے رہنے کے بعد اب اس میں اتنا یارا نہیں رہا تھا کہ مزید ضبط کا مظاہرہ کر سکتا اور اپنے دل کی صدا پر لبیک کہتے ہوئے کوئے یار کی طرف روانہ ہونے کے بجائے کسی اور الجھن میں خود کو گرفتار کر کے بیٹھ جاتا۔

☆☆☆

''آفتاب۔'' وہ آنکھیں موندے بستر پر لیٹا قطرہ قطرہ اپنے جسم میں داخل ہوتے حیات بخش محلول کی تاثیر محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ گزرے حالات کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس جانی پہچانی آواز کو سن کر چونک گیا اور فوراً آنکھیں کھول کر پکارنے والے کی طرف دیکھا۔ وہ افضل تھا۔ اس کا عزیز از جان دوست جو آنکھوں میں نمی لیے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''تم ٹھیک تو ہو نا دوست! ظالموں نے تمہارا یہ کیا حال کر دیا ہے؟'' آفتاب کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس نے دردمندی سے پوچھا اور اس کا دایاں ہاتھ تھام لیا۔

''جیسا ہوں تمہارے سامنے ہوں اور خود بھی حیران ہوں کہ میں زندہ بچ کر یہاں تک کیسے پہنچ گیا ہوں؟'' آفتاب نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ اس کا سارا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا اور یہ معمولی سی مسکراہٹ لبوں پر سجانے کے لیے بھی اسے سخت جدوجہد کرنی پڑی تھی۔

''زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جس کا وقت پورا ہو جائے وہ گھر کی چار دیواری میں بھی محفوظ نہیں رہتا اور جس کی سانسیں باقی ہوں اس کے جینے کے لیے اللہ کوئی نہ کوئی ذریعہ بنا ہی دیتا ہے۔'' افضل کے لہجے میں زمانے بھر کا درد تھا جسے آفتاب اپنی دھن میں محسوس نہیں کر سکا اور اس کی تائید کرتے ہوئے کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔

''تم بالکل ٹھیک کہتے ہو یار! میں اب تک نہیں سمجھ پایا کہ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے مجھے چودھری کے چنگل سے نجات دلائی۔ اپنے انداز و اطوار سے تو وہ غنڈے لگتے تھے لیکن میرے لیے رحمت کے فرشتے ثابت ہوئے۔ انہوں نے نہ صرف چودھری کے ڈیرے کے خفیہ تہ خانے سے مجھے نکالا بلکہ یہاں اس اسپتال میں داخل بھی کروا دیا۔'' وہ افضل کو بتاتے بتاتے یک دم چونک سا گیا۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ایڈمٹ ہوں؟''

''میرے پاس اے سی شہریار عادل کے پی اے کا فون آیا تھا۔ انہوں نے مجھے اس اسپتال کا ایڈریس دیتے ہوئے بتایا کہ تم شدید زخمی حالت میں یہاں داخل ہو۔'' افضل نے اسے بتایا۔

''اس کا مطلب ہے کہ میری رہائی کے پیچھے اے سی صاحب کا ہاتھ ہے۔ انہوں نے جب دیکھا ہوگا کہ سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکل رہا تو پھر انہوں نے وہ طریقہ استعمال کیا جس کے ذریعے چودھری جیسے بندے کو قابو کیا جاسکے۔''

''میرے خیال میں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ تمہاری بازیابی کے سلسلے میں پہلے انہوں نے قانونی طریقہ استعمال کرتے ہوئے پولیس کے ذریعے چودھری کے ڈیرے پر ریڈ کروایا تھا جو کہ ناکام ثابت ہوا۔ اس ناکامی کے بعد انہوں نے سوچا ہوگا کہ یوں بات نہیں بنے گی اور انگلیاں ٹیڑھی کرنی ہی پڑیں گی چنانچہ انہوں نے تمہاری رہائی کے لیے غنڈا عناصر کو استعمال کیا۔ چودھری افتخار کے ڈیرے پر حملے کی اطلاع مجھے بھی ملی تھی لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ سارا ہنگامہ تمہاری خاطر کھڑا کیا گیا ہے۔ اب تمہیں یہاں اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں تو ساری کہانی سمجھ میں آرہی ہے۔'' افضل نے اس کی تائید کرتے ہوئے خود بھی حالات کا تجزیہ کیا۔

''تمہیں کس نے اطلاع دی تھی میرے اغوا کی؟''

''میرے پاس منیب کا فون آیا تھا۔ پیرآباد میں کوئی اکو تانگے والا ہے۔ اس نے تمہیں اغوا ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اسی نے منیب کو بتایا اور منیب سے اے سی صاحب اور مجھ تک خبر پہنچی۔'' افضل نے اسے بتایا۔

''اوہ آئی سی۔'' آفتاب نے تفہیمی انداز میں کہا اور پھر افسردگی سے بولا۔ ''اکو کی منگیتر رانی، کشور کی ملازمہ تھی۔ رانی بے چاری نے ہم دونوں کا بہت ساتھ دیا اور شاید اس جرم کی سزا میں ہی اس سے اس کی زندگی چھین لی گئی۔ میں رانی کی لاش ملنے کی اطلاع سن کر منیب کے مشورے پر پیرآباد سے نکل رہا تھا کہ چودھری کے کارندوں نے مجھے گھیر لیا۔ چودھری نے حالات کا تجزیہ کر کے اندازہ کر لیا تھا کہ کشور کو تمہارے ذریعے ہی گاؤں سے نکالا گیا ہے' بس وہ مجھ سے یہ بات کنفرم کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے اندر بھڑکتی انتقام کی آگ بھی تھی جس کی وجہ سے اس نے مجھ پر بے تحاشا تشدد کروایا۔ اسے مجھ پر اتنا شدید غصہ تھا کہ وہ مجھے جان سے مارنے کے بجائے سسکا سسکا کر زندہ رکھنے پر تلا ہوا تھا۔'' خود پر گزرنے والے تشدد کا سوچ کر آفتاب نے ایک جھرجھری سی لی پھر موضوع کو قدرے بدلتے ہوئے بولا۔

''تم نے بھابی اور کشور کو تو میرے اغوا کے بارے میں نہیں بتایا نا؟ یہ خواتین ذرا کم ہمت ہوا کرتی ہیں اور کوئی بھی ایسی ویسی بات سن کر حوصلہ چھوڑ دیتی ہیں۔''

''آئی ایم سوری یار! اصل میں بات یہ ہے کہ مجھے خود تمہارے اغوا کا علم کشور کی وجہ سے ہو سکا۔ وہ فون پر تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی' جب اس کی تم سے بات نہیں ہو سکی تو اس نے پریشان ہو کر مجھ سے تمہارا پتا کرنے کو کہا۔ اس کے کہنے پر میں نے منیب سے رابطہ کیا تو معلوم ہوا کہ تمہیں اغوا کیا جا چکا ہے۔ میں یہ بات مہتاب کو بتا رہا تھا کہ میری لاعلمی سے کشور نے بھی سب کچھ سن لیا اور یہ سن کر وہ اتنے شدید اسٹریس میں آئی کہ بے ہوش ہو کر گر گئی۔ گرنے سے اس کے سر میں بھی چوٹ لگ گئی۔ میں فوری طور پر اسے اسپتال لے گیا جہاں ڈاکٹر نے اسے ٹریٹمنٹ دینے کے بعد مجھے بتایا کہ سر کی چوٹ معمولی نوعیت کی ہے لیکن ذہنی صدمے کے باعث اسے ہوش نہیں آرہا ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ کشور اسپتال میں ایڈمٹ ہے اور ہنوز بے ہوشی کی حالت میں ہے۔'' وہ خود بہت بڑے صدمے سے گزر رہا تھا لیکن خود پر کڑا ضبط کرتے ہوئے ابھی تک آفتاب پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا اور اسے یہ بتانے کے بجائے کہ تمہارے ساتھ

دوستی نبھانے کی خاطر میں اپنی محبوب بیوی اور معصوم بچوں سے ہاتھ دھو بیٹھا ہوں، کشور کی حالت پر مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی ندامت کا اظہار کر رہا تھا۔

''وہ کون سے اسپتال میں ہے؟ تم مجھے اس کے پاس لے چلو۔'' کشور کی حالت کے بارے میں سن کر وہ لیٹے سے اٹھ بیٹھا۔ اس پل اسے اس طرح اچانک اٹھ بیٹھنے سے جسم میں دوڑ جانے والی درد کی ٹیسوں کا بھی احساس نہیں ہوسکا۔ اگر کچھ دھیان میں تھا تو صرف یہ کہ اس کی کشور اس کی وجہ سے بے ہوشی کی حالت میں کسی اسپتال میں پڑی ہے۔

''تم وہاں کیسے جاؤ گے؟ تم تو خود اتنے شدید زخمی ہو۔ یہاں کے ڈاکٹرز تمہیں بستر سے اٹھنے اور باہر نکلنے کی اجازت نہیں دیں گے۔'' افضل نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے دوبارہ لٹانے کی کوشش کرتے ہوئے سمجھایا۔

''میں یہ سب نہیں جانتا افضل! مجھے ابھی اور اسی وقت کشور کے پاس جانا ہے۔ وہ میری وجہ سے اس حال کو پہنچی ہے اور میں اسے اس حال میں چھوڑ کر یہاں پڑا رہوں، یہ مجھ سے نہیں ہوسکے گا۔'' وہ اس وقت شدید جذباتی ہو رہا تھا۔

''اوکے! تم تھوڑی دیر آرام سے لیٹ کر انتظار کرو۔ میں ڈاکٹرز سے بات کر کے کچھ کرتا ہوں۔'' اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے افضل نے مزید اسے روکنے کی کوشش کرنا بے سود جانا اور تسلی دیتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کو دوبارہ آفتاب کے پاس واپس آنے میں تقریباً پندرہ منٹ لگ گئے اور اس نے یہ پندرہ منٹ کسی مرغ بسمل کی طرح تڑپتے ہوئے گزارے تھے۔ یہ تو شکر ہوا کہ افضل واپس آیا تو اس کے ساتھ وہیل چیئر لیے اسپتال کا ایک ملازم بھی موجود تھا جسے دیکھ کر آفتاب کو تسلی ہوئی ورنہ شاید وہ افضل پر خفا ہونے لگتا۔ افضل اور وارڈ بوائے نے مل کر اسے وہیل چیئر پر بٹھایا۔ افضل خود اس کی وہیل چیئر کو دھکیلتے ہوئے اس مقام تک لے گیا جہاں انہیں لے جانے کے لیے ایمبولینس تیار کھڑی تھی۔ آفتاب کو اس میں منتقل کر دیا گیا۔

''ڈاکٹرز نے بہت مشکل سے تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت دی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ تمہاری ٹانگ میں فریکچر ہے اور پھر بعض گہرے زخموں کو اسٹیچ لگا کر بند کیا گیا ہے۔ خطرہ ہے کہ زیادہ حرکت کرنے سے اسٹیچ کھل سکتے ہیں۔ میں نے مشکل سے سمجھایا کہ ان کے اجازت نہ دینے پر بھی تم رکنے کے لیے راضی نہیں ہو گے میرے اصرار پر انہوں نے جگو نامی آدمی کو فون کر کے اسے صورت حال بتائی اور پھر اس کی طرف سے اجازت ملنے پر مجھے اجازت دی کہ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاسکتا ہوں۔'' ایمبولینس اسپتال سے نکل کر سڑک پر دوڑنے لگی تب افضل نے اسے یہ ساری تفصیل بتائی۔

''جگو وہی شخص ہے جس نے اپنے آدمیوں کے ساتھ مل کر مجھے چودھری کے ڈیرے سے نکالا تھا۔'' اس نے بتایا تو افضل سر کو بھی جنبش دے کر چپ ہوگیا۔ باقی کا راستہ خاموشی کے ساتھ ہی کٹا۔ درمیان میں بس ایک بار افضل نے کوئی فون کال ریسیو کی۔ اس کا موبائل یقیناً وائبریشن پر تھا اس لیے آفتاب کو گھنٹی کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔

''میں آپ کو بتا چکا ہوں انسپکٹر صاحب کہ میں کسی مشکوک فرد کا نام نہیں لے سکتا۔ میں صحافی ہوں اور میرے قلم والفاظ کی وجہ سے میرے اتنے دشمن ہیں کہ میں خود بھی اپنے ان دشمنوں سے واقف نہیں ہوں۔ ایسے میں کسی کا خاص طور پر نام لینا میرے لیے کسی صورت ممکن نہیں۔'' افضل کے الفاظ اس کے کانوں میں پڑے تو وہ ذرا چونکا۔

''خیریت! کیا معاملہ ہے؟''

''کچھ نہیں یار! تمہیں تو معلوم ہے کہ ہم لوگوں کے ساتھ کچھ نہ کچھ چلتا ہی رہتا ہے۔'' افضل نے اسے ٹال دیا۔ کچھ وہ بھی ذہنی طور پر مکمل حاضر نہیں تھا اس لیے زیادہ دھیان نہیں دیا۔ جلد ہی ایمبولینس نے انہیں ایک نجی اسپتال تک پہنچا دیا۔ افضل اسے وہیل چیئر پر بٹھا کر ایک کمرے تک لے گیا۔ آفتاب کو کشور سے ملانے لانے سے پہلے وہ اسپتال کی انتظامیہ سے فون پر بات کر چکا تھا اس لیے کسی نے اسے روکا نہیں۔ کمرے کا بند دروازہ کھول کر وہ آفتاب کی وہیل چیئر کو دھکیلتا ہوا اندر لے گیا تو آفتاب کا دل گویا کسی نے مٹھی میں لے کر بھینچ لیا۔ ہاتھ میں لگی ڈرپ اور مختلف نلکیوں کی محتاج بنی بستر پر بند آنکھوں کے ساتھ لیٹی زرد رو لڑکی وہ تھی جس کی تند و تیز محبت نے اس کی ایک مخصوص دائرے میں گھومتی زندگی میں کچھ نئے رنگ بھر کر ہلچل سی مچا دی تھی اور اب وہ لڑکی یوں بے حس و حرکت اسپتال کے ایک بستر پر لیٹی تھی... تو اس کا دل بری طرح بھر آیا۔ اپنی کسی بھی تکلیف کی پروا نہ کرتے ہوئے اس نے اس بار افضل کی مدد لینے کے بجائے خود وہیل چیئر کو حرکت دی اور کشور کے نزدیک جا پہنچا اور بہت دھیمی آواز میں بالکل سرگوشی کے سے انداز میں اس کے کان کے قریب اپنے ہونٹ لے جاکر اسے پکارا۔

''کشور...'' یہ ایک سرگوشی نہیں تھی۔ صدا تھی جو کشور کے کانوں سے گزر کر اس کے جسم و جان میں گونج اٹھی۔

''آنکھیں کھولو میری جان! دیکھو میں تمہارا آفتاب تم

سے ملنے آیا ہے۔ کیا ایک نظر مجھے دیکھو گی نہیں؟'' اس نے کشور کا ہاتھ تھام کر اسے چومتے ہوئے سرگوشی میں ہی استدعا کی۔ اس کے ساتھ کمرے میں موجود افضل چپکے سے پلٹ کر باہر نکل گیا۔ وہ محبت کو سمجھنے والا آدمی تھا۔ اسے معلوم تھا کہ دل کی گہرائیوں سے کسی سے سچی محبت کرنے والا شخص صرف محبت نہیں کرتا بلکہ عبادت کرتا ہے کیونکہ محبت اسے سکھا دیتی ہے کہ جس خالق نے محبت تخلیق کی ہے وہ خود کس قدر چاہے جانے کے قابل ہے۔ محبت کرنے والا صرف اپنے محبوب سے محبت نہیں کرتا بلکہ اسے محبوب سے بڑھ کر محبوب جانتا ہے جس نے اس کے محبوب کو تخلیق کیا ہے۔ محبت اللہ پر انسان کے یقین کو پختہ کرتی ہے۔ اس وقت آفتاب جو اتنی بے قراری سے کشور کو پکار رہا تھا تو اسی یقین کے سہارے پکار رہا تھا کہ جس رب نے اس کے دل میں محبت کا بیج بویا ہے، وہ اس کی صدا میں اتنی طاقت بھی پیدا کرے گا جو کشور کو اس کی بے ہوشی سے باہر نکال سکے۔ کوئی اس رمز کو سمجھے نہ سمجھے لیکن درحقیقت جو پکار آفتاب کر رہا تھا وہ عبادت تھی۔

''تم ڈرتی تھیں نا کہ کہیں میں تم سے جدا نہ ہو جاؤں۔ اٹھو اور دیکھو کہ تمہاری محبت مجھے زندہ تمہارے پاس لے آئی ہے۔'' بہت دھیمی آواز میں یہ کہہ کر اس نے کشور کے نیم وا لبوں پر ایک نرم سا بوسہ دیا۔ اس بوسے کی حرارت نے گویا اس کے وجود میں برق سی دوڑا دی اور بے سدھ پڑے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اسے لگنے والے اس جھٹکے نے آفتاب کو دیوانہ سا کر دیا اور اس عالم دیوانگی میں وہ کشور کے ایک ایک نقش کو چومتا چلا گیا۔ اس کی پیشانی، آنکھیں، رخسار، لب، گردن ہر ہر جگہ پر آفتاب کے بوسے ثبت ہوتے چلے گئے۔

''میں موت کے منہ سے لوٹ کر آیا ہوں۔ مجھے یہ زندگی تمہارے لیے دی گئی ہے۔ تم مجھ سے منہ موڑ کر اس طرح چپ چاپ لیٹی نہیں رہ سکتیں۔ تمہیں آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھنا ہوگا اور مجھے یہ یقین دلانا ہوگا کہ زندگی کے اس سفر میں تم ہر قدم پر میرے ساتھ ہو۔'' وہ اسے بے تحاشا پیار کرنے کے ساتھ ساتھ مسلسل اس سے سرگوشیوں میں مخاطب بھی تھا۔ بالآخر کشور نے اس کی صدا پر لبیک کہا اور آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا لیکن ایسا وہ صرف پل بھر کے لیے ہی کر سکی تھی۔ ابھی آفتاب اس کی کھلی آنکھوں کو دیکھ کر پوری طرح خوش بھی نہیں ہوسکا تھا کہ ایک بار پھر اس کی آنکھیں بند ہوگئیں اور جسم کو مسلسل جھٹکے لگنے لگے۔ اس کی اس کیفیت پر وہ پریشان ہوگیا اور وہیل چیئر کو تیزی سے حرکت دیتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے ڈاکٹرز کو پکارنا شروع کر دیا۔ فوراً ہی دو تین افراد کشور کے کمرے کی طرف بھاگے۔ ان میں سے کسی نے اس کی وہیل چیئر کو دھکیل کر مکمل طور پر دروازے سے باہر کر دیا اور پھر دروازہ بند ہوگیا۔ افضل جو باہر ہی موجود تھا تیزی سے اس کے قریب آیا۔

''اس کے لیے دعا کرو یار! اسے کچھ ہوا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا۔ اس نے میری خاطر روایتوں سے ٹکر لی ہے۔ وہ آنکھوں میں بہت سے خواب سجا کر میری طرف آئی تھی۔ اس کے سارے خواب مجھ پر قرض ہیں اگر اسے کچھ ہوگیا تو میں یہ قرض کیسے ادا کروں گا؟'' وہ دلاسے کے لیے شانے پر رکھا افضل کا ہاتھ تھام کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''حوصلہ کرو آفتاب! اللہ نے چاہا تو کشور کو کچھ نہیں ہوگا۔ تم دونوں ایک دوسرے کے لیے بنے ہو۔ اللہ تمہیں بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں کرے گا۔'' افضل نے نم آنکھوں کے ساتھ خلوص دل سے یہ سب کہتے ہوئے گویا اس کے لیے دعا بھی کی۔ ابھی تو اس کا اپنا زخم بالکل تازہ تھا۔ چنانچہ اس کی دعا میں وہ تڑپ بھی شامل تھی جو عرش الٰہی کو ہلا دینے کی طاقت رکھتی ہے۔ اس کی تسلی اور دلاسوں نے آفتاب کو بھی سنبھلنے میں مدد دی اور وہ خود پر قابو پا کر جھکے سر کے ساتھ دل ہی دل میں پروردگار سے کشور کی زندگی کے لیے بھیک مانگنے لگا۔ یہی کام اس کے ساتھ افضل بھی کر رہا تھا۔ اس نے خود جدائی کا زخم سہا تھا چنانچہ تہ دل سے خواہش مند تھا کہ اس کے دوست کو یہ زخم نہ سہنا پڑے۔ اللہ اللہ کر کے انتظار کی جاں گسل گھڑیاں گزریں اور تقریباً پون گھنٹے بعد ایک ڈاکٹر نے ان کے قریب آکر خوش خبری سنائی۔

''مبارک ہو۔ آپ کی مریضہ بالکل ٹھیک ہیں۔ بس طویل بے ہوشی کے بعد ہوش میں آنے کی وجہ سے ان کی حالت بگڑ گئی تھی لیکن اب سب کچھ انڈر کنٹرول ہے۔ میں نے اور میرے ساتھی ڈاکٹرز نے مل کر ان کا اچھی طرح چیک اپ کیا ہے۔ ہمارا اندازہ ہے کہ ان کے سارے آرگنز بالکل صحیح فنکشن کر رہے ہیں۔ فوری طور پر ممکن ٹیسٹ ہم نے کر لیے ہیں لیکن کچھ ٹیسٹ مزید ہونا باقی ہیں جن کے لیے کچھ وقت درکار ہے اس لیے آپ کو کچھ دن اور مریضہ کو یہاں ایڈمٹ رکھنا ہوگا۔'' ڈاکٹر نے انہیں خوش خبری سنانے کے ساتھ ساتھ ساری صورت حال بھی واضح کی۔

''کیا ہم اپنے مریض کو دیکھ سکتے ہیں ڈاکٹر؟'' آفتاب تو کچھ بولنے کے لائق ہی نہیں رہا تھا، افضل نے ہی اس کے

جذبات کو زبان دیتے ہوئے ڈاکٹر سے دریافت کیا۔

''فی الحال ہم نے انہیں سکون آور ادویات دی ہوئی ہیں تاکہ وہ کسی اچانک لگنے والے جذباتی جھٹکے سے متاثر نہ ہوں۔ اس طرح طویل بے ہوشی سے ہوش میں آنے والے مریض بہت نازک ہوتے ہیں اور انہیں بہت احتیاط سے ہینڈل کرنا ہوتا ہے۔ میں یہ سب آپ لوگوں کو اس لیے سمجھا رہا ہوں کہ آپ سے جذبات میں کوئی غلطی سرزد نہ ہو اور آپ اپنے جذبات کو کنٹرول میں رکھیں۔''

''آپ بے فکر رہیں ڈاکٹر صاحب! ہم پوری احتیاط کریں گے۔'' ڈاکٹر کی ہدایات کے جواب میں افضل نے ہی اسے یقین دہانی کرائی۔

''او کے، آپ کے اصرار پر میں آپ کو صرف اتنی اجازت دے سکتا ہوں کہ آپ ایک نظر مریضہ کو دیکھ لیں لیکن پلیز خیال رکھیے گا کہ ان کو پکارنے یا ان سے بات چیت کرنے کی غلطی نہ ہو۔ ویسے تو وہ خواب آور ادویات کے زیر اثر ہیں لیکن پھر بھی آپ کو پوری احتیاط کرنی ہوگی کہ انہیں معمولی سا بھی ڈسٹرب نہ کریں۔'' ڈاکٹر سختی سے ہدایات جاری کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا تو ان دونوں نے کشور کے کمرے کا رخ کیا۔ کمرے میں ایک نرس اس کی دیکھ بھال کے لیے موجود تھی۔ ان دونوں کو دیکھ کر وہ زبان سے کچھ نہیں بولی بس ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ پہلے ہی ڈاکٹر کی ہدایات سن کر آئے تھے چنانچہ خود سے بھی احتیاط برت رہے تھے۔ بستر پر دراز کشور کا چہرہ پہلے سے بھی زیادہ زرد لگ رہا تھا لیکن اس زردی کے باوجود اس کے تاثرات میں واضح تبدیلی محسوس کی جاسکتی تھی۔ پہلے اس کے ہر نقش سے بے چینی اور اضطراب ظاہر ہو رہا تھا جبکہ اس وقت اس کے چہرے پر واضح اطمینان چھایا ہوا تھا۔ اس اطمینان نے آفتاب کے دل کو بھی پُرسکون کر دیا اور وہ نرس کی طرف سے اشارہ ملنے سے پہلے ہی اپنی وہیل چیئر سمیت کمرے سے باہر نکل گیا۔ وقت کے قلیل عرصے میں وہ جس بہت بڑے جذباتی طوفان سے گزرا تھا، وہ طوفان اس ایک نظر کی دید نے ہی قابو کر کے اسے پُرسکون کر دیا تھا۔

☆☆☆

''سب کچھ برباد ہو گیا۔ کچھ بھی باقی نہیں بچا۔ اتنے برسوں کی محنت اور انویسٹمنٹ منٹوں میں تباہ ہو کر رہ گئی۔'' مٹھیاں بھینچ کر کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلتا ہوا ڈیوڈ مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔

''کچھ معلوم نہیں ہوا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ ہمارے آدمیوں سے کوئی تو ایسی غلطی ہوئی ہوگی جس کی وجہ سے ہمیں اتنا بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔'' لہٰذا اسی کمرے میں ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس نے حسب معمول مختصر لباس زیب تن کر رکھا تھا لیکن اس وقت وہ اپنے حسن کی بجلیاں گرانے کے بجائے اس مسئلے میں زیادہ الجھی ہوئی تھی جس نے ڈیوڈ کا چین چھین لیا تھا۔ ان تک پاکستان کے پہاڑی سلسلے میں واقع اپنے خفیہ ٹھکانے کی تباہی کی خبر پہنچ گئی تھی۔ یہ خبر ایسی تھی جس نے انہیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ برسوں سے اس پروجیکٹ پر کام کر رہے تھے۔ اپنے لوگوں کو تربیت دے کر انہیں پاکستان کے دینی مدرسوں اور حلقوں میں اس طرح داخل کرنا کہ کوئی ان کی شخصیت پر بہروپ کا شک نہ کر سکے، کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ایسے افراد کو بہت ہوشیاری اور چابک دستی سے کام لینا پڑتا تھا۔ وہ بہت چالاکی اور مکاری سے لوگوں کے ذہنوں میں زہر انڈیلتے رہتے تھے پھر ان افراد میں سے ان لوگوں کو چھانٹ کر الگ کر لیا جاتا تھا جن کی روح تک اس زہر کے اثر سے میلوث ہو جاتی تھی۔ عموماً یہ وہ لوگ ہوتے تھے جو کسی نہ کسی معاشرتی ناانصافی کا شکار ہوں۔ ایسے افراد کے اندر معاشرے کی... کی ناانصافی کا بدلہ لینے کی خواہش درونِ دل زور مار رہی ہوتی ہے چنانچہ اس خواہش کو مہمیز کر کے انہیں اپنے راستے پر چلانا آسان ہوتا ہے۔ ان کے اس پروجیکٹ میں بھارت بھی ان کے ساتھ تعاون کر رہا تھا۔ موساد کی نسبت بھارتی ایجنٹ یہ کام زیادہ آسانی سے کر لیتے تھے کیونکہ جغرافیائی اور ثقافتی مشابہت کے باعث ان کے لیے پاکستان کے ماحول میں سروائیو کرنا زیادہ آسان تھا۔ وہ نہ تو شکلوں سے الگ دکھائی دیتے تھے، نہ ان کے لیے اپنے لب و لہجے کو مخصوص ماحول میں ڈھال لینا زیادہ مشکل تھا۔ وہ پاکستانیوں کی نفسیات بھی بہتر طور پر سمجھتے تھے۔ ان ہی پوائنٹس کو ذہن میں رکھتے ہوئے موساد کے اکابرین نے راکو اپنے اس مشن میں شامل کرنا پسند کیا تھا۔ بھارت نے بھی اپنی ازلی پاکستان دشمنی کی وجہ سے بخوشی ان کے ساتھ شمولیت اختیار کر لی تھی حالانکہ موساد اس کے ایجنٹس کو صرف مہروں کی طرح استعمال کر رہی تھی اور انہیں سوائے اس کے کہ وہ پاکستانیوں میں ہی سے پاکستان کو کھوکھلا کرنے والے دہشت گرد تیار کرنے پر مامور ہیں، کچھ خبر نہیں تھی۔ بھارتی اکابرین اچھی طرح سمجھتے تھے کہ موساد مسلم دشمنی میں ان سے بھی دو ہاتھ آگے ہے چنانچہ انہوں نے بھی سب کچھ جان لینے کے لیے زیادہ تردد بھی نہیں کیا تھا۔ کسی بھی طرح سہی پاکستان کو نقصان تو پہنچ رہا تھا، ان کے لیے یہ اطمینان کافی تھا۔ انہیں

پاکستان میں موجود موساد کے خفیہ ٹھکانوں کے بارے میں بھی مکمل معلومات حاصل نہیں تھیں۔ ان کے ایجنٹس کو چند مخصوص ٹھکانوں اور افراد تک محدود رکھا گیا تھا۔

موساد ایک ایسی قوم کی خفیہ تنظیم تھی جو برسوں کی نہیں صدیوں کی منصوبہ بندی کرتے ہیں اور ایسی منصوبہ بندی کی کامیابی کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ کم سے کم افراد کو راز دار بنایا جائے۔ اس پروجیکٹ کے لیے بھی جس میں بھارت نے بھی اچھی خاصی سرمایہ کاری کی تھی، انہوں نے خاصی راز داری برتی تھی اسی لیے اب حیران بھی تھے کہ ایک ایسا ٹھکانا جس کا علم ان کے معاونین کو بھی نہیں تھا آخر کیسے اور کیونکر تباہ ہوا؟ ان کے جو چند ایک ایجنٹس اسکردو میں موجود تھے، وہ بھی بہت زیادہ معلومات فراہم نہیں کر سکے تھے۔ بس انہیں یہی معلوم ہو سکا تھا کہ جہاں انہوں نے اپنی پہاڑی پناہ گاہ بنا رکھی تھی وہاں بہت شدید دھماکے سنے گئے تھے۔ ان دھماکوں نے پاکستان آرمی کو متوجہ کیا اور جب وہ لوگ وہاں پہنچے تو سب کچھ تباہ ہو چکا تھا۔ صرف چند زخمی افراد کو ہی وہاں سے لایا جا سکا تھا جن میں سے کسی کی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ ان افراد کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، اس کے مطابق وہ سب ان کے لیے بے کار تھے کیونکہ ان میں سے کوئی بھی فرد ان کا کارکن نہیں تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں مختلف علاقوں سے گھیر کر لانے کے بعد اس خفیہ پناہ گاہ میں تربیت دی جا رہی تھی۔ یہ افراد اگر زندہ بھی بچ جاتے اور کوئی بیان دینے کے لائق بھی ہو جاتے تو اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتے تھے کہ وہ جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر آتشیں ہتھیاروں کا استعمال اور خودکش حملوں کی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ ان کا بیان سننے والے یہی گمان کرتے کہ وہ کسی مذہبی انتہا پسند تنظیم کے لیے کام کر رہے تھے۔ موساد یا را کا نام کسی صورت سامنے نہیں آ سکتا تھا لیکن ڈیوڈ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ اتنا بڑا حادثہ کیسے اور کیونکر پیش آیا۔ وہ اپنی غلطیوں سے سبق سیکھنے والے لوگ تھے چنانچہ یہ جاننا ضروری تھا کہ غلطی کہاں اور کیا ہوئی ہے؟ ویسے بھی وہ اپنی تنظیم کی طرف سے اس پروجیکٹ کا انچارج تھا، اس پر تفصیلات جاننے کی ذمے داری یوں بھی عائد ہوتی تھی۔ لنڈا نے جو اس کی گرل فرینڈ ہونے کے ساتھ ساتھ دستِ راست بھی تھی، سوال اٹھایا تو وہ ٹہلنا چھوڑ کر اس کے قریب ہی رکھی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا اور میز پر پڑی شیمپین کی بوتل منہ سے لگا کر غٹاغٹ کئی گھونٹ چڑھا گیا۔ اس بوتل کے ساتھ وہاں گلاس بھی موجود تھے لیکن وہ جس ذہنی انتشار کا شکار تھا اس میں کسی قسم کے تکلفات نہیں برت سکتا تھا۔ شراب حلق سے نیچے اتری تو وہ قدرے پُرسکون ہوا اور لنڈا کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولا۔

"غلطی تو یقیناً ہمارے لوگوں سے ہی ہوئی ہے۔ اب تک مجھے جو معلومات فراہم کی گئی ہیں ان کی روشنی میں مشابرم خان نامی ایک کردار سامنے آیا ہے۔ یہ شخص اسی شہریار عادل کا ڈرائیور ہے جس کا آبائی گھر بلتستان میں ہی ہے۔ شہریار نے چودھری افتخار سے ماہ بانو کو محفوظ رکھنے کے لیے اسی شخص کے گھر میں چھپایا ہوا تھا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ ماہ بانو مجھے مل گئی اور میں نے چودھری کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کے لیے اسے کڈنیپ کروا لیا۔ شہریار کو جب ماہ بانو کے کڈنیپ ہونے کی اطلاع ملی تو اس نے مشابرم خان کو اس کی تلاش پر مامور کر دیا۔ مشابرم خان کا اپنا بھائی اس واقعے میں مارا گیا تھا چنانچہ ذاتی انتقام کی وجہ سے بھی وہ اس کام کو تندہی سے کرنے لگا۔ اس کی سرگرمیوں کا ہمارے لوگوں کو علم تھا لیکن وہ صرف اس وجہ سے کہ مشابرم خان اصل معاملے تک نہیں پہنچ سکا اس سے چھیڑ چھاڑ کرنے سے گریز کرتے رہے اور شاید یہی ان کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ ان کی نظر انداز کر دینے والی پالیسی کا فائدہ اٹھا کر مشابرم خان اچانک ہی کہیں غائب ہو گیا اور جانتی ہو کہ کیا ہوا؟ وہی مشابرم خان آرمی والوں کو ہمارے پہاڑی ٹھکانے کے پاس زخمی حالت میں ملا ہے جسے انہوں نے تحقیق کے لیے اپنی کسٹڈی میں لے لیا ہے اور اتنا خفیہ رکھا ہے کہ ابھی تک ہمارا کوئی آدمی اس تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ نہ ہی یہ علم ہو سکا ہے کہ اس نے کیا بیان دیا ہے؟"

"یہ تو واقعی بہت گمبھیر صورتِ حال ہے۔ اس معاملے کی پوری انکوائری ہونی چاہیے۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ پہاڑی ٹھکانے پر موجود ہمارے افراد نے بھی کچھ ایسی غلطیاں کی ہیں جو ہمارے علم میں نہیں آ سکیں ورنہ یہ تو کسی صورت ممکن نہیں کہ ایک اکیلا شخص اس ٹھکانے تک پہنچ کر اتنی آسانی سے اسے تباہ کر دے۔ مجھے یا کسی کو خود وہاں جا کر ساری صورتِ حال کی چھان بین کرنی چاہیے۔" اس کی بات سن کر لنڈا نے مختصراً اپنا تجزیہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ تجویز بھی پیش کی۔ اس وقت اس کے چہرے پر اتنی گہری سنجیدگی تھی کہ اگر چودھری افتخار اسے دیکھ لیتا تو ہرگز یقین نہیں کرتا کہ یہ وہی لنڈا ہے جس کی آنکھوں کے اشارے اور ہونٹوں پر بجلی کی طرح کوندتی مسکراہٹیں اسے بلاوا دیتی تھیں۔

"میرے خیال میں تم چلی جاؤ۔ ساتھ ساتھ چودھری کو بھی نمٹا دینا۔ اب صورتِ حال ایسی ہو گئی ہے کہ میں حسب وعدہ ماہ بانو کو اس کے حوالے نہیں کر سکتا۔ وہ اسی پہاڑی ٹھکانے پر موجود تھی اور یقیناً دیگر افراد کے ساتھ ساتھ اس کے جسم کے بھی چیتھڑے اڑ گئے ہوں گے۔ چودھری کو ماہ بانو کے بغیر بہلانے اور کام کی طرف متوجہ کرنے کے لیے تمہارا وہاں جانا مفید ثابت ہوگا۔ ویسے بھی اپنی بیٹی والے معاملے میں الجھ کر وہ میری مرضی کی کارکردگی نہیں دکھا پا رہا ہے۔ ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں اپنے آدمیوں کے ذریعے اس کا مسئلہ حل کر دوں لیکن میں اپنے بندوں کو ان غیر ضروری معاملات میں زیادہ استعمال نہیں کرنا چاہ رہا۔ ویسے بھی میں کوئی چودھری کا نوکر نہیں ہوں کہ اس کے تمام مسئلے حل کر کے دوں۔ ہم اس سے جو کام لے رہے ہیں، اس کے بدلے میں معاوضہ بھی دے رہے ہیں اس لیے تم وہاں جاؤ تو اسے اچھی طرح یہ بات سمجھا دینا کہ کام کو کام سمجھ کر کرے۔" عام حالات میں شاید وہ چودھری کو رعایت دے بھی دیتا لیکن اس وقت بُری طرح اپ سیٹ تھا چنانچہ سخت بے مروتی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"او کے ڈارلنگ! تم ٹینشن مت لو۔ میں ہوں نا۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گی۔" لنڈا نے اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے اسے تسلی دی اور اسے اپنی بانہوں میں لے کر اس کے رخسار پر ایک بوسا دینے کے بعد وہاں سے رخصت ہو گئی۔ ڈیوڈ نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ جانتا تھا کہ لنڈا جتنی حسین ہے اس سے بڑھ کر خطرناک بھی ہے اور جب کوئی کام اپنے ذمے لے لیتی ہے تو پھر اس کی تکمیل کے لیے اپنی جان لڑا دیتی ہے۔ اب وہ اپنا مشن مکمل ہونے تک سکون سے بیٹھنے والی نہیں تھی چنانچہ اب وہ اسے اس کی کامیابی تک اپنی محبوبہ کے روپ میں نہیں دیکھ سکے گا۔ اب وہ صرف اور صرف موساد کی ٹاپ ایجنٹ کے روپ میں نظر آئے گی جسے عظیم اسرائیل کے مفادات سے زیادہ کسی شے کی پروا نہیں ہو سکتی تھی۔

☆☆☆

"آپ کی بیان کردہ تفصیلات ان تمام باتوں کی تصدیق کر رہی ہیں جو ہمیں مشابرم خان اور ماہ بانو نے بتائی ہیں لیکن اس سے آگے کے معاملات اتنی بُری طرح الجھے ہوئے ہیں کہ مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ ان دونوں خصوصاً مشابرم خان کے ساتھ کس طرح پیش آیا جائے۔ وہ ایک ایسے معاملے میں انوالو ہو گیا ہے جس کا تعلق ملکی سالمیت سے ہے۔" اسکردو پہنچنے کے بعد شہریار کی میجر ذیشان سے ملاقات ہوئی تو اس نے میجر کی فرمائش پر... بلا کم و کاست ماہ بانو کا سارا قصہ سنانے کے ساتھ ساتھ مشابرم خان کے بلتستان آنے کی وجوہات بھی بیان کر دیں۔ اس کا بیان سننے کے بعد ہی میجر ذیشان نے یہ تبصرہ کیا تھا۔ ویسے شہریار جانتا تھا کہ ان سب باتوں کی پہلے بھی کسی اور ذریعے سے تصدیق کروائی گئی ہوگی اور اسے یہاں بلانے کا مقصد محض شخصی ضمانت حاصل کرنا ہے چنانچہ اس نے اپنے بیان میں کہیں کسی غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا۔

"کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گے کہ وہ کون سے معاملات ہیں جن میں مشابرم خان اس طرح انوالو ہو گیا ہے کہ اس کی ذات آرمی انٹیلی جنس کے لیے مشکوک قرار پائی ہے؟" اس نے میجر ذیشان سے سوال کیا۔

"یہ تو بہت کانفیڈنشل معاملہ لیکن کیونکہ آپ شروع سے کسی نہ کسی حد تک اس معاملے سے جڑے رہے ہیں اس لیے میں آپ کو مختصراً بریف کر سکتا ہوں۔" وہ پہاڑوں میں ہونے والے دھماکوں سے لے کر فوج کے وہاں پہنچنے، مشابرم خان کے ملنے اور پھر اس کے بیان تک مختصر الفاظ میں شہریار کو سب کچھ بتاتا چلا گیا۔

"مجھے یقین ہے کہ اس میں ایک لفظ بھی غلط نہیں ہو گا۔ مشابرم خان بہت سچا اور کھرا آدمی ہے اور اس کے بیان کی تصدیق کے لیے ماہ بانو کا وہ بیان ہی کافی ہے جو اس نے از خود آپ سے مل کر آپ کو دیا ہے۔ آپ دونوں کے بیانات کو آپس میں ملا کر دیکھیں تو اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ اوپر پہاڑوں میں کسی دہشت گرد تنظیم کے ارکان نے اپنا خفیہ ٹھکانا بنا رکھا تھا جہاں وہ لڑکوں کو دہشت گردی کی تربیت دیتے تھے۔ ماہ بانو کے بیان میں عمران نامی جو کردار سامنے آیا ہے اس کے حالات سن کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ کس قسم کے افراد کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ ایک شخص جو پہلے ہی پریشان حال ہو اور ظلم و ناانصافی کا شکار ہونے کے بعد اپنے لیے کوئی انصاف فراہم کرنے والا نہ پائے اس کو گھیر کر اس کی برین واشنگ کر ڈالنا اور اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ ہمارا پڑوسی ملک مسلسل ایسی کوششیں کرتا رہتا ہے اور مجھے افسوس سے یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ وہ اپنی اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب بھی ہے۔" شہریار نے مشابرم خان کی حمایت میں اپنا مؤقف بیان کیا جسے سن کر میجر ذیشان چونک گیا۔

"آپ کیسے اتنے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اس معاملے میں پڑوسی ملک انوالو ہے؟"

"حالات کا تجزیہ کرنے پر میں یہی نتیجہ اخذ کر سکا ہوں۔ ماہ بانو کے بیان کی روشنی میں یہ بات سامنے آئی ہے

کہ جن افراد کو دہشت گردی کی تربیت دی جا رہی تھی، انہیں مذہب کے نام پر یہ سب کچھ کرنے پر اکسایا گیا تھا۔ ایسا ہی ایک کیس میں اپنے ضلع میں دیکھ چکا ہوں۔ اللہ آباد نام کے ایک گاؤں میں ایک بھارتی ایجنٹ نے شاہنواز کا روپ دھار کر وہاں ایک مدرسہ قائم کر رکھا تھا۔ بظاہر شاہنواز ایک نیک اور گاؤں والوں کا ہمدرد آدمی تھا لیکن اندر ہی اندر وہ گاؤں کے بچوں کے معصوم ذہنوں کو بھٹکانے کا کام کر رہا تھا۔ اس کی برین واشنگ کے نتیجے میں عبدالمتین نام کا ایک نوجوان جذبات میں آ کر خودکش حملہ آور بن گیا۔ عبدالمتین کی موت کے بعد میں تحقیقات کرتا ہوا شاہنواز کے مدرسے تک پہنچا تو وہ گاؤں کے دو نوجوانوں کو لے کر پہلے ہی فرار ہو چکا تھا لیکن مدرسے کی عمارت کی تلاشی لینے کے بعد یہ بات سامنے آگئی کہ شاہنواز اصل میں کوئی بھارتی ایجنٹ تھا جو سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنے مشن پر کام کر رہا تھا۔“ میجر کے سوال پر اس نے مختصراً اپنے یقین کی وجہ بیان کی۔

”آپ کا اندازہ کافی حد تک ٹھیک لگتا ہے مسٹر شہریار! تباہ شدہ پہاڑی ٹھکانے سے ہمیں جو اسلحہ اور ٹیکنیکل آلات کی باقیات ملی ہیں، ان میں سے بیشتر بھارتی ساختہ ہیں۔ اب یہ نہیں معلوم کہ وہ لوگ براہ راست خود اس تنظیم کو چلا رہے تھے یا کوئی نام نہاد جہادی تنظیم ان اشیا کی بھارت سے غیر قانونی طور پر خریداری کر رہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ اتنے خفیہ طریقے سے کیا گیا کہ ہماری انٹیلی جنس ایجنسیوں کو بھنک تک نہیں ملی۔ اب جو افراد زندہ ہمارے ہاتھ آئے ہیں ان میں سے بھی ایک آدھ ہی اس لائق ہے کہ کوئی بیان دے سکے اور ان کے دیے گئے بیانات سے اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہو سکا جو ہمیں مشاہرم خان اور ماہ بانو بتا چکے ہیں۔ ان حالات میں آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان دونوں کی ہمارے لیے کس قدر اہمیت ہوگی اور فی الحال ہم انہیں اپنی کسٹڈی میں ہی رکھنا پسند کریں گے۔“

”یہ ان دونوں کے ساتھ سخت زیادتی ہوگی میجر! ان دونوں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے بلکہ وہ تو خود حالات کا شکار ہوئے ہیں۔“ میجر کی بات سن کر شہریار نے احتجاج کیا۔

”مجبوری ہے مسٹر شہریار! ویسے بھی کم از کم مشاہرم خان کو تو مکمل طور پر معصوم نہیں مانا جا سکتا۔ اس نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی غلطی کی ہے۔ اسے چاہیے تھا کہ پہلے ہی مرحلے پر جب اس کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ نیاز علی ڈرائیور کسی مشکوک سرگرمی میں ملوث ہے، وہ پولیس کو رپورٹ کرتا لیکن اس نے ایسا کرنے کے بجائے خود نیاز علی سے پوچھ گچھ کی کوشش کی اور اس کوشش میں نیاز علی اپنی جان سے چلا گیا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے صغیر ٹورسٹ ایجنسی کے مالک صغیر بیگ کو اغوا کر کے حبسِ بے جا میں رکھا اور پھر خود ہی تنہا ایک مہم سر کرنے نکل کھڑا ہوا۔ اگر وہ یہ سب کرنے کے بجائے قانون نافذ کرنے والے اداروں کو اپنے اعتماد میں لیتا تو صورت حال مختلف بھی ہو سکتی تھی۔ ہم لوگ طریقے اور پلاننگ سے مجرموں کو گھیرتے تو بہت سی اہم معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ اب تو سب کچھ تباہ ہو کر رہ گیا ہے اور ہم بالکل اندھیرے میں کھڑے ہیں، اس لائق بھی نہیں کہ کسی پر کوئی الزام دھر سکیں۔ آپ کو معلوم ہے نا کہ ہم نے پہاڑوں پر ہونے والے دھماکوں کے لیے کیا موقف اختیار کیا ہے؟“ میجر ذیشان کے چہرے پر غصے کی ہلکی سی سرخی چھا گئی تھی جو اس بات کی علامت تھی کہ وہ ایک محبِ وطن آدمی ہے جسے میڈیا کے سامنے یہ بیان دیتے ہوئے کہ دھماکے دراصل پاک آرمی کے ایک ٹھکانے پر ہوئے تھے جہاں وہ اپنے معمول کی مشقیں کر رہے تھے... یقیناً شدید کوفت ہوئی تھی۔ دشمن سے اتنی بڑی زک اٹھانے کے بعد وہ اس لائق بھی نہیں تھے کہ اس کی طرف انگلی اٹھا سکیں جبکہ ان کے مقابلے میں بھارت والے اپنے ہاں ہونے والے ہر حادثے کے لیے بلاتکلف پاکستان پر الزام دھر دیتے تھے اور اپنے اس الزام کو ثابت کرنے کے لیے خود ہی سچے جھوٹے ثبوت بھی بنا ڈالتے تھے۔

”جو کچھ ہوا وہ، وہ یقیناً افسوسناک ہے اور میں تسلیم کرتا ہوں کہ مشاہرم خان سے کچھ کوتاہیاں ہوئی ہیں لیکن بہرحال وہ اتنا بڑا مجرم نہیں جس کے لیے کوئی سزا تجویز کی جا سکے۔ اگر آپ اسے مجرم قرار دیں گے تو پھر سب سے پہلے آپ کو خود اپنا جرم تسلیم کرنا پڑے گا۔ سب سے بڑی کوتاہی اور غفلت تو آپ کے ادارے سے ہوئی ہے۔ آپ کی ناک کے نیچے اتنا زبردست سیٹ اپ تیار کر لیا گیا اور آپ بے خبر رہے تو یقیناً یہ ایک مجرمانہ غفلت کا نتیجہ ہے۔ پھر بھی اگر آپ مشاہرم خان کو مجرم سمجھتے ہوئے اسے اپنی کسٹڈی میں رکھنے پر بضد ہیں تو میں کسی حد تک آپ کا موقف تسلیم کر لیتا ہوں لیکن ماہ بانو کو آپ کس بنیاد پر روک سکتے ہیں؟ وہ تو خود حالات کا شکار رہی ہے اور جیسے ہی اسے موقع ملا، اس نے سب سے پہلے آپ لوگوں سے رابطہ کر کے اپنے قانون پسند ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔ کیا آپ اس لڑکی کو اس کی اس قانون پسندی کی سزا دیں گے؟“ وہ بھی بولنے پر آیا تو اپنے مزاج کے مطابق صاف صاف سب کچھ کہتا چلا گیا۔

”سوری مسٹر شہریار! میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ مجھے صرف آپ سے مل کر واقعات کی تصدیق کرنے کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔ آگے کیا ہونا ہے اور کیا نہیں... اس کا فیصلہ کرنل توحید کریں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ اتنا مضبوط بیک گراؤنڈ رکھتے ہیں کہ آپ کے لیے کرنل توحید کو اپروچ کرنا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوگا۔ آپ چاہیں تو ان سے ملاقات کر کے یہ سب ڈسکس کر سکتے ہیں۔“ میجر ذیشان نے سپاٹ لہجے میں اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ گویا ملاقات ختم ہو گئی تھی اور شہریار اتنا لمبا سفر طے کر کے یہاں تک پہنچنے کے بعد بھی ماہ بانو کی ایک جھلک دیکھنے سے محروم رہا...

☆☆☆

”ہیلو آفتاب! مبارک ہو یار، میں نے ابھی ابھی ڈاکٹر آفندی کو فون کیا تھا۔ ان سے معلوم ہوا کہ کشور کی حالت اب بالکل ٹھیک ہے اور وہ ایک نارمل پرسن کی طرح بی ہیو کر رہی ہے... یہ تو سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ اب تم بھی جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ تاکہ دونوں میاں بیوی اسپتال کا پیچھا چھوڑ کر کہیں کسی ڈھنگ کی جگہ رہ سکو بلکہ میرے خیال میں تو اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد تم لوگ ناردرن ایریاز کی طرف نکل جانا۔ اپنا لیٹ ہنی مون بھی منا لو گے اور تلاش میں پھرنے والوں سے بھی پیچھا چھوٹے گا۔“ آج کل افضل کی مصروفیت بہت بڑھی ہوئی تھی۔ اس کے بے شمار جاننے والے تھے جن کی طرف سے ابھی تک تعزیت کا سلسلہ جاری تھا، دوسری طرف صحافتی ذمے داریاں بھی ایسی تھیں کہ وہ غم کی ان گھڑیوں میں بھی مکمل طور پر اپنا دامن چھڑانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ کسی نہ کسی اہم معاملے میں اس کی ضرورت پڑ جاتی تھی اور اس کے کولیگز بے پناہ معذرت اور شرمندگی کے اظہار کے ساتھ اس کی مدد لینے پر مجبور ہو جاتے۔ اپنی ان مصروفیات کی وجہ سے وہ دوبارہ اسپتال جانے کی مہلت نہیں نکال سکا تھا۔ البتہ اپنے اسی کولیگ کے ذریعے جس کی مدد سے کشور کو اس اسپتال میں شفٹ کروایا تھا، آفتاب کو بھی اسی اسپتال میں شفٹ کروا دیا تھا تاکہ وہ قریب رہ کر کشور کی خبر گیری بھی کرتا رہے اور خود اس کا علاج بھی جاری رہے۔ اس کے کہنے پر اس کے کولیگ نے آفتاب کو ایک نیا سیل فون سم سمیت مہیا کر دیا تھا اور اب وہ اسی سیل پر آفتاب سے بات کر رہا تھا۔

”میں تم سے ملنا چاہتا ہوں افضل!“ اس کی تمام باتوں کے جواب میں آفتاب نے صرف ایک جملہ کہا اور افضل کو ایسا لگا جیسے یہ جملہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ بالکل بجھا ہوا ہو۔

”میں موقع دیکھ کر تمہارے پاس چکر لگاؤں گا لیکن سوری یار! ابھی فوری طور پر نہیں آ سکتا۔“ اس نے معذرت کی۔

”مجھے معلوم ہے کہ تم بہت مصروف ہو گے اور تمہارے لیے میرے پاس آنا آسان نہیں ہوگا۔“ اس بار آفتاب کے لہجے میں تلخی سی تھی۔

”مصروفیت تو واقعی ہے لیکن میں احتیاطاً بھی تمہاری طرف آنے سے گریز کر رہا ہوں۔ مجھے شک ہے کہ کچھ لوگ مسلسل میری نگرانی کر رہے ہیں۔ ممکن ہے یہ چودھری کے کرگے ہوں اور میرے پیچھے لگ کر تم تک پہنچ جائیں۔“ اس نے آفتاب کے لہجے کی تلخی کو نظر انداز کرتے ہوئے رسان سے جواب دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اسپتال میں مجبور و لاچار پڑے آفتاب کو اس کے انکار سے ٹھیس لگی ہے اس لیے اس کا لہجہ تلخ ہو چلا ہے۔

”اچھا ہے کہ پہنچ جائیں۔ کم سے کم تم تو مزید قربانی کا بکرا بننے سے بچ گے۔“ آفتاب کے جھنجلاہٹ اور یاسیت میں ڈوبے اس جواب نے اسے چونکا دیا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہو یار!“ اس کے انداز پر الجھ کر وہ اتنا ہی کہہ سکا۔

”اور کتنا چھپاؤ گے دوست! تم پر جو گزری ہے اس نے مجھے صرف دکھ ہی نہیں دیا، گہری شرمندگی سے بھی دوچار کیا ہے۔ یہ احساس کہ تم میری وجہ سے، میری خاطر اتنے عظیم صدمے سے گزرے ہو، مجھے ایک پل چین نہیں لینے دے رہا۔“ اس بار آفتاب کی آواز رندھ سی گئی جبکہ افضل نے سارا معاملہ سمجھتے ہوئے ایک گہرا سانس لیا اور بولا۔

”میں نے تم سے کچھ چھپایا نہیں ہے۔ بس بتانے سے گریز کیا تھا کہ تم پہلے ہی اتنی پریشانی میں تھے۔ ایک طرف تمہاری اپنی حالت، دوسری طرف کشور کی پریشانی چنانچہ میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ تمہیں ایک اور صدمے سے دوچار کر دوں۔“

”میری تکلیف اور پریشانی تمہارے دکھ کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر مجھے تمہارا دکھ اپنے دل پر سہنا پڑے تو یہ ایک دوست کی حیثیت سے میرا حق ہے اور یہاں تو ایک طرح سے میں ہی تمہیں یہ دکھ پہنچانے کا سبب بنا ہوں۔“

”ایسا کچھ نہیں ہے۔ میری قسمت میں جو چوٹ لکھی تھی وہ مجھے مل گئی۔ ان تینوں کا مجھ سے بچھڑنا قدرت کا فیصلہ ہے۔ جب خدا نے ہمارا ساتھ ہی اتنا لکھا تھا تو سب چاہے جو بھی ہوتا، مقررہ وقت پر یہ ساتھ ختم ہو ہی جانا تھا۔ تم خوامخواہ خود کو موردِ الزام نہ ٹھہراؤ۔“ شدید غم سے دوچار ہونے کے

باوجود وہ آفتاب کو ایک اچھے دوست کا فرض ادا کرتے ہوئے اس کے احساسِ شرمندگی سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔

''مجھے تمہاری دوستی پر فخر ہے افضل! تم نے ہر ضرورت کے وقت پر میرا ساتھ دیا ہے لیکن افسوس کہ جب تم پر مشکل گھڑی آئی تو میں تم سے دور تھا۔ تم نے ملاقات ہونے پر بھی کچھ نہیں بتایا وہ تو ابھی تھوڑی دیر پہلے اتفاق سے میں نرس سے پچھلے دو چار دن کے اخبارات منگوا کر ان کا مطالعہ کر رہا تھا تو تمہارے متعلق خبر پر نظر پڑی۔ میں تو چکرا کر رہ گیا۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ بھابی اور بچے اب اس دنیا میں نہیں رہے ہیں۔ سوچ رہا تھا تمہیں فون کرکے تم سے بات کروں لیکن ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی، وہ تو خود تمہاری کال آ گئی۔'' وہ گہری اداسی میں ڈوبا کہتا جا رہا تھا۔

''بس یار! جو اللہ کو منظور تھا، وہ ہو گیا۔ زخم تو خیر ایسا لگا ہے کہ اب ساری زندگی بھرنے والا نہیں لیکن صبر کے سوا چارہ بھی کیا ہے؟ اب تو میری یہی خواہش ہے کہ تم اور کشور خوش رہو اور سارے جہان کی خوشیاں پاؤ۔ میں تمہارے بچوں میں اپنے بچوں کا پیار پا لوں گا۔'' افضل کی آواز میں بھی بالآخر دکھ کی جھلک آ ہی گئی لیکن اس نے خود پر فوراً ہی قابو پا لیا۔

''اب تم آرام کرو اور اپنے ذہن کو فضول باتوں میں الجھنے سے بچاؤ۔ اور ہاں کسی قسم کی بے احتیاطی مت کرنا۔ ابھی تمہارا روپوش رہنا بہت ضروری ہے۔ چودھری کے کارندے کتوں کی طرح تمہاری بو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم ذرا سی بداحتیاطی سے ان کی نظر میں آ جاؤ۔ اللہ نے تمہیں اور کشور دونوں کو نئی زندگی عطا کی ہے۔ اس زندگی کی قدر کرنا اور اس کی حفاظت کرنا تمہارا فرض ہے بلکہ میرا خیال ہے کہ تم اپنے اسپتال میں محدود رہنے کا فائدہ اٹھاؤ اور اس عرصے میں اپنا حلیہ تبدیل کر ڈالو۔ میرے خیال میں داڑھی مونچھیں رکھ لینے اور ہیئر اسٹائل تبدیل کر لینے سے تمہارے حلیے میں نمایاں تبدیلی آ جائے گی اور سرسری طور پر دیکھنے والے کے لیے آسانی سے تمہیں شناخت کر لینا آسان نہیں رہے گا۔'' وہ پے در پے اس کو ہدایات جاری کرتا جا رہا تھا۔

''ٹھیک ہے یار! میں خیال رکھوں گا تم میرے لیے اتنا پریشان مت ہو۔'' اس نے افضل کو تسلی دی۔

''اوکے، میں فون بند کرتا ہوں۔ آج مجھے ذرا اپنے دفتر کا بھی چکر لگانا ہے۔ کئی کام ادھورے پڑے ہیں، انہیں بھی دیکھنا ہے۔'' افضل نے فون بند کر دیا۔ فون بند کرتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ وہ آفتاب سے بات کرتے ہوئے کمال ضبط کا مظاہرہ کرتا رہا تھا ورنہ حقیقت یہ تھی کہ اس کا دل دھاڑیں مار مار کر رونے کو چاہ رہا تھا۔ عجیب وقت آ پڑا تھا کہ وہ دوست کے سینے سے لگ کر اپنے آنسو بھی نہیں بہا سکتا تھا اور اب اسے ساری زندگی ان آنسوؤں پر بند ہی باندھے رکھنا تھا۔ سینے میں موجزن غم کے طوفان کو ساری دنیا سے چھپا کر زندگی کو پوری فنکاری کے ساتھ گزارنا تھا۔

اس وقت بھی اس نے اپنے رونے کی خواہش کو پیچھے دھکیلا اور گاڑی کی چابیاں لے کر ایک حسرت بھری نظر خالی گھر پر ڈالتے ہوئے باہر نکل گیا۔ گاڑی اپنے علاقے سے نکال کر وہ مین روڈ پر پہنچا تو ایک ایسی گاڑی اس کی نظر میں آ چکی تھی جو گھر سے مسلسل اس کے تعاقب میں تھی۔ اس نے اس تعاقب کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنے سابقہ انداز میں ڈرائیونگ جاری رکھی۔ اگر تعاقب کرنے والوں کا مقصد اس کے ذریعے آفتاب اور کشور تک پہنچنا تھا تو وہ اس سلسلے میں پوری طرح محتاط ہو چکا تھا۔ اول تو وہ ان سے ملاقات کے لیے جانے کا ارادہ ہی نہیں رکھتا تھا اور اگر کبھی جاتا بھی تو پھر ان تعاقب کنندگان سے پیچھا چھڑا کر ہی وہاں جاتا۔ فی الحال تو اسے اپنے اخبار کے دفتر جانا تھا اور وہاں تک کسی کا پیچھے پیچھے پہنچ جانا کوئی قابلِ تشویش بات نہیں تھی۔ یہ دنیا جانتی تھی کہ وہ ایک مشہور اخبار کے ساتھ منسلک ہے اور اسی اخبار کے لانچ کردہ نیوز چینل کے لیے بھی کام کرتا ہے۔

شہر کے گنجان علاقے میں واقع اخبار کے دفتر کے سامنے اپنی گاڑی روک کر وہ نیچے اترا تو بیک ویو مرر میں اسے وہ گاڑی بھی نظر آ گئی جو گھر سے ہی اس کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ اس گاڑی کو یہاں بھی دیکھ کر اب کسی شک کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ واقعی اس کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ نگرانی کرنے والوں کے بارے میں وہ یہی قیاس کر سکتا تھا کہ وہ چودھری کے کارندے ہیں جنہوں نے مبینہ طور پر اس کے بیوی بچوں کو بھی قتل کیا تھا۔ اپنے ہنستے بستے گھر کو اجاڑنے والے قاتلوں کا تصور کرکے اس کی مٹھیاں غصے سے بھنچ گئیں لیکن اس غصے کے اظہار کے لیے پیچھے گاڑی میں موجود لوگوں تک جانا اور ان سے بھڑنا کوئی دانشمندی نہیں تھی۔ وہ بہ مشکل خود پر قابو پاتے ہوئے دفتر کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ وہاں موجود ساتھیوں نے بڑے خلوص سے اس کا خیر مقدم کیا۔ وہ سب تعزیت کے لیے اس کے گھر بھی آئے تھے اور اس کے ساتھ ہونے والے حادثے پر بڑے غم و غصے کا اظہار بھی کیا تھا۔ اس وقت بھی وہ لوگ اس سے بہت ہمدردی کے ساتھ حال احوال دریافت کرنے لگے۔ وہ ان لوگوں کے سوالوں کا جواب دے ہی رہا تھا کہ چپراسی پیغام لے کر آ گیا کہ ایڈیٹر صاحب اسے اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں۔ ان تک اس کے آنے کی اطلاع پہنچانے والا بھی یقیناً وہی تھا۔ پیغام ملتے ہی وہ اٹھ کر ایڈیٹر کے کمرے میں چلا گیا۔

''آؤ افضل! مجھے تمہیں دوبارہ دفتر میں دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے۔ یہ مت سمجھنا کہ میں خودغرضی کا مظاہرہ کر رہا ہوں۔ ایسا میں تمہاری ہی وجہ سے کہہ رہا ہوں۔ تم جتنی جلدی خود کو زندگی کے معمولات میں شامل کر لو گے خود پر گزرنے والے حادثے کے صدمے کو سہنا اتنا ہی آسان ہوتا جائے گا۔ بس ان حالات میں تم خود کو تنہا مت سمجھنا۔ تم نے کسی مشکوک فرد کا نام نہیں لیا ورنہ تم دیکھتے کہ پوری صحافی برادری تمہارے پیچھے کھڑی ہو کر اس شخص کو کیفرِ کردار تک پہنچانے میں حصہ لیتی۔'' ایڈیٹر صاحب کے ان دعوؤں میں کتنے فیصد سچائی تھی یہ افضل بھی سمجھتا تھا۔ وہ کوئی پہلا صحافی تو نہیں تھا جس کو کسی حادثے سے گزرنا پڑا تھا۔ کتنے تو اس دشت کی سیاحی میں خود اپنی جان بھی گنوا چکے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ان کے ساتھی ایسے مواقعوں پر بھرپور احتجاج کرتے تھے لیکن انصاف... انصاف یہاں کس کو ملا تھا جو وہ اپنے لیے کوئی امید لگاتا۔ ہاں! ایڈیٹر صاحب نے جو زبانی ہمدردی کر دی تھی وہ بھی دل کو سہارا دینے کے لیے کافی تھی۔

''شکریہ سر! لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں خود کسی کا نام لینے سے قاصر تھا اس لیے آپ لوگوں کو کیسے زحمت دیتا؟'' اس نے ان کے سامنے بھی وہی مؤقف اختیار کیا جو اب تک پولیس اور پریس کے سامنے ظاہر کرتا رہا تھا۔ اس کے اس جواب کے بعد ایڈیٹر صاحب نے بھی موضوع بدل دیا اور ان پروجیکٹس پر گفتگو کرنے لگے جن پر وہ کام کر رہا تھا۔ آدھے گھنٹے کی ڈسکشن کے بعد جب انہیں یقین ہو گیا کہ افضل پہلے ہی خاصا کام کر چکا ہے اور آگے بھی مقررہ وقت پر اپنا کام کر لے گا تو انہوں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

''ارے ہاں افضل! یاد آیا جس رات تمہاری بیوی اور بچوں کا قتل ہوا اس دن صبح میں ایک شخص تمہارا پوچھتا ہوا یہاں دفتر آیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ تمہاری بیوی کا کزن ہے لیکن اسے تمہارے گھر کا ایڈریس معلوم نہیں اس لیے دفتر چلا آیا ہے۔ اس روز تم فیلڈ میں تھے۔ میں نے اس شخص کو تمہارے گھر کا ایڈریس دے دیا تھا۔ وہ گھر پر تم لوگوں سے ملنے آیا تو ہوگا؟'' وہ ایڈیٹر کے کمرے سے نکلنے ہی لگا تھا کہ انہوں نے پیچھے سے اسے آواز دے کر روکتے ہوئے یہ سب بتایا۔

''میری بیوی کا کزن...!'' افضل حیران ہوا۔

''کیا نام بتایا تھا اس نے اپنا؟''

''نام تو مجھے یاد نہیں رہا۔'' ایڈیٹر صاحب نے اپنا سر کھجایا۔ ''بہرحال، دیکھنے میں کسی اچھی فیملی کا ممبر لگ رہا تھا۔ رنگ گورا اور آنکھیں نیلی تھیں۔ جوان العمر آدمی تھا۔ میں نے سنا ہے کہ تمہاری بیوی کا تعلق کسی قبائلی خاندان سے تھا اس لیے اس جوان کو دیکھ کر مجھے یقین آ گیا کہ وہ تمہارا سسرالی رشتے دار ہی ہے۔ کیا وہ تم سے ملنے تمہارے گھر نہیں آیا تھا؟'' انہوں نے اپنی یادداشت پر زور دے کر اسے تفصیلات بتاتے ہوئے آخر میں تشویش سے سوال بھی کیا۔

''میرے علم میں نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے وہ میری غیر موجودگی میں میری بیگم سے مل کر چلا گیا ہو۔ بعد میں تو اس بے چاری کو موقع ہی نہیں ملا کہ وہ مجھے کچھ بتا سکتی۔ ممکن ہے بعد میں اس کا وہ کزن جنازے میں شرکت کے لیے بھی آیا ہو لیکن اس روز اتنے لوگ تھے کہ مجھے خود ہوش نہیں کہ کون کون مجھ سے آ کر ملا تھا۔'' وہ نوجوان کا حلیہ سن کر مزید ٹھٹک گیا تھا لیکن ایڈیٹر پر کچھ ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا اور گول مول جواب دے کر باہر نکل گیا۔ اس کے بعد اس نے دفتر میں بھی زیادہ دیر نہیں ٹھہرا گیا اور وہ ایک گھنٹے سے بھی قلیل وقت میں وہاں سے نکل پڑا۔ واپسی کے سفر میں بھی وہی گاڑی اس کے تعاقب میں تھی لیکن اب وہ تعاقب کنندگان کے بارے میں ابہام کا شکار تھا۔ پہلے تو اسے سو فیصد یقین تھا کہ چودھری کے کارندے آفتاب اور کشور کا پتا جاننے کے لیے اس کا پیچھا کر رہے ہیں لیکن اب وہ سوچنے پر مجبور تھا کہ کہیں یہ مہتاب کا وہ چچازاد تو نہیں جو ماضی میں کبھی اس کا منگیتر رہا تھا اور جس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن ضرور مہتاب کو تلاش کرکے اپنے ٹھکرائے جانے کا انتقام لے کر رہے گا۔ یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ مہتاب اور بچوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد اب وہ افضل کی جان کے درپے ہو تاکہ اپنے انتقام کی تکمیل کر سکے۔

ان خیالوں میں گم گاڑی چلاتے ہوئے اس کی نظریں مسلسل عقب نما آئینے میں پیچھے آنے والی گاڑی کو دیکھ رہی تھیں۔ اس گاڑی اور اس کے سواروں کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے اندازہ ہی نہیں ہو سکا اور پیچھے سے ایک تیز رفتار کار تعاقب میں آتی گاڑی کو اوورٹیک کرکے خود اس کی گاڑی کے ساتھ ساتھ بائیں جانب چلنے لگی۔ کار سوار نے لمحے بھر کے لیے اسے شعلہ بار نظروں سے دیکھا اور پھر ڈیش بورڈ پر پڑا چھوٹا مگر جدید ساخت کا پسٹل اٹھا کر اس کا نشانہ لیتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔

☆☆☆

''یہ کیا چکر ہے؟ ہمارے علاوہ اور کون ہے جو اس

سالے صحافی کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے ہم پہلے بھی ناکام رہے اور اب پھر اس نے ایسی گڑبڑ کی ہے کہ وہ صحافی کا بچہ اپنے سائے سے بھی ہوشیار رہنے لگے گا۔" بالا اپنی رپورٹ کے ساتھ چودھری کی خدمت میں حاضر تھا اور اس کی پیش کردہ رپورٹ سن کر چودھری نے تشویش بھرے لہجے میں یہ تبصرہ کیا تھا۔

"معلوم نہیں سرکار کون ہے میں تو بس اتنا ہی دیکھ سکا کہ ایک گڈی ہمارے پیچھے سے نکل کر آگے آئی اور گڈی والے نے صحافی کی گڈی کے ساتھ چلتے ہوئے بالکل اچانک ہی فیر (فائر) مارا اور ہوا کی طرح اپنی گڈی نکال کر لے گیا۔ گولی کھا کر صحافی اپنی گڈی کو سنبھال نہیں سکا لیکن یہ ہے کہ اس کی قسمت چنگی تھی اس لیے گڈی تھوڑی ادھر ادھر ہوئی اور فیر شاید انجن بند ہونے کی وجہ سے رک گئی۔ گولی سے بھی اسے ایسا خاص نقصان نہیں پہنچا بس بازو کے زخمی ہونے پر بلا ٹل گئی۔ اب اسپتال میں پڑا ہے علاج کے لیے۔ تین چار دن سے پہلے تو اسے وہاں سے چھٹی نہیں ملنے والی اس لیے میں گامے اور شیدے کو اس کی نگرانی کی ڈیوٹی دے کر آپ کے پاس چلا آیا ہوں۔" بالا، چودھری کے چہرے پر چھائی کوفت اور غصے کی سرخی کو دیکھتے ہوئے جواب میں ایک بار پھر وہی سب کچھ دہرا رہا تھا جو وہ پہلے بھی بیان کرچکا تھا۔

چودھری کا مزاج آج کل کس قدر برہم ہے، وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ کچھ نامعلوم افراد اس کے ڈیرے پر حملہ کر کے اس کے شکار آفتاب کو بہت صفائی سے نکال لے گئے تھے۔ اس رات حملے سے آدھا ایک گھنٹہ پہلے ہی بالا اپنے آدمیوں کو لے کر لاہور کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ وہ لوگ افضل کے گھر جانے کے لیے نکلے تھے۔ حالات کے پیشِ نظر چودھری نے اسے اور منشی کو اپنا رازدان بنالیا تھا۔ چنانچہ اسے اس رات یہ کرنا تھا کہ افضل کے گھر پہنچ کر اسے اور اس کے اہلِ خانہ کو قابو میں کرتا اور اگر کشور وہاں موجود ہوتی تو اسے اپنے ساتھ لے آتا۔ دوسری صورت میں وہ افضل کے بیوی بچوں کو تشدد کا نشانہ بنا کر اسے اس بات پر مجبور کرتا کہ وہ کشور کا پتا بتا دے لیکن جب وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ افضل کی رہائش گاہ پر پہنچا تو وہاں تو صورتِ حال ہی کچھ اور تھی۔ وہ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوا تو انہیں گھر میں کسی کی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا بلکہ اندر داخل ہو کر ان لوگوں کو بالکل ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی غیر آباد گھر میں پہنچ گئے ہیں۔ گھر کے اس غیر معمولی سناٹے کو آدھی رات کے بعد چھا جانے والی خاموشی پر محمول کرتے ہوئے انہوں نے جائزہ لینا شروع کیا تو ایک کمرے میں افضل کی بیوی اور بچوں کی لاشیں دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ لاشیں دیکھ کر صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ انہیں سوتے میں موت کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس صورتِ حال پر ہکا بکا ہوتے ہوئے انہوں نے باقی گھر کی عجلت میں تلاشی لی لیکن نہ تو وہاں کشور موجود تھی اور نہ ہی افضل۔ وہ لوگ صورتِ حال کو نہ سمجھتے ہوئے واپس پلٹ گئے۔ واپس پہنچے تو معلوم ہوا ڈیرے پر اس عرصے میں کیا گزر چکی ہے۔ وہ خود شکاری بن کر کہیں شکار کرنے گئے تھے لیکن ایک طرف انہیں اپنی شکارگاہ میں کچھ نہیں ملا تو دوسری طرف پیچھے سے کوئی ان کے ٹھکانے پر ہی شکار کھیل کر چلا گیا۔ اپنے سارے اچھے لڑاکے بالا ساتھ لے کر گیا تھا۔ جو چند ایک ڈیرے پر موجود تھے وہ حملہ آوروں کا مقابلہ نہیں کر سکے تھے اور بری طرح چوٹ کھائی تھی۔

ڈیرے پر اس طرح حملہ ہو جانے کا تو ان میں سے کسی کو گمان تک نہیں تھا جو وہاں کی حفاظت کا بہت مضبوط انتظام کر کے جاتے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ ڈیرا دہشت کی ایسی علامت تھا جہاں کسی کی قدم رکھنے کی جرأت ہی نہیں ہوتی تھی اور ماضی میں وہاں عموماً دو سے تین ملازموں کی ڈیوٹی لگانے پر ہی اکتفا کیا جاتا تھا لیکن جب شیر یار نے ایک بار وہاں گھس کر ڈیوٹی پر موجود دو بندوں کو ناکارہ کرنے کے بعد نہ صرف اپنی وہ تصویریں حاصل کرلیں جن کے ذریعے چودھری اسے بلیک میل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا بلکہ تہ خانے میں آگ بھی لگا دی تو اس کے بعد وہ لوگ ڈیرے کی نگرانی کے بارے میں کافی چوکنے ہو گئے اور زیادہ آدمی وہاں نگرانی کا کام انجام دینے لگے لیکن اس رات تو مجبوری تھی۔ بالا ایک اہم کام کے لیے جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ہوشیار بندوں کا ہونا ضروری تھا اور پھر وہ لوگ ڈیرا کوئی بالکل ہی خالی چھوڑ کر نہیں چلے گئے تھے۔ جتنے ہتھیار بند بندے وہاں موجود تھے وہ بھی نگرانی کے لیے کافی تھے لیکن ڈیرے پر حملہ ہی اتنا منظم ہوا تھا کہ وہاں موجود بندے کچھ نہیں کر سکے۔ اپنے آدمیوں کی اس شکست نے چودھری کو بڑا چراغ پا کیا تھا۔ اس کے بعد بالا بھی اپنی مہم میں ناکام ہو کر واپس آگیا تھا۔ اس ہزیمت پر پہلے تو چودھری تمام کارندوں پر خوب گرجا برسا اور پھر جب غصے کی شدت ذرا کم ہوئی اور وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے لائق ہوا تو اس نے بالے اور اس کے آدمیوں کو افضل کی نگرانی کا حکم دیا۔ اس حکم کو صادر کرنے اور پھر بالے کے عمل پیرا ہونے میں اتنا وقت لگ گیا تھا کہ وہ لوگ افضل کے پیچھے اس اسپتال تک نہیں پہنچ سکے جہاں آفتاب اور کشور دونوں زیرِ علاج تھے۔ اپنی اس ایک اور بدقسمتی سے بے خبر وہ لوگ افضل کی نگرانی پر لگے رہے۔

افضل نے نگرانی کو محسوس کر کے اسپتال کا رخ ہی نہیں کیا لیکن اس نے کسی مرحلے پر ان نگرانی کرنے والوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی اس لیے بالے اور اس کے ساتھیوں کو اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ افضل نے اپنے تعاقب کو بھانپ لیا ہے۔ وہ معمول کے مطابق اپنے کام میں لگے رہے لیکن اب پھر ایک ایسا حادثہ پیش آچکا تھا جس کے باعث افضل کی نقل و حرکت اسپتال کے ایک کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی اور وہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے ایسی کسی جگہ نہیں پہنچ سکتے تھے جہاں آفتاب یا کشور میں سے کسی کو پا سکتے۔ ان حالات میں چودھری کا مزاج برہم ہونا ایک لازمی بات تھی اور اس برہمی کے پیشِ نظر ہی بالا معمول سے کہیں زیادہ نظریں جھکا کر عاجزی سے بات کر رہا تھا پھر بھی اسے ڈر تھا کہ کہیں چودھری بھڑک نہ جائے اور حالات و واقعات کی الٹ پھیر کی وجہ سے کشور اور آفتاب تک پہنچنے میں جو تاخیر ہو رہی ہے، اس کی ذمے داری اس کے شانوں پر ڈال کر اس پر لات ہی نہ پڑے لیکن خوش قسمتی سے گفتگو کے اختتام پر پہنچنے سے پہلے ہی چودھری کا موبائل بج اٹھا۔ چودھری نے موبائل کی اسکرین پر کال کرنے والے کا نام پڑھنا چاہا لیکن وہاں کوئی اجنبی نمبر جگمگا رہا تھا۔ اس نے کچھ بے دلی کی سی کیفیت میں کال ریسیو کی۔

"کیا بات ہے چودھری صاحب! آواز کچھ بجھی بجھی سی لگ رہی ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟" اس کی بے دلی سے کی گئی ہیلو کے جواب میں دوسری طرف سے بہ زبانِ انگریزی جس کھنکتی ہوئی آواز نے اسے مخاطب کیا، اسے سن کر وہ بہت زیادہ اعصابی تناؤ کا شکار ہونے کے باوجود کھل اٹھا۔ اس کھنکناتی سریلی آواز نے اسے بولنے والی کا دلکش سراپا اور گرم جوش قربت یاد دلا دی تھی۔

"لنڈا...! ڈیئر آر یو؟ میرے موبائل پر جو نمبر آرہا ہے وہ تو پاکستان کا ہی ہے۔ کیا تم یہاں ہو؟" اس نے بہت بے تابی سے پوچھتے ہوئے بالے کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔

"یس، آئی ایم ہیئر۔" اس نے اپنی مخصوص بلاوا دیتی ہنسی کے ساتھ جواب دیا۔

"یہاں کہاں؟ لاہور ایئرپورٹ پر یا کسی ہوٹل میں؟ مجھے بتاؤ میں فوراً تمہیں لینے کے لیے گاڑی بھیجتا ہوں۔" چودھری نے بے تابی سے کہا تو وہ ایک بار پھر ہنس پڑی پھر شوخی سے بولی۔

"ایسی بھی کیا بے صبری چودھری صاحب! میں یہاں تک آئی ہوں تو کسی نہ کسی روز آپ سے ملنے بھی آہی جاؤں گی۔"

"کسی روز کیوں؟ آج اور ابھی کیوں نہیں؟" چودھری نے کسی نوجوان عاشق کی سی بے قراری سے سوال کیا۔

"ابھی کچھ پابندی ہے۔" اس نے مبہم سا جواب دیا۔

"کیسی پابندی؟ اور یہ پابندی کس نے لگائی ہے؟"

"ڈیوڈ نے۔" یہ جواب دے کر اس نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا اور پھر بھرپور سنجیدگی کے ساتھ بولی۔ "مجھے ڈیوڈ ہی نے یہاں بھیجا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ میں نے چودھری افتخار سے وعدہ کیا تھا کہ لنڈا کو پاکستان بھیجوں گا اس لیے اپنا وہ وعدہ پورا کرنے کے لیے میں تمہیں بھجوا رہا ہوں لیکن ظاہر ہے کہ وہ مجھے صرف آپ کی دل بستگی کے لیے تو نہیں بھیج سکتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں آپ کے پاس جاؤں اور اب تک جو کام ہوا ہے اس کا جائزہ لوں۔"

"ہاں تو ٹھیک ہے تم آؤ اور جائزہ لے لو۔" اس نے فوراً پیشکش کی۔

"لیکن کس چیز کا؟" لنڈا کے لہجے میں اس بار طنز کی کاٹ تھی۔ "آپ کیا سمجھ رہے ہیں ڈیوڈ آپ کی طرف سے بے خبر ہے؟ اسے ساری خبر ہے۔ وہ جانتا ہے کہ آپ نے ابھی تک کام شروع نہیں کروایا ہے۔ اس صورتِ حال پر وہ بہت برہم ہے۔ اگر میں درمیان میں نہ ہوتی تو وہ بہت سختی سے آپ سے بازپرس کرتا لیکن میں نے آپ کی اور اپنی فرینڈشپ کا خیال کرتے ہوئے اسے باز رکھا اور یقین دلایا کہ میرے کہنے پر آپ اپنے کام کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ اب میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ آپ کے پاس چند دن کی مہلت ہے۔ تمام ضروری سامان ہم پرووائڈ کر چکے ہیں۔ آپ اپنے آدمیوں کو کام پر لگا دیں جب مجھ تک یہ اطلاع پہنچے گی کہ آپ کے آدمی ہمارے حسبِ منشا کام کر رہے ہیں تو پھر میں خود آپ سے ملاقات کے لیے رابطہ کروں گی۔"

ایک تو چودھری کو یہ اندازہ تھا کہ ڈیوڈ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ اس کی پہنچ کسی ایسے خفیہ ادارے تک ہے جو اس جیسے زمیندار کو کیا، پاکستانی حکومت تک کو ہلا کر رکھ سکتا ہے۔ دوسرے یہ سب کہنے والی لنڈا جیسی ہوشربا عورت تھی اس لیے وہ برداشت سے کام لے گیا ورنہ چودھری افتخار عالم شاہ جیسے مطلق العنان شخص سے کوئی اس دھمکی بھرے انداز میں گفتگو کرے، یہ کہاں ممکن تھا لیکن اب وہ جس چکر میں پھنس چکا تھا اس کے بعد یہ سب تو سہنا ہی تھا۔

''سوری ڈارلنگ! تم اور ڈیوڈ جانتے ہی ہو کہ میں یہاں کس پریشانی میں مبتلا ہوں اسی وجہ سے میں وہ کام نہیں کرسکا جس کا ڈیوڈ سے وعدہ کیا تھا۔'' اس کی زندگی میں مشکل سے ہی کبھی کوئی ایسا لمحہ آیا ہوگا کہ اسے کسی سے معذرت کرنی پڑی ہو لیکن اس وقت وہ لنڈا سے سوری کہنے پر مجبور تھا۔

''وہ پریشانی آپ کا ذاتی مسئلہ ہے۔ ہم جس حد تک آپ کی ہیلپ کرسکتے تھے، وہ ہم نے کی۔ اگر آپ ڈیوڈ کی طرف سے ملنے والی انفارمیشن پر ڈھنگ سے اور فوری ایکشن لیتے تو آپ کا مسئلہ حل ہو جاتا۔ بہرحال میں ایک بار پھر یہی کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ کی پریشانی آپ کا پرسنل پرابلم ہے اور آپ کے کسی پرابلم سے بزنس پر اثر نہیں پڑنا چاہیے۔ آئی ہوپ کہ آپ خیال رکھیں گے اور نیکسٹ ٹائم جب میں آپ کو کال کروں گی تو مجھے اچھی پروگریس سننے کو ملے گی پھر میں اپنی آنکھوں سے وہ سب دیکھنے آؤں گی۔'' وہ اسے ساری تندوتلخ سنانے کے بعد ایک بار پھر ملاقات کا چارا ڈالنے لگی۔

''اگر تمہاری یہی شرط ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں تمہاری امید سے بھی بڑھ کر اچھی پروگریس دیکھنے کو ملے گی۔'' چودھری نے دعویٰ کیا۔

''او کے! میں آپ کے اس چیلنج کو ضرور آزمانے آؤں گی۔ فی الحال تو اتنا ہی کہہ سکتی ہوں کہ گڈ لک اینڈ گڈ بائے۔''

اس نے اچانک ہی فون بند کر دیا۔ چودھری نے بے تاب ہو کر اپنے موبائل پر آنے والے نمبر پر کال بیک کرنا چاہی لیکن وہ نمبر کسی پبلک بوتھ کا تھا جس پر کال بیک کرنا ممکن نہیں تھا۔

''لعنت ہے ایسی اولاد پر جس کی وجہ سے زندگی کا مزہ کرکرا ہو کر رہ جائے۔ ایک بار وہ باغی لڑکی میرے ہاتھ آجائے پھر میں اسے اس کی اس جرأت اور بغاوت کا مزہ چکھاؤں گا۔'' لنڈا سے رابطہ ٹوٹ جانے پر وہ بُری طرح جھنجلا گیا تھا چنانچہ غصے سے بڑبڑانے لگا۔ ویسے لنڈا کا قصہ درمیان میں نہ بھی ہوتا تو کشور کے لیے اس کے پاس کسی رعایت کی گنجائش نہیں تھی۔ خاندانی رسم ورواج سے بغاوت کرنے والی لڑکیوں کو عبرت ناک انجام سے دوچار کرنے کا سلسلہ نسلوں سے ان کے خاندان میں جاری تھا اور چودھری اس رواج کو ختم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ اپنے بزرگوں کے اس نظریے پر پورا یقین رکھتا تھا کہ بغاوت کرنے والی لڑکی کو ایسی کڑی سزا دی جانی کہ آئندہ جنم لینے والی لڑکیاں بھی ان کے بارے میں سن کر تھرّا اٹھیں اور اگر کسی کے دل میں بغاوت کا خیال پیدا ہو تو بھی وہ اس انجام کا سوچ کر توبہ کرلے۔ لیکن کمال یہ تھا کہ اس نظریے اور اصول پر سختی سے کاربند ہونے کے باوجود ہر نسل میں کوئی نہ کوئی ایسی باغی لڑکی تو نکل ہی آتی تھی جو اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی اور ظلم پر احتجاج کرتے ہوئے خاندانی روایات سے ٹکرانے کی جرأت کر ڈالتی۔ یہ اور بات کہ اس جرأت کے نتیجے میں عموماً اس بے چاری لڑکی کو اپنی جان ہی گنوانی پڑتی تھی لیکن شاید مرتے ہوئے اس کے پاس یہ اطمینان ہوتا ہوگا کہ اس نے سونے سے بے قفس کی قید میں ساری زندگی سسکتے ہوئے گزارنے کے بجائے اس قفس کو توڑ کر اڑنے کی کوشش تو کی۔ کشور نے بھی اپنی اسی... باغی نسل کی پیروی کی تھی چنانچہ اس کا باپ اسے انہی جیسے انجام سے دوچار کرنے پر تلا ہوا تھا۔

☆☆☆

قدرے کچی پکی سی سڑک پر مہارت سے جیپ چلاتا ہوا میجر ذیشان معمول کے مطابق اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے لیے جا رہا تھا کہ اچانک ہی اسے اپنی جیپ کو بریکس لگا کر روکنا پڑا۔ وہ سنہری بالوں والی کوئی عورت تھی جو سڑک کے درمیان پڑی تھی۔ فاصلے سے دیکھنے پر یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہوئی ہے اور اب بے ہوشی کی حالت میں پڑی ہوئی ہے۔ عورت کی حالت کے پیش نظر وہ جیپ روکنے کے بعد نیچے اترا اور تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ اس کے قریب آنے پر بھی عورت کے جسم میں کوئی جنبش پیدا نہیں ہوئی تو وہ اس کے نزدیک پنجوں کے بل بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں کی مدد سے اسے سیدھا کیا۔ سیدھا کرنے پر عورت کا چہرہ اس کی نظروں کے سامنے آگیا اور یہ چہرہ یقیناً ایسا تھا کہ دیکھنے والا خصوصاً... اگر وہ مرد ہو تو چند پل کے لیے ہی سہی مبہوت ضرور رہ جاتا تھا۔ میجر ذیشان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ ذرا دیر کے لیے عورت کے دمکتے حسن میں کھو کر ساکت ہی رہ گیا۔ اس کی اپنی اب تک کی زندگی میں بے شمار دیسی اور بدیسی عورتوں سے ملاقات ہوئی تھی اُن میں سے بیشتر بہت خوب صورت بھی تھیں لیکن ایسا حسن کبھی اس کے سامنے نہیں آیا تھا جسے پہلی نظر دیکھنے کے ساتھ ہی پورے جسم میں برق سی دوڑ جائے۔ شارٹ اسکرٹ میں ملبوس کسی عریاں ٹانگوں والی وہ عورت جس کی آنکھیں فی الحال بند تھیں، اپنے وجود میں کسی جادوگرنی کا سا سحر رکھتی تھی جو پل بھر میں کسی کو بھی ساکت کرسکتی تھی۔ میجر ذیشان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا لیکن جب اسے خیال آیا کہ عورت بے ہوش ہے اور شاید اسے فوری طبی امداد کی ضرورت بھی ہے تو وہ ہڑبڑا کر اپنے سکتے کی کیفیت سے باہر آیا اور عورت کے سنہری دمکتے ہوئے رخساروں کو تھپکتے ہوئے اسے ہوش میں لانے کی سعی کرنے لگا لیکن اس کی یہ کوشش بار آور ثابت نہیں ہوئی اور عورت ہنوز بے ہوشی کی ہی حالت میں پڑی رہی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر وہ اپنی جیپ کی طرف واپس پلٹا اور اس میں سے پانی کی بوتل نکال کر واپس عورت تک آیا۔ اس بار اس نے پانی کی پوری بوتل اس کے چہرے پر انڈیل ڈالی۔ پانی کی تری اور ٹھنڈک نے عورت کو کسمسانے پر مجبور کر دیا اور ایک جھرجھری سی لیتے ہوئے اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ وہ بے پناہ خوب صورت آنکھوں کی مالک تھی۔ اس کی آنکھوں کی نیلاہٹ میں سمندروں جیسی گہرائی تھی جو دیکھنے والے کو ڈبو ڈالنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ میجر ذیشان بھی ڈوبنے لگا تھا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا اور عورت کی طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

''ہو آر یو میڈم؟ آر یو او کے؟'' عورت نے اس کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں دیا اور چند پل کے لیے ٹکر ٹکر اس کی صورت دیکھتے رہنے کے بعد دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔ میجر ذیشان نے محسوس کیا کہ وہ بہت زور زور سے سانس لے رہی ہے۔ سانس لینے کا یہ انداز ایسا تھا جیسے اسے اس کام میں دشواری پیش آ رہی ہو۔ عورت کی اس کیفیت سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہ بے شک وہ ہوش میں آگئی ہے لیکن مکمل طور پر فٹ نہیں ہے اور اسے طبی امداد ملنی چاہیے، اس نے اسے سہارا دے کر اپنی جیپ تک لے جانے کا فیصلہ کیا تاکہ اسے اسپتال پہنچا سکے۔

''تھوڑی سی ہمت کیجیے میڈم اور میری جیپ میں چل کر بیٹھیے تاکہ میں آپ کو اسپتال پہنچا سکوں......'' اس نے عورت سے کہا اور اسے سہارا دینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ عورت نے بھی اس کی بات سمجھ لی تھی چنانچہ اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ میجر ذیشان نے اسے سہارا دینے کے لیے اپنا دایاں بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کر دیا۔ عورت نے کوئی تعرض نہیں کیا بلکہ خود اپنے بائیں بازو کو اس کے شانوں پر پھیلا دیا اور اپنے جسم کا سارا بوجھ اس پر ڈالتے ہوئے کھڑی ہوئی۔ عورت کی اس قربت نے میجر ذیشان کے جسم میں ایک بار پھر برق دوڑا دی۔ اس بار جسم میں دوڑنے والی برق کی شدت پہلے سے بہت زیادہ تھی۔ پہلی بار اسے صرف اس کے بارعب حسن کے دیدار نے جھٹکا لگایا تھا اور اب بات لمس کی تھی۔ عورت کا لمس تو اس کے عام سا ہونے کی صورت میں بھی مرد کو ہلا ڈالنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور یہاں تو حسن کا شاہکار سامنے موجود تھا۔ وہ حسن کی ان تجلیوں سے خود کو سنبھالنے کی کوشش میں نڈھال ہوا جا رہا تھا تو یہ کوئی ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ پھر یہ حسن کوئی ڈھکا چھپا بھی نہیں تھا۔ اپنی تہذیب اور معاشرت کے اعتبار سے اس عورت نے جو لباس زیب تن کر رکھا تھا وہ اس کے جسمانی خطوط کو بہت خوبی کے ساتھ عیاں کر رہا تھا۔ ایک طرف شارٹ اسکرٹ سے جھانکتی سڈول ٹانگیں تھیں تو دوسری طرف کھلے گریبان والے تنگ بلاؤز نے بھی بہت سے راز عیاں کر رکھے تھے۔ آج کل موسم خوش گوار تھا یقیناً اس وجہ سے عورت کو اس قسم کا لباس پہننے میں قطعی تکلف محسوس نہیں ہوا ہوگا یوں بھی اس کے خدوخال اور رنگت اس کے مغرب کے باسی ہونے کی گواہی دے رہے تھے۔ سرد ممالک میں رہنے والی عورتیں سردی کی شدت کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور معمولی درجۂ حرارت گر جانے کی صورت میں اوڑھ لپیٹ کر رہنے کی عادی نہیں ہوتیں چنانچہ وہ بھی اپنے منی اسکرٹ میں مزے سے تھی۔ میجر ذیشان نے ہانپتے کانپتے بہ مشکل اسے جیپ تک پہنچایا اور اسے فرنٹ سیٹ پر بٹھانے کے بعد خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی لیکن فوری طور پر جیپ اسٹارٹ نہیں کرسکا۔ خود کو سنبھالنے کے لیے اسے چند لمحے درکار تھے۔ ان لمحات میں اس نے دیکھا کہ عورت دونوں ہاتھوں سے سر تھامے اسے یوں دبا رہی تھی جیسے شدید درد محسوس کر رہی ہو۔

''کیا تم سر میں درد محسوس کر رہی ہو؟'' میجر ذیشان نے انگریزی میں اس سے پوچھا۔

''ہاں، ایکچوئلی میرے سر کی پشت پر بہت زور سے ضرب لگائی گئی تھی جس کی وجہ سے میں بے ہوش ہوگئی اور اب ہوش میں آنے کے بعد کافی درد محسوس کر رہی ہوں۔'' اس نے پہلی بار میجر کے کسی سوال کا جواب دیا۔ اس کا لب ولہجہ سن کر وہ سمجھ گیا کہ وہ امریکن شہری ہے۔

''کس نے تمہارے سر پر ضرب لگائی تھی ذرا وضاحت سے بتاؤ بلکہ ایسا کرو کہ سب سے پہلے اپنا تعارف کروا دو۔'' ذیشان نے جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے اس سے مطالبہ کیا۔

''میرا نام ایملی پارکر ہے۔ نیویارک سے آئی ہوں۔ وہاں میں ایک کنسٹرکشن کمپنی میں بہ طور آرکیٹیکچر جاب کرتی ہوں۔ مجھے سیاحت کا بہت شوق ہے اس لیے جب بھی کچھ معقول رقم جمع کرنے میں کامیاب ہو جاؤں، چھٹیاں لے کر کسی نہ کسی ملک کی سیاحت کے لیے نکل پڑتی ہوں۔ اس بار میں نے اس کام کے لیے پاکستان کو بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس کے شمالی علاقہ جات کو چنا ہے۔'' وہ خود کو اس حد تک سنبھال

چکی تھی کہ سوالات کے جواب دے سکے چنانچہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اس کی فرمائش پر اپنا مختصر تعارف کروایا۔

"میرا نام ذیشان ہے۔ میں اپنی جاب پر جانے کے لیے یہاں سے گزر رہا تھا کہ تم بے ہوش پڑی ہوئی نظر آئیں۔ اب یہ تم بتاؤ گی کہ تمہارے ساتھ کیا بیتی اور تم کیسے اس جگہ بے ہوش ہو کر گر پڑیں؟" وہ یونیفارم میں نہیں تھا کہ اس کی شناخت ظاہر ہو جاتی چنانچہ اپنے نام کے ساتھ میجر لگائے بغیر محتاط انداز میں اپنا تعارف کروایا۔ یہ اور بات تھی کہ اس کی اس احتیاط پسندی نے تعارف سننے والی کے ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ دوڑا دی تھی۔ تاہم جب اس نے میجر ذیشان کے سوالوں کا جواب دینے کے لیے اس کی طرف رخ کیا تو وہ پوری طرح سنجیدہ تھی۔

"میں یہاں ایک ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہوں۔ میرا ارادہ تھا کہ کوئی گروپ مل جائے تو اس کے ساتھ اٹیچ ہو جاؤں گی اس طرح سفری اخراجات کافی کم ہو جاتے ہیں لیکن اتفاق سے آج کے دن ایسا کوئی گروپ روانہ نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا چلو آج یہیں اردگرد گھوم پھر کر دن گزار لیا جائے چنانچہ میں صبح ناشتے سے بھی پہلے ہوٹل سے نکل کھڑی ہوئی۔ میں نے اپنے ساتھ صرف اپنا ہینڈ بیگ لیا تھا اور ارادہ تھا کہ آدھے ایک گھنٹے کی واک کے بعد جہاں کوئی مناسب ہوٹل نظر آیا وہاں ناشتا کر لوں گی لیکن پھر یہ حادثہ پیش آ گیا۔ میں اس سڑک سے گزر رہی تھی کہ کسی نے پیچھے سے میرے سر پر وار کر دیا۔ وار اتنا شدید تھا کہ میں فوراً ہی بے ہوش ہو گئی۔ اب تمہاری کوششوں سے ہوش میں آئی ہوں اور ہوش میں آنے کے بعد مجھے میرا ہینڈ بیگ نظر نہیں آیا اس کا مطلب ہے کہ مجھ پر حملہ کرنے والا کوئی چور اچکا تھا جس نے صرف ہینڈ بیگ حاصل کرنے کے لیے ہی یہ حرکت کی تھی۔" ایملی کی بتائی تفصیل نے میجر کو شرمندہ کر دیا۔ وہ ایک غیر ملکی تھی جسے اس کے وطن میں لوٹ لیا گیا تھا چنانچہ اسے سخت افسوس ہوا۔

"ایسا کرتے ہیں کہ پہلے تھانے چل کر اس واردات کی رپورٹ لکھوا دیتے ہیں۔ یہاں اس طرح کے جرائم عام نہیں ہیں بلکہ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا اسے سن کر مجھے کافی حیرت ہوئی ہے۔ اس علاقے میں تو دنیا بھر سے سیاح آتے ہی رہتے ہیں اور کبھی انہیں اس طرح کی کوئی پریشانی نہیں اٹھانی پڑی۔ مجھے لگتا ہے کہ اس واردات کے پیچھے کوئی باہر سے آیا ہوا بندہ ہے۔ کیا تم نے حملہ آور کو دیکھا تھا؟"

"نہیں، میں نے بتایا نا کہ اس نے مجھ پر پیچھے سے وار کیا تھا اس لیے مجھے اسے دیکھنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔"

ایملی نے اپنے سر کی پشت سہلاتے ہوئے میجر کے سوال کا جواب دیا۔

"خیر وہ جو کوئی بھی تھا، مجھے امید ہے کہ اسے ڈھونڈ لیا جائے گا اور اس سے تمہارا سامان برآمد ہو جائے گا۔" اس نے ایملی کو تسلی دی اور جیپ کا رخ مقامی تھانے کی طرف کر دیا۔ تھانے میں ایملی سے اس کے ہینڈ بیگ کی رنگت، ساخت اور اس میں موجود سامان کی تفصیلات کے علاوہ کئی دوسرے سوالات بھی کیے گئے۔ وہ لوگ رپورٹ درج کروا کر تھانے سے باہر نکلے تو کافی وقت گزر چکا تھا۔

"میرے خیال میں تم میری وجہ سے اپنے آفس پہنچنے میں لیٹ ہو گئے ہو۔" ایملی نے قدرے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے ذیشان سے کہا۔

"کوئی بات نہیں، تمہاری مدد کرنا بھی میرا فرض تھا۔" ایک تو وہ اس کے ساتھ ہونے والی واردات پر شرمندہ تھا دوسرے اس کے رعب حسن نے بھی کچھ اس طرح جکڑا ہوا تھا کہ دل کسی طور اسے چھوڑ کر جانے پر آمادہ نہیں تھا چنانچہ مسکراتے ہوئے بہت اخلاق سے اس کی بات کا جواب دیا اور مزید بولا۔ "تم نے بتایا تھا کہ ناشتا کیے بغیر اپنے ہوٹل سے نکل کھڑی ہوئی تھیں۔ ایسا کرتے ہیں کہ کسی اچھی سی جگہ ناشتا کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا۔ تمہارے سر پر لگائی جانے والی چوٹ سے خون بے شک نہیں نکلا لیکن پھر بھی ایک نظر ڈاکٹر کو دکھا لینا مناسب رہے گا۔"

"میرے خیال میں ڈاکٹر کو دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سر میں معمولی سا درد ہے میں کوئی پین کلر لوں گی تو ٹھیک ہو جائے گا البتہ ناشتا میں ضرور کروں گی بلکہ تم ایسا کرو کہ مجھے میرے ہوٹل تک لے چلو اس طرح تم مجھے ڈراپ بھی کر دو گے اور ہم ساتھ ناشتا بھی کر لیں گے۔" ایملی نے تجویز پیش کی جس پر صاد کرتے ہوئے میجر ذیشان نے جیپ کا رخ اس ہوٹل کی طرف کر دیا جہاں وہ مقیم تھی۔ ہوٹل کا نام وہ اس وقت سن چکا تھا جب ایملی تھانے میں رپورٹ لکھوا رہی تھی۔ یہ ایک اچھی شہرت کا حامل خوب صورت سا ہوٹل تھا۔ جس کے احاطے میں سیب کے بہت سے درخت لگے ہوئے تھے۔ ہوٹل کا ڈائننگ ہال نچلی منزل پر تھا جبکہ رہائشی کمرے اوپر تھے۔ ہوٹل کے احاطے میں گاڑی روکنے کے بعد میجر ذیشان نے ایملی کے ساتھ ڈائننگ ہال کا رخ کیا لیکن ابھی وہ ایک دو قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ ایملی ذرا سا لڑکھڑائی اور میجر کا بائیں بازو دبوچنے کے انداز میں پکڑ کر اس کا سہارا لیا۔

"آر یو اوکے؟" اس نے خود بھی اسے سہارا دیتے ہوئے تشویش سے پوچھا۔

"بس ذرا چکر سے آ رہے ہیں۔ ایسا کرتے ہیں کہ اوپر میرے روم میں چلتے ہیں۔ ناشتا وہیں منگوا لیں گے۔" اس نے نقاہت بھری آواز میں جواب دیا۔

"اگر تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے تو ہم پہلے ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔" ذیشان نے تشویش سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں، پہلے ناشتا کر لیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ناشتا کر کے میری طبیعت سنبھل جائے۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو پھر ڈاکٹر کے پاس چلیں گے۔" ایملی نے انکار کر دیا۔ مجبوراً اس نے اس کی بات مان لی۔ کمرے کے دروازے کی اضافی چابی اس نے کاؤنٹر کلرک سے لے لی تھی خود ایملی کے پاس موجود چابی تو اس کے ہینڈ بیگ کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔ ایملی کو سہارا دیے وہ پتھروں سے بنی سیڑھیاں چڑھتا ہوا اس کے کمرے کی طرف بڑھا۔ سیڑھیوں کی تعمیر میں سرخ پتھر استعمال کیا گیا تھا اور حفاظت و سہارے کے لیے لگائی گئی ریلنگ سفید رنگ کی تھی۔ اس ریلنگ پر گلابی پھولوں والی سبز بیل لپٹی ہوئی تھی۔ ایملی کا تقریباً سارا بوجھ اپنے بازوؤں پر سنبھالے اس خوب صورت سے راستے سے گزرتے ہوئے میجر ذیشان اپنے جذبات میں خاصی ہلچل محسوس کر رہا تھا۔ ایسی عورت اور ایسا ماحول کسی بھی مرد کو سحر زدہ کر دینے کے لیے بہت ہوتا ہے۔ وہ بھی اس سحر میں گرفتار ہوتا جا رہا تھا۔ خود کو بڑی مشکل سے قابو میں رکھتے ہوئے وہ ایملی کے کمرے تک پہنچا اور ایک ہاتھ سے دروازے کا لاک کھولا۔ لاک کھولنے کے بعد وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔

"مجھے بیڈ پر لٹا دو۔ کچھ دیر لیٹنے سے آرام آ جائے گا تو پھر اس کے بعد ناشتا کریں گے۔" اندر پہنچنے پر ایملی نے خواہش ظاہر کی۔ اس کے کہنے پر وہ اسے سہارا دیے ہوئے بیڈ تک لے گیا اور جھک کر نرمی سے اسے وہاں لٹا دیا۔ اسے لٹانے کے بعد وہ سیدھا ہونا چاہتا تھا لیکن نہ ہو سکا۔ ایملی نے ابھی تک اس کا بازو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اس کے بازو نہ چھوڑنے پر وہ ذرا سا چونکا تو اس نے ہونٹوں پر ایک بلاوا دیتی ہوئی مسکراہٹ سجاتے ہوئے اپنا دوسرا ہاتھ اس کی گردن کے گرد حمائل کرتے ہوئے ذرا سا اسے اپنی طرف کھینچا۔ وہ اس ذرا سا کھینچنے پر ہی گرتا چلا گیا کہ کوئی چور خواہش تو پہلے ہی اندر مچل رہی تھی۔ ایملی پر گرتے ہی اس نے سب سے پہلے اس کے نرم و گداز سینے کا لمس محسوس کیا۔ تنگ بلاؤز میں قید حسن کا یہ منبع سانسوں کے زیر و بم سے ایک ردھم میں حرکت کرتا پہلے ہی بہت دیر سے اس کے ضبط کا امتحان لے رہا تھا اب جو اس درجے قربت ملی تو اسے یوں لگا کہ وہ ریشم کے کسی ڈھیر پر جا گرا ہے۔ خود سپردگی پر آمادہ، ایملی کے ریشم جیسے بدن کی نرماہٹوں اور گداز میں ڈوبتے ہوئے اسے بالکل بھی اس بات کا خیال نہیں رہا تھا کہ ریشم کے تاروں میں الجھنے کے بعد پھر ان سے نجات پا لینا آسان نہیں ہوتا۔

☆☆☆

اس کے سامنے گویا کوئی ناقابل یقین منظر تھا۔ اس ایک چہرے کی دید کے لیے وہ کتنا ترسی تھی۔ پہاڑی قید خانے کی تنہائیوں سے لے کر برف زاروں کی صعوبتوں کو سہتے سہتے گویا یہ امکان ہی معدوم ہو گیا تھا کہ وہ کبھی دوبارہ اس شخص کو دیکھ پائے گی اور اب جبکہ وہ دوبارہ اسے اپنے روبرو دیکھ رہی تھی تو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"کیسی ہو ماہ بانو؟" وہ مسکراتا ہوا اس سے مخاطب ہوا تو گویا بے جان تصویر میں جان پڑ گئی۔ اس نے چاہا کہ خود سے پوچھے جانے والے اس سوال کا جواب دے سکے لیکن حلق میں اٹک جانے والے آنسوؤں کے گولے نے اسے بولنے نہیں دیا اور یک دم ہی آنکھوں سے آنسوؤں کا ریلا سا بہہ نکلا۔

"یہ کیا بے وقوف لڑکی! اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں اتنے مشکل حالات سے نکال کر ایک بار پھر نئی زندگی عطا کی ہے۔ جہاں تک ممکن ہو سکے، اس زندگی کو ہنستے مسکراتے گزارنے کی کوشش کرو۔ مشکلوں اور پریشانیوں کا کیا ہے یہ تو آتی جاتی رہتی ہیں۔ آج اگر وقت تمہارے لیے سخت ہے تو آنے والے کل میں یقیناً تمہارے حصے میں بہت سی خوشیاں اور آسانیاں بھی لکھی ہوں گی۔" وہ اس کے بہتے آنسو دیکھ کر اپنی جگہ بیٹھا نہیں رہ سکا اور اس کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی لیکن اس کوشش کا نتیجہ اور بھی الٹ نکلا۔ وہ بجائے رونا ترک کرنے کے مزید شدت سے آنسو بہانے لگی اور ہچکیاں لیتے ہوئے اس کے سینے سے لگ گئی۔ شہریار کے لیے یہ صورت حال بہت اچانک تھی۔ ایک خوب صورت اور نوخیز لڑکی جو کہ اس کے دل سے بھی قریب تھی، اس کے سینے سے لگی تھی اور وہ رونے کی وجہ سے ہچکولے لیتے اس کے جسم کا گداز اپنے بدن پر محسوس کر سکتا تھا۔ وہ گویا دہرے امتحان میں گھر گیا۔ ایک طرف اس کا رونا دل کو تکلیف دے رہا تھا تو دوسری طرف اس کی اس درجے قربت جسم و جاں کو سلگا رہی تھی۔

"خود کو سنبھالو ماہ بانو! یوں سمجھو کہ قدرت نے تمہیں

زندگی گزارنے کا ایک اور سنہری موقع فراہم کیا ہے۔ تم نے جو پچھلے تکلیف دہ دن گزارے ہیں، اس کا ایک بہت اچھا نتیجہ بھی سامنے آیا ہے۔ تمہیں یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ تمہیں جس پہاڑی غار میں قید کیا گیا تھا، وہ مکمل طور پر تباہ ہوگیا ہے۔ اس تباہی میں وہاں موجود تقریباً سارے ہی لوگ مارے گئے ہیں۔ جو زندہ بچے تھے ان میں سے بھی دو کل مر گئے ہیں، باقی بھی اس پوزیشن میں نہیں کہ کوئی بیان دے سکیں۔ اس صورتِ حال کا ایک فائدہ یہ ہوا ہے کہ تمہارے بارے میں کسی کے پاس معلومات نہیں ہیں۔ ہم دو چار لوگوں کے سوا کسی کو نہیں معلوم کہ تم اس قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئی تھیں چنانچہ یہی سمجھا جائے گا کہ دیگر لوگوں کے ساتھ تم بھی ماری گئی ہو اور یہ تمہارے حق میں بہت بہتر ہے۔ تمہارے پاس موقع ہے کہ ایک نئے نام اور نئی شناخت کے ساتھ دوبارہ سے زندگی شروع کرسکو۔ میں نے کرنل توحید سے بات کرکے سارے انتظامات کروا دیے ہیں۔ جو بھی حالات و واقعات پیش آئے ہیں، ان میں تمہارا ایک فیصد بھی قصور نہیں نکلتا چنانچہ تم پر کوئی فردِ جرم عائد نہیں کی جاسکتی۔ کرنل توحید اپنے ذرائع سے تمہارے ماضی اور حالات کے بارے میں معلومات حاصل کرچکے ہیں اور انہیں تمہارے ساتھ ہمدردی ہے۔ میری درخواست پر انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں اس سارے معاملے سے الگ رکھا جائے اور کسی کو بھی تمہارے بارے میں بھنک نہ پڑنے دی جائے۔ انہوں نے از خود یہ تجویز پیش کی ہے کہ تمہیں بالکل خاموشی کے ساتھ یہاں سے کراچی منتقل کردیا جائے۔ وہاں تم کسی گرلز ہاسٹل میں رہ کر اپنا تعلیمی سلسلہ دوبارہ جوڑ سکتی ہو کیونکہ تمہیں مردہ سمجھا جاچکا ہے اس لیے اس بات کا کوئی امکان نہیں ہوگا کہ کوئی تمہیں ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچ جائے گا۔ کسی دشمن سے اتفاقی ٹکراؤ ہونے سے بچنے کے لیے تم یہ احتیاط کرسکتی ہو کہ جب بھی باہر نکلو تو پردے کا اہتمام کرلو۔ اس طرح تمہیں یکسوئی اور اطمینان سے اپنی تعلیم جاری رکھنے کا موقع مل جائے گا۔''

اس کی قربت سے سلگ اٹھنے کے باوجود شہریار نے یک دم ہی اسے خود سے الگ کرکے شرمندہ کرنا مناسب نہیں سمجھا چنانچہ ہولے ہولے اس کی پشت سہلاتے ہوئے اسے وہ سب کچھ بتاتا چلا گیا جو بڑی جدوجہد کے بعد اس نے اس کے لیے طے کیا تھا۔ کرنل توحید سے ملنے، انہیں حالات کو سمجھانے اور پھر اپنے سوچے ہوئے منصوبے کے لیے قائل کرنے کے لیے اسے کافی محنت کرنی پڑی تھی لیکن خوش کن امر یہ تھا کہ اس کی محنت رائیگاں نہیں گئی تھی اور کرنل توحید نے اس کا نکتۂ نظر اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ وہ قائل ہوگئے تھے کہ ایک بے سہارا اور مظلوم لڑکی کو جو پہلے ہی حالات کے ہاتھوں اپنا بہت کچھ کھو چکی ہے، مزید مشکلات سے دوچار نہ کیا جائے اور اس کے لیے کچھ ایسے انتظامات کردیے جائیں کہ وہ نئے سرے سے اپنی زندگی شروع کرسکے۔ ماہ بانو کی اسکردو سے کراچی منتقلی سے قبل ان دونوں کی اس خفیہ ملاقات کا انتظام بھی انہوں نے ہی کیا تھا۔

''کراچی کے ایک گرلز کالج میں تمہارے داخلے کا انتظام ہوگیا ہے۔ اسی کالج کے ہاسٹل میں ہی تمہاری رہائش ہوگی۔ تم وہاں رہ کر دل لگا کر پڑھنا لکھنا۔ تمہاری ضروریات کا میں پورا خیال رکھوں گا۔ موقع ملنے پر تم سے ملاقات کے لیے بھی آسکتا ہوں۔ تم میرا فون نمبر اپنے پاس رکھنا تاکہ وقتِ ضرورت مجھ سے رابطہ کرسکو۔ اور ہاں یاد رکھنا کہ کراچی پہنچنے کے بعد تم ماہ بانو نہیں رہو گی۔ وہاں تمہارا داخلہ مہرین کے نام سے ہوا ہے اور مستقبل میں یہی نام تمہاری پہچان ہوگا۔'' اپنی بات کے اختتام پر وہ ذرا سا مسکرایا۔ ماہ بانو رونا دھونا بھول کر بہت غور سے اس کی بات سن رہی تھی، یک دم ہی چونکی اور پھر پہلی بار اسے شہریار سے اپنی قربت کا احساس ہوا۔ وہ کسمسا کر اس سے دور ہٹی۔ شہریار بھی اس کی پشت پر موجود اپنا ہاتھ ہٹا کر یوں صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ ماہ بانو کے لیے اپنے دل میں ایک خاص کیفیت محسوس کرنے کے باوجود وہ ابھی تک اس کے بارے میں اس زاویے سے سوچنے پر آمادہ نہیں ہوا تھا۔ اس کے گریز کی سب سے بڑی وجہ ماہ بانو کی کم عمری تھی۔ وہ پہلے ہی اسے مصیبتوں کے گرداب میں پھنسی اس لڑکی کو کسی اور مشکل میں گرفتار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ یہ بات سمجھتا تھا کہ نوعمری کی محبت انسان کے لیے ساری زندگی کا روگ بن جاتی ہے اور وہ خود ماہ بانو کے لیے اپنے جذبات کے سلسلے میں سو فیصد پُریقین نہیں تھا۔ وہ جو کچھ محسوس کرتا تھا، وہ ایک وقتی کشش بھی ہوسکتی تھی۔ اپنے کسی وقتی جذبے کے لیے وہ اس معصوم لڑکی کو زندگی بھر کا روگ لگا دیتا، یہ اسے منظور نہیں تھا چنانچہ احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے کو تیار نہیں تھا ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ ابھی کچھ دیر قبل جب وہ کمرے میں داخل ہوا تھا اور ماہ بانو کے چہرے پر پہلی نظر پڑی تھی تو اس کے دل نے بہت شدت سے یہ خواہش کی تھی کہ وہ اسے اپنی بانہوں میں بھر لے اور اسے بتائے کہ اس کی گمشدگی کا ایک ایک دن اس نے کتنی مشکل سے گزارا ہے۔

''آپ مجھے چھوڑنے میرے ساتھ کراچی چلیں گے نا؟'' یہ پہلا جملہ تھا جواب تک ماہ بانو نے اس سے کہا تھا۔

''نہیں، کرنل توحید خود تمہیں اپنے کسی اعتماد کے بندے سے وہاں بھجوائیں گے۔ میں نے تمہارے ساتھ کراچی جانے کے امکان پر غور کیا تھا لیکن مجھے مناسب معلوم نہیں ہوا۔ ہوسکتا ہے کہ تمہاری تلاش میں مارے مارے پھرنے والوں نے میری سرگرمیوں پر نظر رکھی ہوئی ہو۔ یہ تو چودھری بھی سمجھتا ہے کہ تمہیں اس کے چنگل سے نکالنے میں میرا بڑا ہاتھ ہے اس لیے وہ اور اس کے پالتو ہر وقت میری بو سونگھتے پھرتے ہیں۔ ان حالات میں تم میرے ساتھ نہ ہی نظر آؤ تو بہتر ہے۔ کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد میں خود مناسب موقع دیکھ کر تم سے ملنے کراچی آؤں گا۔'' اس نے انکار میں جواب دیتے ہوئے ماہ بانو کو ساری صورتِ حال سمجھانے کے ساتھ ساتھ تسلی بھی دی۔

''میں آپ کا انتظار کروں گی۔'' جواب میں وہ صرف یہی چھوٹا سا جملہ بول سکی لیکن حقیقتاً اس جملے میں بڑی گہرائی تھی۔ اس نے دل کی گہرائی سے یہ دعویٰ کیا تھا۔ اس بات سے ناواقف ہونے کے باوجود کہ وہ خود بھی شہریار کے دل میں نقب لگا چکی ہے، وہ واقعی تاعمر اس کا انتظار کرنے کی خواہش دل میں رکھتی تھی۔ تاہم یہ فیصلہ تو وقت کے ہاتھ میں تھا کہ وہ اپنے دعوے پر قائم رہتی بھی ہے یا نہیں۔ اگر قائم رہتی بھی ہے تو یہ کیا ضروری تھا کہ شہریار اس کی طرف آتا؟ اصولاً تو اس کا انتخاب کوئی ایسی لڑکی ہی ہونی چاہیے تھی جو تعلیم، عمر اور مرتبے میں اس کی ہم پلہ ہوتی لیکن ماہ بانو بھی کیا کرتی کہ وہ محبت جیسے بے بس کردینے والے جذبے کی زد میں آئی ہوئی تھی اور یہ جذبہ تو ہر حقیقت اور سچائی کو فراموش کرکے بس اپنی ہی کرنے پر تلا رہتا ہے۔

☆☆☆

''یہ سب کیا ہے افضل؟ مجھے اخبار سے پتا چلا کہ تم پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ خود تم تو مجھے کچھ بتاتے نہیں ہو اور جب مجھے معلوم ہوتا ہے تو میں شرمندہ ہو جاتا ہوں کہ یہ ساری مصیبت میری وجہ سے تم پر آئی ہے۔'' اس پر قاتلانہ حملے کی اطلاع اس کے حلقے میں تیزی سے پھیل گئی تھی اور فوری طور پر اخبارات میں بھی یہ خبر شائع ہوگئی تھی۔ اس خبر کے ساتھ پچھلے دنوں ہونے والے اس کی بیوی بچوں کے قتل کا حوالہ بھی دیا گیا تھا۔ خبر شائع ہونے سے پہلے ہی جو صحافتی دنیا کے لوگ تھے، انہوں نے اس کے موبائل پر فون کرکے اس کی خیریت دریافت کرنی شروع کردی تھی، باقیوں کو خبر کی اشاعت کے بعد معلوم ہوگیا چنانچہ اس کے موبائل پر کالز کا تانتا سا بندھ گیا تھا۔ وہ بہت زیادہ زخمی نہیں تھا۔ گولی نے صرف بازو کے گوشت کو متاثر کیا تھا اور چند ایک چوٹیں گاڑی کو اچانک لگنے والے جھٹکے کی وجہ سے آئی تھیں اس لیے بستر پر لیٹے لیٹے آرام سے کالز ریسیو کر رہا تھا۔ اس کی اس مصروفیت کو دیکھ کر البتہ ڈاکٹر نے اسے ٹوکا تھا کہ وہ مسلسل فون کالز اٹینڈ کرنے کے بجائے اگر آرام کرے تو بہتر رہے گا۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے بعد وہ نمبر دیکھ کر صرف بہت ضروری کالز ہی ریسیو کر رہا تھا۔ اس بار اس کا موبائل بجا تو اسکرین پر آفتاب کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ آفتاب تک اس پر ہونے والے حملے کی اطلاع پہنچ گئی ہے چنانچہ اس نے آواز میں حتی الامکان بشاشت بھرتے ہوئے اس کی کال ریسیو کی تھی لیکن بہرحال وہ اس کی آواز کی بشاشت سے متاثر نہیں ہوا تھا اور دکھ اور شرمندگی کی ملی جلی کیفیت میں اپنے جذبات کا اظہار کرتا چلا گیا۔

''میں ٹھیک ہوں یار! تم میری فکر نہ کرو اور خواہ مخواہ کی شرمندگی بھی مت پالو۔ تمہاری اس حساسیت کی وجہ سے ہی میں جان بوجھ کر تمہیں کچھ بتانے سے گریز کرتا ہوں لیکن صحافی ہونے کی مجبوری ہے کہ جو بات چھپانا چاہو، یار لوگ اسے بھی چھاپ کر دم لیتے ہیں اور بات چھپنے کے بجائے چھپ جاتی ہے۔'' اس نے ہلکے پھلکے انداز میں آفتاب کو بہلانے کی کوشش کی۔

''تمہارے کہنے سے میری فکرمندی دور نہیں ہوسکتی افضل! میں جانتا ہوں کہ یہ چودھری ہی ہے جو میری وجہ سے تمہارے پیچھے پڑ گیا ہے لیکن اب میں نے سوچ لیا ہے کہ میں خود اپنے آپ کو چودھری کے حوالے کردوں گا تاکہ کم از کم تمہاری جان تو چھوٹے۔ بس تم مجھ پر اتنا احسان اور کرنا کہ کشور کو کسی محفوظ جگہ منتقل کرکے اس کا خیال رکھنا، وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ میں نہ سہی میری محبت کی نشانی ضرور اس کے پاس رہے۔'' اس نے اپنا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے افضل سے درخواست کی۔

''بکواس مت کرو۔ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا ہے جو اس قسم کی باتیں سوچ رہے ہو؟ صرف ایک اندازے کی بنیاد پر تم اپنے آپ کو چودھری کے حوالے کرنے چلے ہو۔ یہ سوچے بغیر کہ تمہیں اس کے چنگل سے بچانے کے لیے کسی نے کتنی کوشش کی تھی۔ تمہاری جذباتیت کی وجہ سے اس شخص کی محنت اور میری قربانی دونوں رائیگاں چلی جائیں گی۔'' اس کا ارادہ جان کر افضل کو شدید غصہ آیا چنانچہ بری طرح اسے ڈپٹنے لگا۔

''مجھے ہر بات کا احساس ہے لیکن میں تمہاری جان کی قیمت پر اپنی جان بچانے کی خودغرضی نہیں دکھا سکتا۔'' اس

کے تحت لہجے کا برا مانے بغیر آفتاب نے اپنا نکتۂ نظر بیان کیا۔

''تم جذبات سے کام لے رہے ہو دوست! یہ لازمی نہیں ہے کہ مجھ پر قاتلانہ حملہ کروانے والا چودھری ہی ہو۔ میں صحافی ہوں اور میری ڈھیروں دشمنیاں ہیں، تم تو خود اس فیلڈ سے منسلک ہو۔ تم نہیں جانتے کیا کہ یہاں جہاں ذرا سا کسی کی دُم پر پیر رکھ دو وہ مرنے مارنے پر تل جاتا ہے اور میری دشمنیوں میں سے ایک بڑی دشمنی تو مہتاب کی وجہ سے بھی ہے۔ خود پر حملے سے پہلے میرے سامنے ایک ایسی بات آئی تھی جس کو سن کر میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ شاید ہم چودھری کو مجرم سمجھ کر غلطی کر رہے ہیں۔ ایڈیٹر صاحب نے بتایا تھا کہ جس رات مہتاب کا قتل ہوا اس دن کوئی شخص مجھ سے ملنے دفتر آیا تھا اور اس نے خود کو مہتاب کا کزن ظاہر کرتے ہوئے دفتر سے میرے گھر کا پتا حاصل کر لیا تھا۔ مجھے لگتا ہے وہ شخص مہتاب کا وہی کزن ہے جس سے اس کی منگنی ہوئی تھی اور جو اتنے برسوں سے ہمیں تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ اب اتفاق سے ایک ایسے وقت میں وہ ہمیں تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا جبکہ چودھری افتخار بھی ہمارا دشمن بنا ہوا ہے چنانچہ میری اور تمہاری دونوں کی توجہ اسی کی طرف رہی اور میں اپنے دشمن نمبر ایک کو بھول گیا لیکن اب جو صورتِ حال میرے سامنے آئی ہے اس کے پیشِ نظر میں تم سے یہی کہوں گا کہ کوئی حماقت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پتا چلا کہ تم جذبات میں آ کر خود کو چودھری کے حوالے کر دو اور یہاں میں اپنے دشمن کے ہاتھوں مارا جاؤں۔'' افضل نے بہت تیزی سے خود پر قابو پا لیا تھا اور اب رسان سے آفتاب کو ساری صورتِ حال سمجھا رہا تھا۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ تم مجھے میرے ارادے سے باز رکھنے کے لیے اپنے سسرالی دشمن کا بہانہ بنا رہے ہو؟'' آفتاب نے اس کی بات سن کر مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''بالکل نہیں۔ اگر تم حالات کا عقل سے تجزیہ کرو تب بھی یہ بات واضح ہے کہ چودھری کو میرے قتل سے کچھ نہیں ملنے والا۔ مہتاب اور بچوں کو اگر اس نے اشتعال میں قتل کروا بھی دیا ہے تو اب میرے سلسلے میں یہ غلطی نہیں کر سکتا۔ میری موت کا مطلب ہوگا کہ اس نے تم تک پہنچنے کا راستہ کھو دیا۔ اگر اس حادثے کے پیچھے چودھری ہوتا تو یقیناً اس کے بندے مجھ پر گولی چلانے کے بجائے مجھے گھیرنے اور تشدد کے ذریعے تمہارا پتا معلوم کرنے کی کوشش کرتے۔'' افضل کی اس دلیل میں جان تھی چنانچہ آفتاب کو قائل ہونا پڑا۔

''جو بھی بات ہو۔ اب تم اپنا بہت خیال رکھنا یار! تم جیسے قیمتی دوست کو کھونے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔'' وہ فون بند کرنے سے پہلے اسے یہ ہدایت کرنا نہیں بھولا تھا۔ اس کی اس فکرمندی پر افضل نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ موبائل ایک طرف رکھتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ اسے آفتاب کے خلوص پر کوئی شک نہیں تھا بلکہ وہ خود بھی اسے اپنے دوستوں میں سے سب سے قیمتی خیال کرتا تھا لیکن مہتاب اور بچوں کے بعد گویا ہر شخص کی محبت بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ مہتاب..... نام کی وہ عورت جو اس کی بیوی اور دو بچوں کی ماں تھی اس کے لیے کتنی اہم تھی، وہ چاہتا بھی تو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے مہتاب کو بے تحاشا چاہا تھا اور جواب میں اس نے بھی اسے ہر وہ خوشی دی تھی جو اس کے اختیار میں تھی۔ مہتاب اور بچوں کے ساتھ اپنی چھوٹی سی دنیا بسانے کے بعد اس نے گویا ہفت اقلیم کی دولت پالی تھی اور اب یہ دنیا اجڑی تھی تو باقی کی ساری دنیا بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔

''سر! آپ کی میڈیسن کا ٹائم ہو گیا ہے۔'' وہ خیالوں کی دنیا میں جانے کب تک ڈوبا رہتا کہ اس آواز کو سن کر چونک کر آنکھیں کھولنی پڑیں۔ وہ کوئی میل نرس تھا جو اپنے ہاتھ میں موجود ٹرے اس کے سرہانے موجود سائیڈ ٹیبل پر رکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر افضل نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی جب تک وہ بیٹھتا میل نرس اس کی طرف رخ کر چکا تھا۔ مخصوص سفید لباس میں ملبوس سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والے اس میل نرس کو شناخت کرنے میں اسے کچھ دشواری پیش آسکتی تھی اگر اس کے ہاتھ میں دبا ہوا سا جدید ساخت کا پسٹل دکھائی نہ دے رہا ہوتا۔ وہ وہی تھا جو اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے برسوں سے انتقام کی آگ دل میں جلائے انہیں ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ اپنے اس جنونی رقیب کو نظروں کے سامنے دیکھ کر افضل کو کوئی شک نہیں رہا کہ مہتاب اور بچوں کا قتل اسی کے ہاتھوں ہوا ہے اور اب وہ اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے لیے اس کے خون کی بھینٹ لینے آ پہنچا ہے۔ اس شخص کو سامنے دیکھ کر افضل کا دایاں ہاتھ اضطراری طور پر پھیلا اور اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی، دواؤں کی شیشیوں میں سے ایک شیشی اٹھا کر اسے دے ماری۔ اس کی ماری گئی شیشی سیدھی پستول بردار کی آنکھ پر جا کر لگی اور وہاں سے خون کا فوارہ سا پھوٹ پڑا لیکن اس اثنا میں وہ بھی اپنا کام کر چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موجود پسٹل جس کا رخ افضل کے سینے کی طرف تھا، چل چکی تھی اور اس کی اور افضل کی چیخ تقریباً ایک ساتھ ہی بلند ہوئی تھی۔

حادثات و سانحات کی شکار... پناہ کی تلاش میں سرگرداں ماہ بانو کی داستانِ حیات کے واقعات اگلے ماہ پڑھیے

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرِ نگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیرآباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ چودھری ظالم و جابر اور عیاش تھا۔ شہریار اس کے ناجائز کاموں میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ پیرآباد کا رہائشی ماسٹر آفتاب جو عرصے سے گاؤں کے پرائمری اسکول کی ترقی کا خواہش مند ہوتا ہے، شہریار کا سہارا پاکر کھل کر اپنے مشن پر کام کرنے لگتا ہے۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب کو دیکھتی ہے تو اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس کی محبت کی شدت کو دیکھتے ہوئے آفتاب کو اسے اپنے دل میں جگہ دینی پڑتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان ہونے والی چوری چھپے کی ملاقاتیں خفیہ نکاح تک جا پہنچتی ہیں۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیرآباد سے ہے۔ اس کے والدین بچپن میں ہی اس کے خالہ خالو کو دے دیتے ہیں جن کے ساتھ وہ فیصل آباد میں رہتی تھی لیکن والدین اور بھائی بہنوں سے ملاقات کے لیے اس کا پیرآباد آنا جانا رہتا تھا۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آجاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکل کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اگلی بار اس کا اپنی بہن کی شادی میں دوبارہ پیرآباد آنا ہوتا ہے۔ چودھری اسے اغوا کروالیتا ہے لیکن ماہ بانو ایک بار پھر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چودھری افتخار ہر صورت اس سے شادی کرنا چاہتا ہے مگر ماہ بانو شادی سے قبل ہی اپنی بہن زہرہ کے تعاون سے گھر سے بھاگ نکلتی ہے اور شہریار سے جا ملتی ہے۔ شہریار اسے اپنی گاڑی میں چھپا کر پیرآباد سے نکال دیتا ہے اور دارالامان بھجوا دیتا ہے لیکن چودھری کے آدمی مستقل اس کے پیچھے رہتے ہیں پھر ماہ بانو مشکلات سے گزرتی ہوئی خواجہ سراؤں کے ہتھے لگ جاتی ہے۔ خواجہ سراؤں کا گرو الماس اسے لے کر ایک ہندو سیٹھ کی کوٹھی پہنچتا ہے۔ کوٹھی میں اسے ایک حیرت انگیز منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔ کوٹھی کے تہ خانے میں کئی خواجہ سرا جمع ہوتے ہیں جن کی موجودگی میں ان کا مہا گرو ایک نوجوان لڑکی کو ایک مورتی کے قدموں میں بھینٹ چڑھا دیتا ہے پھر ایک چھاپے کے دوران ماہ بانو کو تھانے لے جایا جاتا ہے۔ سجاد رانا کو اپنی بیٹی شینا کی تلاش ہوتی ہے جسے خواجہ سراؤں کے ایک گروہ نے اغوا کرلیا تھا۔ چنانچہ جب انہیں یہ اطلاع ملتی ہے کہ خواجہ سراؤں کے ایک گروہ میں ایک لڑکی دیکھی گئی ہے تو وہ اسے اپنی بیٹی سمجھ کر بازیافت کروانے کی کوشش کرتا ہے اور نتیجے میں ماہ بانو آزاد ہو جاتی ہے۔ ماہ بانو کو شہریار کا ماموں زاد بھائی سجاد رانا اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاتا ہے جہاں شہریار بھی موجود ہوتا ہے۔ وہیں وہ شینا کی تصویر دیکھتی ہے اور شہریار کو بتاتی ہے کہ اس لڑکی کو ہندو سیٹھ کی کوٹھی میں ایک دیوی کے قدموں میں بھینٹ چڑھایا جا چکا ہے۔ سجاد رانا کو اپنی بیٹی کے قاتلوں کی تلاش تھی اور یہ تلاش اس کی را کے ایجنٹوں سے مڈبھیڑ کروا دیتی ہے جس کا حتمی نتیجہ اس کے قتل کی صورت میں نکلتا ہے۔ چودھری ماہ بانو کی سجاد رانا کے گھر موجودگی کی بھنک پاکر اسے وہاں سے اغوا کروانے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہ کوشش ناکام ہو جاتی ہے اور شہریار اپنے ڈرائیور مشابرم خان کے مشورے پر ماہ بانو کو کاندے منتقل کر دیتا ہے۔ کاندے سے ماہ بانو مشابرم خان کے بھائی اکرم خان اور ماں کے ساتھ ہوتے ہوئے ایک شادی میں شرکت کے لیے جاتی ہے اور وہاں کی کیمپنگ سائٹ پر ایک گورے کی ہوس کا نشانہ بننے سے بچ جاتی ہے لیکن وہ ماہ بانو کو اغوا کراتا ہے اور اس کارروائی میں اکرم خان مارا جاتا ہے۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ ماہ بانو کے بارے میں ساری معلومات حاصل کرلیتا ہے اور یہ جاننے کے بعد کہ چودھری ماہ بانو کی تلاش میں ہے، وہ... ماہ بانو کا لالچ دے کر چودھری کو اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ چودھری کے ظلم و جبر کی ایک نشانی فریدہ ہے۔ وہ نورپور گاؤں کے چودھری مختار کی بہن ہے۔ ادھر چودھری شہریار کو پھنسانے کے نئے چالیں چلتا ہے، مگر کامیاب نہیں ہو پاتا۔ کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ اس کا آفتاب کے دوست افضل اور اس کی بیوی کے ذریعے فرار ممکن ہوتا ہے۔ ادھر کشور کے غائب ہونے سے حویلی میں کھلبلی مچ جاتی ہے اور کشور کے غیاب پر وہاں کی ملازمائیں زیرِ عتاب آجاتی ہیں۔ خاص طور پر کشور کی ملازمہ خاص رانی۔ ادھر ماہ بانو اس برف زار سے فرار ہونے کی کوشش کرتی ہے اور وہاں موجود عمران نامی لڑکے کے ساتھ بھاگ نکلتی ہے مگر عمران ایک جگہ ایوالانچ کی زد میں آجاتا ہے اور اس میں دب کر اپنی جان گنوا بیٹھتا ہے۔ ماہ بانو تنہا اس برف زار میں بھٹکنے لگتی ہے۔ ادھر چودھری افتخار نیو پارک سے واپس آکر رانی پر بے پناہ تشدد کرتا ہے مگر رانی موقع پاکر چودھری کے ریوالور سے خود کو ختم کر لیتی ہے۔ شہریار نورپور سے واپسی پر تھانے جاتا ہے جہاں ایک اناڑی ڈاکٹر سے تفتیش کے دوران موت کے منہ میں چلے جانے والے بچے کا باپ جگو مل جاتا ہے اور وہ شہریار کا احسان مند ہوتے ہوئے اسے اپنا موبائل نمبر دے کر اپنی خدمات پیش کرنے کی آفر کرتا ہے۔ ادھر مشابرم خان ماہ بانو کی تلاش میں اس برف زار تک پہنچ جاتا ہے اور دشمنوں کا پتا لگالیتا ہے اور وہاں ایمونیشن بلاسٹ ہونے سے کافی تباہی ہوتی ہے۔ چودھری افتخار کو کشور کے غیاب کے حوالے سے ڈیوڈ کی زبانی آفتاب اور افضل سے متعلق اطلاعات ملتی ہیں کہ ان افراد کی شخصیت مشکوک ہے۔ چودھری افتخار ماسٹر آفتاب کو اغوا کرالیتا ہے۔ شہریار کو جب اس کی اطلاع ملتی ہے تو وہ ڈیرے پر ریڈ کرتا ہے مگر آفتاب کو بازیاب نہیں کرا پاتا۔ ماہ بانو برف زار میں بھٹکتے بھٹکتے بے ہوش ہو جاتی ہے اور اس دوران اسے ایک مہربان شخص مل جاتا ہے جو کلا مخبر ہوتا ہے، وہ اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ ادھر کشور کو جب آفتاب کے اغوا کی خبر ملتی ہے تو وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ افضل اسے اسپتال لے کر جاتا ہے۔ جب وہ گھر پہنچتا ہے تو اسے اپنی بیوی بچوں کی لاشیں ملتی ہیں۔ ادھر مشابرم خان لڑائی کے دوران زخمی ہو جاتا ہے اور پاکستان آرمی والوں کے وہاں پہنچنے سے ان کی تحویل میں پہنچ جاتا ہے۔ شہریار ماسٹر آفتاب کو چھڑانے کے لیے جگو کا سہارا لیتا ہے اور جگو آفتاب کو چودھری کے چنگل سے نکال لاتا ہے۔ آفتاب کی حالت خاصی خراب ہوتی ہے۔ اسے لاہور کے اسپتال میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ ادھر کشور بھی صدمے سے بے ہوش ہوتی ہے۔ تاہم آفتاب کے وہاں پہنچنے پر اس کی حالت میں بہتری آنے لگتی ہے۔ دہشت گردوں کا ٹھکانا تباہ ہونے سے ڈیوڈ چراغ پا ہو جاتا ہے اور تحقیق کے لیے لنڈا کو پاکستان بھیجتا ہے۔ ادھر ماہ بانو کو بچانے والا مہربان شخص اپنے واقف کار کے توسط سے اسے ایک مخبر سے ملوا دیتا ہے جو ماہ بانو کی فراہم کردہ معلومات کے بعد اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ شہریار کو بھی اس واقعے کی اطلاع مخبر کے ذریعے مل جاتی ہے اور شہریار فوراً اسکردو پہنچ جاتا ہے اور مشابرم خان اور ماہ بانو کو آرمی کی تحویل سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر اسے یہ کہہ کر منع کر دیا جاتا ہے کہ انویسٹی گیشن جاری ہے تاہم وہ ماہ بانو کو چھڑانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اسے کراچی منتقل کرنے کا منصوبہ بنا لیتا ہے۔ ادھر صحافی افضل پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے لیکن وہ زخمی ہو کر اسپتال میں پہنچ جاتا ہے۔ اسپتال میں ایک میل نرس اسے میڈیسن دینے آتا ہے مگر وہ اسے دوائیں دینے نہیں بلکہ موت کے گھاٹ اتارنے آتا ہے۔ افضل اپنے بچاؤ کے لیے سائیڈ ٹیبل پر رکھی شیشی اسے مارتا ہے جو اس کی آنکھ پر لگتی ہے مگر دشمن کے ہاتھ میں موجود پستول سے فائر ہو چکا ہوتا ہے۔ دونوں کی چیخیں ایک ساتھ بلند ہوتی ہیں۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

گولی سینے میں داخل ہونے سے قبل افضل نے حملہ آور کو پہچان لیا تھا۔ وہ یقینی طور پر مہتاب کا وہی کزن تھا جس کو اس کا نام نہاد منگیتر ہونے کا شرف حاصل تھا۔ اپنے اس نیم خواندہ اور آوارہ گرد کزن کو اس کی بدکرداری کے سبب چھوڑ کر مہتاب نے افضل کا انتخاب کیا تھا۔ قبائلی رسم و رواج میں جکڑی مہتاب سیدھے راستے سے افضل کی شریکِ حیات نہیں بن سکتی تھی، چنانچہ اس نے بہت خاموشی سے اپنا گھر چھوڑ کر افضل سے کورٹ میرج کرلی تھی۔ افضل اور اس کے مابین تعلقات کا... کسی کو علم نہیں تھا اس لیے اس کے خاندان والوں کے لیے... افضل تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ کچھ ان دونوں میاں بیوی کی احتیاط پسندی بھی تھی جس نے اتنے برسوں تک انہیں محفوظ رکھا تھا لیکن مہتاب کا کزن یقیناً اتنے برسوں میں بھی چین سے نہیں بیٹھا تھا اور انتقام کے جنون میں آخرکار اس نے ان لوگوں کا کھوج لگا ہی لیا تھا۔ اب وہ افضل کی پھینکی ہوئی بوتل سے آنکھ پر چوٹ کھانے کے بعد بھی جنونی انداز میں ہنس رہا تھا۔ اسے اپنی آنکھ سے بہتے خون کے بجائے افضل کے سینے سے ابلتا خون کا فوارہ اور اس کا تکلیف سے تڑپتا جسم دکھائی دے رہا تھا۔ یہ منظر اس کے سینے میں برسوں سے جلتی انتقام کی آگ کے لیے باعثِ تسکین تھا۔

اپنی اس جنونی کیفیت میں وہ کمرے کے دروازے کا کھلنا محسوس نہیں کرسکا۔ وہ ایک نرس تھی جو ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ٹرے اٹھائے اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے آئی تھی لیکن دروازہ کھولتے ہی اسے جو منظر نظر آیا، اس نے پل بھر کے لیے اسے ساکت کردیا۔ اس کے سکتہ زدہ وجود میں پہلی حرکت ہاتھوں کی لرزش کی صورت میں پیدا ہوئی جس کے باعث اس کے ہاتھ میں موجود ٹرے گر پڑی۔ ٹرے گرنے کے ساتھ ہی اس کا منہ کھلا اور اس نے ایک زوردار چیخ ماری۔ ٹرے گرنے اور نرس کے چیخنے کی آوازیں سن کر جنونی قاتل دروازے کی طرف متوجہ ہوا اور تیزی سے نرس کی طرف قدم بڑھائے لیکن اس مرحلے پر نرس نے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا اور پھرتی سے باہر نکل کر دروازے کی باہر سے کنڈی لگا دی۔ نرس کی حرکت نے افضل کے قاتل کو یہ احساس دلادیا کہ وہ بری طرح پھنس چکا ہے... اس نے دیوانہ وار دروازے پر لاتیں اور مکے برسانے شروع کر دیے۔ ادھر نرس بھی مسلسل چیخ رہی تھی۔ اس ہنگامے نے بہت سے لوگوں کو متوجہ کر دیا۔ اسپتال میں موجود گارڈز بھی دوڑے آئے اور صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے لیکن خوف زدہ نرس سوائے چیخنے اور بند دروازے کی طرف اشارہ کرنے کے کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں تھی۔ بہرحال اس کے اشارے نے اتنا تو گارڈز کو سمجھا ہی دیا کہ جو بھی گڑبڑ ہے، وہ افضل کے کمرے کے اندر ہے۔ خاص طور پر دروازے کے ساتھ اندر سے کی جانے والی زور آزمائی بڑی معنی خیز تھی۔ گارڈز نے اپنی گنز سمیت دروازے کے باہر پوزیشن لے لی۔

”اندر جو کوئی بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا کر باہر نکل آئے۔ ہم دروازہ کھول رہے ہیں۔“ ایک گارڈ نے بلند آواز میں حکم جاری کیا۔ دوسری طرف خوف زدہ نرس کو اس کی دو ساتھی نرسیں مل کر سنبھالنے کی کوشش کررہی تھیں۔ انہوں نے اسے پکڑ کر ایک کرسی پر بٹھا دیا تھا اور اس کے ہونٹوں سے گلاس لگا کر اسے پانی پلانے کی کوشش کررہی تھیں۔ صورتِ حال ایسی تھی جس نے اچھے خاصے لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی اور اسپتال کے عملے کے علاوہ مریضوں کی عیادت کے لیے آنے والے کافی لوگوں کا بھی وہاں ہجوم لگ گیا تھا۔

”آپ سب لوگ یہاں سے ہٹ جائیں۔ ہم دروازہ کھول رہے ہیں۔ آپ لوگوں کے لیے خطرہ ہوسکتا ہے۔“ گارڈ بلند آواز میں چلایا۔ اس کی بات سن کر ہجوم منتشر ہونے لگا لیکن تجسس کے مارے دو چار افراد اب بھی ایسے تھے جو وہاں سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ گارڈ نے انہیں ایک بار پھر تنبیہ کی اور کوئی اثر نہ ہوتے دیکھ کر اپنے ساتھی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ دونوں نے آنکھوں آنکھوں میں کچھ طے کیا اور پھر ان میں سے ایک نے کنڈی ہٹا کر ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی ایک گولی سنسناتی ہوئی اندر سے آئی اور کاؤنٹر سے لگ کر کھڑے نوجوان کے سر میں گھس گئی۔ وہاں موجود لوگوں کی منظر دیکھ کر چیخیں نکل گئیں اور ڈھٹائی کا مظاہرہ کرنے والے بھی بھاگ کھڑے ہوئے۔

گارڈز ان لوگوں کی طرف سے بے نیاز اندر موجود شخص سے نمٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ تو طے ہو چکا تھا کہ اندر موجود شخص مسلح ہے اور کوئی نیک ارادہ نہیں رکھتا۔ چنانچہ گارڈز کو بھی اپنی گنز کا استعمال کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں ہوا اور وہ ایک دوسرے کو کور دیتے ہوئے فائرنگ کرتے ہوئے اندر گھس گئے۔ جواب میں اندر سے بھی گولیاں چلائی گئی تھیں لیکن گارڈز کی چلائی گئی گولیاں اپنا کام دکھا چکی تھیں چنانچہ اندر موجود شخص کو دوسے زیادہ فائر کرنے کا موقع نہیں ملا۔

مسلح گارڈز جب کمرے کے اندر داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ بستر پر موجود مریض اپنے ہی خون میں نہایا ہوا ساکت پڑا ہے جبکہ دوسرے شخص کی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ اس کے دائیں شانے اور پیٹ میں گولیاں لگی تھیں۔ ایک آنکھ سے بھی خون بہہ رہا تھا جو اس کے چہرے پر پھیل کر اسے کافی بھیانک بنا رہا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر فرش پر پڑا پسٹل ظاہر کر رہا تھا کہ کچھ دیر قبل وہی اس پسٹل کو استعمال کر رہا تھا لیکن گارڈز کی چلائی گئی گولیوں نے کام دکھایا اور وہ پسٹل استعمال کرنے کے قابل نہیں رہا۔ حملہ آور کو بے دست و پا پا کر گارڈز نے امدادی کارروائی شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ فوراً ہی اسپتال کے منتظم کو بھی صورت حال کی اطلاع کر دی گئی اور پھر اس کے حکم پر ڈاکٹرز اور پیرا میڈیکل اسٹاف حرکت میں آ گیا۔ افضل کے سرسری معائنے سے ہی اندازہ ہو گیا کہ اس کے سینے میں لگنے والی گولی کام دکھا چکی تھی اور اس کی روح کا جسم سے رشتہ ٹوٹ چکا تھا جبکہ زخمی حملہ آور نازک حالت میں ہونے کے باوجود زندہ تھا۔ اس شخص کے قاتل ہونے سے قطع نظر اسے طبی امداد دی جانے لگی۔ اتفاق سے تھانہ، اسپتال سے قریب ہی تھا اور یہ سارا ہنگامہ شروع ہوتے ہی وہاں اطلاع کر دی گئی تھی۔ چنانچہ پولیس خلافِ عادت کافی جلدی وہاں پہنچ گئی تھی۔ پولیس والوں کی موجودگی اور اجازت نے اسپتال کی انتظامیہ کے لیے حملہ آور کو بروقت طبی امداد پہنچانا آسان کر دیا تھا لیکن جب ڈاکٹرز نے اس کا ٹریٹمنٹ شروع کیا تو انہیں احساس ہو گیا کہ ان کی کوششیں کارگر ثابت نہیں ہوں گی اور کسی بھی لمحے یہ شخص اپنی زندگی ہار جائے گا۔ انہوں نے پولیس کارروائی کے لیے وہاں رکے ہوئے پولیس آفیسر کو صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ ڈاکٹرز کی زبانی یہ جاننے کے بعد کہ حملہ آور فی الحال زندہ ہے اور بیان دینے پر رضامند بھی نظر آتا ہے، اس نے فوراً کارروائی کے لیے کمر باندھ لی۔ اس کے ساتھی پہلے ہی جائے وقوعہ کی تفصیلات جمع کرنے، آلۂ قتل کو اپنے قبضے میں لینے اور عینی شاہدین کے بیانات لینے کا کام کر رہے تھے۔ حملہ آور کی گولی کا شکار ہو جانے والے نوجوان کی لاش بھی کاؤنٹر کے پاس سے اٹھوا لی گئی تھی لیکن ان کارروائیوں سے بڑھ کر حملہ آور کا بیان تھا۔ اس کے بیان سے صورت حال واضح ہو جاتی اور پولیس کو زیادہ مغز ماری کی زحمت نہیں کرنی پڑتی۔ چنانچہ انکوائری آفیسر ڈاکٹرز کی طرف سے اشارہ ملتے ہی فوراً اپنے معاون کے ساتھ قریب المرگ حملہ آور کے پاس جا پہنچا۔

''میرا نام صائب خان ہے۔ صحافی افضل اور اس کے بیوی بچوں کا قتل میں نے ہی کیا ہے اور مجھے اپنے اس عمل پر کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔'' پولیس والوں کو دیکھتے ہی حملہ آور نے انہیں کسی سوال کی مہلت دیے بغیر خود ہی بولنا شروع کر دیا۔

''تم نے ان لوگوں کو کیوں قتل کیا؟ کیا تمہاری افضل سے کوئی دشمنی تھی؟'' انکوائری آفیسر نے تیزی سے سوال کیا جس کے جواب میں صائب خان کے چہرے پر نفرت چھا گئی۔

''افضل نے میری غیرت کو للکارا تھا۔ افضل کی بیوی مہتاب میری بچپن کی منگ تھی لیکن اس نے نہ جانے کب اسے ورغلا کر اپنے ساتھ بھاگنے پر آمادہ کر لیا۔ اس نے یہ کام اتنی ہوشیاری سے کیا تھا کہ مجھ سمیت کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکا کہ مہتاب کو ورغلا کر لے جانے والا وہ ہے۔ بہر حال میں نے قسم کھائی تھی کہ جس کسی نے بھی یہ کام کیا ہے، میں مرتے دم تک اسے تلاش کروں گا اور اس سے انتقام لے کر رہوں گا۔'' صائب خان کے ہر لفظ سے زہر ٹپک رہا تھا۔ اس کی حالت سے صاف ظاہر تھا کہ اسے سانس لینے میں مشکل پیش آ رہی ہے لیکن اس حالت میں بھی وہ نفرت و غصے کے جذبات سے بھرا ہوا تھا۔ درحقیقت اپنے قول کے مطابق اس نے مرتے دم تک اپنی غیرت کو للکارنے والے سے دشمنی نبھائی تھی۔

''پھر تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ افضل ہی تمہاری کزن مہتاب کو بھگا کر لے گیا تھا؟'' پولیس آفیسر کو صائب خان کی اکھڑی سانسوں سے زیادہ ساری کہانی جان لینے میں دلچسپی تھی۔

''ایک دن میں... ٹی وی پر ایک ٹاک شو دیکھ رہا تھا، تب میں نے افضل کو دیکھا اور مجھے یاد آیا کہ ایک بار یہ صحافی ہمارے ہاں آ کر رکا تھا۔ اگرچہ یہ مہتاب کے غائب ہونے سے بہت پہلے کی بات تھی لیکن پھر بھی میرے دل میں یہ خیال آ گیا کہ ہو سکتا ہے کہ اس سارے معاملے کے پیچھے افضل ہو۔ اپنے شک کی بنیاد پر میں افضل کو تلاش کرتا ہوا لاہور آ گیا۔ یہاں آ کر مجھے اس کے دفتر کا پتا معلوم کرنے میں

زیادہ مشکل نہیں ہوئی۔ دفتر ہی سے میں نے اس کے گھر کا پتا حاصل کر لیا اور خاموشی سے وہاں پہنچ کر نگرانی کرنے لگا۔ میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ اگر مہتاب ہی افضل کی بیوی ہے تو وہ کسی وقت تو گھر سے باہر نکلے گی اور میں اسے پہچان لوں گا۔ مہتاب گھر سے باہر تو نہیں نکلی لیکن افضل کے گھر پہنچنے پر اس نے گیٹ کھولا تو مجھے اس کی ایک جھلک نظر آ گئی۔ اسے دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں اس وقت تو وہاں سے واپس آ گیا لیکن آدھی رات کے بعد پھر وہاں پہنچا۔ میرا ارادہ تھا کہ سوتے میں خاموشی سے افضل اور مہتاب کا کام تمام کر دوں گا لیکن اس رات جب میں ان کے گھر میں داخل ہوا تو افضل گھر پر نہیں تھا۔ میں نے مہتاب اور اس کے بچوں کو گولی مار کر ختم کر دیا اور اس کے بعد افضل کی تاک میں رہنے لگا۔ ایک بار مجھے موقع ملا تو افضل کو اس کی قسمت نے بچا لیا لیکن وہ کب تک بچتا؟ دیکھ لو! آخرکار میں نے اس سے اپنا انتقام لے ہی لیا۔'' اپنی بات کے اختتام پر صائب خان نے ایک وحشیانہ قہقہہ لگایا لیکن..... اپنے قہقہے کی تاب نہیں لا سکا۔ اس کی ڈوبتی ابھرتی سانسوں میں اس قہقہے نے اکھاڑ پچھاڑ مچا دی۔ وہاں موجود ڈاکٹر تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ اس کی زندگی سے پہلے ہی مایوسی ظاہر کر دینے کے باوجود ڈاکٹر کو اپنی پیشہ ورانہ ذمے داری تو نبھانی ہی تھی۔ ویسے اسے حیرت تھی کہ صائب خان نے اتنا لمبا چوڑا بیان کس طرح دے دیا؟ یقیناً یہ اپنے مقصد میں کامیابی کا نشہ... تھا جو اس نے موت کی آغوش میں جاتے جاتے بھی بڑے فخر سے اپنا سارا کارنامہ سنا ڈالا تھا۔

☆☆☆

''میں نے حادثے کے متعلق معلومات حاصل کر لی ہیں۔ اب میں تمہیں بتا سکتی ہوں کہ کیا ہوا تھا جس کی وجہ سے ہم اپنا اتنا اہم ٹھکانا کھو بیٹھے۔'' لنڈا نیویارک میں موجود ڈیوڈ کو رپورٹ پیش کرنے کے لیے تیار تھی۔ میجر ذیشان سے اس نے ایک رات میں ہی اتنا کچھ اگلوا لیا تھا کہ اس پر صورت حال واضح ہو گئی تھی۔

''گڈ! مجھے تم سے اسی تیز رفتاری کی امید تھی اسی لیے تو میں نے تمہاری جدائی گوارا کر کے تمہارا پاکستان جانا منظور کر لیا تھا۔'' اس کی طرف سے کامیابی کی نوید سن کر ڈیوڈ کھل اٹھا۔

''میں جانتی ہوں ڈارلنگ! اگر یہاں میری اتنی ضرورت نہیں ہوتی تو میں خود بھی تم سے دور رہنا پسند نہیں کرتی۔ لیکن مجھے اس معاملے کے ساتھ ساتھ چودھری کو بھی تو دیکھنا ہے۔ تم جانتے ہو کہ ہم چودھری کو جس پروجیکٹ کے

جی ہاں! یہ کینوس بالکل سادہ ہیں کیونکہ آج کل میں چھٹی پر ہوں

لیے استعمال کر رہے ہیں، وہ بھی کم اہم نہیں ہے۔'' اس کی بات پر مسکراتے ہوئے لنڈا نے اسے جواب دیا۔ موساد کے لیے خدمات انجام دیتے ہوئے اگرچہ وہ بے شمار مردوں کو اپنی جسمانی قربت سے فیض یاب کر چکی تھی لیکن ڈیوڈ کا معاملہ سب سے جدا تھا۔ وہ واقعی ڈیوڈ سے محبت کرتی تھی۔

''میں سب سمجھتا ہوں۔ تم باقی باتیں جانے دو اور فی الحال مجھے اس معاملے کی تفصیلات بتاؤ کہ تم نے کیسے اور کیا معلومات حاصل کیں؟''

''اپنے مقامی نمائندے سے ہمیں یہ تو معلوم ہو ہی گیا تھا کہ اس کیس کی تحقیقات آرمی انٹیلی جنس کا ذیشان نامی ایک میجر کر رہا ہے۔ بس میں اس میجر کو اپنے دام میں لے آئی اور توقع کے خلاف ایک رات میں ہی اس سے بہت کچھ اگلوا لیا ہے۔ بے چارہ شاید عرصے سے عورت کی قربت کے لیے ترسا ہوا تھا اس لیے فوراً ہی میرے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔ میجر ذیشان اور اپنے آدمیوں سے مجھے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، ان کے مطابق ہمارے نقصان کا سبب وہ لڑکی ماہ بانو بنی ہے جسے تم نے اغوا کروا کر پہاڑی ٹھکانے پر قید.... کیا تھا۔ اسسٹنٹ کمشنر شہریار عادل نے چونکہ اسے اپنی ذمے داری پر بلتستان بھجوایا تھا، چنانچہ وہ اس کے اغوا کا سن کر بہت پریشان ہوا اور اس نے اپنے ڈرائیور مشابرم خان کو بھائی کی تدفین میں شرکت کے علاوہ ماہ بانو کی تلاش کے لیے بھی بلتستان روانہ کر دیا۔ مشابرم خان خود بھائی کی موت کا انتقام لینے کے لیے پاگل ہو رہا تھا چنانچہ اس نے دل و جان

سے ماہ بانو کو اغوا کرنے والوں کی تلاش شروع کر دی۔ ہمارے لوگ اس کی ساری کارروائیاں دیکھ رہے تھے لیکن انہیں امید نہیں تھی کہ مشابرم خان، ماہ بانو تک پہنچ سکے گا لہٰذا انہوں نے اسے چھیڑنا غیر ضروری سمجھا اور دور سے ہی اس پر نظر رکھے رہے۔ وہ اپنی تلاش کے سلسلے میں پہاڑوں کی طرف روانہ ہوا، تب بھی کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ یہی خیال تھا کہ وہ کسی صورت پہاڑی ٹھکانے تک نہیں پہنچ سکتا اور ناکام ہو کر خود ہی واپس پلٹ جائے گا۔ لیکن مشابرم خان کی قسمت نے اس کا ساتھ دیا اور وہ ٹھکانے پر جا پہنچا۔ وہاں اس کی ہمارے آدمیوں سے جھڑپ ہوگئی اور کچھ اس طرح کی صورتِ حال پیش آئی کہ پہلے وہاں موجود ایندھن میں پھر اسلحے کے ذخیرے میں آگ لگ گئی جس کا نتیجہ دھماکوں کی صورت میں نکلا اور وہاں موجود تقریباً سارے ہی لوگ مارے گئے۔ چند ایک افراد کے ساتھ مشابرم خان زخمی حالت میں زندہ بچ نکلا اور اس نے آرمی والوں کو ساری تفصیلات سنا دیں۔ باقی زخمیوں میں سے دو آدمی..... زخموں کی تاب نہ لا کر مر گئے جبکہ تین کو ہمارے آدمیوں نے باری باری خفیہ طور پر موت کی نیند سلا دیا تا کہ وہ کوئی بیان دینے کے لیے باقی..... نہ رہیں۔ مشابرم خان تک البتہ ان کی رسائی نہیں ہو سکی۔ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر آرمی انٹیلی جنس والوں نے اسے بہت خفیہ طور پر اپنی تحویل میں رکھا ہوا ہے۔ خود میجر ذیشان بھی اب اپنے آفیسر کرنل توحید کو مطلع کیے بغیر اس سے ملاقات نہیں کر سکتا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ ماہ بانو بھی اب زندہ نہیں رہی ہے۔'' ساری تفصیلات سننے کے بعد ڈیوڈ نے تبصرہ کیا۔

''یہ تو بالکل سامنے کی بات ہے اور اسے تو ہم نے پہلے ہی سمجھ لیا تھا۔ وہ وہاں موجود تھی تو اس کو بھی باقی لوگوں کے ساتھ مرنا ہی تھا۔ میرے خیال میں تو اس کے جسم کے اتنے ٹکڑے ہو گئے ہوں گے کہ دھماکوں کے بعد وہاں کارروائی کرنے والوں کو اندازہ بھی نہیں ہو سکا ہوگا کہ مرنے والوں میں کوئی عورت بھی تھی...... مجھے میجر ذیشان نے بتایا ہے کہ جو لوگ غار کے اندر رہ گئے تھے، ان کی ہڈیوں کا سرمہ بن گیا ہے۔ ماہ بانو لازمی بات ہے کہ غار کے اندر ہی تھی اس لیے اس کا بھی یہی حال ہوا ہوگا۔ تمہیں ان تھرڈ ورلڈ کنٹریز کے کام کرنے کا انداز تو معلوم ہی ہے۔ یہ لوگ اتنی محنت کہاں کرتے ہیں کہ ملبے سے ملنے والے ایک ایک عضو کا تجزیہ کریں۔ انہوں نے تو بس سب کچھ سمیٹ کر ایک اجتماعی قبر میں دفنا دیا ہوگا۔ ویسے بھی آرمی انٹیلی جنس اپنی نااہلی کو چھپانے کے لیے اس حادثے کی اصلیت چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ انہوں نے میڈیا والوں کو بھنک بھی نہیں پڑنے دی ہے کہ اصل ماجرا کیا تھا۔'' لنڈا کے لہجے میں وہی تحقیر تھی جو ترقی یافتہ ممالک کا شاید ہر فرد تیسری دنیا کے افراد کے لیے اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔ اپنے اسی طرزِ فکر کی وجہ سے اس نے میجر ذیشان کو ماہ بانو کے سلسلے میں کریدنے کی کوشش نہیں کی تھی ورنہ اس کی معلومات زیادہ مکمل اور مستند ہوتیں۔

''پاکستان آرمی انٹیلی جنس کا شک کس پر ہے؟ وہ اس سیٹ اپ کے پیچھے کس کا ہاتھ سمجھ رہے ہیں؟''

''ہماری پلاننگ کے مطابق ان کا شک انڈیا پر ہی گیا ہے۔ اسلحہ اور دیگر ساز و سامان چونکہ زیادہ تر ہم نے انڈیا سے ہی اسمگل کروا کر وہاں پہنچایا تھا اس لیے انہوں نے انڈیا کو ہی اس کا ذمے دار سمجھا ہے۔ ویسے بھی دونوں ملکوں کے درمیان دشمنی اتنی گہری ہے کہ وہ اپنے اپنے ملک میں ہونے والی ہر تخریبی کارروائی کا ذمے دار ایک دوسرے کو ہی ٹھہراتے ہیں۔'' لنڈا کا یہ جواب کافی حد تک حقیقت پر مبنی تھا۔ اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر.... انہوں نے یہ منصوبہ بندی کی تھی کہ اگر کبھی ان کا بنایا سیٹ اپ پکڑا بھی جائے تو شک انڈیا پر ہی رہے۔ پہاڑی ٹھکانے کے علاوہ ان کے تیار کردہ جو دہشت گرد ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے، ان کے پاس بھی زیادہ تر بھارتی ساختہ اسلحہ ہی ہوتا تھا۔ البتہ ساتھ ہی کچھ روسی ساز و سامان بھی اس کے ساتھ شامل تھا اور وہ بھی اس لیے کہ انڈیا والوں کو انہوں نے یہ تسلی دی ہوئی تھی کہ وہ انڈیا اور روس کے پاکستان کے قریبی ممالک ہونے کی وجہ سے ان کی مصنوعات استعمال کروا رہے ہیں کیونکہ اس طرح مال اسمگل کرنے میں سہولت کے ساتھ ساتھ اخراجات بھی کم آتے ہیں۔

''چلو کم از کم یہاں تو ہم کامیاب رہے ورنہ یہ سوچ سوچ کر کہ پہاڑی ٹھکانے کی تباہی کے ساتھ ساتھ ہماری اس پر کی گئی کثیر سرمایہ کاری بھی برباد ہو گئی ہے، میرا سر پھٹنے لگا تھا۔ عام آبادی سے ہٹ کر بالکل الگ تھلگ اور محفوظ لوکیشن دوبارہ ملنا اور پھر وہاں نیا سیٹ اپ قائم کرنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔ اس پروجیکٹ پر تو ہم نے انڈیا کو یہ لالچ دے کر بھی اچھی خاصی سرمایہ کاری ان سے کروالی تھی کہ کبھی پاکستان اور اس کے درمیان جنگ چھڑی تو پہاڑی ٹھکانے پر موجود جنگجو اس کے بہت کام آئیں گے۔'' ڈیوڈ کا دکھ کسی طرح کم نہیں ہو پا رہا تھا۔

''جو ہوا اسے جانے دو۔ سب کچھ بہرحال ختم نہیں ہوا

ہے۔ ہمارے تربیت یافتہ لوگ پورے پاکستان میں پھیلے ہوئے ہیں اور انہیں کبھی بھی کسی بھی مقصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔'' لنڈا نے ڈیوڈ کو تسلی دی اور یہ تسلی اتنی غلط بھی نہیں تھی۔ وہ لوگ واقعی بھارتی ایجنسی کے ساتھ مل کر اپنا بہت وسیع نیٹ ورک قائم کر چکے تھے۔ عملاً یہ نیٹ ورک بھارت کے ہی کنٹرول میں تھا لیکن را اور موساد کا آپس کا گٹھ جوڑ اتنا مضبوط تھا کہ اگر وہ لوگ کوئی فرمائش کرتے تو را کے لیے انکار ممکن نہیں تھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟ کہاں ہو اور کیا کر رہی ہو؟'' ڈیوڈ نے اپنا ذہن ہونے والے نقصان کی طرف سے ہٹاتے ہوئے اس کا آئندہ کا لائحہ عمل جاننا چاہا۔

''میں اسکردو سے نکل گئی ہوں۔ ویسے تو میں نے میجر ذیشان کو پوری طرح نشے میں مدہوش کرنے کے بعد اس سے ساری معلومات حاصل کی تھیں اور مجھے امید ہے کہ اسے بالکل بھی یاد نہیں ہوگا کہ وہ مجھے کیا کچھ بتا چکا ہے...... پھر بھی میرا مزید یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں تھا اس لیے میں فوری طور پر نکل گئی۔ ویسے بھی مجھے اب چودھری کو نمٹانا ہے۔ اس سے فارغ ہو کر میں جلد از جلد واپس تمہارے پاس پہنچنا چاہتی ہوں۔''

''اوکے، وش یو بیسٹ آف لک۔ تم جلد از جلد اپنا کام مکمل کر کے واپس آؤ۔ میں یہاں بے قراری سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' ڈیوڈ نے بھی جواباً اس پر اپنی محبت جتائی اور پھر سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس سے رابطہ ختم ہونے کے بعد لنڈا ایک اور شخص سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ جلد ہی وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گئی۔

''حکم کیجیے میڈم! آج آپ کو ہماری یاد کیسے آ گئی؟'' مخصوص کوڈ ورڈ کی ادائیگی کے بعد جب دوسری طرف.... موجود شخص کو یہ یقین ہو گیا کہ وہ لنڈا ہے تو اس نے بڑے خوشامدی لہجے میں پوچھا۔ وہ ان لوگوں میں سے.... تھا جنہیں لنڈا کا قرب حاصل کرنے کا شرف حاصل ہو چکا تھا.... ایک بار کی قربت میں ہی وہ اس حد تک اس کا گرویدہ ہو گیا تھا کہ اس کے کہنے پر کچھ بھی کر سکتا تھا۔ ویسے تو اگر لنڈا کی جگہ کوئی بدصورت عورت ہوتی، تب بھی اسے اس کے حکم کی پیروی کرنی ہی ہوتی کہ...... موساد کی ٹاپ ایجنٹ کو ٹالنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

''یاد کی بھی تم نے خوب کہی نارائن! ہمارا جو اتنا بڑا نقصان ہوا ہے اس کے بعد بھی کیا ہم تمہیں یاد نہ کریں؟'' لنڈا نے کاٹ دار لہجے میں مخاطب سے سوال کیا۔

''بالکل میڈم بالکل! بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ جو کچھ ہوا، وہ آپ سے بڑھ کر ہمارا نقصان ہے۔'' نارائن فوراً سنجیدہ ہو گیا۔

''تو پھر کوئی ایسا کام کرو کہ نقصان کی تلافی بے شک نہ ہو لیکن ہمارا دشمن بھی بری طرح بلبلا اٹھے۔'' اس نے یوں فرمائش کی جیسے اپنے کسی عاشق سے کسی عمدہ ریسٹورنٹ میں ڈنر کا وعدہ لے رہی ہو۔

''آپ فکر نہ کریں میڈم! یہ کام ہو جائے گا۔ ہم خود بھی پہلے سے اس کی پلاننگ کر رہے ہیں۔'' نارائن نے اسے تسلی دی۔

''بہت خوب! تمہاری عمدہ کارکردگی کا انعام... سمجھو کہ مجھ پر ادھار رہے گا۔ جب بھی ہمارا ملنا ہوا، میں تمہیں یہ انعام دینے میں دیر نہیں لگاؤں گی۔'' لنڈا نے اسے کسی لالچی بچے کی طرح لالی پاپ دکھایا۔ اسے یقین تھا کہ دوسری طرف موجود نارائن کی ابھی سے رال ٹپکنے لگی ہوگی۔ را کے ایک اعلیٰ عہدے دار کی حیثیت سے کام کرنا اپنی جگہ لیکن مستقبل میں لنڈا کی قربت کا وعدہ اسے کئی گنا فعال کر دیتا اور نارائن جیسے سفاک فطرت آدمی کی اعلیٰ کارکردگی میں اتنی سفاکی تو بہرحال ہوتی کہ پاکستانیوں کو ایک لمبی مدت تک اپنے زخم چاٹنے پڑتے۔

☆☆☆

شہریار بڑی گہری نیند سو رہا تھا۔ آج بہت عرصے بعد اسے اتنی پُرسکون نیند آئی تھی ورنہ ماہ بانو کے اغوا کے بعد سے تو اس کے لیے..... اطمینان سے سونا ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ بے شمار الجھنیں، مسائل اور پریشانیاں اپنی جگہ لیکن سب سے زیادہ ماہ بانو کا غیاب... تھا جس نے اس کے دل کو بے کل سا کر رکھا تھا۔ وہ اپنے دل میں ماہ بانو کے لیے موجود جذبے کا چاہے خود سے اعتراف کرنے سے گریز کرتا تھا لیکن محبت کو ایسے کسی اعتراف کی ضرورت بھی کب ہوتی ہے؟ وہ تو خود اپنا آپ تسلیم کروا کر چھوڑتی ہے۔ یہ محبت کی زورآوری ہی تو تھی جو آج وہ دل میں یہ اطمینان محسوس کرنے کے بعد کہ ماہ بانو اپنے دشمنوں کی دسترس سے دور ایک محفوظ ٹھکانے پر موجود ہے اور ایک بار پھر اپنی زندگی کو قرینے سے شروع کر سکتی ہے، چین کی نیند سو رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ کراچی جیسے پُرہجوم شہر میں ماہ بانو کا وجود اس طرح گم ہو جائے گا کہ اگر کوئی ڈھونڈنا بھی چاہے گا تو نہ ڈھونڈ سکے گا...... ویسے بھی، اب کسی کا اسے ڈھونڈنے کے لیے نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ

سمجھ لیا گیا تھا کہ ماہ بانو مر چکی ہے۔ اس کے زندہ ہونے کے راز سے چند ہی لوگ واقف تھے اور یہ چند لوگ ایسے تھے جن کی زبان پر حقیقت آنے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ چنانچہ اگر وہ مطمئن ہو کر گہری، پُرسکون نیند سو رہا تھا تو یہ اس کا حق تھا۔ اس نے بہت سی راتیں یونہی بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے بھی تو گزاری تھیں اور اپنے ان رت جگوں کا کسی کے سامنے ذکر تک نہیں کر سکا تھا۔ بہت سے رت جگوں کے بعد اسے آج کہیں جا کر سکون کی نیند نصیب ہوئی تھی لیکن دشمنوں کو اس کا یہ سکون گوارا نہیں تھا۔ یک دم ہی اس کے موبائل کی گھنٹی... بجنے لگی اور کمرے کی پُرسکون فضا میں ارتعاش سا پیدا ہو گیا۔ وہ بہت بے مزہ ہو کر نیند سے جاگا اور سائڈ ٹیبل پر رکھے موبائل کو ہاتھ بڑھا کر اٹھا لیا۔ اسکرین پر پیر آباد کے ماسٹر منیب کا نام آ رہا تھا۔

ابھی کچھ دن قبل ہی اس کے اور منیب کے درمیان موبائل نمبرز کا تبادلہ ہوا تھا۔ آفتاب کی اسکول سے غیر موجودگی میں ضروری تھا کہ کوئی ایسا بندہ اس سے رابطے میں رہتا جس کے ذریعے وہ پیر آباد کے حالات کے بارے میں خیر خبر لیتا رہتا۔ اسی مقصد کے تحت اس نے منیب کو اپنا براہِ راست رابطہ نمبر دے دیا تھا۔ وہ اسکول میں کام کرنے والے استادوں میں سے سب سے زیادہ سینئر ہونے کے علاوہ آفتاب کے قریب رہنے کی وجہ سے بھی اس کے لیے زیادہ قابلِ بھروسا تھا اور اب اتنی رات گئے منیب اس کے موبائل پر کال کر رہا تھا تو یہ ایک تشویش ناک بات تھی۔ دل میں سخت پریشانی محسوس کرتے ہوئے اس نے کال ریسیو کر لی لیکن بہر حال اس کی آواز میں ایسی کوئی علامت موجود نہیں تھی جس سے دوسری طرف موجود شخص اندازہ لگا سکتا کہ وہ پریشان ہے یا گہری نیند سے جاگا ہے۔

''خیریت تو ہے منیب! تم نے اتنی رات کو کس سلسلے میں فون کیا ہے؟'' اس نے ٹھہری ہوئی آواز میں پوچھا۔

''خیریت نہیں ہے سر! صورتِ حال بہت خراب ہے۔'' دوسری طرف سے منیب کی ہیجان زدہ آواز سنائی دی۔

''کیوں... کیا ہو گیا ہے؟'' اپنے اندیشوں کو درست ثابت ہوتے دیکھ کر اس نے پوچھا۔

''چودھری کے بندوں نے اسکول کی عمارت کو آگ لگا دی ہے۔ انہوں نے یہ کام چھپ چھپا کر کرنے کے بجائے کھلم کھلا کیا ہے اور اب اس مکان کو گھیرے کھڑے ہیں جس میں ہم ٹیچرز رہائش پذیر ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم سب ابھی فوری طور پر گاؤں چھوڑ کر چلے جائیں ورنہ ہمارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ وہ سب مسلح ہیں اور بری طرح دروازہ پیٹ رہے ہیں لیکن میں اور میرے ساتھی خوف زدہ ہیں۔ اگر ہم ان کے کہنے پر ابھی گاؤں چھوڑنے کے لیے مکان سے باہر نکلتے بھی ہیں تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ ہمیں نقصان نہیں پہنچائیں گے... لیکن ہم زیادہ دیر اس مکان میں بند رہ کر بھی محفوظ نہیں رہ سکتے۔ وہ لوگ چاہیں تو بہت آرام سے دروازہ توڑ کر اور دیواریں پھلانگ کر اندر آ سکتے ہیں۔'' منیب نے لرزتی ہوئی آواز میں اسے ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا اور یقیناً یہ صورتِ حال بے حد گمبھیر تھی۔ شہریار نے اپنی سماعت پر تھوڑا سا زور دیا تو اسے بھی وہ آوازیں سنائی دینے لگیں جس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ منیب کے بیان کے مطابق مکان کے دروازے کو بری طرح پیٹا جا رہا ہے۔

''تم موبائل آف مت کرنا منیب! موبائل آن رکھتے ہوئے... تم دروازے کے قریب جاؤ اور باہر موجود لوگوں سے مذاکرات کر کے انہیں اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کرو کہ تم لوگوں کو وہاں سے نکلنے کے لیے صبح تک کی مہلت دے دی جائے۔ اگر وہ صبح تک انتظار کے لیے راضی نہ ہوں تو ان سے کم سے کم دو ڈھائی گھنٹے کی مہلت لے لو۔ اس دوران میں تمہاری مدد کے لیے کوئی بندوبست کرتا ہوں۔''

اس نے منیب کو ہدایات جاری کیں اور خود لینڈ لائن پر ایس پی کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اس کی سماعتیں اگر ایک طرف جاتی رنگ ٹون کو سن رہی تھیں تو دوسری طرف اس نے منیب کی آواز پر بھی کان لگائے ہوئے تھے۔

''میری بات سنو! رک جاؤ۔ میں اور میرے ساتھی تمہاری بات ماننے کے لیے تیار ہیں۔ ہم یہ جگہ چھوڑ کر چلے جائیں گے۔'' وہ اس کے حسبِ ہدایت دروازے کے قریب جا کر بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔

''چلے نہیں جائیں گے، ابھی باہر نکلو اور اپنی راہ لو۔'' جواب میں دروازہ دھڑ دھڑانے کا سلسلہ رکا اور ایک سخت کھردری آواز سنائی دی۔ عین اسی وقت ایس پی کی طرف سے شہریار کی کال ریسیو کر لی گئی اور وہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''ایس پی صاحب! فوری طور پر ایک ٹیم پیر آباد روانگی کے لیے تیار کریں۔ وہاں اسکول کی عمارت میں آگ لگا دی گئی ہے اور ساتھ ہی اسکول ٹیچرز اپنی رہائش گاہ پر سخت خطرے سے دوچار ہیں۔ ان کے مکان کو چودھری کے کارندوں نے گھیر لیا ہے اور مسلسل انہیں ہراساں کر رہے ہیں۔'' اپنے موبائل کے ماؤتھ پیس والے حصے کو مکمل طور پر

ہتھیلی سے...... بند کرتے ہوئے اس نے ایس پی کو احکامات جاری کیے اور... صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھنے کا مقصد یہ تھا کہ منیب اس کی آواز نہ سن سکے۔ اگر وہ یہ سن لیتا کہ شہریار کے نزدیک بھی ان لوگوں کی زندگی کے لیے خطرہ تھا تو اس کا حوصلہ پست ہو جاتا۔ ابھی تو وہ دل میں اچھی امید رکھتے ہوئے چودھری کے کارندوں سے مذاکرات کر کے انہیں اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ لوگ انہیں صبح تک کی مہلت دینے پر تیار ہو جائیں۔ شہریار ان مذاکرات کو اپنے موبائل پر سن سکتا تھا۔

''میں آرڈر جاری کرتا ہوں سر! اور ساتھ ہی یہ کوشش بھی کرتا ہوں کہ ہمارے محکمے کے جو لوگ پیر آباد میں تعینات ہیں، کسی طرح ان سے رابطہ ہو سکے۔ جب تک یہاں سے پولیس پارٹی پہنچے، وہ لوگ صورتِ حال کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔'' ایس پی کافی مناسب آدمی تھا چنانچہ اس کا حکم سن کر کوئی حیل و حجت کرنے کے بجائے فوراً مستعد ہو گیا اور اپنی طرف سے ایک تجویز بھی پیش کی۔

''آپ کوشش کر کے دیکھ لیں لیکن مجھے امید نہیں کہ وہ لوگ کچھ کر سکیں گے۔ ایک تو وہ تعداد میں ہی دو تین سے زیادہ نہیں ہیں، دوسرے ان میں اتنی ہمت بھی نہیں ہوگی کہ چودھری کے کارندوں کے مقابلے پر کھڑے ہو سکیں... بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ خود بھی چودھری کے ہی نمک خوار ہوں۔'' اس نے ٹھنڈے لہجے میں ایک نہایت تلخ حقیقت بیان کی۔

''اوکے سر! پھر میں ویسا ہی کرتا ہوں جیسا آپ نے کہا ہے۔'' ایس پی نے بھی فوراً اس کی بیان کردہ حقیقت کو تسلیم کر لیا۔ ایس پی کی کال سے فارغ ہو کر وہ... منیب اور چودھری کے کارندوں کے درمیان ہونے والی بحث کی طرف دوبارہ متوجہ ہوا۔

''دو گھنٹے کیا ہم دو منٹ کے لیے بھی تم لوگوں کو اس گاؤں میں برداشت نہیں کر سکتے۔ فوراً باہر نکلو اور جس حال میں بھی ہو، یہاں سے نکل پڑو... ورنہ تمہارا وہ حال کریں گے جسے دیکھ کر کسی میں ہماری حکم ماننے سے انکار کی جرأت ہی نہیں رہے گی۔'' منیب نے یقیناً اس کی ہدایت کے مطابق مذاکرات کو آگے بڑھایا تھا لیکن چودھری کے کارندے بھی اسی کی طرح ضدی... اور ہٹ دھرم تھے چنانچہ چیختی ہوئی آواز میں منیب کو یہ دھمکی دی گئی۔ شہریار نے بھی اپنے موبائل پر ایک ایک لفظ سنا اور اپنا وارڈ روب کھول کر اس میں سے لباس نکالنے لگا۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھا چنانچہ باہر نکلنے سے پہلے لباس کی تبدیلی ضروری تھی۔ رات کے اس پہر کوئی پُرتکلف لباس منتخب کرنے کے بجائے اس نے لائن سے استری کر کے ٹنگے ہوئے کپڑوں میں سے ایک سادہ سی شرٹ اور جینز کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس لمحے اچانک.... اس کی موبائل پر گرفت کمزور ہوئی اور موبائل اس کی انگلیوں سے پھسلتا ہوا نیچے زمین کی طرف گرنے لگا۔ اس نے پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے موبائل کو زمین تک پہنچنے سے پہلے ہی دوبارہ پکڑ لیا لیکن جب موبائل اس نے کان سے لگایا تو اس میں سے ہر قسم کی آوازیں معدوم ہو چکی تھیں۔ اس نے موبائل کی اسکرین آنکھوں کے سامنے کی۔ منیب سے اس کی کال منقطع ہو چکی تھی۔ یقیناً گرتے ہوئے موبائل کو کیچ کرنے کے چکر میں سرخ بٹن پش ہو گیا تھا جس کے باعث لائن کٹ گئی تھی۔

اس نے لباس نکال کر وارڈ روب بند کی اور دوبارہ رابطے کی کوشش کرنے لگا لیکن منیب کی طرف سے کال ریسیو نہیں کی جا رہی تھی۔ شاید چودھری کے کارندوں کے ساتھ مصروف ہونے کی وجہ سے اسے موقع نہیں مل رہا تھا۔ شہریار نے تیزی سے.... کپڑے تبدیل کیے اور ایک بار پھر کال ملا کر دیکھی۔ اب بھی وہی صورتِ حال تھی۔ منیب کی طرف سے مایوس ہو کر اس نے عبدالستان کا نمبر ملایا اور اسے فوری طور پر پیر آباد روانگی کے پروگرام سے آگاہ کرتے ہوئے چند منٹوں میں تیار ہونے کی ہدایت کی۔ وہ اتنی عجلت میں تھا کہ اس نے عبدالستان کو اپنے وہاں جانے کی وجہ سے بھی آگاہ نہیں کیا۔۔ اور صرف ڈائریکٹ حکم سنا دیا... عبدالستان بھی اس کا مزاج آشنا ہو چلا تھا چنانچہ کوئی سوال نہیں کیا اور صرف ''یس سر'' کہہ کر فون بند کر دیا۔ جب شہریار اپنے ڈرائیور کے ساتھ اس کو لینے پہنچا تو وہ بالکل تیار تھا۔ گاڑی رکتے ہی وہ خاموشی سے اس میں سوار ہو گیا۔ شہریار فوری طور پر اسے صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بجائے اپنے موبائل پر مصروف رہا۔ پہلے اس نے منیب کا نمبر ملا کر دیکھا۔ پچھلی تمام کوششوں کی طرح اس بار بھی اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ بیل جا رہی تھی لیکن کال ریسیو نہیں کی جا رہی تھی۔ اس صورتِ حال پر سخت تشویش محسوس کرتے ہوئے اس نے ایس پی سے رابطہ کیا۔ اس سے گفتگو کے نتیجے میں معلوم ہوا کہ پولیس پارٹی ان لوگوں سے پہلے ہی روانہ ہو چکی تھی اور ان کے مقابلے میں پولیس پارٹی کے پیر آباد جلدی پہنچنے کا امکان تھا۔

ایس پی کے اتنے تعاون کے لیے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے شہریار نے رابطہ منقطع کر دیا۔ وہ منیب اور اس کے ساتھیوں کو بچانے کے لیے جو اقدامات کر سکتا تھا، وہ کر

چکا تھا لیکن اسے خود بھی شک تھا کہ اس کی یہ کوشش بارآور ثابت ہوگی۔ نئے ایس پی کو تارڑ کے مقابلے میں کافی فرض شناس پانے کے باوجود اس نے اس موقع پر خود پیرآباد جانے کا فیصلہ بھی اس لیے کیا تھا کہ اس کی موجودگی پولیس کے لیے سپورٹ کا باعث بن سکے اور وہ چودھری کے دباؤ میں آکر کسی کوتاہی کے مرتکب نہ ہوجائیں... لیکن سوال تو یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیا ان لوگوں کے پیرآباد پہنچنے تک کچھ باقی بچے گا؟ اسکول کی جلتی عمارت اور اپنی رہائش گاہ پر محصور منیب اور اس کے ساتھی اساتذہ کہیں ان کے پہنچنے سے قبل ہی... اپنی ہستی نہ کھو بیٹھیں....؟ انہی خدشات اور سوالات کے درمیان گھرے تیز رفتاری سے پیرآباد کی طرف رواں دواں گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اس نے عبدالمنان کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ اس بات کا تو پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ پیرآباد میں کوئی بڑی گڑبڑ ہوچکی ہے جو رات کے اس پہر شہریار نے وہاں جانے کا فیصلہ کیا ہے لیکن موجودہ صورتِ حال اس اعتبار سے زیادہ تشویش ناک تھی کہ تین انسانی زندگیاں داؤ پر لگی ہوئی تھیں۔ اسکول کی عمارت اگر جل کر تباہ بھی ہوجاتی تو اس نقصان کا ازالہ ہوسکتا تھا۔ مالی نقصانات عموماً قابلِ تلافی ہوتے ہیں لیکن انسانی جان کا نعم البدل تو کسی صورت حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ پھر جان کے خطرے سے دوچار وہ تین اساتذہ اپنی ذات میں تنہا تو نہیں تھے۔ ان تین افراد کے ساتھ تین خاندان بھی جڑے ہوئے تھے۔ ان تینوں کو کوئی نقصان پہنچتا تو دراصل یہ تین خاندانوں کا نقصان ہوتا۔ صورتِ حال کی گمبھیرتا کو محسوس کرکے عبدالمنان کی اپنی پیشانی بھی شکن آلود ہوگئی اور وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"میرے خیال میں سر اس صورتِ حال سے نمٹنے کا ہمارے پاس ایک ہی طریقہ ہے۔" کچھ دیر کی سوچ بچار کے بعد وہ شہریار سے مخاطب ہوا۔

"کیا؟" اس نے صرف ایک لفظی سوال کیا۔

"ہم چودھری افتخار سے رابطہ کرتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں کہ کچھ نامعلوم افراد نے ہمارے اسکول ٹیچرز کی رہائش گاہ کو گھیر لیا ہے۔ ہمارے لیے فوری طور پر انہیں امداد پہنچانا ممکن نہیں چنانچہ آپ مہربانی کرتے ہوئے اپنے آدمیوں کو ان ٹیچرز کی مدد کے لیے بھیج دیں۔ ظاہر ہے، چودھری نہ تو انکار کرسکے گا اور نہ ہی یہ اعتراف کرسکے گا کہ دراصل وہ اس کے آدمی... ہیں جنہوں نے اسکول ٹیچرز کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا ہے۔ ناچار اسے ہماری خواہش پر اپنے آدمیوں کو وہاں سے ہٹانا پڑے گا۔ اس کے لیے ہوسکتا ہے کہ وہ تھوڑا بہت ڈراما بھی کرے اور کچھ ایسا...

... کروا لے جس سے یہ محسوس ہو کہ واقعی اس کے آدمیوں نے جدوجہد کرکے حملہ آوروں کو مار بھگایا ہے... لیکن اس سے ہمیں کیا فرق پڑتا ہے۔ ہمارا کام نکل جائے گا اور ہم بھی چودھری کو منافقانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے اس "تعاون" کے لیے شکریہ کہہ کر واپس آجائیں گے۔" عبدالمنان نے اپنا پورا منصوبہ اس کے گوش گزار کیا۔

"تجویز تو اچھی ہے۔ کوشش کرکے دیکھ لیتے ہیں۔" پہلی بار شہریار کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔ اسے عبدالمنان کی اس تجویز کو سن کر چور کو کوتوال بنا دینے والا محاورہ یاد آگیا تھا۔ اس نے عبدالمنان کو چودھری کا نمبر ملانے کا اشارہ کیا۔ اس کا اشارہ پاکر وہ نمبر ڈائل کرنے لگا لیکن شہریار دیکھ رہا تھا کہ اس کی بار بار کوشش کے باوجود کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا ہے۔ آخر اس نے نمبر ڈائل کرنے کا سلسلہ روک دیا۔ شہریار نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"چودھری کا موبائل آف ہے اور حویلی کی لینڈ لائن والا نمبر مسلسل انگیج جارہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے ریسیور ہی ہٹا کر رکھ دیا گیا ہو۔" عبدالمنان نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ جو تجویز عبدالمنان کے ذہن میں آئی تھی، وہ شاید پہلے ہی چودھری کے ذہن میں تھی چنانچہ اس نے چالاکی سے یہ بندوبست کرلیا تھا کہ اس سے رابطہ ہی نہ کیا جاسکے۔ اب ان لوگوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ.... پیرآباد پہنچنے تک منیب اور دیگر اساتذہ کو تن بہ تقدیر چھوڑ دیا جائے چنانچہ شدید تناؤ کے عالم میں خاموشی سے ان کا سفر جاری رہا۔

ڈرائیور جو بظاہر کسی بے جان مورتی کی طرح بے تاثر چہرہ لیے بالکل خاموشی سے ڈرائیو کررہا تھا درحقیقت اس ساری صورتِ حال کو سمجھتے ہوئے اپنی تمام تر مہارت کو بروئے کار لاتے ہوئے بہت تیزی سے گاڑی دوڑا رہا تھا۔ اس کی اس کارکردگی کی وجہ سے پیرآباد تک کا فاصلہ تیزی سے سمٹ رہا تھا لیکن ابھی وہ پیرآباد سے کچھ دور ہی تھے کہ اچانک بارش شروع ہوگئی۔ راستہ بہت اچھا نہیں تھا۔ ایک طرف سڑک کی حالت مخدوش تھی تو دوسری طرف روشنی کا بھی کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ مجبوراً ڈرائیور کو گاڑی کی رفتار کم کرنی پڑی۔ صورتِ حال کی گمبھیرتا کے باوجود شہریار کا ذہن ان باتوں کو نوٹ کرتا چلا گیا۔ ویسے تو اپنے علاقے کے یہ مسائل پہلے ہی اس کے نوٹس میں تھے اور وہ ان کے حل کے لیے کچھ کرنا بھی چاہتا تھا لیکن بہرحال وہ لامحدود

اختیارات اور وسائل کا مالک نہیں تھا۔ ان چیزوں کی بہتری کے لیے اسے جو فنڈز درکار تھے، وہ ابھی تک گورنمنٹ نے منظور نہیں کیے تھے۔ خاص طور پر اس لیے بھی کوئی پیش رفت مشکل سے ہوتی تھی کہ علاقے کے منتخب نمائندے مکمل طور پر اپنے فرائض سے غافل تھے اور مشکل سے ہی کبھی یہاں پائے جاتے تھے... ورنہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ لاہور شہر ہی ان کا مستقل ٹھکانا بنا ہوا تھا جہاں وہ خود بھی عیش و آرام سے رہتے تھے اور ان کے بچوں کو بھی بہترین تعلیمی اور دیگر سہولیات میسر تھیں۔

خدا خدا کرکے ان کا سفر تمام ہوا اور گاڑی پیرآباد کی حدود میں داخل ہونے کے بعد اس مکان کی طرف بڑھ گئی جہاں اسکول کے اساتذہ کی رہائش تھی۔ شہریار نے دور ہی سے اس مکان کے سامنے کھڑی پولیس کی جیپ دیکھ لی۔ بارش کے باعث علاقے کی بجلی غائب تھی لیکن پولیس جیپ کی جلتی بتیوں نے کسی حد تک ماحول کو روشن کر رکھا تھا۔ اس روشنی میں جو کچھ نظر آرہا تھا، وہ اتنا خوش کن نہیں تھا۔ دو پولیس والے مکان کے اندر سے کسی شخص کو اٹھا کر باہر لا رہے تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر شہریار کے ہونٹ بھنچ گئے۔ جس شخص کو باہر لایا گیا تھا، وہ اس کے بارے میں یہ اندازہ لگانے سے قاصر رہا.... کہ آیا وہ زندہ ہے یا نہیں۔ لیکن ..... یہ طے تھا کہ وہاں کچھ برا ہوچکا ہے۔ ان کی گاڑی پولیس جیپ کے پہلو میں جاکر رکی تو منظر کچھ اور واضح ہوگیا۔ اب وہ لوگ دیکھ سکتے تھے کہ مکان کی دیواریں سیاہ ہورہی ہیں۔ یقیناً اسے آگ لگائی گئی تھی۔ بارش کی وجہ سے آگ تو بجھ گئی تھی لیکن سیاہی کی صورت آگ لگائے جانے کا واقعہ مکان کے در و دیوار پر لکھا صاف نظر آرہا تھا۔ گاڑی رکی تو ایک پولیس والا تیزی سے پچھلے دروازے کی طرف لپک کر آیا۔ شہریار نے اسے پہچان لیا۔ وہ ڈی ایس پی منظور تھا۔

"السلام علیکم سر! ایس پی صاحب نے آپ کے لیے پیغام دیا ہے کہ وہ راستے میں ہی ہیں۔ بارش کی وجہ سے مشکل پیش آرہی ہے لیکن ان کی کوشش ہے کہ وہ جلد از جلد یہاں پہنچ جائیں۔" اسے سلام جھاڑتے ہوئے اس نے تیزی سے اپنے آفیسر کا پیغام پہنچایا۔ شہریار اس پیغام پر کوئی ردِعمل ظاہر کیے بغیر گاڑی سے باہر نکل گیا۔ اس کے لیے ایس پی کا یہاں موجود ہونا یا نہ ہونا اتنا اہم نہیں تھا جتنا وہاں موجود افراد کی زندگی کی اہمیت تھی۔

"کیا صورتِ حال ہے؟" اپنی نظروں کو ادھر ادھر دوڑاتے ہوئے اس نے مختصر الفاظ میں سوال کیا۔ تیز جھکڑ...... کے ساتھ برستی بارش نے لمحوں میں ہی اسے شرابور کر ڈالا تھا لیکن اس وقت اسے اس بات کی قطعی فکر نہیں تھی۔ اس کے باہر نکلتے ہی ڈرائیور اور عبدالمنان بھی گاڑی سے نکل آئے تھے اور اب وہ سب اجتماعی طور پر اس بارش میں بھیگ رہے تھے۔

"ہمارے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی مکان کو آگ لگائی جاچکی تھی۔ دروازے کی کنڈی باہر سے بند تھی اس لیے اندر والوں کے لیے باہر نکلنا ممکن نہیں تھا۔ پھر شاید بارش شروع ہونے کی وجہ سے آگ خود بخود ہی بجھ گئی لیکن یقیناً آگ اتنی زیادہ تھی کہ بجھتے بجھتے بھی ڈھیروں دھواں اگل گئی۔ اندر موجود تینوں افراد آگ میں جل کر نہیں بلکہ دھوئیں سے دم گھٹنے کے باعث اپنی جان سے چلے گئے۔" ڈی ایس پی منظور کی پیش کردہ رپورٹ نے واضح کردیا کہ انہیں مدد کے لیے وہاں پہنچنے میں بہت دیر ہوگئی ہے۔ اس رپورٹ کو سن کر وہ کچھ لمحوں کے لیے سکتہ زدہ سا رہ گیا اور خالی خالی نظروں سے دوسری لاش کو مکان سے باہر لایا جاتا دیکھنے لگا۔ پولیس والے جب اس شخص کو اٹھا کر جیپ کے قریب پہنچے تو ہیڈ لائٹس کی روشنی نے اس کا چہرہ نمایاں کردیا۔ وہ منیب تھا جس نے اسے مدد کے لیے فون کیا تھا۔ کیا جرم تھا اس کا اور اس کے دوسرے ساتھیوں کا؟ وہ لوگ ایک محدود سی تنخواہ کے عوض انتہائی مخدوش حالات میں معصوم بچوں کے ذہنوں کو علم کی روشنی سے منور کرنے کی ..... کوشش کررہے تھے۔ یہ کوئی ایسا جرم تو نہیں تھا جس کی سزا میں ان کی زندگی کا چراغ ہی گل کردیا جاتا۔ وہ تو روشنی کے سفیر تھے جنہیں کسی کے ظلم و جبر نے تاریک رات میں نگل لیا تھا۔

"ایس پی صاحب کو میں نے صورتِ حال بتادی تھی۔ انہی کی ہدایت پر میں ان لاشوں کو مرکزِ صحت تک منتقل کروا رہا ہوں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہاں سے صبح ایمبولینس کے ذریعے لاشیں نورکوٹ کے اسپتال میں شفٹ کردی جائیں گی۔ ابھی اتنی تیز بارش میں تو ایمبولینس کا پہنچنا بھی ممکن نہیں۔" اسے خاموش پاکر ڈی ایس پی خود ہی آگے کی تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔ اس بار بھی وہ چپ ہی رہا۔ ایمبولینس ابھی لاشوں کو لے کر اسپتال جاتی یا صبح... اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ جنہوں نے مدد کے لیے پکارا تھا، ان کی مدد سے بے نیاز ہوچکے تھے۔ اب ان کی لاشیں چند گھنٹوں کی تاخیر سے اسپتال، گھر اور آخری آرام گاہ پہنچائی جاتیں بھی تو کیا فرق پڑ جاتا؟ اصل میں تو تاخیر اس وقت نہیں ہونی چاہیے تھی جب وہ زندہ تھے اور ان کے دلوں میں زندگی کی امید روشن تھی۔

"آپ نے کوئی ایسا عینی شاہد تلاش کیا جو بتا سکے کہ یہاں آگ لگانے والے لوگ کون تھے؟" مرنے والے مر چکے تھے۔ اب کچھ بھی کرلیا جاتا، ان کے بے جان جسموں میں دوبارہ زندگی کی رمق پیدا نہیں کی جاسکتی تھی۔ لیکن ان کا خونِ ناحق تو انصاف کے لیے پکار رہا تھا۔ ان کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر ہی شاید اب ان کی روحوں کی بے قراری دور کی جاسکتی تھی۔

"موقع پر کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ ہم یہاں پہنچے تو صورتِ حال بالکل ایسی ہی تھی جیسی آپ ابھی دیکھ رہے ہیں۔ البتہ میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ ہماری جیپ یہاں سے ذرا فاصلے پر تھی، تب کسی گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہوا تھا۔ شاید مکان کو آگ لگانے والے باہر رہ کر نگرانی کررہے تھے کہ کوئی ان لوگوں کی مدد کے لیے نہ آسکے اور یقیناً اسی وجہ سے کوئی یہاں موجود بھی نہیں تھا۔ اگر میرے پاس دو گاڑیاں ہوتیں تو میں ایک فرار ہونے والی گاڑی کے پیچھے بھیج دیتا لیکن پہلے یہاں کی صورتِ حال دیکھنا ضروری تھا۔ پھر کوئی گاڑی نظر بھی نہیں آئی تھی، بس مجھے آواز ہی محسوس ہوئی تھی۔ اس اندھیرے اور برسات میں ہم کوشش بھی کرتے تو شاید کامیاب نہ ہو پاتے۔" ڈی ایس پی منظور اسے حالات سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ہر عمل کی وضاحت بھی پیش کرتا جارہا تھا۔ ان سوال جواب کے دوران پولیس جیپ لاشوں کو لے کر مرکزِ صحت کی طرف روانہ ہوچکی تھی اور وہ لوگ ابھی تک مکان کے باہر ہی کھڑے مسلسل برستی بارش میں بھیگ رہے تھے۔

بے بسی اور دکھ کی انتہائی کیفیت سے دوچار شہریار نے اپنے قدم آگے بڑھائے اور مکان میں داخل ہوگیا۔ بہت زیادہ وقت نہیں گزرا تھا جب اس میں کچھ جیتے جاگتے انسان موجود تھے اور اب یہ مکان ویران ہوچکا تھا۔ وہ گھوم پھر کر مکان کا جائزہ لینے لگا۔ مکان میں دھوئیں کے ساتھ ساتھ واضح طور پر پیٹرول کی بو بھی محسوس ہورہی تھی۔ یقیناً آگ لگانے والوں نے باہر سے پیٹرول چھڑک کر مکان کو آگ دکھا دی تھی اور نتیجے میں یہ مکان اپنے رہائشیوں کی مقتل گاہ بن گیا۔ وہ دل پر بہت بھاری بوجھ لیے مکان کا جائزہ لیتا رہا۔ ایک دیوار کے پاس اسے موبائل سیٹ پڑا ہوا نظر آیا۔ اس نے جھک کر وہ موبائل اٹھالیا اور بٹن پش کرکے اسے چیک کرنے لگا۔ کال رجسٹر میں اسے متعدد مس کالز نظر آئیں جو کہ اس کے موبائل سے ہی کی گئی تھیں۔ یعنی یہ موبائل منیب کا تھا اور جانے کیسے اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا تھا۔

"ڈی ایس پی صاحب! آپ اس واقعے کی رپورٹ لکھیں۔ ان مظلوم مقتولوں کی طرف سے میں مدعی ہوں اور میں عدالت میں گواہی دوں گا کہ انہیں قتل کرنے والے لوگ کون تھے۔" موبائل پر نظریں جمائے وہ دھیمی مگر اندرونی رنج و غصے سے دہکتی آواز میں ڈی ایس پی سے مخاطب ہوا۔

☆☆☆

"یہ یہاں سے اسلام آباد کے لیے ڈائیوو کے ٹکٹ اور میری خالہ کے گھر کا ایڈریس ہے۔ ایڈریس زیادہ مشکل نہیں ہے۔ آپ کسی بھی ٹیکسی والے کو بتائیں گے تو وہ آپ کو پہنچا دے گا لیکن بالفرض کوئی مشکل پیش آتی ہے تو میں نے ایڈریس کے ساتھ ہی اپنے کزن کا موبائل نمبر بھی لکھ دیا ہے۔ آپ اسے فون کرلیجیے گا، وہ آپ کو خود لینے آجائے گا۔" افضل کے صحافی دوست نے دو ٹکٹ اور پتا لکھا ہوا ایک کاغذ گم صم بیٹھے آفتاب کی طرف بڑھایا۔ یہ افضل کا وہی دوست تھا جس نے افضل کے کہنے پر کشور کو پہلے والے اسپتال سے یہاں منتقل کروایا تھا۔ اب افضل کی موت کے بعد بھی وہ اپنے دوست سے دوستی نبھانا نہیں بھولا تھا اور ان دونوں کی مدد کے لیے پہنچ گیا تھا۔ یوں تو آفتاب بھی کسی حد تک صحافت کے میدان کا ہی بندہ تھا اور ایک کالم نگار کی حیثیت سے اسے کافی پسند کیا جاتا تھا لیکن موجودہ حالات میں اس کا دماغ کچھ اس طرح ماؤف ہوگیا تھا کہ اس کی قوتِ عمل ہی جواب دے گئی تھی ورنہ اگر وہ چاہتا تو اپنے ذاتی تعلقات سے بھی فائدہ اٹھا سکتا تھا۔

"تھینک یو ویری مچ دوست! بغیر کسی تعلق کے بھی تم نے ہمیں یاد رکھا اور ان مشکل حالات میں ہماری مدد کے لیے آئے... ورنہ تو آج کل لوگ بنا غرض کے کسی سے ملنا بھی پسند نہیں کرتے۔" چہرے پر ایک بجھی ہوئی سی مسکراہٹ لیے آفتاب نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ افضل کی موت نے اسے بری طرح متاثر کیا تھا۔ افضل اس کا سب سے قریبی دوست تھا اور اس دوست کے پورے خاندان سمیت دنیا سے اٹھ جانے کا واقعہ ایسا نہیں تھا جسے وہ آسانی سے فراموش کردیتا۔ افضل اور اس کے بیوی بچوں کا قاتل صاحب خان مرنے سے قبل جو بیان دے گیا تھا، اس سے یہ واضح ہوگیا تھا کہ اس حادثے میں چودھری کا ہاتھ نہیں ہے۔ یہ وضاحت آفتاب اور کشور کے لیے کسی حد تک اطمینان کا سبب بنی تھی۔ افضل اور اس کے اہلِ خانہ کی موت کے غم کے ساتھ اگر یہ احساس بھی ساتھ ہوتا کہ وہ لوگ ان کی وجہ سے چودھری کے عتاب کا نشانہ بنے ہیں تو یقیناً صدمے کی شدت کئی گنا بڑھ جاتی....

"تعلق تو تم نے خود ہی مجھ سے طے کرلیا ہے۔ دوست کہہ کر پکارا ہے تو پھر اب دوست ہی سمجھو اور تمام تر تکلفات کو چھوڑ دو۔ ویسے اگر تم یہ تعلق نہ بھی جوڑتے تو میں افضل کے دوست کی حیثیت سے تمہیں اپنا دوست ہی سمجھتا۔ افضل سونے کا آدمی تھا۔ اس جیسا دوست ہونا آدمی کے لیے اللہ کی بہت بڑی نعمت ہوتی ہے۔ اسے کھویا ہے تو لگتا ہے زندگی میں بہت بڑا خلا پیدا ہوگیا ہے اور یہ خلا شاید کبھی پُر ہو بھی نہیں سکتا۔" مرد ہونے کے باوجود ان لمحات میں اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی امڈ آئی تھی۔

"تم نے اس کے بارے میں بالکل صحیح رائے دی۔ وہ واقعی بہت زبردست انسان تھا۔ تمہاری صورت مجھے ایک اچھا دوست مہیا کرکے وہ تو جاتے جاتے مجھ پر ایک اور احسان کر گیا ہے۔" آفتاب کی آواز بھی بھیگ گئی۔

"اسے لوگوں پر احسان کرنے کے سوا کام ہی کیا تھا۔ ایسا مخلص اور بے لوث آدمی میں نے کوئی اور نہیں دیکھا۔ میں تمہیں بتاؤں، دو سال پہلے میرے والد کا بائی پاس ہونا تھا۔ گورنمنٹ اسپتال میں آپریشن کروانے کو میرا دل نہیں مانتا تھا اور پرائیویٹ کی رقم پوری نہیں تھی۔ اس وقت افضل نے مجھے بتائے بغیر اپنی بالکل نئی کار بیچ کر رقم فراہم کردی۔ حالانکہ اس نے وہ کار بہت شوق اور مشکل سے خریدی تھی۔ مزاج کا بادشاہ تھا اس لیے اچھی خاصی انکم ہونے کے باوجود اس کا بینک بیلنس کبھی قابلِ ذکر نہیں رہا۔ عموماً اس کی آمدنی دوسروں کی مدد کرنے میں ہی خرچ ہوجاتی تھی۔ بیگم بھی اس کو اپنی ہم مزاج ہی ملی تھیں اس لیے بھی عادتیں بدل نہیں سکیں۔ میں والد کے آپریشن کے بعد اس کے گھر شکریہ ادا کرنے گیا تھا، تب میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے افضل کا شکریہ ادا کیا اور اس بات پر تھوڑی خفگی دکھائی کہ تم نے مجھے بتائے بغیر اپنی نئی گاڑی کیوں بیچ ڈالی... تو افضل سے پہلے وہ بولیں کہ بھائی! گاڑی کا کیا ہے، ہم نے اس کی جگہ دوسری سیکنڈ ہینڈ کار لے لی ہے اور وہ بھی ٹھیک ٹھاک چلتی ہے لیکن اگر آپ کے والد کا بروقت آپریشن نہ ہو پاتا اور خدانخواستہ وہ اس وجہ سے اپنی جان سے چلے جاتے تو ان کا نعم البدل کہاں سے آتا؟ اس وقت میں نے افضل کی قسمت پر رشک کیا تھا کہ اس کی بیوی جیسی عورتیں تو دنیا میں کہیں کہیں ہی ہوتی ہیں۔ ورنہ عموماً تو عورتوں کو روپے پیسے کے معاملے میں شوہروں سے لڑتے ہوئے ہی پایا جاتا ہے۔" اس کے لہجے میں... ستائش اور ایک طرح کی عقیدت مندی تھی۔

"صحیح کہا یار تم نے۔ وہ دونوں ہی میاں بیوی اپنی جگہ انمول تھے، شاید اسی وجہ سے مختصر عمر لکھوا کر لائے تھے۔ اچھے لوگ اس دنیا میں کم ہی لمبی عمر پاتے ہیں۔" آفتاب جو افضل سے متعلق اس طرح کے کئی واقعات کا پہلے بھی گواہ تھا، ایک گہرا سانس لیتے ہوئے بولا پھر گویا دونوں کے درمیان بولنے کے لیے کچھ نہیں رہا اور وہ چند لمحے کے لیے یونہی خاموش بیٹھے رہے۔

"اب ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ تم اپنی مسز کے ساتھ کسی کی نظروں میں آئے بغیر نکلنے کی کوشش کرنا۔ تمہاری مسز کی تو خیر ہے۔ میں ان کے لیے جو برقع لایا ہوں، اسے پہن کر وہ کسی کے نوٹس میں آنے سے بچ جائیں گی لیکن تمہارے لیے مجھے یہ ڈر ہے کہ کسی نے ذرا غور سے دیکھ لیا تو کہیں پہچان نہ لے۔ یہ داڑھی مونچھیں تم نے اسپتال میں رہ کر ہی بڑھائی ہیں، صرف رنگ آج تبدیل کیا ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ اسٹاف کے وہ لوگ جن سے تمہارا زیادہ واسطہ پڑا ہے، اس تبدیلی کو نوٹ کرکے کہیں تمہیں پہچان نہ لیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارا یہ نیا حلیہ کسی کے علم میں ہو کیونکہ ہوسکتا ہے، تمہیں ڈھونڈنے والے اسپتالوں کو بھی چھانتے پھر رہے ہوں۔ تم جتنی زخمی حالت میں لائے گئے تھے، اس کے بعد یہ خیال تو خود بخود ہی ذہن میں آتا ہے کہ بندہ علاج کے لیے کسی اسپتال میں بھی ہوسکتا ہے اس لیے وہاں ڈھونڈنا چاہیے۔ بے شک تمہارا اور تمہاری مسز کا اصل نام اسپتال کے ریکارڈ میں نہیں لکھوایا گیا ہے لیکن کیا معلوم تمہیں تلاش کرنے والے تمہاری تصویریں ہاتھ میں لے کر...... ڈھونڈتے پھر رہے ہوں... اور یہاں کوئی انعام وغیرہ کے لالچ میں بتا ڈالے کہ ہاں جناب، یہ دونوں یہیں داخل تھے اور اب فلاں فلاں حلیے میں یہاں سے روانہ ہوچکے ہیں۔" اس نے آفتاب کو احتیاط کی راہ اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے اپنے خدشات سے بھی آگاہ کردیا۔ اس کے یہ خدشات نظرانداز کیے جانے کے قابل نہیں تھے چنانچہ آفتاب نے اپنی طرف سے پوری احتیاط کی یقین دہانی کرواتے ہوئے مختصر سامان پر مشتمل اپنا اور کشور کا مشترکہ بیگ شانے سے لٹکالیا۔

"تم مسز کو لے کر باہر نکلو۔ باہر میری نیلے رنگ کی سوزوکی مہران کھڑی ہے۔ یہ اس کی چابی ہے۔ تم دونوں گاڑی میں بیٹھو۔ میں آتے ہوئے ریسیپشن پر بل بنانے کے لیے کہہ کر آیا تھا، وہ ادا کرکے آتا ہوں۔" آفتاب کے ہاتھ میں گاڑی کی چابی تھماتے ہوئے اس نے کہا اور خود باہر نکل گیا۔ آفتاب نے بھی اس کی تقلید میں اپنا کمرا چھوڑ دیا اور

کشور کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ وہ اس کے حسبِ ہدایت برقع پہن کر تیار تھی۔ باہر نکل کر اس نے آفتاب کا بازو تھام لیا۔ ابھی وہ مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہوا تھا اور چلنے کے لیے اسٹک کا سہارا لینے پر مجبور تھا۔ کشور نے بازو تھاما تو اسے مزید سہارا مل گیا۔ وہ دونوں ہی اتنے محتاط تھے کہ اسپتال سے باہر نکلنے سے قبل ایک دوسرے سے بھی بات نہیں کی۔ ان دونوں کو ساتھ ساتھ باہر نکلتے بہت سے لوگوں نے دیکھا لیکن یہ سرسری نظریں تھیں۔ دیکھنے والوں نے اگر ان کے بارے میں کوئی رائے قائم بھی کی ہوگی تو یہی کہ وہ کسی مریض کے ملاقاتی ہیں اور اس سے ملاقات کر کے واپس جا رہے ہیں۔ ان کے ہمدرد نے انہیں دیگر رسمی کارروائیوں سے تو بچا ہی لیا تھا ورنہ اسپتال سے ڈسچارج ہونے کا بھی ایک مکمل طریقۂ کار ہوتا ہے۔ اگر اس طریقۂ کار پر عمل کیا جاتا تو وہ اس نئے حلیے میں کم از کم ڈاکٹر کی نظر میں تو آ ہی جاتے۔

باہر نکلتے ہی انہیں نیلے رنگ کی مہران نظر آ گئی۔ وہ گاڑی کا لاک کھول کر اس کی پچھلی نشست پر براجمان ہو گئے اور نظریں اسپتال کے خارجی دروازے پر لگا دیں۔ ابھی مشکل سے ڈھائی تین منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ایک تیز رفتار لینڈ کروزر اسپتال کے دروازے کے عین سامنے آ کر رکی...... لینڈ کروزر کے اچانک لگائے جانے والے بریکس کی آوازیں فضا میں دور تک سنائی دیں۔ گیٹ پر کھڑا چوکیدار بھی چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ آفتاب اور کشور تو دیکھ ہی اسی طرف رہے تھے چنانچہ جب لینڈ کروزر سے دو صورت سے ہی بدمعاش نظر آنے والے افراد نیچے اترے تو وہ دونوں ہی چونک گئے۔ ان دو میں سے ایک کا چہرہ ان کے لیے آشنا تھا۔ وہ چودھری کے کارندوں میں سے ایک تھا۔ ڈرائیور کو گاڑی میں ہی چھوڑ کر وہ دونوں گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔ گیٹ پر موجود چوکیدار نے انہیں رکنے کا اشارہ کیا تو وہ شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے رک بھی گئے۔ آفتاب اور کشور فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کی آوازیں نہیں سن سکتے تھے لیکن اتنا اندازہ بہرحال انہیں ہو رہا تھا کہ چوکیدار ان لوگوں سے ان کی آمد کی غرض و غایت دریافت کر رہا ہے۔

"یہ لوگ یقیناً ہمیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں آئے ہوں گے۔ انہیں کسی طرح معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہم یہاں ہیں۔" اس منظر کو دیکھتی کشور نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا اور یک دم ہی گاڑی کا لاک کھول کر نیچے اترنے لگی۔

"یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟" آفتاب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گاڑی سے باہر نکلنے سے روکا۔

"ہمارا یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں ہے آفتاب! ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے۔" اس نے اضطراری لہجے میں جواب دیا۔ اس کا یہ اضطراب اور بے چینی بے وجہ نہیں تھا۔ اگر چودھری کے گماشتوں کی نظر ان دونوں پر پڑ جاتی تو یقیناً وہ بری طرح پھنس جاتے۔ آفتاب خود بھی تذبذب میں پڑ گیا۔ چودھری کے آدمیوں کا جو انداز تھا، اس سے اس نے اتنا تو اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کسی مبینہ اطلاع پر یہاں تک نہیں آئے ہیں بلکہ اپنے طور پر اسے اسپتالوں میں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ اگر ان کے پاس اس کی وہاں موجودگی کی کوئی اطلاع ہوتی تو وہ بہت زیادہ جارحانہ رویے کا مظاہرہ کرتے اور یوں گیٹ پر رک کر چوکیدار کے سوالوں کا جواب دینے کی زحمت نہ اٹھاتے۔ اس نے کشور کا ہاتھ تھامے تھامے ہی ایک بار پھر رخ موڑ کر اسپتال کے گیٹ کی طرف دیکھا۔ چودھری کے آدمی اب اندر داخل ہو رہے تھے اور افضل کا دوست بابر باہر نکلتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اسپتال کے سامنے کھڑی لینڈ کروزر کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص کی توجہ بھی اسی طرف تھی اور اس نے ایک بار بھی رخ موڑ کر مہران کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ گمان ہی نہیں کر سکتا تھا کہ جن لوگوں کی تلاش میں وہ یہاں تک آئے ہیں، وہ ان سے اتنے نزدیک کھلی فضا میں بھی موجود ہو سکتے ہیں۔

"کیا بات ہے... کوئی مسئلہ ہو گیا ہے کیا؟" بابر جو دور ہی سے ان لوگوں کو دیکھتا ہوا آ رہا تھا، قریب پہنچنے پر گاڑی کے کھلے دروازے اور اترنے کے لیے پر تولتی کشور پر سوالیہ نظر ڈال کر پوچھنے لگا۔

"ابھی یہاں سے چلو۔ تفصیلات میں بعد میں بتاتا ہوں۔" آفتاب نے کچھ فاصلے پر کھڑی لینڈ کروزر پر ایک اضطراری نظر ڈالتے ہوئے بے چینی سے کہا تو بابر نے اس کے لہجے کے غیر معمولی پن کو محسوس کر کے فوراً ہی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اسپتال کی حدود سے کافی دور نکل چکے تھے۔

"اب بتاؤ کیا مسئلہ تھا؟"

"ابھی جب تم اسپتال کے گیٹ سے باہر نکل رہے تھے تو تم نے دو افراد کو اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا ہوگا؟ گیٹ کے بالکل سامنے ایک لینڈ کروزر بھی تمہیں نظر آئی ہوگی؟" آفتاب نے جواباً اس سے پوچھا۔

"ہاں ہاں... میں نے دیکھا تھا۔ ان دونوں افراد میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک پوسٹ کارڈ سائز تصویر بھی تھی۔

شاید وہ اس تصویر کی مدد سے کسی کو تلاش کر رہے تھے۔"

"وہ کسی کو نہیں، مجھے تلاش کر رہے تھے۔ وہ چودھری کے کارندے تھے جو میری تلاش میں مارے مارے پھرتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے..... اگر ہمیں اسپتال سے روانہ ہونے کا فیصلہ کرنے میں چند منٹوں کی بھی تاخیر ہو جاتی تو اس وقت ہم بری طرح پھنس چکے ہوتے۔" آفتاب کے جواب نے بابر کو ششدر کر دیا۔ اس قسم کے خدشات ذہن میں ہونے کے باوجود وہ یہ امید نہیں کر رہا تھا کہ اتنی جلدی چودھری کے کارندے اسپتال تک پہنچ سکتے ہیں۔ حقیقتاً اس وقت وہ بال بال بچے تھے۔ بہت مشکل حالات میں قسمت نے ایک بار پھر ان کا ساتھ دیا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ قسمت کی یہ یاوری کب تک ان کا ساتھ دیتی؟

☆☆☆

اس نے کھڑکی پر پڑے بلائنڈز ہٹا کر باہر جھانکا۔ باہر بارش اسی شدومد سے برس رہی تھی۔ رات ان کے پیر آباد پہنچنے سے پہلے شروع ہونے والی بارش دوسرے دن کی شام ہو جانے کے باوجود کسی طور رکنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ تین مظلوموں کی دردناک موت نے آسمان کو بھی رلا ڈالا ہو۔ شہریار کل رات ہی وہاں سے واپس لوٹ آیا تھا اور صبح دفتر پہنچتے ہی ایک نئی مصروفیت نے اسے گھیر لیا تھا۔ محکمۂ موسمیات کی طرف سے کسی پیشگی اطلاع کے بغیر شروع ہونے والے بارش کے اس سلسلے نے معمولاتِ زندگی کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا اور کئی چھوٹے موٹے حادثات کی اطلاعات اس کے دفتر تک پہنچنا شروع ہو گئی تھیں۔ ان اطلاعات پر فوری امدادی کارروائیوں کے احکامات جاری کرنے کے علاوہ وہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ بہت دیر تک مزید احتیاطی اقدامات کے سلسلے میں مشاورت بھی کرتا رہا تھا۔

دوپہر کے کھانے سے قبل اس نے خود باہر نکل کر اردگرد کے علاقوں کا جائزہ بھی لیا تھا۔ اس جائزے نے اسے بہت شدت سے یہ احساس دلایا تھا کہ اس کے زیرِ نگرانی ضلع میں قدرت کی کسی سختی اور آزمائش کو سہنے کی سکت بہت ہی کم ہے اور برے پر سودرے کے مصداق ان کے پاس وسائل بھی اتنے تسلی بخش نہیں کہ صورتِ حال زیادہ بگڑ جانے پر کوئی تدارک کیا جا سکے۔ ان حالات میں اسے یہی سمجھ آیا تھا کہ صوبائی حکومت سے رابطہ کر کے ان سے مدد کی درخواست کرے۔ اس کی اس درخواست کا وہاں سے کوئی مثبت جواب نہیں ملا تھا بلکہ ایک طرح سے اسے یہ جتایا گیا تھا کہ وہ معمولی بارش کو غیر معمولی اہمیت دے رہا ہے۔ اس صورتِ حال پر وہ خاصا کبیدہ خاطر ہوا تھا لیکن اپنے ہاں کے اداروں کی بے حسی بھی اس کے لیے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ متعلقہ ادارے اس وقت تک حرکت میں آنا بیکار سمجھتے ہیں جب تک کوئی بڑا حادثہ پیش نہ آ جائے اور لوگ بلبلا کر چیخ نہ اٹھیں۔ صوبائی حکومت کی طرف سے کسی اچھائی کی کم ہی امید رکھتے ہوئے اس نے ممکنہ حد تک اپنے انڈر میں موجود افراد کو متحرک کر دیا تھا اور خود دفتری اوقات ختم ہو جانے کے باوجود ابھی تک اپنے دفتر میں بیٹھا تھا۔ دفتر کے دروازے پر ہلکی سی دستک ابھری تو وہ کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر اس طرف متوجہ ہوا۔ آنے والا عبدالمنان تھا۔

"حالات کیسے ہیں عبدالمنان؟" وہ پلٹ کر اپنی کرسی تک آیا اور... بیٹھتے ہوئے عبدالمنان سے دریافت کیا۔

"مسلسل بارش کی وجہ سے حالات بتدریج خرابی کی طرف جا رہے ہیں سر! اطلاع ملی ہے کہ ایک جگہ بجلی کے تار گرنے کی وجہ سے پانچ افراد زد میں آ گئے ہیں۔ ان پانچوں میں سے دو نے تو موقع پر ہی دم توڑ دیا تھا جبکہ باقی تین کو بھی کافی نازک حالت میں اسپتال پہنچایا گیا ہے۔ اس حادثے کے بعد سے بجلی کی سپلائی مکمل طور پر منقطع کر دی گئی ہے جس کی وجہ سے مزید مشکلات کا سامنا ہے۔ دیکھا جائے تو نظامِ زندگی بری طرح درہم برہم ہو کر رہ گیا ہے۔ اکثر دیہاتوں کی صورتِ حال بہت خراب ہے۔ نہر میں بھی پانی کی سطح بہت بلند ہو چکی ہے اور خدشہ ہے کہ پیر آباد اور اردگرد کے چند اور گاؤں زیرِ آب آ سکتے ہیں۔" عبدالمنان نے اسے جو رپورٹ دی وہ بہت ہی تشویش ناک تھی جسے سن کر وہ کچھ دیر تک اپنے کمرے میں جلتی واحد ٹیوب لائٹ کو خاموشی سے تکتا رہا۔ یہ ٹیوب لائٹ بھی جنریٹر کی وجہ سے روشن تھی۔

روشن ٹیوب لائٹ سے نظریں ہٹا کر اس نے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کی انگلیاں لیاقت رانا کا نمبر ڈائل کر رہی تھیں۔ ان کی بیماری اور صدمات سے چور حالت دیکھ کر اس کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ کسی معاملے میں انہیں زحمت نہ دے لیکن یہ بہت سے لوگوں کی زندگیوں کا معاملہ تھا اور وہ جانتا تھا کہ لیاقت رانا کی کوشش سے اسے وہ سہولیات میسر آ سکتی ہیں جو اس کی درخواست کے باوجود صوبائی حکومت نے فراہم نہیں کی تھیں۔ لیاقت رانا فون لائن پر آیا تو اس نے بہت اطمینان سے اس کی پوری بات سنی اور یقین دلایا کہ وہ حتی الامکان اس کی مدد کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ سیاست داں سہی لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کے ماموں کا اس سے کیا ہوا یہ

وعدہ کوئی سیاسی وعدہ نہیں ہے۔ سیاست کے کیچڑ بھرے میدان میں رہ کر وہ بے شک اپنے دامن کو مکمل طور پر چھینٹوں سے محفوظ تو نہیں رکھ پایا تھا لیکن بہرحال فطرتاً وہ ایک اچھا اور ہمدرد انسان تھا اور اب اس کے ذاتی دکھوں نے تو اسے اور بھی زیادہ نرم دل کر دیا تھا۔ اپنی پوتی شینا اور بیٹے سجاد رانا کی موت کے بعد اس کی سیاست میں دلچسپی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ روگ کی طرح جان سے لگ جانے والی بیماریوں نے انہیں اس لائق ہی نہیں رہنے دیا تھا کہ وہ سیاسی جوڑ توڑ میں حصہ لے سکے لیکن بہرحال اب بھی اس کی حیثیت اس ہاتھی سے کم نہیں تھی جو مر کر بھی سوا لاکھ کا رہتا ہے۔ اب بھی اس میں اتنا دم خم تو تھا کہ اس کے مطالبات پورے کروا سکے۔ اس کی طرف سے وعدہ کیے جانے کے بعد شہریار خاصا مطمئن ہو گیا اور اس اطمینان نے اسے دوسرے امور کی یاددہانی کروانا شروع کر دی۔

"منیب اور اس کے ساتھی اساتذہ کی لاشوں کا کیا ہوا؟ انہیں پیر آباد کے ہیلتھ یونٹ سے شفٹ کیا جا سکا؟"

"یہ کام صبح دس گیارہ بجے کے درمیان کر لیا گیا تھا۔ لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہونے کے بعد ضروری قانونی کارروائی کے بعد انہیں ورثا کے حوالے کر دیا جائے گا۔ ہم نے ورثا تک اطلاع پہنچا دی ہے۔ منیب اور ایک ماسٹر کے ورثا یہاں پہنچ بھی گئے ہیں جبکہ تیسرے کے ورثا کی طرف سے ابھی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ شاید بارش کی وجہ سے انہیں یہاں تک پہنچنے میں مشکل پیش آ رہی ہو۔" عبدالمنان نے اسے جواب دیا۔

"اس طرف دھیان رکھنا۔ اگر وہ لوگ کسی وجہ سے نہ پہنچ سکیں تو خود اپنی ذمے داری پر ڈیڈ باڈی ان کے گھر بھجوا دینا۔ ان بے چاروں پر جتنا بڑا دکھ ٹوٹا ہے اس میں ہم سے جہاں تک ہو سکے ان کی مدد کرنی چاہیے۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ مقتولین کے ورثا کی مناسب مالی امداد بھی کی جا سکے۔ جو جان چلی گئی اس کے نقصان کا مداوا تو خیر کسی صورت نہیں کیا جا سکتا لیکن کمانے والوں کی موت کے بعد پیدا ہونے والے معاشی مسائل کا حل تو نکالا جا سکتا ہے۔" وہ منیب اور اس کے ساتھی اساتذہ کی موت سے بہت دکھی تھا۔ اس کا بس چلتا تو فوری طور پر چودھری کو کڑی سزا دلوا ڈالتا لیکن موجودہ حالات میں تو وہ ابھی تک اسے گرفتار بھی نہیں کروا سکا تھا۔

ایک تو اس کے پاس کوئی عینی شاہد نہیں تھا جو عدالت میں یہ بیان دے سکتا کہ اسکول و گھر کو نذرِ آتش کرنے والے چودھری کے ہی کارندے تھے، دوسرے موسم کی خراب صورتِ حال نے بھی اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالی تھی اور وہ فوری طور پر درپیش مسائل کے تدارک میں مصروف ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی وہ چند ہدایات دینے کے بعد عبدالمنان کے ساتھ موجودہ صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تبادلۂ خیال کرنے لگا۔ وہ کوشش کر رہے تھے کہ ان کا ضلع بھر سے رابطہ رہے۔ مواصلاتی نظام کے متاثر ہونے کی وجہ سے وہ اپنی اس کوشش میں مکمل طور پر کامیاب تو نہیں تھے لیکن جہاں سے بھی ان کا جتنا بھی رابطہ ہو پا رہا تھا، وہاں سے کوئی اچھی اطلاعات موصول نہیں ہو رہی تھیں۔ رات آٹھ بجے کے قریب انہیں اطلاع موصول ہوئی کہ نہر میں پانی کی سطح بہت بلند ہو چکی ہے اور خدشہ ہے کہ اگلے ڈھائی تین گھنٹے میں پانی پیر آباد کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ اس اطلاع کو سن کر وہ بے چین ہو اٹھا۔

"مجھے..... فوری طور پر امدادی کارکنوں کے ساتھ پیر آباد پہنچنا چاہیے۔ اگر فوری مدد نہیں کی گئی تو کئی انسانی جانوں کا نقصان ہو سکتا ہے۔"

"میرے خیال میں سر... آپ خود وہاں جانے کے بجائے امدادی ٹیم کو بھجوا دیں۔ اس وقت راستے بہت خراب ہیں، کوئی حادثہ بھی پیش آ سکتا ہے۔" عبدالمنان نے اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

"خراب راستوں کے ڈر سے میں اپنی جان بچا کر بیٹھ جاؤں اور دوسروں کی زندگیاں داؤ پر لگا دوں... یہ کہاں کا انصاف ہے؟ امدادی ٹیم کے ساتھ میں خود جاؤں گا تاکہ ان لوگوں کے حوصلے بھی بلند ہو سکیں۔ تمہیں البتہ یہیں دفتر میں ہی رہنا ہوگا تاکہ ملنے والی اطلاعات پر مناسب اقدامات کر سکو۔" اس نے تیز لہجے میں عبدالمنان کو جواب دیا۔ اس کے اس انداز پر عبدالمنان نے بہ غور اس کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہ برہم ضرور تھا لیکن بہرحال اسے دفتر میں چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کسی ناراضی کے باعث نہیں بلکہ انتظامی نقطۂ نظر سے تھا۔ اس طرف سے اطمینان ہو جانے کے بعد وہ اس کے حسبِ ہدایت ایسی ہی کسی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے پہلے سے تیار کردہ ریسکیو ٹیم کے افراد کو احکامات جاری کرنے لگا۔ اس دوران شہریار نے ایک بار پھر لیاقت رانا سے رابطہ کر کے انہیں تازہ صورتِ حال بتانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم کیا کہ وہ کب تک اسے مطلوبہ امداد فراہم کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس کی طرف سے خاصا امید افزا جواب موصول ہوا۔ اس جواب کو سن کر وہ قدرے مطمئن سا ہو کر اپنے دفتر سے نکل کھڑا ہوا۔ چوبیس گھنٹوں کے اندر یہ اس کا پیر آباد کی طرف دوسری دفعہ سفر تھا لیکن اس بار وہ اپنی ذاتی گاڑی کے بجائے ایک جیپ میں روانہ ہوا تھا۔ راستے کے بارے میں جو خدشات تھے، ان کے پیشِ نظر جیپ میں سفر کرنا ہی مناسب تھا۔

امدادی ٹیم کے ارکان ایک سفید رنگ کے شہزور پر سوار تھے۔ دونوں گاڑیاں برستی بارش میں، رات کے مہیب اندھیروں اور سناٹوں کا بڑے عزم سے مقابلہ کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف گامزن ہو گئیں۔ راستہ واقعی بہت خراب ہو چکا تھا اور ڈرائیورز کو مشکل پیش آ رہی تھی لیکن انہوں نے بے پناہ ہمت اور حوصلے کا مظاہرہ کرتے ہوئے گاڑیوں کی رفتار کم نہ ہونے دی۔ بالآخر آگے پیچھے دوڑتی گاڑیوں نے کسی نہ کسی طرح پیر آباد تک کا درمیانی راستہ طے کر ہی لیا۔ جب وہ لوگ پیر آباد میں داخل ہوئے تو شہریار نے محسوس کیا کہ اس کے پیچھے آتے شہزور کی لائٹیں ایک... جگہ رک گئی ہیں اور ان کا درمیانی فاصلہ بڑھ رہا ہے۔ اس نے اپنے ڈرائیور کو جیپ روک کر صورتِ حال معلوم کرنے کا حکم دیا۔ معلوم ہوا کہ شہزور کا ایک پہیا کچی زمین میں دھنس گیا ہے جس کی وجہ سے وہ آگے نہیں بڑھ پا رہا۔ امدادی ٹیم کے ارکان نے امید ظاہر کی کہ وہ جلد ہی اس مصیبت سے نجات حاصل کر لیں گے۔ جتنے افراد اس کی جیپ میں سما سکتے تھے، انہیں اپنے ساتھ سوار کر کے وہ باقی کو پھنسے ہوئے ٹرک کو نکالتا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ آبادی کی حدود شروع ہوتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سارا گاؤں جاگ رہا ہے۔ بجلی کی سپلائی تو یہاں بھی منقطع تھی لیکن لالٹینوں وغیرہ کی مدھم روشنی جگہ جگہ نظر آ رہی تھی۔ اس مدھم روشنی میں وہ پریشانی سے چیختے چلاتے لوگوں کو ادھر ادھر بھاگتے دیکھ سکتا تھا۔ ان پریشان حال لوگوں نے ضلع کے اے سی کو اپنے درمیان پایا تو ان کے چہروں پر حیرت کے ساتھ ساتھ امید کی کرنیں بھی نظر آنے لگیں۔

ان کی زندگیوں میں شاید پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اتنی جلدی کوئی سرکاری افسران کے درمیان پہنچ گیا تھا ورنہ اس طرح کے لوگ تو اس وقت ... پہنچتے تھے جب وہ اپنا مال و متاع گنوانے کے ساتھ ساتھ کئی پیاروں کو بھی زمین میں دفن کر چکے ہوتے تھے۔ ان لوگوں سے اسے اطلاع ملی کہ نہر کی سطح خطرناک حد تک بلند ہو چکی ہے اور پانی کسی بھی لمحے گاؤں میں داخل ہو سکتا ہے۔ نہر گاؤں کے مشرقی حصے میں تھی اور یہ حصہ نشیب میں تھا جبکہ گاؤں کا مغربی حصہ کافی بلند اور محفوظ تھا۔ وہ لوگ اپنے اہلِ خانہ اور مال مویشی مغربی حصے میں منتقل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شہریار کے ساتھ آئے ہوئے امدادی کارکن اس کام میں ان کی مدد کرنے لگے۔ ان کے پاس طاقتور ایمرجنسی لائٹس اور اس طرح کے کاموں کا تجربہ تھا چنانچہ کام میں تیزی آ گئی۔ شہریار نے اپنی جیپ بھی ان لوگوں کے حوالے کر دی تھی۔ آدھے گھنٹے کے اندر ہی زمین میں دھنس جانے والا شہزور بھی میدان میں اتر آیا تھا جس کی وجہ سے لوگوں اور مال واسباب کی منتقلی کا کام اور بھی تیزی سے ہونے لگا۔ تاہم اب نہر کے پانی نے اپنی حد پھلانگ کر گاؤں کا رخ کرنا شروع کر دیا تھا۔ منہ زور پانی پہلے ہی بارش کی وجہ سے جل تھل زمین کو تیزی سے غرق کرتا جا رہا تھا۔

"اس واری پانی کے تیور الگ ہی ہیں۔ پانی کا وڈا ریلا چودھری سرکار کی زمینوں کی طرف چلا گیا ہے۔" وہ ایک چھتری سر پر تانے اپنے ساتھ لائے گئے واحد بڑے سے خیمے میں عورتوں اور بچوں کے بہ مشکل سمانے کا منظر دیکھ رہا تھا کہ کسی طرف سے اسے یہ آواز سنائی دی۔ معلوم نہیں بولنے والے کی آواز میں تشویش تھی یا طمانیت... وہ اندازہ نہیں لگا سکا لیکن پھر فوراً ہی ہوا کے دوش پر سفر کر کے اس تک پہنچنے والی دوسری آواز نے اس کی الجھن دور کر دی۔ کہنے والا کہہ رہا تھا۔ "ایسا تو ہونا ہی تھا۔ کل رات چودھری نے وڈا ظلم کمایا۔ بے قصور لوگوں کی جان لے ڈالی۔ اب دیکھ نو، کب سے اس کے بندے کوشش کر رہے تھے کہ حفاظتی باڑھ بنا کر پانی کو چودھری کی زمینوں کی طرف آنے سے روک سکیں لیکن پانی اتنی تیزی سے آیا کہ لمحہ بھر میں سب ملیامیٹ کر دیا۔ تین چار بندوں کو تو میں نے خود ریلے کی زد میں آ کر ڈوبتے دیکھا ہے۔ اندھیرے کی وجہ سے میں ان کی شکلیں تو نہیں پہچان سکا لیکن تھے تو وہ چودھری ہی کے نمک خوار جو ہمیں مصیبت میں چھڈ کے خود اپنے آقا کی زمینیں بچانے میں لگے ہوئے تھے۔ وچارے خود اپنی جان بھی نہیں بچا سکے۔" وہ افسوس کا اظہار کر رہا تھا لیکن اس کے لہجے میں افسردگی نہیں تھی۔ خود شہریار نے بھی اپنے دل میں ایسی ہی کیفیت محسوس کی۔ اسے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے پانی میں ڈوب کر مر جانے والے افراد بھی ان بھیڑیوں میں شامل ہوں جنہوں نے کل رات منیب اور اس کے نہتے ساتھیوں کو گھیر کر موت کی آغوش میں پہنچا دیا تھا۔ یہ ناممکن تو نہیں تھا کہ اپنے آقا کے اشارے پر یہ ظلم کرنے والے آج خود انتقامِ قدرت کے گھیرے میں آ گئے ہوں۔ اپنی اس گہری سوچ سے وہ کسی شے کے جھٹکنے کی وجہ سے باہر آیا۔ وہ آواز کے ماخذ کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ ابتر حلیے والا شاید چالیس بیالیس سال کا کوئی مخبوط الحواس شخص تھا جو

ایک امدادی کارکن کے سہارے اپنے پیر میں پڑی زنجیریں چھنکاتا ہوا اس طرف آرہا تھا۔ اس کے پیروں میں موجود زنجیروں نے شہریار کو الجھن میں ڈال دیا۔ وہ بے اختیار ہی اس کی طرف بڑھا۔

"اس شخص کے پیروں میں زنجیریں کیوں ہیں؟" اس نے سہارا دینے والے امدادی کارکن سے سوال کیا۔

"معلوم نہیں سر! ہم لوگوں کو ریسکیو کر رہے تھے جب ہمیں ایک مکان کے اندر سے چیخنے چلانے کی آواز آئی۔ اندر جاکر دیکھا تو یہ آنگن میں ایک درخت کے ساتھ زنجیروں سے بندھا چلا رہا تھا۔ پانی مکان میں داخل ہو چکا تھا چنانچہ ہم نے بڑی مشکل سے زنجیر کو درخت سے نکالا اور اسے اسی حالت میں یہاں لے آئے۔" امدادی کارکن نے جواب دیا جبکہ پیروں میں زنجیریں پہنا شخص ہر طرف سے بے نیاز اپنے میل بھرے ناخنوں کو چبانے میں مصروف تھا۔

"اس کے گھر والے کہاں ہیں، ذرا ان کو تلاش کر کے مجھ سے ملواؤ۔" اس نے مخبوط الحواس شخص کی آنکھوں سے جھلکتی...... ذہانت کی چمک کو بہ غور دیکھتے ہوئے حکم دیا تو امدادی کارکن "یس سر" کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ دس پندرہ منٹ بعد وہ ایک عورت کے ساتھ اس کے سامنے تھا۔

"یہ نسیمہ بی بی ہے۔ اس شخص کی بھرجائی۔" گہری سانولی رنگت والی، دبلی پتلی سی اس عورت کے ہر نقش سے غربت جھلک رہی تھی۔

"یہ شخص جس کے پیروں میں زنجیریں پڑی ہیں، تمہارا دیور ہے؟" امدادی کارکن تعارف کی مختصر رسم نبھا کر آگے نکل گیا تو اس نے عورت سے سوال کیا۔

"ہاں جی! برسوں سے میرے متھے لگا یہ پاگل میرا دیور ہی ہے۔" عورت نے بیزاری سے اعتراف کیا۔ اس کے لہجے کی بیزاری اس بے پروائی سے بالکل ہم آہنگ تھی جس کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ ایک ذہنی معذور انسان کو اپنے گھر کے آنگن میں لگے درخت سے بندھا چھوڑ کر خود اپنی جان بچا کر نکل پڑی تھی...... بلکہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ بے پروائی سے بھی بڑھ کر سنگ دلی کا مظاہرہ کرتی ہوئی جان بوجھ کر اسے ڈوب مرنے کے لیے چھوڑ آئی ہوتا کہ ہمیشہ کے لیے جان ہی چھوٹے۔

"نام کیا ہے تمہارے دیور کا؟" عورت کی نیت کے بارے میں کوئی بھی حتمی رائے قائم کرنے کے بجائے اس نے اس سے سوال کیا۔

"بشیر محمد۔" عورت نے اسی بیزاری سے جواب دیا۔

"تم نے اسے زنجیروں سے درخت کے ساتھ کیوں باندھ رکھا تھا؟" شہریار نے ذرا سختی سے پوچھا۔

"تسی دیکھ ہی سکدے ہو سرکار کہ یہ جھلا ہے۔ اب میں اکیلی جان محنت مزدوری کروں، اپنے معذور منڈے کی دیکھ بھال کروں یا اس پاگل کے پیچھے لور لور پھروں؟" اس کے لہجے کی سختی کو محسوس کر کے وہ اپنی بیزاری کو قائم نہیں رکھ سکی اور لہجے میں مظلومیت بھر کر بولی۔

"کیوں... اس کا بھائی اور تمہارا خاوند کہاں ہے؟"

"وہ بارہ سال ہوئے مر گیا۔ سارا کیا دھرا اسی منحوس کا ہے۔ اسی کی وجہ سے میرے خاوند کی جان گئی اور بالکا معذور پیدا ہوا۔" عورت نے تلخی سے جواب دیا لیکن شہریار کی سمجھ میں اس کی بات کا سر پیر نہ آسکا۔

"کیا مطلب؟" اس نے اچنبھے سے پوچھا۔

"مطلب کیا ہونا ہے جی... اس کی بدعقیدگی میرے ہنستے بستے گھر کو کھا گئی۔ نہ یہ پیر کے مزار کی بے حرمتی کرتا اور نہ ہی میرا ہنستا بستا گھر اجڑتا۔ اس کی کالی زبان میری ساری خوشیوں کو کھا گئی۔" عورت بھی گویا بھری بیٹھی تھی۔ بشیر محمد کو کینہ توز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی اور پھر پے در پے اسے کئی کوسنے دیتی چلی گئی۔

"نسیمہ بی بی! مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا گزری ہے؟" شہریار کی دلچسپی پیر سرکار کا نام سن کر اس قصے میں مزید بڑھ گئی۔

"تفصیل کی ہونی ہے جی! چنگا بھلا ہنستا بستا گھر تھا میرا اور صغیر محمد کا۔ کوئی کمی تھی تو بس اولاد کی۔ ویاہ کو چھ برس گزرنے کے بعد بھی رب سوہنے نے میری گود خالی رکھی ہوئی تھی۔ صغیر محمد کی ماں اٹھتے بیٹھتے مجھے بے اولادی کے طعنے دیتی تھی بلکہ اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر اب ایک برس ہور میری گود خالی رہی تو وہ صغیر محمد کا دوجا ویاہ کر دے گی۔ میری پریشانی دیکھ کر ایک پڑوسن نے مشورہ دیا کہ اگر میں پیر سرکار کے مزار پر جاکر چڑھاوا دوں اور منت مانوں تو میری گود ضرور بھر جائے گی۔ میرے پاس ہور تو کچھ نہیں تھا۔ ماں پیو نے جہیز میں سونے کے جھمکوں کی ایک جوڑی دی تھی۔ اولاد کی خاطر میں وہ جھمکے قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ صغیر محمد بھی راضی ہو گیا اور وڈے عرس والے دن ہم دونوں میاں بیوی مزار پر جا پہنچے۔ میرا یہ دیور بشیر محمد ان دنوں شہر میں رہتا تھا۔ اسے پڑھنے لکھنے کا وڈا شوق تھا۔ اسی چکر میں یہ شہر میں رہ کر خود ہی محنت مزدوری کر کے اپنی تعلیم (تعلیم) حاصل کر رہا تھا۔ اسی شہری تعلیم نے اس کا متھا خراب کر دیا...... عرس والے دن یہ شہر سے گاؤں پہنچ گیا اور ماں سے یہ سن کر کہ میں اور صغیر محمد چڑھاوا دینے مزار پر گئے ہوئے ہیں، خود بھی ہمارے پیچھے وہیں آگیا اور لگا نصیحتیں کرنے۔ کہتا تھا قبروں سے آدمی کو کچھ نہیں ملتا۔ جو مانگنا ہے اللہ سے مانگو۔ میں نے اور صغیر محمد نے اسے وڈا سمجھایا کہ تو واپس گھر چلا جا اور ہمیں ہماری مرضی پر چھوڑ دے لیکن یہ نہیں مانا اور زور زور سے بولنے لگا۔ وڈی گستاخی کی اس روز اس نے پیر سرکار کی شان میں۔ انہیں جعلی پیر اور جانے کیا کیا کہنے کے ساتھ یہ بھی کہہ گیا کہ چودھری صاحب نے غریبوں کو لوٹنے کے لیے یہ عرس کا چکر چلایا ہوا ہے اور ان پڑھ گاؤں والوں کو بے وقوف بنا رہے ہیں۔ بھلا بتائیں جی! چودھری صاحب کو کس چیز کی کمی تھی جو وہ ہم جیسے کمینوں کو لوٹتے؟ بشیر محمد کی باتیں سن کر مزار کی خدمت کرنے والے مجاوروں کو غصہ آگیا۔ انہوں نے مار پیٹ کر اسے باہر نکالا اور کہیں لے جاکر بند کر دیا۔ بعد میں چودھری صاحب نے اسے اس کی گستاخی کی یہ سزا سنائی کہ اسے گھر میں ہی برگد کے درخت سے باندھ کر رکھا جائے اور کہیں آنے جانے نہ دیا جائے۔ صغیر محمد نے چودھری صاحب کا حکم مان کر ایسا ہی کیا لیکن بشیر محمد نے ہمارا جینا حرام کر دیا۔ دن بھر چیختا چلاتا رہتا۔ کبھی چودھری صاحب کو تو کبھی وڈے پیر سرکار کو گالیاں دیتا۔ اس کی باتیں سن کر میں ہولتی رہتی کہ ضرور ہم پر کوئی مصیبت پڑنے والی ہے۔ اس کی زبان بند رکھنے کے لیے میں اسے پورا پورا دن کھانا نہیں دیتی کہ چپ چاپ پڑا رہے گا تو روٹی ملے گی ورنہ بھوکا رہنا پڑے گا۔ میری اس دھمکی کا اس پر کیا اثر ہونا تھا۔ اس کی ماں بھی چپکے سے اور کبھی مجھ سے لڑ جھگڑ کر اپنے پتر کو روٹی کھلا دیتی تھی۔ میں خود پیر سرکار کی کرامت سے ویاہ کے چھ برس بعد ماں بننے والی تھی اس لیے زیادہ اپنی ساس کے منہ نہ لگتی۔ لیکن بشیر محمد کے کیے کا عذاب تو ہمارے گھر پر اترنا ہی تھا۔ ایک رات میری ساس ایسی سوئی کہ صبح اٹھ ہی نہیں سکی۔ اس کے مرنے کے بعد بشیر محمد کی زبان کو کچھ لگام لگی لیکن کیا فیدہ تھا جی۔ ہم تو پیر سرکار کی ناراضی کے گھیرے میں آگئے تھے۔ میرے گھر اتنا سوہنا پتر پیدا ہوا لیکن غریب پیدائشی طور پر دونوں پیروں سے معذور تھا۔ میں وڈی تڑپی، چیخی چلائی، بشیر محمد کو مارا پیٹا بھی لیکن اس سے کچھ ہونے تو والا نہیں تھا۔ آخر صبر کر کے بیٹھ گئی لیکن ہم پر پڑی نحوست ختم کہاں ہوئی تھی، جبھی دو سال بعد صغیر محمد کو کھیتوں میں کام کرتے ہوئے زہریلے سانپ نے کاٹ لیا۔ وہ وہیں چٹ پٹ ہو گیا۔ اس دن میں نے فیصلہ کر لیا کہ بشیر محمد کو اپنے آنگن میں رہنے نہیں دوں گی۔ میں دھکے دے کر اسے گھر سے نکال دیتی لیکن چودھری صاحب کا حکم ملا کہ بشیر محمد کو اسی طرح رہنے دو۔ اس کی گستاخی کی سزا یہی ہے کہ ساری حیاتی اسی طرح کھلے آنگن میں بندھا رہے اور گرمی سردی برداشت کرے۔ مجھے حکم ماننا پڑا۔ پچھلے پندرہ سال سے میں اس منحوس کو اپنے آنگن میں برداشت کر رہی ہوں۔ اپنا اور اپنے پتر کا پیٹ بھرنے کے لیے کھیت میں مزدوری کرتی ہوں۔ کچھ بچ جائے تو اس نحوست کے مارے کے آگے بھی ڈال دیتی ہوں۔ کم بخت ایسا ڈھیٹ ہے کہ ساری سختیاں سہہ کر بھی جیے جا رہا ہے۔ سات آٹھ سال سے تو اس کے دماغ نے بھی کام کرنا بند کر دیا ہے لیکن منحوس کی آنکھیں بند نہیں ہوتیں۔ اب بھی دیکھ لو کہ بجائے وہیں ڈوب کر مر جاتا، میری چھاتی پر مونگ دلنے کے لیے ایک واری فیر بچ کر آگیا ہے۔" نسیمہ بی بی کے لہجے میں بشیر محمد کے لیے نفرت ہی نفرت تھی۔ شہریار نے سر گھما کر اپنے بارے میں ہونے والی گفتگو سے بے نیاز بشیر محمد کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے اردگرد پھیلی افراتفری اور شور شرابے پر کان دھرے بغیر سر جھکائے زمین پر بیٹھا تھا۔

"سزا ملنے کے وقت کتنی عمر ہوگی بشیر محمد کی؟" وہ چودھری کے ظلم کا شکار بشیر محمد سے نظریں ہٹا کر ایک بار پھر نسیمہ بی بی کی طرف متوجہ ہوا۔

"یہی کوئی سترہ اٹھارہ برس۔" نسیمہ بی بی کے لہجے میں پھر بیزاری اترنے لگی۔ اس کی بیزاری کی پروا کیے بغیر شہریار حساب کرنے لگا۔ سترہ اٹھارہ برس کا نوجوان اپنی عمر کے پندرہ سال ایک غیر انسانی سزا بھگتنے کے بعد آج یقیناً تینتیس سال کا تھا لیکن اس نے زندگی کی جو سختیاں سہی تھیں، انہوں نے اس کی عمر کو کہیں آگے دھکیل دیا تھا اور وہ چالیس سال سے زیادہ کا ہی نظر آتا تھا۔ جانے اس کی آنکھوں میں کون کون سے خواب سجے ہوں گے اور وہ پڑھ لکھ کر کیا بننا چاہتا ہو گا؟ لیکن اپنی حق گوئی اور بے باکی کے جرم کے باعث انسانوں کے بجائے جانوروں کی سی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس صورت حال پر وہ اپنا ذہنی توازن نہ کھوتا تو کیا ہوتا؟ لیکن جہالت کی گود میں پلنے والی عقیدت نے اس کی اس حالت کو بھی پیر سرکار کا عتاب جانا تھا۔

"میں جاؤں صاحب! اپنے پتر کو ایک عورت کے پاس چھڈ کر آئی تھی۔ وہ میرے لیے پریشان ہو رہا ہو گا۔" اسے نسیمہ کی آواز نے اپنے خیالات سے چونکایا۔

"ہاں جاؤ۔" اس نے اسے اجازت دی اور خود بشیر محمد کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اسے بہت سے مصیبت زدہ لوگوں

کی مدد کے علاوہ بشیر محمد کو بھی اس منجدھار سے نکالنا تھا جس میں وہ پچھلے پندرہ سال سے پھنسا ہوا تھا۔

☆☆☆

میجر ذیشان نے اگلے روز پھر اس ہوٹل کا رخ کیا... جس میں اس نے ایملی پارکر نامی ساحرہ کے ساتھ بڑا پرسرور انگیز وقت گزارا تھا اور اپنے دل میں یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا کہ وہ عورت حیرت انگیز تھی۔ اس سے ایک بار ملنے کے بعد دوبارہ ملنے کے لیے دل تڑپتا تھا اور وہ اس کی قربت کی خواہش دل میں لیے... دوبارہ اس سے ملنے پہنچا تھا۔ اس بار اس نے دن کی روشنی کے بجائے رات کے اندھیرے کا انتخاب کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایملی سے اس کی ملاقاتیں کسی کی نظر میں آئیں لیکن ہوٹل پہنچ کر اسے اس وقت شدید دھچکا لگا جب اسے معلوم ہوا کہ ایملی کل دوپہر ہی یہاں سے رخصت ہو گئی ہے۔ اسے ایملی نے یہ تو بتایا تھا کہ وہ سیاحوں کے کسی گروپ کے ساتھ آگے سفر کا ارادہ رکھتی ہے لیکن اس کے جو ضروری کاغذات غائب ہو گئے تھے، ان کی غیر موجودگی میں اس کا سفر کے لیے آگے چلے جانا حیرت انگیز تھا۔ کسی غیر ملکی سیاح کے لیے دیارِ غیر میں سفر و رہائش کے اخراجات کے علاوہ اس کے شناختی کاغذات کی جو اہمیت ہوتی ہے، اس سے وہ خود بھی اچھی طرح واقف ہوتا ہے۔ ان حالات میں ایملی کا بنا کسی اطلاع کے اسکردو سے روانہ ہو جانا اس کے لیے باعثِ حیرت تھا۔ اس نے ہوٹل انتظامیہ سے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ کس گروپ کے ساتھ اور کہاں کے لیے روانہ ہوئی ہے اور جواب میں اسے یہ تعجب خیز بات معلوم ہوئی کہ ایملی کسی گروپ کے ساتھ روانہ نہیں ہوئی۔ وہ اکیلی ہی ہوٹل سے نکلی تھی اور اس نے اپنی منزل کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔

اس کی اس حرکت پر حیرت کا شکار میجر ذیشان مایوسی کے عالم میں اپنی رہائش گاہ پر واپس لوٹ گیا۔ ایملی کے اس طرح اچانک غائب ہو جانے سے اسے دھچکا لگا تھا۔ وہ ایسی عورت نہیں تھی کہ اس کی ایک بار کی قربت کے بعد آدمی کی طلب مٹ جاتی۔ وہ تو میجر ذیشان کے اندر اپنی قربت کی پیاس بھڑکا کر چلی گئی تھی۔ اس پیاس کو بجھانے کے لیے اس نے شراب کا سہارا لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ عادی شرابی نہیں تھا لیکن کبھی کبھی شغل کے طور پر مے نوشی میں حرج بھی نہیں سمجھتا تھا چنانچہ اس کی رہائش گاہ پر ہمہ وقت شراب کی ایک دو بوتلیں موجود رہتی تھیں۔ اس وقت بھی اس نے ایک بوتل کھولی اور مے نوشی شروع کر دی۔ ابھی پہلا ہی جام اس کے حلق سے نیچے اترا تھا کہ وہ بری طرح چونکا۔ کل اس نے ہوٹل کے کمرے میں ایملی کے شباب کے ساتھ ساتھ.... شراب پی تھی اور اب اسے دھندلا دھندلا سا کچھ یاد آ رہا تھا۔ شراب اور شباب کے نشے میں چور اس کی زبان سے ایملی کے سامنے کچھ ایسی باتیں نکلی تھیں جو نہیں نکلنی چاہیے تھیں بلکہ اب اسے یاد آ رہا تھا کہ وہ باتیں اس کی زبان سے خود بخود نہیں نکلی تھیں، ایملی نے کرید کرید کر اس سے معلوم کی تھیں۔

وہ جام ہاتھ سے رکھ کر مضطرب سا ہو کر کھڑا ہو گیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ جوں جوں وہ اس معاملے پر غور کرتا جا رہا تھا، ایملی کا کردار مشکوک ہوتا جا رہا تھا۔ ایملی کا اس سے ملنا، اپنے ساتھ واردات کی کہانی سنانا، پھر ہوٹل میں اپنے کمرے تک لے جانا اور وہاں یک دم ہی اسے اپنے حسن کے سحر میں جکڑ کر بے بس کر دینا... کچھ بھی تو اب حقیقی نہیں لگ رہا تھا۔ اس ساری تفصیل میں ایک ڈرامائی سا عنصر تھا جسے میجر ذیشان کے تربیت یافتہ ذہن کو بہت پہلے محسوس کر لینا چاہیے تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ بھی عام مردوں کی طرح ایملی کے حسن کے جال میں پھنس گیا تھا۔ اس وقت وہ اپنے اس طرح پھنسنے پر خود کو بری طرح ملامت کرتا گہری تشویش میں مبتلا ہو چکا تھا۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ جس عورت کے جال میں پھنسا تھا، وہ کوئی عام عورت نہیں تھی۔ وہ موساد کی اسپیشل ایجنٹ لنڈا تھی جو بڑے بڑے ذہین مردوں کی عقل خبط کرنے میں خصوصی مہارت رکھتی تھی۔ اگر اس نے میجر ذیشان کو الو بنا دیا تھا تو یہ کچھ انوکھا نہیں تھا۔ اسے اس کام کی بھرپور تربیت دی گئی تھی کہ وہ قدرت کی طرف سے عطا کردہ حسن کو کس طرح ہتھیار بنا کر انہیں زیر کر سکتی ہے۔

حیران پریشان میجر ذیشان پر جب اپنے آپ کو بے وقوف بنائے جانے کا انکشاف ہوا تو وہ فوراً ایکٹیو ہو گیا۔ اسے خود سے چند اہم راز اڑا کر لے جانے والی ایملی پارکر کو تلاش کرنا تھا لیکن یہ کام کوئی آسان نہیں تھا۔ ایملی کو ہوٹل سے چیک آؤٹ کیے تیس گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا اور تیس گھنٹے کسی کے منظر سے غائب ہو جانے کے لیے بہت ہوتے ہیں۔ اس نے تحقیقات شروع کروائیں تو معلوم ہوا کہ ایملی نے اسکردو سے واپس جانے کے لیے ہوائی جہاز کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ دوسری صورت زمینی راستے کی..... ایک ایسی جگہ پر جہاں مسلسل غیر ملکی سیاحوں کا آنا جانا لگا رہے، ایک عورت کے بارے میں معلومات حاصل کرنا اس لیے بھی مشکل تھا کہ وہ نہ تو اس عورت کے اصل نام سے واقف تھا اور نہ ہی اس کے پاس اس کی کوئی تصویر وغیرہ موجود تھی۔ اس کے حکم پر اس کے ماتحت صرف حلیے کی بنیاد پر ایملی کے بارے میں تحقیقات کرتے رہے تھے۔ ان تحقیقات کے نتیجے میں بالآخر انہیں اتنا تو معلوم ہو گیا کہ بیان کردہ حلیے سے کسی قدر ملتی جلتی عورت نے اسکردو سے اسلام آباد تک سڑک کے ذریعے سفر کیا تھا۔ وہاں سے آگے وہ عورت کہاں گئی تھی، یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ اس رپورٹ نے میجر ذیشان کو پوری طرح باور کروا دیا کہ وہ بہت بڑی لغزش کا مرتکب ہو گیا ہے۔ پچھتاوے اور احساسِ ندامت سے گھرے میجر ذیشان کے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اپنے ڈپارٹمنٹ کو اپنی اس کوتاہی سے آگاہ کر دے۔ چنانچہ پوری رات کی شب بیداری کے بعد صبح جب وہ ذہنی اور جسمانی طور پر تھکا ہوا کرنل توحید کے سامنے حاضر ہوا تو اس نے اپنے جرم کا اعتراف کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

کرنل توحید کو اپنے ذہین اور محبِ وطن آفیسر کی اس کوتاہی نے شدید صدمہ تو پہنچایا لیکن وہ چہرے سے کچھ بھی ظاہر کیے بغیر اس سے ایک ایک تفصیل معلوم کرتا رہا۔ کئی سوالات کے نتیجے میں اسے یہ معلوم ہو گیا کہ میجر ذیشان نے بے شک بیشتر تفصیلات جاسوس لڑکی کو بتا دی ہیں لیکن ماہ بانو کا معاملہ کھل کر سامنے نہیں آیا۔ بہرحال، میجر ذیشان کے..... پیش آنے والے واقعے نے اسے یہ باور کرا دیا تھا کہ جو کچھ پیش آیا، اس کا ذمے دار مکمل طور پر بھارت کو سمجھنا شاید ان کی ایک غلطی ہے... کیونکہ جو لڑکی میجر ذیشان سے ٹکرائی تھی، اس کا ایشیا سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ کسی غیر ایشیائی لڑکی کا بھارتی خفیہ ایجنسی کے لیے کام کرنا اگرچہ ناممکن تو نہیں تھا لیکن اس پورے معاملے میں کچھ ایسا تھا جو کرنل توحید کی چھٹی حس کو یہ احساس دلا رہا تھا کہ بات ان کے روایتی دشمن بھارت سے کہیں آگے کی ہے۔ وہ گہری فکر میں ڈوب گیا اور اپنا آئندہ کا لائحہ عمل سوچنے لگا۔

☆☆☆

ملک کے تین بڑے شہروں میں پے در پے قیامت ٹوٹی تھی۔ پہلا واقعہ کراچی میں پیش آیا۔ وہ کسی نیم سیاسی مذہبی جماعت کا سالانہ اجلاس تھا۔ جماعت کا دعویٰ تھا کہ ان کا مقصد محض اسلام کی سربلندی، تبلیغ و ترویج ہے لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ جماعت ایک سیاسی جماعت کو درونِ خانہ ٹھیک ٹھاک سپورٹ کرتی تھی۔ مذہبی جماعت سے وابستہ، اس کے نظریات و عقائد سے متاثر لوگ اپنے ووٹ عموماً اسی سیاسی جماعت کے نمائندوں کو دینا پسند کرتے تھے۔ جواب میں لازمی ہے کہ سیاسی جماعت کی طرف سے بھی کافی کچھ کیا جاتا تھا، یوں مل جل کر دونوں کا کاروبار چل رہا تھا۔ مذہبی جماعت نے اپنا سالانہ جلسہ منعقد کرنے کا اعلان کیا تو اپنی حامی سیاسی جماعت کی مدد سے انہیں من پسند جلسہ گاہ بھی میسر آ گئی اور جلسے کے شرکا کو شہر کے مختلف حصوں سے لانے لے جانے کے لیے گاڑیوں کے علاوہ دیگر انتظامات بھی بہترین طریقے سے انجام پا گئے۔ جلسے کا باقاعدہ آغاز تو نمازِ مغرب کے بعد ہونا تھا لیکن لوگوں کو سہ پہر تین بجے سے وہاں جمع کیا جانے لگا۔ عصر تک جلسہ گاہ کا یہ عالم تھا کہ ہر طرف سر ہی سر نظر آتے تھے۔ مردوں کے علاوہ عورتیں اور بچے بھی بڑی تعداد میں جلسہ گاہ میں موجود تھے۔ اسٹیج پر بھی بڑی گہما گہمی نظر آتی تھی۔ ملک کے کئی بڑے نعت خواں اس موقع پر مدعو کیے گئے تھے جو وقفے وقفے سے اسٹیج پر آ کر نعتیں پڑھ رہے تھے۔ ان کی خوب صورت آوازوں پر جھومتے شرکائے جلسہ جب وقتاً فوقتاً بلند کیے جانے والے نعروں کا جواب دیتے تو فضا گونج اٹھتی۔

ایک جوش اور سرور کا عالم تھا جس میں لوگ ڈوبے ہوئے تھے اور انہیں اپنا کئی گھنٹے قبل جلسہ گاہ میں جمع کیا جانا بھی کوفت زدہ نہیں کر رہا تھا۔ البتہ وہ عورتیں جن کی گود میں چھوٹے بچے تھے اور ماؤں کو پریشان کر رہے تھے، تھوڑی سی جھنجلاہٹ کا شکار تھیں۔ پہلے پہل وہ روتے پریشان کرتے بچوں کو مختلف ترکیبوں سے بہلانے پھسلانے کی کوشش کرتیں۔ اگر بچہ بہل جاتا تو ٹھیک ورنہ آخر میں اس کا انجام یہ ہوتا کہ ماں سے دو چار دھموکے کھا کر تھوڑی دیر ریں ریں کرتا پھر ہار مان کر یا تو چپکا بیٹھ جاتا یا ماں کی گود میں ہی دبک کر سو جاتا۔ بچے کو قابو میں کر لینے والی ماں ایک بار پھر اطمینان اور پوری عقیدت کے ساتھ نعت کے ساتھ جھومنے لگتی۔ مغرب سے ذرا قبل جماعت کے اکابرین نے جلسہ گاہ میں قدم رنجہ فرمایا۔ ان کی آمد کے بعد تو جلسہ گاہ کا رنگ ہی بدل گیا۔ لوگوں کے جوش و عقیدت میں کئی گنا اضافہ نظر آنے لگا۔ جلسہ گاہ مذہبی نعروں کے ساتھ ساتھ استقبالی نعروں سے بھی گونج اٹھی۔ مغرب کی اذان شروع ہوئی تو یہ شور ذرا تھما اور اعلان کیا گیا کہ نماز کے بعد امیر جماعت حاضرین جلسہ سے خطاب فرمائیں گے۔ نماز کے لیے صفیں ترتیب دی جانے لگیں۔ اسلامی بھائی چارے اور مساوات کا پرچار کرتے رہنے کے باوجود اکابرین جماعت کی صفیں اوپر اسٹیج پر بنیں اور عوام کے حصے میں وہی مٹی سے اٹی دریاں آئیں جہاں وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے براجمان تھے۔

صف بندی کے بعد ابھی امام نے اللہ اکبر کہنے کے

لیے ہاتھ بلند ہی کیے تھے کہ کان پھاڑ دھماکوں کی آوازوں سے فضا لرز اٹھی۔ ہر طرف چیخ و پکار اور آہ و بکا سنائی دینے لگی۔ ایسی افراتفری اور ہاہاکار مچی کہ کسی کو کوئی ہوش نہیں رہا۔ خون اور انسانی اعضا سے پٹ جانے والی جلسہ گاہ میں ایسی بھاگ دوڑ مچی کہ کئی لوگ پیروں تلے بھی آ کر کچلے گئے۔ پولیس اور امدادی کارکنوں کے حرکت میں آنے تک بہت بڑی تعداد میں انسانی زندگیاں دم توڑ چکی تھیں اور کئی لوگ طبی امداد کے لیے اسپتال پہنچنے سے پہلے ختم ہو گئے تھے۔ یہ کوئی معمولی دہشت گردی نہیں تھی۔ جلسہ گاہ میں چند سیکنڈوں کے وقفے سے تین دھماکے ہوئے تھے اور ان دھماکوں میں عوام کے ساتھ ساتھ جماعت کے اکابرین میں سے بھی کئی افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

ان اکابرین کی موت نے شہر بھر میں قیامت بپا کر دی۔ مذہبی جماعت کی حمایتی سیاسی جماعت بھی میدان میں اتر آئی۔ ایک طرف انتظامیہ کی ناقص کارکردگی اور سیکیورٹی کے خراب انتظام کی نشان دہی کرتے ہوئے حکومت کو تنقید کا نشانہ بنایا جانے لگا تو دوسری طرف شہر بھر میں جلاؤ گھیراؤ کے ساتھ احتجاجی مظاہرے کر کے دہشت گردوں کو پکڑنے اور سزا دیے جانے کے مطالبات کیے جانے لگے۔ جلسہ گاہ میں جو قیامت برپا ہوئی تھی، سو ہوئی تھی، اس کے بعد بھی کئی دن تک شہر جلتا رہا... لوگ مرتے رہے اور بے پناہ معاشی نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔ اللہ اللہ کر کے مذاکرات، دعوؤں اور جھوٹے وعدوں کے ذریعے ہفتے بھر میں کراچی میں کاروبارِ زندگی معمول پر لایا ہی گیا تھا کہ لاہور میں ایک دوسری قیامت کھڑی ہو گئی۔

وہ ایک ایسا وقت تھا جب شہر کے بیچوں بیچ واقع ریلوے ٹریک پر سے بہ یک وقت دو ٹرینوں کو گزرنا تھا۔ ٹرینوں کا اس ٹریک پر سے گزرنا معمول کی بات تھی۔ جس وقت ٹرین کو اس مقام سے گزرنا ہوتا، دونوں طرف سے پھاٹک بند کر کے ٹریک کو روک دیا جاتا۔ معروف شاہراہ پر ٹریفک کی روانی کچھ دیر کے لیے منقطع ہوتی اور پھر ٹرین کے گزر جانے کے بعد ایک بار پھر ٹریفک رواں دواں ہو جاتا۔ اس روز جانے کیا ہوا کہ ٹرینوں کے گزرنے کے وقت پھاٹک بند نہیں کیا گیا۔ اسپیڈ میں آتی کئی گاڑیاں ٹرینوں کی آمد سے بے خبر ریلوے ٹریک کو کراس کر کے آگے کی طرف گامزن ہونے کے لیے آگے بڑھیں تو دونوں طرف سے آتی ٹرینوں کی زد میں آ گئیں۔ موقع پر ایک قیامت سی مچ گئی۔ گاڑیوں کے مسافر تو تیز رفتار ٹرینوں کی زد میں آ کر اپنی گاڑیوں سمیت جو قیمہ بنے سو بنے، ٹرینوں میں سفر کرنے والے بھی محفوظ نہیں رہ سکے۔ ایک ٹرین کی کئی بوگیاں ٹریک سے اتر گئیں جبکہ دوسری ٹرین کے ڈبے ایک دوسرے کے اندر اس بری طرح دھنسے کہ اندر موجود مسافر پس کر رہ گئے۔ موقع پر وہی معمول کی افراتفری مچ گئی۔ پولیس موبائلز اور ایمبولینسوں کے سائرن، نیوز چینلز کے نمائندوں کی بھاگ دوڑ، سیاسی و سماجی لیڈروں کے مذمتی بیانات، موقع پرستوں کا مردہ و زخمی افراد کے مال و اسباب کو لوٹنا... یہ سب ہو چکا تو سوال اٹھا کہ آخر مقررہ وقت پر ریلوے پھاٹک کیوں بند نہیں کیا گیا تھا؟ سرکاری اہلکار اس سوال کے جواب میں گول مول بیانات دیتے رہے لیکن بہرحال تحقیق کرنے والے بہت سے حقائق سے واقف ہو چکے تھے۔

انکوائری کے نتیجے میں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ریلوے پھاٹک کھولنے اور بند کرنے کے ذمے دار شخص کو قتل کر دیا گیا تھا چنانچہ وہ شخص اس قابل ہی نہیں تھا کہ اپنی ڈیوٹی انجام دے سکتا۔ ریلوے کے اس ملازم کی موت نے ثابت کر دیا کہ جو حادثہ پیش آیا، وہ محض حادثہ نہیں تھا بلکہ ایک بڑی سازش تھی جس کا شکار ہو کر کئی لوگ لقمۂ اجل بن گئے اور کئی کے نصیب میں عمر بھر کی معذوری لکھ دی گئی۔ تحقیقات کا دائرہ مزید وسیع کیا گیا تو یہ انکشاف ہوا کہ صرف گاڑیوں کے ٹرینوں سے تصادم کی سازش کا تانا بانا نہیں بُنا گیا تھا بلکہ ٹریک پر ایک ٹائم بم بھی نصب کیا گیا تھا۔ بم بہت زیادہ طاقتور نہیں تھا لیکن بہرحال ایسا ضرور تھا کہ اس نے ریل کی پٹریوں کو اکھاڑ ڈالا تھا۔ یہ بم ٹھیک اس وقت پھٹا تھا جب ٹرینیں اس کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ یعنی سازش تیار کرنے والوں نے پورا انتظام کیا تھا کہ اگر گاڑیوں اور ٹرینوں کا آپس میں تصادم نہ بھی ہو تو وسیع پیمانے پر تباہی پھیل سکے۔

تحقیقات کرنے والے خفیہ ایجنسی کے اہلکاروں نے اگرچہ میڈیا کو حقائق کی بھنک نہیں پڑنے دی لیکن خود ان کی کارروائیاں جاری رہیں اور وہ اس دہشت گردی میں ملوث ہاتھوں تک رسائی حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگ گئے۔ اس جدوجہد نے انہیں قبائلی علاقوں تک پہنچا دیا۔ کچھ ایسے نام سامنے آئے جو اسمگلرز کی حیثیت سے پہلے ہی مشکوک افراد کی فہرست میں شامل تھے لیکن نامعلوم وجوہات کی بنا پر خفیہ ادارے ہمیشہ انہیں طرح دیتے رہے تھے۔ ان افراد کے بارے میں قبائلی علاقوں کا بچہ بچہ جانتا تھا کہ وہ پڑوسی ملک سے سامانِ آرائش، اشیائے خورونوش، کپڑا اور اسی

طرح کی دوسری چیزیں اسمگل کرتے ہیں۔ خفیہ اداروں کے پاس رپورٹ تھی کہ وہ ان اشیا کی آڑ میں اسلحہ اور منشیات جیسی اشیا بھی اسمگل کر رہے ہیں لیکن انہوں نے ان اسمگلرز پر ہاتھ ڈالنا ضروری نہیں سمجھا۔

اب جو سانحۂ کراچی اور لاہور کی تحقیقات شروع ہوئیں تو معلوم ہوا کہ پڑوسی ملک سے دھماکا خیز مواد انہی اسمگلرز کے ذریعے پاکستان پہنچایا گیا تھا۔ اس مرحلے پر یقیناً خفیہ ایجنسیوں کو ان کے خلاف فیصلہ کن قدم اٹھانا چاہیے تھا اور ملک کی جڑیں کاٹنے والے ان غداروں کی گرفتاری عمل میں آنی چاہیے تھی لیکن وہ اسمگلرز ایجنسیز کے افراد سے چند قدم آگے ہی تھے۔ وہ اپنی گردن گرفت میں آنے سے قبل ہی بیرونِ ملک فرار ہو چکے تھے چنانچہ حکومتی خفیہ اداروں کے بس میں فقط مایوسی سے ہاتھ ملنے کے سوا کچھ نہیں رہا تھا۔ ہاں، اس بھاگ دوڑ کا ایک فائدہ ضرور ہوا۔ تحقیقی افسران کے ہاتھوں یہ خبر لگ گئی کہ دہشت گردی کا تیسرا واقعہ اسلام آباد میں پیش آنے کا امکان ہے اور اس مقصد کے لیے کچھ دہشت گرد دھماکا خیز مواد کے ساتھ اسلام آباد کی حدود میں داخل بھی ہو گئے ہیں۔

ہر طرف سیکیورٹی ہائی الرٹ کر دی گئی۔ تمام سرکاری عمارتوں، مساجد اور تعلیمی اداروں کی سخت نگرانی کی جانے لگی۔ دہشت گردوں کی تلاش میں کئی جگہ چھاپے بھی مارے گئے لیکن وہ تو گویا سلیمانی ٹوپی پہن کر گھوم رہے تھے کہ کسی کی پکڑ میں نہیں آ سکے پھر انہوں نے جو کارروائی کی وہ بھی توقع کے خلاف تھی چنانچہ سارے حفاظتی انتظامات دھرے کے دھرے رہ گئے۔ دہشت گردوں نے اس بار اسلام آباد کے ایک بڑے ہوٹل کو نشانہ بنایا تھا۔ ہوٹل میں دھماکا ہوا اور کئی منزلہ عمارت کو شدید نقصان پہنچنے کے ساتھ ساتھ کئی انسانی جانیں بھی زد میں آ گئیں۔ مرنے والوں میں مقامی افراد کے ساتھ کئی غیر ملکی بھی شامل تھے چنانچہ حکومتِ پاکستان کو کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی اس پریشانی اور شرمندگی کے برعکس کہیں کچھ لوگ بہت خوش تھے۔ انہوں نے اپنا ہر ٹارگٹ بہت کامیابی کے ساتھ حاصل کر لیا تھا اس لیے خوش ہونا ان کا حق تھا۔ ان خوش ہونے والوں میں را کا اعلیٰ عہدے دار نارائن بھی شامل تھا جسے اسلام آباد ہوٹل کے بم دھماکے کے ٹھیک اگلے دن لنڈا کی طرف سے ایک پیغام موصول ہوا تھا۔ پیغام کے الفاظ تھے۔

”کامیابی مبارک۔ تمہاری کارکردگی نے ہمارے زخموں پر مرہم رکھنے کا کام کیا ہے۔ تم نے ہمیں خوش کیا، جلد ہی تمہیں بھی خوش کر دیا جائے گا۔“

اس پیغام نے نارائن کی باچھیں پھیلا دیں۔ ملکی مفادات کے ساتھ ساتھ اسے انعام میں لنڈا کی ہوش ربا قربت بھی تو میسر آنے والی تھی۔ اس نوید کو سن کر وہ خوش نہ ہوتا، یہ کیسے ممکن تھا؟

☆☆☆

”ہیلو اے سی صاحب!“ وہ اپنے سامنے رکھی ایک رپورٹ کا جائزہ لے رہا تھا کہ جانی پہچانی پُرجوش آواز کے مخاطب کرنے پر اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ ڈاکٹر ماریا تر و تازہ چہرہ لیے اپنی تمام تر دلکشی کے ساتھ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ادھیڑ عمر عورت بھی موجود تھی۔ اس عورت نے لانگ اسکرٹ پہن رکھا تھا اور گلے میں مفلر نما دوپٹا لپیٹ رکھا تھا۔

”ان سے ملیے، یہ میری ممی ہیں۔“ ڈاکٹر ماریا نے اپنے ساتھ موجود خاتون کا تعارف کروایا۔

”اوہ... ہیلو مسز جوزف! ڈاکٹر ماریا سے آپ کا بہت ذکر سنا ہے۔ ملنے کی خواہش بھی تھی لیکن بس اتفاق ہے کہ میں موقع ہی نہیں نکال سکا آپ سے ملاقات کے لیے۔“ شہریار نے خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں۔ مجھے اندازہ ہے کہ آپ جس سیٹ پر کام کر رہے ہیں، اس کی مصروفیات ہی ایسی ہیں کہ بندہ چاہ کر بھی وقت نہیں نکال پاتا۔“ جواباً مسز جوزف نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ ایک شان دار عورت تھی جس کے بولنے کا ناپا تلا انداز اور چہرے پر موجود وقار ظاہر کر رہا تھا کہ اس کی ساری زندگی مہذب ماحول میں گزری ہے۔ شہریار کو یاد تھا کہ ڈاکٹر ماریا نے اسے اپنی ماں کے بارے میں بتاتے ہوئے یہ بات بھی بتائی تھی کہ وہ ایک ملازمت پیشہ عورت تھی جس نے خود اپنی محنت سے اپنی اکلوتی بیٹی کو میڈیکل کی تعلیم دلوائی تھی۔

”آپ لوگ تشریف تو رکھیں۔“ شہریار کو خیال آیا کہ وہ دونوں ابھی تک کھڑی ہوئی ہیں تو وہ اپنے سامنے رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ وہ اس وقت پیر آباد میں موجود تھا اور ایک ٹینٹ میں قائم کردہ عارضی دفتر میں بیٹھا متاثرین کے لیے کی جانے والی امدادی کارروائیوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک ہونے والی طوفانی بارش نے پیر آباد سمیت اور بھی دیہاتوں کو متاثر کیا تھا لیکن نہر کا پانی ... گاؤں میں داخل ہو جانے کی وجہ سے پیر آباد میں نقصان نسبتاً زیادہ ہوا تھا۔ آج کل وہ ان متاثرین کی بحالی کے سلسلے

میں بری طرح مصروف تھا اور باقی معاملات کی طرف سے اس کی توجہ فی الحال ہٹی ہوئی تھی۔ کبھی وہ ایک گاؤں میں ہوتا تو کبھی دوسرے گاؤں میں۔ اب بھی اسے پیر آباد پہنچے آدھے گھنٹے سے کچھ اوپر ہی وقت گزرا ہوگا۔ ڈاکٹر ماریا اور مسز جوزف کو یقیناً اس کی یہاں آمد کی اطلاع مل گئی تھی چنانچہ وہ دونوں اس سے ملنے چلی آئی تھیں۔

''بارشوں نے اچھی خاصی تباہی مچا دی ہے۔ بے چارے غریب لوگ بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ ایک طرف ان کے گھر بار اور کھیت زد میں آئے ہیں تو دوسری طرف صحت کے مسائل بھی کھڑے ہو گئے ہیں۔ چھوٹے بچے خاص طور پر متاثر ہوئے ہیں۔ بچوں میں پیٹ اور جلد کی بیماریاں پھیل رہی ہیں۔ مرکزِ صحت میں علاج کے لیے لائے جانے والے زیادہ تر مریض انہی دو تکالیف کی شکایت کرتے ہیں۔ ہمارے پاس اسٹاک میں موجود دواؤں کی بھی قلت ہونے لگی ہے۔'' اس کی پیشکش پر وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئیں اور بیٹھنے کے بعد ڈاکٹر ماریا نے حالیہ تباہ کاری پر تبصرہ شروع کر دیا۔

''مجھے دواؤں کے سلسلے میں اطلاع مل گئی تھی۔ میں نے آرڈر کر دیا ہے۔ آج شام تک آپ تک ساری ضروری دوائیں پہنچ جائیں گی۔'' شہریار نے اسے جواب دیا۔

''تھینک یو اے سی صاحب! مجھے معلوم ہے کہ آپ کی طرف سے ایسے کسی کام میں تاخیر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس وقت آپ کے پاس آنے کا یہ مقصد بھی نہیں تھا۔ اس وقت تو میں ممی کے اصرار پر انہیں آپ سے ملوانے کے لیے لائی تھی۔ ممی آپ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتی ہیں۔'' ڈاکٹر ماریا نے بتایا تو وہ سوالیہ نظروں سے مسز جوزف کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں اسکول کے سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہتی تھی۔ پچھلے دنوں جو کچھ پیش آیا، وہ بہت افسوس ناک تھا۔ قیمتی انسانی جانوں کے زیاں کے ساتھ ساتھ گاؤں کے بچوں کا مستقبل بھی داؤ پر لگ گیا ہے۔ پہلے اسکول کے روحِ رواں ماسٹر آفتاب غائب ہوئے اور اب ان کے ساتھی بھی نہیں رہے۔ ظاہر ہے ان حالات میں بچوں کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہنا تو ممکن ہی نہیں ہے۔ آپ فی الحال موجودہ مصیبت سے نمٹ رہے ہیں۔ اسکول کے سلسلے میں نئے سرے سے انتظامات کرنے میں تو آپ کو کافی وقت لگ جائے گا۔'' مسز جوزف نے بولنا شروع کیا تو شہریار کے ہونٹ بھنچ گئے۔ منیب اور اس کے ساتھی اساتذہ کی دردناک اموات ایسی نہیں تھیں جنہیں بھلایا جا سکتا... اور اس سے بڑھ کر افسوس کا مقام یہ تھا کہ ابھی تک ان کی ناحق اموات کے لیے کسی ظالم پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکا تھا۔ وہ دوسری طرف مصروف ہو گیا تھا تو گویا معاملہ دب ہی گیا تھا، حالانکہ اس نے قتل کی جو ایف آئی آر درج کروائی تھی، اس میں واضح طور پر چودھری پر شک ظاہر کیا تھا۔

''میں آج کل یہاں رہ کر ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہی ہوں۔ ساری زندگی ملازمت کرنے کی وجہ سے فارغ بیٹھنے کی عادت نہیں رہی اس لیے وقت گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کوشش کرتی ہوں کہ ماریا کے ساتھ اس کے کام میں ہاتھ بٹا دوں لیکن ظاہر ہے، میرا میڈیکل کے شعبے سے کوئی تعلق نہیں اس لیے میں اس کے لیے زیادہ کارآمد بھی نہیں ہوں۔ اپنی اس بے کاری کی زندگی سے اکتا کر میں کوئی حل ڈھونڈ رہی تھی تو کل بیٹھے بیٹھے مجھے اسکول کا خیال آ گیا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں گاؤں کے بچوں کو پڑھانے کا سلسلہ شروع کر دوں؟ اس طرح مجھے بھی ایک اچھی مصروفیت مل جائے گی اور بچوں کا بھی کچھ بھلا ہو جائے گا۔'' مسز جوزف کے الفاظ گویا اس کے لیے خوشی کا پیام تھے۔ وہ کھل اٹھا۔

''تھینک یو مسز جوزف! تھینک یو ویری مچ۔ موجودہ حالات میں آپ کا یہ تعاون میرے لیے بہت بڑا احسان ہو گا۔ میں خود اس سلسلے میں پریشان تھا۔ مجھے اندازہ ہے کہ اسکول کے لیے نئے اسٹاف کا تقرر کرنا خاصا دشوار مرحلہ ثابت ہوگا۔ سابقہ اساتذہ کے ساتھ جو غیر انسانی سلوک کیا گیا ہے، اس کے بعد کوئی دوسرا ٹیچر پیر آباد کا رخ کرتے ہوئے گھبرائے گا۔ موجودہ حالات میں آپ کی یہ پیشکش بہت اہمیت رکھتی ہے۔ میں آپ کی اس آفر کے لیے تہِ دل سے مشکور ہوں۔'' وہ واقعی بہت خوش تھا۔ ایسے حالات میں جبکہ اسکول کی عمارت کو تالا لگا ہوا نظر آ رہا تھا، مسز جوزف کی پیشکش اندھیرے میں امید کا دیا بن گئی تھی۔

''شکریے کی کوئی بات نہیں اے سی صاحب! ہم بے شک آپ کے ہم مذہب نہیں ہیں لیکن ہم وطن تو ہیں۔ ہم بھی اس مٹی سے محبت کرتے ہیں اور اس کا قرض اپنی جان پر محسوس کرتے ہیں۔ لہٰذا اگر مجھے اس قرض کو ادا کرنے کا ایک موقع مل رہا ہے تو میں اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھاؤں۔'' مسز جوزف نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنا نقطۂ نظر بیان کیا۔

''بس تو پھر ٹھیک ہے... میں اپنے آدمیوں سے کہتا ہوں کہ اسکول کی عمارت کو دیکھ لیں اور اس لائق بنا دیں کہ بچے وہاں بیٹھ سکیں۔ دیگر سہولیات بھی آہستہ آہستہ فراہم کر دی جائیں گی۔ آپ بتائیں، آپ کب سے کام شروع کرنا پسند کریں گی؟'' مسز جوزف کے جذبے سے متاثر شہریار کے لہجے میں بڑا جوش تھا۔

''میں تو ابھی سے کام شروع کرنے کو تیار ہوں لیکن یقیناً عملاً ایسا ہونا ممکن نہیں۔'' مسز جوزف نے جواب دیا۔

''آپ مجھے آج اور کل کا دن دے دیں۔ پرسوں آپ کو آپ کا اسکول تیار ملے گا۔'' اس نے انہیں یقین دہانی کروائی۔

''ٹھیک ہے... تو پرسوں صبح میں اسکول پہنچ جاؤں گی۔ اب آپ ہمیں اجازت دیجیے۔ ماریا کو بھی اپنے مریض دیکھنے ہوں گے۔'' مسز جوزف نے کہا اور پھر وہ دونوں الوداعی کلمات ادا کرتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئیں۔

ان دونوں کے جانے کے بعد شہریار نے سامنے میز پر رکھا اپنا موبائل اٹھایا اور ایک نمبر ڈائل کیا۔

''چودھری افتخار شاہ کے خلاف منیب اور اس کے ساتھی اساتذہ کے قتل کے الزام میں ایک ایف آئی آر درج کروائی گئی تھی ایس پی صاحب! آپ نے اس سلسلے میں کیا ایکشن لیا؟'' کال ریسیو ہونے پر مطلوبہ شخص کے لائن پر آتے ہی اس نے سرد لہجے میں دریافت کیا۔

''اس سلسلے میں تو کوئی ایکشن لینے کا موقع ہی نہیں ملا سر! موسم کی خراب صورت حال نے ہی ساری گڑبڑ کر دی۔ آپ بھی مصروف ہو گئے۔ آپ کی سپورٹ کے بغیر تو ہم چودھری کے خلاف ایکشن نہیں لے سکتے تھے... وہ بھی اس صورت میں کہ ہمارے پاس اس کے خلاف کوئی ثبوت یا گواہ موجود نہیں۔'' ایس پی نے گویا اس پر اپنی معذوری ظاہر کر دی۔ ایس پی برا آدمی نہیں تھا لیکن بہرحال اس میں اتنی جرأت بھی نہیں تھی کہ اپنے کندھوں پر ذمے داری لیتے ہوئے چودھری کے خلاف ایکشن لینے کی جسارت کر سکتا۔

''کتنے افسوس کا مقام ہے ایس پی صاحب... کہ جس قانون کو مظلوموں کا سہارا بننا چاہیے، اس قانون کے محافظ ایک ظالم کی بیخ کنی کے لیے خود سہاروں کی تلاش کریں۔ یہاں کچھ لوگ ناحق مارے گئے اور آپ میں اتنی جرأت نہیں کہ آپ قاتل کے خلاف قانونی کارروائی کر سکیں؟'' اس نے غم و غصے کی ملی جلی کیفیت میں ایس پی کو شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔

''میں مجبور ہوں سر! میرے شانے اتنے طاقتور نہیں کہ اتنا بھاری بوجھ اٹھا سکیں۔ میں عمر کے اس حصے سے بھی گزر چکا ہوں جب آدمی جذبات میں آگے کچھ بھی دیکھے بغیر خود کو ہیرو ثابت کرنے کے لیے کوئی بھی قدم اٹھا لیتا ہے... لیکن ابھی آپ میری بات نہیں سمجھیں گے۔ ابھی آپ بیچلر ہیں۔ کوئی بھی جرأت مندی دکھاتے ہوئے آپ کو اپنے بیوی بچوں کا خیال نہیں ستا سکتا لیکن ہم جیسوں کو خیال آتا ہے، ہمارے کسی قدم کا ہماری فیملی پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔'' ایس پی کے لہجے میں کچھ جھنجلاہٹ اور بے بسی تھی۔

''اگر یہ بات ہے تو پھر آپ کو پولیس فورس چھوڑ دینی چاہیے۔'' وہ ایس پی کا جواب سن کر شدید مایوس ہوا تھا اس لیے جلے دل سے مشورہ دیا۔

''میں اگر آپ کے مشورے پر عمل کر بھی لوں تو اس سے محکمے کو کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ میری جگہ جو دوسرا شخص آئے گا، وہ بھی یا تو میری طرح مجبور ہو گا یا پھر کوئی ایسا عقل مند جو اس جنگ میں آپ کے ساتھ کھڑا ہو کر ڈراوے اور دھمکیاں سننے کے بجائے چودھری کی صف میں کھڑا ہونا پسند کرے گا۔''

''کیا بات ہے ایس پی صاحب! کیا آپ کو چودھری کی طرف سے ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے؟'' اس کے جواب نے شہریار کو چونکایا۔

''جس دن ہم نے ماسٹر آفتاب کی تلاش میں چودھری کے ڈیرے پر ریڈ کیا تھا۔ اس کے دوسرے دن سے یہ صورت حال ہے۔ میری بیٹی اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلتی ہے تو اس کا گھر سے اسکول کے گیٹ تک تعاقب کیا جاتا ہے۔ آج بیٹا اپنے دوستوں کے ساتھ میچ کھیلنے کے لیے گراؤنڈ گیا تو وہاں اسے دو تین افراد نے ہراساں کرنے کی کوشش کی اور اس سے کہا کہ اپنے باپ سے کہو زیادہ قانون کا محافظ نہ بنے۔ جو لوگ قانون توڑنا جانتے ہیں، ان کے لیے قانون کے محافظوں کو بھی توڑ پھوڑ کر رکھ دینا مشکل نہیں ہے۔ اب آپ بتائیں... ان حالات میں، میں پریشان نہ ہوں اور گھبراؤں نہ تو پھر کیا کروں؟ جو لوگ میرے بچوں کا تعاقب کر سکتے ہیں، انہیں دھمکیاں دے سکتے ہیں، وہ کل کو انہیں کوئی نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔ میں اپنے بچوں کو کوئی نقصان پہنچنا تو برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کے مقابلے میں تو میرے لیے یہ زیادہ آسان ہے کہ میں آپ کے مشورے کے مطابق پولیس فورس چھوڑ دوں اور اپنے روزگار کے سلسلے میں کوئی اور بندوبست کرنے کی کوشش کروں۔'' ایس پی کے الفاظ سے اسے اندازہ ہوا کہ وہ بے چارہ واقعی خوف زدہ ہے اور یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ چودھری افتخار جیسے غنڈا گیری کرنے والے وڈیرے اور جاگیردار واقعی اتنے

خطرناک ہوتے ہیں کہ ان کے لیے پورے پورے خاندانوں کو اجاڑ ڈالنا ذرا مشکل نہیں ہوتا۔ موجودہ ایس پی تو پھر بہر حال ایک شریف آدمی تھا لیکن سابقہ ایس پی رفیق تارڑ جیسا آدمی جو عرصہ دراز تک چودھری کا ہم نوالہ و پیالہ رہا تھا، وہ بھی اس کے مقابل ٹکنے کی جرأت نہیں کر سکا تھا۔ اس نے اپنے تیسرے ساتھی فاریسٹ آفیسر باجوہ کا انجام دیکھا تھا۔ چودھری نے صرف اس وجہ سے کہ باجوہ اس کے لیے کارآمد نہیں رہا تھا اور جنگل سے لکڑی اور کھالوں کی چوری کے سلسلے میں اس کی گردن جکڑی جا چکی تھی، دوستی کا لحاظ کیے بغیر بڑی خاموشی سے باجوہ کو قتل کروا دیا تھا... کہ نہ باجوہ رہے، نہ پولیس اس کی زبان سے چودھری کے خلاف کچھ اگلوا سکے۔

ایس پی رفیق تارڑ نے یہ صورتِ حال دیکھی تو سوچا وہ خود بھی کسی وقت چودھری کی زد میں آ سکتا ہے چنانچہ اس نے عقل مندی سے کام لیا اور وزیرِ اعلیٰ سے اپنی رشتے داری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تربیتی کورس کے بہانے بیوی بچوں سمیت ملک سے باہر نکل گیا۔ اس طرح ایک طرف اس کی ملازمت برقرار رہی تو دوسری طرف وہ چودھری کا شکار بننے سے بھی بچ گیا۔ موجودہ ایس پی بھی خود کو اور اپنی فیملی کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ انسانی فطرت ہی یہی ہے کہ وہ یہ سوچے بغیر کہ موت کا ایک مخصوص وقت معین ہے اور اس معین وقت تک موت.... زندگی کی حفاظت کرتی ہے، خود زندگی کی حفاظت میں ہلکان رہتا ہے۔ وہ اللہ کو زبان سے ربّ العالمین تسلیم کرنے کے باوجود عملاً اس کے اختیارات کو اتنا محدود سمجھتا ہے کہ زندگی اور موت جیسے معاملات بھی اپنے جیسے انسانوں کے ہاتھ میں تصور کرنے لگتا ہے۔ عقیدے کی یہ خرابی اور ایمان کی کمزوری اسے زندگی کے ہر شعبے میں کمزور اور ناکام بنا دیتی ہے۔

ایس پی کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ وہ کرپٹ آدمی نہیں تھا لیکن وہ ایسا ایمان والا بھی نہیں تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی قدرت پر یقین نہ رکھتا ہو۔ شہریار نے ایس پی سے فی الحال مزید بات کرنا بے کار سمجھتے ہوئے خاموشی سے لائن کاٹ دی۔ اس کا سب سے بڑا المیہ ہی یہ تھا کہ وہ جو جنگ لڑ رہا تھا، اس میں اس کا ساتھ دینے والی سپاہ کم حوصلہ اور بزدل تھی اور ان کی یہ بزدلی ظالم کے حوصلے اور بھی بلند کر دیتی تھی۔ وہ سر جھٹک کر ایک بار پھر اس رپورٹ کا جائزہ لینے لگا جسے ڈاکٹر ماریا اور اس کی ممی کی آمد سے قبل دیکھ رہا تھا۔ ٹینٹ میں کچھ دوسرے افراد بھی مصروفِ عمل تھے لیکن کوئی بھی اس سے غیر ضروری طور پر مخاطب ہونے کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔

ٹینٹ کے سامنے کے حصے میں اس کا ڈرائیور کم باڈی گارڈ مستعد کھڑا ہوا تھا۔ عبدالمنان اس کے ساتھ یہاں نہیں آیا تھا۔ اس کے ذمے اس نے نور پور کا دورہ کر کے وہاں حالیہ بارشوں کے بعد ہونے والی تباہ کاری کا جائزہ لینے اور ضروری اقدامات اٹھانے کا کام لگایا تھا۔

''اس رپورٹ کی حد تک تو آپ لوگوں کی کارکردگی خاصی تسلی بخش ہے۔ صحیح اندازہ فیلڈ میں جا کر ہی ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ وہاں بھی مجھے مایوسی نہیں ہوگی۔'' رپورٹ کا جائزہ لینے کے بعد اس نے وہاں بہ طور انچارج کام کرنے والے شخص سے کہا۔

''آپ اطمینان رکھیں سر! ہماری طرف سے آپ کو کوئی شکایت نہیں ملے گی۔'' اس شخص نے پُراعتماد لہجے میں اسے یقین دہانی کروائی۔ اس کے دعوے پر کوئی بھی تبصرہ کیے بغیر وہ کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور ٹینٹ سے باہر کا رخ کیا۔ اسے باہر کی طرف آتا دیکھ کر پہلے ہی سے مستعد کھڑا ڈرائیور اور بھی ہوشیار ہو گیا اور تیزی سے گاڑی کی طرف لپکا تاکہ اس کے لیے پچھلی نشست کے ساتھ والا دروازہ کھول سکے۔

شہریار بھی اردگرد سے بے نیاز گاڑی ہی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یک دم ہی کسی گاڑی کے انجن کی ہلکی سی آواز سنائی دی اور اگلے ہی لمحے زبردست چرچراہٹ کے ساتھ ایک لینڈ کروزر اس کے قریب رکی۔ اس نے نظر اٹھا کر لینڈ کروزر کی طرف دیکھا۔ حسبِ توقع اس میں چودھری اپنے چیلوں کے ساتھ سوار تھا۔

''واہ جی واہ! ساڈے پنڈ کی تو قسمت ہی جگ گئی ہے۔ اے سی صاحب آج کل اِدھر زیادہ ہی نظر آ رہے ہیں۔'' وہ شاید چودھری کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتا لیکن چودھری بولتا ہوا اپنی گاڑی سے نیچے اتر آیا۔

''کمال ہے چودھری صاحب! آپ اس تباہی و بربادی کو قسمت جاگنا کہتے ہیں؟ میں تو یہاں اس لیے چلا آتا ہوں کہ غریب گاؤں والوں کی بے آرامی اور بھوک کا خیال مجھے چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔'' اس نے تلخی سے چودھری کی بات کا جواب دیا۔

''نقصان تو ہمارا بھی بڑا ہوا ہے لیکن آپ نے ہمارے نقصان کا حساب کتاب پوچھنے کے لیے کبھی ہماری طرف آنے کی زحمت نہیں کی۔'' چودھری نے فوراً شکوہ کیا۔

''آپ اپنا نقصان پورا کرنا بڑی اچھی طرح جانتے ہیں، یہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ البتہ حساب کتاب واقعی مجھے آپ سے کرنا ہے اور اس کے لیے میں پہلی فرصت میں

آپ کی طرف آؤں گا۔'' وہ ایک ایک لفظ چباتے ہوئے بولا۔ جواب میں چودھری نے قہقہہ لگایا۔

''ہاں جی، سنا ہے آپ نے ماسٹر منیب اور اس کے ساتھیوں کے قتل کے الزام میں مجھے مجرم نامزد کیا ہے۔ آپ سے ایسی حماقت کی امید نہیں تھی۔'' اس کے لہجے میں واضح تمسخر تھا۔

''میں نے بلا جواز ایسا نہیں کیا ہے۔ مرنے سے پہلے منیب نے مجھے مدد کے لیے فون کیا تھا اور بتایا تھا کہ اس کے مکان کو آپ کے گرگوں نے گھیر رکھا ہے۔ میرے موبائل فون پر مرنے سے قبل منیب کی طرف سے آنے والی کال آپ کے خلاف ایک اہم ثبوت ہے۔ آپ اتنی آسانی سے بچ کر نہیں نکل سکیں گے۔'' اس کے اور چودھری کے درمیان جو دشمنی کا رشتہ تھا، اب اس پر کسی مصلحت کا پردہ ڈالنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی چنانچہ وہ بہت کھل کر دو بدو اس سے بات کر رہا تھا۔

''ایسے ثبوت عدالت میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ آپ کا بیان میرے اوپر ایک الزام سے زیادہ کچھ بھی ثابت نہیں ہوگا... بلکہ ہو سکتا ہے جواباً میں آپ پر یہ الزام عائد کر دوں کہ پچھلے دنوں میرے ڈیرے پر جو حملہ ہوا، اس میں آپ ملوث تھے اور آپ ہی کے اشارے پر اس موقع پر پولیس نے حرکت میں آنے کی زحمت نہیں کی۔'' چودھری نے شاطرانہ لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔

''آپ اپنی ساری چالیں چل دیکھیں لیکن یاد رکھیے گا کہ یومِ حساب زیادہ دور نہیں ہے۔ اپنے ہر ظلم اور زیادتی کا آپ کو بالآخر نتیجہ بھگتنا ہی پڑے گا۔'' اس بار وہ اپنی بات کہنے کے بعد مزید وہاں رکا نہیں اور اپنی گاڑی کے کھلے دروازے سے گزر کر پچھلی نشست پر براجمان ہو گیا۔ اس کا اشارہ پاتے ہی ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ شیڈول کے مطابق اپنے سارے کام نمٹاتے ہوئے بھی اس کا ذہن چودھری کی باتوں میں الجھا رہا۔ چودھری نے یہ بات بالکل صحیح کہی تھی کہ منیب کی آخری فون کال اس کے خلاف کوئی واضح ثبوت نہیں تھا۔ وہ قتل کے اس مقدمے میں چودھری کو گھسیٹ کر عدالتی کارروائیوں میں تو الجھا سکتا تھا لیکن اسے مجرم ثابت نہیں کر سکتا تھا۔ چودھری اور اس کے گرگے قتل کے اس الزام سے صاف بچ نکلتے جبکہ ان مظلوم اساتذہ کا خون اس سے پکار پکار کر یہی مطالبہ کر رہا تھا کہ ان کے خونِ ناحق کا بدلہ ضرور لیا جائے۔ غم و غصے کی شدید کیفیت میں جلتا جب وہ سارا دن کا تھکا ہارا واپس اپنے دفتر پہنچا تو انتقامی جذبات

سے پوری طرح مغلوب تھا۔ اپنے اندر بھڑکتے اس آتش فشاں کو سرد کرنے کے لیے یک دم ہی ایک نام اس کے ذہن کی اسکرین پر جھلملایا... ''جگو!''

اس نام کے ذہن میں آتے ہی اس کے اندر جیسے سکون سا اتر آیا اور انگلیاں بے تابی سے جگو کا نمبر ڈائل کرنے لگیں۔

جگو ایک سیاسی جماعت سے وابستہ تھا اور اس جماعت کے مفاد کے لیے ہر وہ کام کرتا تھا جسے کوئی غنڈا کر سکتا تھا۔ اس کی حیثیت کسی سڑک چھاپ غنڈے کی نہیں تھی۔ نہ وہ ہر ایک کے ہاتھوں بکنے والا تھا لیکن جب سے شہریار نے اس کے بیمار بیٹے کو بے یار و مددگار دیکھ کر اپنی گاڑی میں اسپتال پہنچایا تھا اور اس کی زندگی بچانے کا ذریعہ بنا تھا، جگو اس کا بے دام غلام بن گیا۔ اس نے شہریار کو پیشکش کی تھی کہ وہ جب چاہے، اس کو کسی کام کے لیے حکم دے سکتا ہے۔ اس کے کہنے پر آفتاب کو چودھری کی قید سے چھڑا کر وہ اپنی وفاداری ثابت بھی کر چکا تھا۔ اب ایک بار پھر اس کے دعوے کو آزمانے کا موقع آ گیا تھا اور شہریار کو یقین تھا کہ جگو اسے مایوس نہیں کرے گا۔

☆☆☆

''ہیلو۔'' ناریل کے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے وہ اردگرد چلتی پھرتی لڑکیوں کو آپس میں خوش گپیاں کرتے دیکھنے میں مصروف تھی کہ اپنے قریب سے ابھرنے والی اس آواز پر چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ دبلی پتلی سی ایک خوش شکل لڑکی تھی جو ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے اس سے مخاطب تھی۔ ماہ بانو نے بھی اپنے چہرے پر جوابی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے اس کے مصافحے کے لیے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام لیا۔

''میرا نام راحیلہ ہے۔ میں تمہاری کلاس فیلو ہوں۔ کئی دنوں سے تمہیں اپنی کلاس میں نئے اضافے کی صورت دیکھ رہی ہوں۔ سلام دعا کی نوبت اس لیے نہیں آ سکی کہ میں اپنی اسٹڈیز کے معاملے میں اچھی خاصی کریزی ہوں اور اس سے ہٹ کر مشکل سے ہی کہیں وقت خرچ کرتی ہوں۔ اصل میں ڈاکٹر بننا میرا جنون ہے اور میں ذرا بھی وقت ضائع کر کے یہ رسک لینے کو تیار نہیں ہوتی کہ میڈیکل میں ایڈمیشن کے لیے میرٹ بنانے سے محروم رہ جاؤں... لیکن تم میں کچھ خاص بات ہے۔ دل خود بخود ہی تم سے بات کرنے کی خواہش کرتا ہے چنانچہ ابھی جو فری پیریڈ ملا تو میں نے سوچا کہ کچھ دیر تم سے گپ شپ کر لی جائے۔ ویسے تم بھی مجھے اپنے قبیلے ہی کی فرد

لگتی ہو۔ تمہیں بھی میں نے ہر وقت کتابوں میں سر گھسائے رکھنے کے سوا ادھر ادھر کہیں دلچسپی لیتے نہیں دیکھا۔ اگر میرا تمہارے بارے میں اندازہ درست ہے تو ہم یقیناً اچھے دوست بن سکتے ہیں۔'' راحیلہ نام کی وہ لڑکی نان اسٹاپ بولتی ہوئی اس کے قریب ہی بیٹھ چکی تھی۔ ماہ بانو کو اس دوران سوائے مسکرانے کے کچھ بھی کہنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ویسے وہ راحیلہ سے واقف تھی۔ اپنی اس کلاس فیلو کو اس نے کلاس میں بھی بہت ایکٹیو دیکھا تھا۔ لیکچرز کے دوران کوئی نہ کوئی سوال اٹھاتے رہنے اور ٹیچرز کے پوچھے گئے سوالوں کے نہایت اعتماد سے درست جوابات دینے کی وجہ سے وہ ہمیشہ کلاس میں بہت نمایاں رہتی تھی۔ اس کی یہ خود اعتمادی اور ٹیچرز کا اس سے مشفقانہ سلوک گواہی دیتا تھا کہ وہ ایک ذہین طالبہ ہے۔

''اسی طرح بیٹھی مسکراتی رہو گی یا اپنا تعارف بھی کرواؤ گی؟'' راحیلہ کو اپنے بے تحاشا بولنے کا تو یقیناً احساس نہیں تھا لیکن ماہ بانو کی خاموشی اس نے محسوس کر لی تھی چنانچہ اپنے بے ساختہ انداز میں اسے ٹوکتے ہوئے بولی۔

''میرا نام مہرین ہے۔ پنجاب سے مائیگریٹ ہو کر یہاں آئی ہوں۔ تمہاری طرح مجھے بھی ڈاکٹر بننے کا بہت شوق ہے۔ اب دیکھو، یہ شوق پورا ہوتا ہے یا نہیں۔'' ماہ بانو نے اپنے لیے شہریار کے تجویز کردہ نئے نام سے اپنا مختصر تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''بندے کے اندر اپنے ارادے پورے کرنے کا دم ہونا چاہیے پھر اس کی کوئی خواہش ادھوری نہیں رہتی۔ یہ میں نہیں میرے بڑے بھائی صاحب فرماتے ہیں اور درست ہی فرماتے ہیں۔ میں نے بچپن سے لے کر آج تک کبھی انہیں ناکام ہوتے نہیں دیکھا۔ انہوں نے بچپن میں ہی ٹھان لیا تھا کہ ڈاکٹر بننا ہے اور اپنا یہ شوق پورا کر کے رہے حالانکہ ہمارے والد کی بہت معمولی سی جاب تھی اور میڈیکل کی تعلیم کے اخراجات پورے کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی لیکن بھائی نے اسکالرشپس لے لے کر اس مشکل کو آسان کر دیا۔ آج کل وہ ایک پرائیویٹ اسپتال میں جاب کر رہے ہیں۔ مزید تعلیم کے لیے ان کا امریکا جانے کا ارادہ ہے، فی الحال حالات اس بات کی اجازت نہیں دے رہے لیکن مجھے یقین ہے کہ زیادہ عرصہ حالات بھائی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکیں گے اور وہ جلد ہی اپنی خواہش کے مطابق امریکا میں ہوں گے۔'' راحیلہ بہت مان اور فخر سے اپنے بھائی کے بارے میں بتا رہی تھی۔

''واقعی تمہارے بھائی تو بہت باہمت انسان ہیں۔ ان کے بارے میں سن کر مجھے بڑا حوصلہ ملا ہے۔ کیا نام ہے ان کا؟'' راحیلہ کی زبانی اس کے بھائی کے بارے میں سن کر اس نے تبصرہ کرتے ہوئے یونہی اس کا نام بھی پوچھ ڈالا۔

''طارق... ڈاکٹر طارق نام ہے میرے بھائی کا۔'' راحیلہ نے اسے بتایا پھر اچانک ہی اس کا ہاتھ تھام کر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''آؤ، ہماری دوستی ہونے کی خوشی میں چل کر چنوں کی چاٹ کھاتے ہیں۔'' ماہ بانو خاموشی سے اس باتونی لڑکی کے سنگ چل پڑی لیکن پھر اس کا رخ کالج کے گیٹ کی طرف دیکھ کر چونک گئی۔

''یہ اس طرف کیوں جا رہی ہو؟ کینٹین تو پیچھے کی طرف ہے نا؟'' اس نے راحیلہ کو ٹوکا۔

''ارے کینٹین کی بدمزہ چاٹ کون کھائے گا؟ ہم تو گیٹ کے باہر کھڑے ہوئے ریڑھی والے سے چاٹ لیں گے۔ سچ... بہت مزے کی چاٹ بناتا ہے وہ۔'' راحیلہ نے یوں چٹخارا لیا جیسے چاٹ سے بھری پلیٹ اس کے سامنے رکھی ہو۔ ماہ بانو اس کے اس انداز پر مسکرا دی اور اس کے ساتھ ہی چوکیدار سے ذرا سی بحث و تکرار کے بعد کالج سے باہر نکل آئی۔ یہاں گیٹ کے بالکل سامنے ہی تین چار ریڑھی والے کھڑے ہوئے تھے۔ راحیلہ اسے لیے ایک ریڑھی کی طرف بڑھ گئی۔ ماہ بانو بہت دنوں بعد زندگی کا یہ رنگ دیکھ رہی تھی اس لیے اسے بہت اچھا محسوس ہو رہا تھا۔ وقت کے ان لمحات میں وہ اپنے سارے مسائل اور دکھ وقتی طور پر فراموش کر بیٹھی تھی۔ یہاں تک کہ اسے یہ بھی خیال نہیں رہا تھا کہ وہ کالج کی حدود کے باہر احتیاط کے تقاضے پورے کرنے کے لیے چہرے کو نقاب سے ڈھانپ لینے کا معمول اختیار کر چکی ہے... اس وقت وہ اس معمول کے خلاف کھلے چہرے کے ساتھ بے فکری سے کھڑی راحیلہ کو ریڑھی والے کو نمک، مرچ اور کھٹائی کے تناسب کے سلسلے میں ہدایات جاری کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

''اللہ کے نام پر دے دے بی بی! تیرے لیے چاند سے دولہا کی دعا کروں گی۔'' یک دم ہی اس کے عقب سے بھونڈی آواز میں یہ صدا لگائی گئی اور ساتھ ہی تالی کی مخصوص آواز بھی سنائی دی۔ وہ بے ساختہ ہی پیچھے کی طرف گھومی اور بھڑکیلے لباس اور شوخ میک اپ والے ایک خواجہ سرا کو اپنے اتنے نزدیک دیکھ کر لرز سی گئی۔ اسے لگا کہ اس کی قسمت کے گرداب نے ایک بار پھر اسے گھیر لیا ہے اور وہ ان آزاد فضاؤں سے ایک بار پھر کسی قید خانے میں پہنچائی جانے والی ہے۔

حادثات و سانحات کی شکار... پناہ کی تلاش میں سرگرداں ماہ بانو کی داستانِ حیات کے واقعات اگلے ماہ پڑھیے

اٹھارھویں قسط

اسما قادری

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور بااثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے ..... یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے ..... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں ..... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے ..... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل ..... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرِ نگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیر آباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ چودھری ظالم و جابر اور عیاش تھا۔ شہریار اس کے ناجائز کاموں میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ پیر آباد کا رہائشی ماسٹر آفتاب جو عرصے سے گاؤں کے پرائمری اسکول کی ترقی کا خواہش مند ہوتا ہے، شہریار کا سہارا پاکر کھل کر اپنے مشن پر کام کرنے لگتا ہے۔ چودھری کی نخوت پسند بیٹی کشور، آفتاب کو دیکھتی ہے تو اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس کی محبت کی شدت کو دیکھتے ہوئے آفتاب کو اسے اپنے دل میں جگہ دینی پڑتی ہے اور دونوں کے درمیان ہونے والی چوری چھپے کی ملاقاتیں خفیہ نکاح تک جا پہنچتی ہیں۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیر آباد سے ہے۔ اس کے والدین بچپن میں ہی اسے اس کے خالہ خالو کو گود دے دیتے ہیں جن کے ساتھ وہ فیصل آباد میں رہتی تھی لیکن والدین اور بھائی بہنوں سے ملاقات کے لیے اس کا پیر آباد آنا جانا رہتا تھا۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آجاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکل کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اگلی بار اس کا اپنی بہن کی شادی میں دوبارہ پیر آباد آنا ہوتا ہے۔ چودھری اسے اغوا کروا لیتا ہے لیکن ماہ بانو ایک بار پھر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چودھری افتخار بہرصورت اس سے شادی کرنا چاہتا ہے مگر ماہ بانو شادی سے قبل ہی اپنی بہن زہرہ کے تعاون سے گھر سے بھاگ نکلتی ہے اور شہریار سے جا ملتی ہے۔ شہریار اسے اپنی گاڑی میں چھپا کر پیر آباد سے نکال دیتا ہے اور دارالامان بھجوا دیتا ہے لیکن چودھری کے آدمی مستقل اس کے پیچھے رہتے ہیں پھر ماہ بانو مشکلات سے گزرتی ہوئی خواجہ سراؤں کے ہتھے لگ جاتی ہے۔ خواجہ سراؤں کا گرو انااس اسے لے کر ایک ہندو سیٹھ کی کوٹھی پہنچتا ہے۔ کوٹھی میں اسے ایک حیرت انگیز منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔ کوٹھی کے تہ خانے میں کئی خواجہ سرا جمع ہوتے ہیں جن کی موجودگی میں ان کا سربراہ ایک نوجوان لڑکی کو ایک مورتی کے قدموں میں بھینٹ چڑھا دیتا ہے پھر ایک چھاپے کے دوران ماہ بانو کو تھانے لے جایا جاتا ہے۔ سجاد رانا کو اپنی بیٹی شینا کی تلاش ہوتی ہے جسے خواجہ سراؤں کے ایک گروہ نے اغوا کر لیا تھا۔ چنانچہ جب اسے یہ اطلاع ملتی ہے کہ خواجہ سراؤں کے ایک گروہ میں ایک لڑکی دیکھی گئی ہے تو وہ اسے اپنی بیٹی سمجھ کر بازیافت کروانے کی کوشش کرتا ہے اور نتیجے میں ماہ بانو آزاد ہو جاتی ہے۔ ماہ بانو کو شہریار کا ماموں زاد بھائی سجاد رانا اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاتا ہے جہاں شہریار بھی موجود ہوتا ہے۔ وہیں وہ شینا کی تصویر دیکھتی ہے اور شہریار کو بتاتی ہے کہ اس لڑکی کو ہندو سیٹھ کی کوٹھی میں ایک دیوی کے قدموں میں بھینٹ چڑھایا جا چکا ہے۔ سجاد رانا کو اپنی بیٹی کے قاتلوں کی تلاش تھی اور یہ تلاش اس کی را کے ایجنٹوں سے مڈبھیڑ کرواتی ہے جس کا حتمی نتیجہ ان کے قتل کی صورت میں نکلتا ہے۔ چودھری ماہ بانو کی سجاد رانا کے گھر موجودگی کی بھنک پاکر اسے وہاں سے اغوا کروانے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہ کوشش ناکام ہو جاتی ہے اور شہریار اپنے ڈرائیور مشابرم خان کے مشورے پر ماہ بانو کو کاندے منتقل کر دیتا ہے۔ کاندے سے ماہ بانو مشابرم خان کے بھائی اکرم خان اور ماں کے ساتھ ہوتے ایک شادی میں شرکت کے لیے جاتی ہے اور وہاں کی کیمپنگ سائٹ پر ایک گورے کی ہوس کا نشانہ بننے سے بچ جاتی ہے لیکن گورا ماہ بانو کو اغوا کرتا ہے اور اس کارروائی میں اکرم خان مارا جاتا ہے۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ ماہ بانو کے بارے میں ساری معلومات حاصل کر لیتا ہے اور یہ جاننے کے بعد کہ چودھری ماہ بانو کی تلاش میں ہے، وہ اسے ماہ بانو کا لالچ دے کر چودھری کو اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ چودھری کے ظلم و جبر کی ایک نشانی فریدہ ہے۔ وہ نور پور گاؤں کے چودھری مختار کی بہن ہے۔ ادھر چودھری شہریار کو پھنسانے کے لیے چالیں چلتا ہے مگر کامیاب نہیں ہو پاتا۔ کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ اس کا آفتاب کے دوست افضل اور اس کی بیوی کے ذریعے فرار ممکن ہوتا ہے۔ ادھر کشور کے غائب ہونے سے حویلی میں کھلبلی مچ جاتی ہے اور کشور کے غیاب پر وہاں کی ملازمائیں زیرِ عتاب آجاتی ہیں۔ خاص طور پر کشور کی ملازمہ خاص رانی۔ ادھر ماہ بانو اس برف زار سے فرار ہونے کی کوشش کرتی ہے اور وہاں موجود عمران نامی لڑکے کے ساتھ بھاگ نکلتی ہے مگر عمران ایک جگہ ایوالانچ کی زد میں آجاتا ہے اور اس میں دب کر اپنی جان گنوا بیٹھتا ہے۔ ماہ بانو تنہا اس برف زار میں بھٹکنے لگتی ہے۔ ادھر چودھری افتخار نیویارک سے واپس آکر رانی پر بے انتہا تشدد کرتا ہے مگر رانی موقع پاکر چودھری کے ریوالور سے خود کو ختم کر لیتی ہے۔ شہریار نور پور سے واپسی پر تھانے جاتا ہے جہاں ایک اناڑی ڈاکٹر سے تفتیش کے دوران موت کے منہ میں چلے جانے والے بچے کا باپ جگو مل جاتا ہے اور وہ شہریار کا احسان مند ہوتے ہوئے اسے اپنا موبائل نمبر دے کر اپنی خدمات پیش کرنے کی آفر کرتا ہے۔ ادھر مشابرم خان ماہ بانو کی تلاش میں اس برف زار تک پہنچ جاتا ہے اور دشمنوں کا پتا لگا لیتا ہے اور وہاں ایمونیشن بلاسٹ ہونے سے کافی تباہی ہوتی ہے۔ چودھری افتخار کو کشور کے غیاب کے حوالے سے ڈیوڈ کی زبانی آفتاب اور افضل سے متعلق اطلاعات ملتی ہیں کہ ان افراد کی شخصیت مشکوک ہے۔ چودھری؛ ماسٹر آفتاب کو اغوا کرا لیتا ہے۔ ماہ بانو برف زار میں بھٹکتے بھٹکتے بے ہوش ہو جاتی ہے اور اس دوران اسے ایک مہربان شخص مل جاتا ہے جو کہ [illegible] ہے، وہ اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ ادھر کشور کو جب آفتاب کے اغوا کی خبر ملتی ہے تو وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ افضل اسے اسپتال لے کر جاتا ہے۔ جب وہ گھر پہنچتا ہے تو اسے اپنی بیوی بچوں کی لاشیں ملتی ہیں۔ ادھر مشابرم خان لڑائی کے دوران زخمی ہو جاتا ہے اور پاکستان آرمی والوں کے وہاں پہنچنے سے ان کی تحویل میں پہنچ جاتا ہے۔ شہریار ماسٹر آفتاب کو چھڑانے کے لیے جگو کا سہارا لیتا ہے اور جگو آفتاب کو چودھری کے چنگل سے نکال لاتا ہے۔ دہشت گردوں کا ٹھکانا تباہ ہونے سے ڈیوڈ چراغ پا ہو جاتا ہے اور تحقیق کے لیے لنڈا کو پاکستان بھیجتا ہے۔ ادھر ماہ بانو کو بچانے والا مہربان شخص اپنے واقف کار کے توسط سے اسے ایک مخبر سے ملوا دیتا ہے جو ماہ بانو کی فراہم کردہ معلومات کے بعد اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ شہریار کو بھی اس واقعے کی اطلاع مخبر کے ذریعے مل جاتی ہے اور شہریار فوراً اسکردو پہنچ جاتا ہے اور مشابرم خان اور ماہ بانو کو آرمی کی تحویل سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر اسے یہ کہہ کر منع کر دیا جاتا ہے کہ انویسٹی گیشن جاری ہے تاہم وہ ماہ بانو کو چھڑانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اسے کراچی منتقل کرنے کا منصوبہ بنا لیتا ہے۔ ادھر صحافی افضل پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے لیکن وہ زخمی ہو کر اسپتال میں پہنچ جاتا ہے۔ اسپتال میں ایک میل نرس اسے میڈیسن دینے آتا ہے مگر وہ اسے دوائیں دینے نہیں بلکہ موت کے گھاٹ اتارنے آتا ہے۔ افضل اپنے بچاؤ کے لیے سائڈ ٹیبل پر رکھی شیشی اسے مارتا ہے جو اس کی آنکھ پر لگتی ہے مگر دشمن کے ہاتھ میں موجود پسٹل سے فائر ہو چکا ہوتا ہے۔ دونوں کی چیخیں ایک ساتھ بلند ہوتی ہیں۔ افضل اس حملے میں مارا جاتا ہے اور حملہ آور بھی وہاں موجود گارڈز کی فائرنگ سے شدید زخمی ہو کر مارا جاتا ہے تاہم مرنے سے پہلے اپنا بیان ریکارڈ کروا دیتا ہے۔ قاتل مہتاب کا کزن تھا جو رقابت میں مہتاب، اس کے بچوں اور پھر افضل کو موت کے گھاٹ اتار رہا تھا ہے... لنڈا پاکستان آکر خفیہ ٹھکانے پر تباہی کا پتا لگاتی ہے۔ ادھر چودھری افتخار کے آدمی اسکول کی عمارت اور ٹیچرز کی رہائش گاہ کو آگ لگا دیتے ہیں جہاں رہائش پذیر تین اساتذہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ شہریار وہاں پہنچتا ہے تو سب کچھ ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ تاہم وہ اس واقعے کی رپورٹ چودھری کے خلاف درج کروا دیتا ہے۔ ادھر ملک کے تین بڑے شہروں میں پے در پے قیامت ٹوٹی۔ پہلے کراچی میں کافی اموات ہوئیں پھر لاہور میں ٹرینوں کا حادثہ اور پھر اسلام آباد میں ہوٹل میں بم دھماکا ہوا۔ اس سب کارروائیوں میں دشمن ملک کا ہاتھ تھا اور موساد بھی خوش تھی۔ ماہ بانو کراچی آجاتی ہے اور میڈیکل کالج میں مہرین کے نام سے داخلہ لے لیتی ہے۔ وہاں اسے راحیلہ نامی ایک لڑکی ملتی ہے جو اس سے کافی گھل مل جاتی ہے۔ وہ اس کے ساتھ کالج سے باہر چاٹ کھانے نکلتی ہے۔ ابھی وہ چاٹ والے کے پاس کھڑی ہوتی ہیں کہ ایک خواجہ سرا آکر ان سے بھیک مانگتا ہے۔ ماہ بانو اسے دیکھ کر سہم جاتی ہے اور اسے لگتا ہے اسے پھر گرداب نے گھیر لیا ہے اور وہ پھر کسی قید خانے میں پہنچائی جانے والی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیں!

"ایسے ٹکر ٹکر کیا دیکھ رہی ہے لڑکی! کیا پہلے کبھی کوئی خسرہ نہیں دیکھا؟" اس کی اسی گم صم کیفیت پر وہ مانگنے والا یا والی بُرا مان کر پوچھنے لگا لیکن اس کی ایسی حالت ہو گئی کہ جواب دینے کے لائق بھی نہیں رہی۔

"کیا ہو گیا مہرین! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ چلو اندر چلتے ہیں۔" راحیلہ جو اس کی طرف متوجہ ہو چکی تھی، اس کی غیر ہوتی حالت دیکھ کر فکرمندی سے پوچھنے لگی۔ ابھی کچھ دیر قبل ہی وہ دونوں بڑے خوش گوار موڈ میں چھولوں کی چاٹ کھانے کے لیے کالج سے باہر نکلی تھیں۔

"آؤ اندر چلیں۔ تمہاری طبیعت تو مجھے بالکل بھی ٹھیک نہیں لگ رہی۔" ماہ بانو کی طرف سے کوئی جواب نہ پاکر راحیلہ نے اس کا ہاتھ تھاما اور چھولوں کو بھول کر کالج کے گیٹ کی طرف چل پڑی۔ ماہ بانو نے گیٹ سے اندر داخل ہونے سے پہلے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ خواجہ سرا اپنی جگہ حیران پریشان کھڑا تھا۔ اس کے لیے ماہ بانو کا ردِعمل یقیناً انوکھا تھا لیکن یہ تو ماہ بانو ہی سمجھتی تھی کہ اسے دیکھ کر اس کی حالت غیر کیوں ہو گئی۔ اس کے وجود نے اسے اپنے ماضی کا ایک تلخ تجربہ یاد دلا دیا تھا۔ بے شک وہ غریب ان میں سے نہیں تھا جن سے اس کے ماضی کی تلخ یادیں وابستہ تھیں۔ اس کا صرف حلیہ ان جیسا تھا، چہرہ بالکل مختلف تھا۔ کردار بھی یقیناً مختلف ہوگا لیکن اس خواجہ سرا سے ہونے والے سامنے نے اس سے کچھ دیر قبل محسوس ہونے والا آزادی کا احساس چھین لیا تھا۔ اسے یہ یاد دلا دیا تھا کہ اس کی جان کے ساتھ کیسے جھمیلے اور مسائل چمٹے ہوئے ہیں۔ وہ کیسے خود پر گزرنے والا وہ وقت بھول سکتی تھی جب وہ چودھری کے پنجوں سے نکل بھاگنے کے چکر میں ان لوگوں کے درمیان جا پھنسی تھی۔ وہ تو ان دنوں [illegible] والا کے ڈرائیور سرمد کے دوست عامر کے گھر پناہ گزین تھی جب خواجہ سراؤں کے ایک گروہ کے ہتھے چڑھ گئی۔ پھر وہ وہاں سے سیٹھ سندر رام نامی ایک تاجر کی کوٹھی میں پہنچ گئی۔ وہاں اس نے اپنی نظروں کے سامنے دلہن بنی ایک کم سن لڑکی کو دیوی کے قدموں میں قربان ہوتے دیکھا۔ کچھ عرصے بعد اسے نگار کی مدد سے خواجہ سراؤں کے چنگل سے نجات ملی اور وہ ڈی آئی جی سجاد رانا کے گھر تک پہنچی تو اس پر انکشاف ہوا کہ اس نے جس لڑکی کو سندر رام کی کوٹھی کے تہ خانے میں مرتے ہوئے دیکھا تھا، وہ سجاد رانا کی اکلوتی بیٹی اور شہریار کی بھتیجی شینا تھی۔ پولیس۔ قاتلوں کو پکڑنے میں ناکام رہی تھی البتہ بعد کی تحقیقات سے یہ ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ سندر رام پاکستان میں رہ کر حقیقت میں را کے مددگار کے طور پر کام کر رہا تھا اور یہ ہندو خواجہ سرا بھی اسی سیٹ اپ کا ایک حصہ تھے۔ جاسوسی کے اس نیٹ ورک کے دو اہم مہروں میں سے سندر رام تو مر گیا تھا جبکہ مہاگرو غائب تھا۔ اس کی تلاش کے لیے بعد میں کیا اقدامات اٹھائے گئے، ماہ بانو کو اس کا علم نہیں تھا۔

ماہ بانو کو شہریار نے تحفظ کے خیال سے مشابرم خان کے گاؤں کاندے منتقل کر دیا تھا لیکن وہاں بھی وہ حالات کے گرداب سے بچ نہیں سکی اور اس گرداب میں ڈوبتی ابھرتی اب کراچی آپہنچی تھی۔ کراچی کے اس کالج میں ایک عام طالبہ کی طرح دوبارہ اپنی پڑھائی کا آغاز کرنے کے بعد اسے لگا کہ اب وہ ایک نارمل زندگی کی طرف آگئی ہے لیکن کالج کے باہر ایک خواجہ سرا سے ہونے والے ٹکراؤ نے اسے احساس دلایا تھا کہ اس کے لیے زندگی کا نارمل ہو جانا اتنا آسان نہیں۔ اس نے زندگی کے جو پُرخطر رخ دیکھے ہیں، وہ وقتاً فوقتاً اسے یاد آکر دہلاتے رہیں گے۔ آج بھی اس کے ساتھ یہی ہوا تھا۔

"تم ٹھیک تو ہو نا مہرین؟ اگر طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے تو میں پرنسپل سے بات کرتی ہوں۔ وہ تمہیں کسی ڈاکٹر کے پاس بھجوا دیں گی۔" اسے ایک بینچ پر بٹھانے کے بعد اس کی پسینے سے تر ٹھنڈی ہتھیلیوں کو سہلاتے ہوئے

راحیلہ نے اس سے دریافت کیا۔

''نن... نہیں رہنے دو۔ میں اب ٹھیک ہوں۔'' اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے راحیلہ کو جواب دیا۔

''تمہیں اچانک ہو کیا گیا تھا؟ میں نے تو بس یہ دیکھا کہ تم اس خواجہ سرا کو دیکھتے ہی اپنے حواس کھو بیٹھی ہو۔ کیا تم اس سے ڈر گئی تھیں؟'' راحیلہ نے پُرتجسس لہجے میں سوال کیا۔

''ہاں یار! بس پتا نہیں کیا بات ہے۔ میں بچپن ہی سے ان خواجہ سراؤں سے بہت ڈرتی ہوں۔ شروع سے میرا یہ حال ہے کہ جہاں کسی خواجہ سرا کو قریب سے دیکھا، وہیں میری جان نکلنے لگی۔ ابھی بھی وہ اچانک سر پر آ کر کھڑا ہوا تو میں ڈر گئی۔'' اس نے پھیکی سی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے راحیلہ کی تسلی کے لیے بہانہ بنایا۔

''بہت بے وقوف لڑکی ہو تم۔ ساری دنیا جن سے لطف اندوز ہوتی ہے، تم نے دل میں ان کا خوف پال رکھا ہے۔ ارے، یہ بے چارے تو خود دنیا سے ڈرتے ہیں۔ کبھی لڑکوں کو دیکھا ہے کہ کیسے ان سے چھیڑ خانی کرتے ہیں۔ اکثر تو بے چاروں کا ناطقہ بند کر دیتے ہیں اور تم ہو کہ اس قدر بے ضرر مخلوق سے ڈرتی ہو۔'' راحیلہ اسے پیار سے ڈپٹنے اور سمجھانے لگی۔ وہ سر جھکائے اس کی باتیں سنتی رہی کہ جواب میں اسے وہ سب کچھ نہیں بتا سکتی تھی جو اس کی آنکھوں نے دیکھا تھا اور جو اس نے سہا تھا۔

☆☆☆

''یہ لیجیے جناب چائے۔'' کشور نے بھاپ اڑاتی چائے کی پیالی میز پر لا کر رکھی تو آفتاب لکھنے کا سلسلہ موقوف کر کے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ گزشتہ ایام کے مقابلے میں کافی نکھری ہوئی اور پُرسکون لگ رہی تھی۔ ایسا یقیناً اس لیے تھا کہ انہیں کسی گھر کی چار دیواری کا تحفظ میسر آ گیا تھا۔ اسلام آباد میں مقیم بابر کی خالہ کا یہ گھرانہ ان کے لیے اچھی پناہ گاہ ثابت ہوا تھا۔ بابر کی خالہ نے بھانجے کے بنا کسی حیل و حجت کے انہیں اپنے گھر میں جگہ دے دی تھی اور آج کل وہ ان کے گھر کی بالائی منزل پر واقع اس کمرے میں مقیم تھے۔

''بڑی زیادتی ہوئی آپ کے ساتھ... کہاں تو حویلی میں ہر وقت حکم بجا لانے والی ملازمائیں آپ کے آگے پیچھے پھرتی رہتی تھیں اور کہاں آپ کو یہ معمولی معمولی کام اپنے ہاتھوں سے سرانجام دینے پڑ رہے ہیں۔'' اس نے کشور کا ہاتھ تھام کر پیار سے سہلاتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا۔

''ایسا مت سوچیں۔ ملازماؤں کے اس جھرمٹ اور آسائشوں کے ڈھیر میں مجھے اپنے دل کی کوئی خوشی میسر نہیں تھی۔ وہ تو کسی قید خانے میں مقید قیدی کی سی زندگی تھی جسے تین وقت کا کھانا اپنی کال کوٹھری میں فراہم کر دیا جاتا تھا۔ قیمتی ساز و سامان اور ملازماؤں کی فوج کے درمیان رہنے سے کسی کا خوش قسمت ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ خوش قسمت وہ ہوتا ہے جو خوشی کو محسوس کر سکے۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب میں کچن میں آپ کے لیے چائے بنا رہی تھی تو میرا دل ایک خوشی محسوس کر رہا تھا کہ میں نے اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کیا۔ یہ اللہ کی مجھ پر مہربانی ہی تو ہے کہ اس نے میری ویران زندگی میں خوشی کے رنگ برنگے پھول کھلا دیے۔ خوشی کے یہ دن تھوڑے بھی ہوئے تو میں کسی سے کوئی شکوہ نہیں کروں گی۔ اب اگر موت بھی آ جائے تو میں اس اطمینان کے ساتھ مر جاؤں گی کہ مرتے ہوئے میں آپ کے قریب تھی۔'' وہ بہت جذب کے ساتھ اپنی اندرونی کیفیات کا اظہار کر رہی تھی۔

''مرنے کی باتیں نہ کریں میری جان! ابھی تو ہم نے ساتھ جینے کا آغاز کیا ہے۔ ہمیں بہت دور تک ایک دوسرے کا ساتھ دینا ہے اور اس زندگی کو پھلتے پھولتے دیکھنا ہے جو اللہ کی مہربانی سے آپ کے وجود میں سانس لے رہی ہے۔ ابھی ہم پر ذرا مشکل وقت ہے لیکن اللہ نے چاہا تو وہ دن بھی ضرور آئیں گے جب ہم اپنے گھر کے آنگن میں اپنے بچوں کو بھاگتا دوڑتا دیکھیں گے اور ہمارے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہو گی۔'' آفتاب نے اس کا ہاتھ ہونٹوں کے قریب لے جا کر نرمی سے اس کی پشت پر بوسہ دیتے ہوئے ایک خواب اس کی آنکھوں کو سونپا۔

''سچ کہیں آفتاب! کیا سچ مچ وہ دن ہماری زندگی میں آئیں گے؟ جب ہمارا اپنا ایک گھر ہو گا اور اس گھر کا آنگن ہمارے بچوں کی ہنسی سے مہکے گا؟ اگر ایسا ہوا تو زندگی کتنی خوب صورت ہو جائے گی نا... بالکل ایسا لگے گا جیسے آسمان سے ہمارے لیے رنگوں کی برسات ہو رہی ہے۔'' وہ بے ساختہ ہی آفتاب کے سینے سے آ لگی اور آنکھیں موند کر گویا تصور میں اس منظر کو دیکھنے لگی۔

''بالکل ایسا ہی ہو گا۔ پھر ہم خود بچے بن کر اپنے بچوں کے ساتھ ان رنگوں سے کھیلیں گے۔ ویسے آپ کے خیال میں ہمارے کتنے بچے ہونے چاہئیں؟'' وہ اس کے چہرے کو محبت پاش نظروں سے دیکھتا ہوا شرارت سے پوچھنے لگا۔ اس کے اس شرارت بھرے سوال پر کشور نے محجوب سی ہو کر اپنا چہرہ کچھ اور بھی اس کے سینے میں چھپا لیا۔ اب آفتاب اس کا

چہرہ نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ اس کے سامنے کشور کا سیاہ بالوں والا سر تھا۔ ان بالوں سے اٹھتی شیمپو کی مہک اس کی سانسوں سے ٹکرا کر کچھ اور بھی اسے دیوانہ کرنے لگی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے کشور کا سر تھامتے ہوئے اس کا اپنے سینے میں چھپا چہرہ نظروں کے سامنے کیا اور پھر بے تحاشا اسے چومنے لگا۔ کشور کے گلابی ہونٹ، فراخ پیشانی، خم دار ٹھوڑی، چکنے رخسار، بڑی بڑی آنکھیں سب بوسوں کی اس برسات میں بھیگتی چلی گئیں۔ محبت کے اس بے تحاشا اظہار پر وہ شدتِ جذبات سے اس بری طرح کانپنے لگی جیسے بہت دیر تک برسات کے ٹھنڈے پانی میں نہائی ہو۔

''اتنا مت چاہیں کہ پھر یہ دل زندہ رہنے کی ہوس میں مبتلا ہو جائے اور جب میرے باپ کے نمک خوار میری موت کا پیغام لے کر پہنچیں تو میرے لیے جان دینا مشکل ہو جائے۔'' کپکپاتے لبوں سے یہ بات کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے کئی موتی پھسل پڑے۔

''پھر وہی مرنے کی باتیں... میں نے آپ سے کہا ہے نا کہ مرنے کی بات مت کریں۔ ہمیں ایک لمبے عرصے تک جینا ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ جینا ہے۔'' آفتاب نے اپنی انگلیوں کی پوروں پر اس کے آنسو چنتے ہوئے خفگی سے ٹوکا تو وہ سنبھل گئی۔

''سوری آفتاب! بس حالات ہی ایسے ہیں کہ میں بار بار مایوسی کا شکار ہو جاتی ہوں لیکن اب میں ایسی باتیں نہیں کروں گی۔'' اس کے مضبوط مردانہ ہاتھ پر اپنا نازک سا ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے وعدہ کیا پھر چونک کر بولی۔ ''باتوں باتوں میں آپ کی چائے تو ٹھنڈی ہو گئی۔ میں ابھی دوسری گرم چائے لے کر آتی ہوں۔''

''یہ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔ ہم لکھنے والوں کے لیے گرم چائے کی پیالی ایندھن کا کام دیتی ہے۔ اس کے بغیر لگتا ہے کہ دماغ کی گاڑی ٹھپ ہو کر رہ گئی ہے۔ میں تو یوں بھی بہت دنوں بعد کاغذ قلم لے کر بیٹھا ہوں۔ خیالات کو یکجا کرنے میں خاصی دشواری پیش آ رہی ہے۔ پیچھے کے حالات کا بھی کچھ علم نہیں۔ میں نے بابر سے کہا تھا کہ مجھے مقامی اخبارات بھجوا دے تاکہ گاؤں کے حالات کا کچھ علم ہو سکے۔ مجھے سب سے زیادہ فکر اسکول کی ہے۔ تمہارے ابا جی پہلے ہی اسکول کے دشمن ہیں، اب جو کچھ پیش آیا ہے اس کے بعد تو ان کا سارا نزلہ اسکول پر ہی گرے گا۔ وہ کوشش کریں گے کہ کسی طرح اسکول بند کروا دیں۔ اگر ایسا ہوا تو مجھے بہت افسوس ہو گا۔ یوں بھی کبھی کبھی میں گلٹی فیل کرتا ہوں کہ میں نے اپنی ذاتی خوشی کی خاطر اتنے بہت سے بچوں کا مستقبل داؤ پر لگا دیا۔'' وہ ہلکے پھلکے انداز میں بات کرتے کرتے یک دم ہی رنجیدہ ہو گیا۔

پیر آباد کا وہ چھوٹا سا اسکول اس کے برسوں کی محنت کا نتیجہ تھا۔ اب کہیں جا کر تو وہ وقت آیا تھا کہ اسے اپنی محنت کا صلہ ملتا نظر آنے لگا تھا لیکن حالات نے یک دم ہی کروٹ لی تھی۔ کشور کی محبت میں مبتلا ہو جانا، اس سے خفیہ نکاح، ملاقاتیں اور پھر کشور کے امید سے ہونے کی خبر سننے کے بعد اسے حویلی کے عتاب سے بچانے کے لیے گاؤں سے فرار کروانا... یہ سب وہ واقعات تھے جن کے بارے میں اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کی زندگی کی ترجیحات میں تو یہ سب کچھ شامل ہی نہیں تھا لیکن کشور کی تند و تیز محبت نے کچھ اس طرح اسے گھیرا کہ پھر وہ حالات کے دھارے پر بہتا ہی چلا گیا اور اب ہر چیز سے الگ تھلگ یہاں اسلام آباد میں بیٹھا حالات کے سازگار ہونے کا منتظر تھا۔

''سوری آفتاب! میری وجہ سے آپ اپنے مشن سے الگ ہو گئے۔ میری جذباتیت نے آپ کی ساری محنت و جدوجہد برباد کر کے رکھ دی۔ کاش! میں اپنے جذبات پر قابو رکھتی اور آپ کو اپنی محبت میں مبتلا ہونے پر مجبور کرنے کے بجائے حویلی کی دیواروں کے درمیان ہی گھٹ گھٹ کر مر جاتی تو یہ سب نہ ہوتا۔'' اس کی رنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے وہ بھی دکھی ہو گئی اور حسرت زدہ لہجے میں کہنے لگی۔

''فضول باتیں مت سوچیں۔ تقدیر میں جو کچھ لکھا جا چکا تھا، ہم اسے کسی صورت ٹال نہیں سکتے تھے۔ میں تو صرف اس لیے اداس ہو گیا تھا کہ میری اس پروجیکٹ کے ساتھ برسوں کی محنت جڑی تھی۔ میرا مقصد آپ پر الزام لگانا یا آپ کو شرمندگی میں مبتلا کرنا نہیں تھا۔ آئندہ کبھی خود کو قصوروار جان کر اداس ہونے یا ٹینشن لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کی جو حالت ہے اس میں ٹینشن لینا ویسے ہی مناسب نہیں۔ بچے پر اس کا برا اثر پڑ سکتا ہے اور یہ بچہ ہماری محبت کی نشانی ہے۔ آپ کو اس نشانی کی بہت حفاظت کرنی ہے۔ کچھ سمجھیں یا نہیں؟'' وہ فوراً اپنا موڈ بدل کر کشور کو بہلانے لگا اور آخر میں اس کی ناک کی پھننگ کو انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے درمیان پکڑ کر ہلاتے ہوئے پیار سے استفسار کیا۔ جواب میں کشور نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا دی۔

''اب جائیے اور گرم چائے لے آئیے۔ میں بھی اپنا کام مکمل کرتا ہوں۔'' آفتاب ایک بار پھر اپنے سامنے رکھے کاغذات کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کشور ٹھنڈی ہو جانے والی

چائے کی پیالی لے کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ نیچے کچن میں بابر کی خالہ رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھیں۔

"خالہ! آفتاب نے بابر بھائی سے کچھ اخبارات وغیرہ منگوائے تھے۔ وہ کوریئر سے بھجوائیں گے... آپ ذرا خیال رکھیے گا۔" خالی چولھے پر چائے کا پانی چڑھاتے ہوئے اس نے خالہ سے کہا۔

"بابر کا بھیجا ہوا پارسل تو صبح گیارہ بجے ہی مل گیا تھا۔ میں نے صفائی والی ماسی سے کہا تھا اوپر پہنچا دے۔ شاید وہ سمجھی ہوگی کہ بدر کے کمرے میں پہنچانا ہے اس لیے وہاں رکھ آئی ہوگی۔ تم وہاں دیکھ لینا۔" خالہ نے جواباً کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں ابھی یہ چائے لے کر اوپر جاؤں گی تو دیکھ لوں گی۔" اس نے ابلتے ہوئے پانی میں پتی ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

"دیکھو لڑکی! یہ اوپر نیچے کے چکر ذرا کم کیا کرو۔ اس حالت میں بار بار سیڑھیاں چڑھنا اترنا تمہارے لیے نقصان دہ بھی ثابت ہوسکتا ہے۔" انہوں نے بزرگوں والی اپنائیت سے اسے ٹوکا تو وہ بُرا ماننے کے بجائے مسکرانے لگی۔ زندگی میں کوئی تو ایسا میسر آیا تھا جو بڑے ہونے کے ناتے اسے مشورے اور ہدایات دے سکے۔

"افسوس۔ تم آج کل کی لڑکیاں بزرگوں کی باتوں کو مذاق سمجھتی ہو۔ ہم جو کچھ کہتے ہیں اپنے تجربے کی روشنی میں تمہاری بھلائی کے لیے ہی کہتے ہیں۔" اس کی مسکراہٹ کا غلط مطلب لیتے ہوئے انہوں نے ذرا سا بُرا مانتے ہوئے اسے ڈپٹا۔

"ایسی کوئی بات نہیں خالہ! میں بھلا کیسے آپ کی بات کو مذاق میں اڑا سکتی ہوں۔ مجھے تو خود کسی بزرگ کے مشوروں کی ضرورت ہے۔" کشور نے جلدی سے انہیں صفائی دی پھر مزید وضاحت پیش کرتے ہوئے بولی۔ "اصل میں ابھی آفتاب کو آرام کی ضرورت ہے۔ ان کا پیر اس حد تک ٹھیک نہیں ہو سکا کہ وہ سیڑھیاں چڑھ اتر سکیں اس لیے مجھے ہی انہیں اوپر سب کچھ لے جا کر دینا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ بات تو میں بھی سمجھتی ہوں لیکن تم بار بار چکر لگانے کے بجائے کوشش کیا کرو کہ ایک ساتھ ہی ضرورت کی ساری چیزیں اوپر لے جاؤ۔ دوپہر تک تو ماسی یہیں ہوتی ہے۔ اس وقت اس سے کام لے لیا کرو۔ یہ چائے وائے بھی گھڑی گھڑی بنا کر اوپر لے جانے کے بجائے ایک وقت میں تھرماس میں بھر کر لے جاؤ تاکہ تمہارے یہ اوپر نیچے کے چکر کم ہوں۔ پہلا پہلا معاملہ ہے، احتیاط بہت ضروری ہے۔" وہ اسے ہدایتیں دیتی رہیں اور کشور ان کے خلوص کو محسوس کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلاتی رہی۔ اسے وہ خاتون یوں بھی شروع سے پسند آئی تھیں۔ انہیں بابر نے ان دونوں کے بارے میں جو بتایا تھا، انہوں نے اسی پر اکتفا کرلیا تھا اور بار بار کے سوالات یا غیر ضروری تجسس سے انہیں پریشان کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ گھر کے اندر بھی ان دونوں کو پوری آزادی میسر تھی اور وہ پُرتکلف مہمانوں کے بجائے گھر کے افراد کی طرح وہاں رہ رہے تھے۔ البتہ آفتاب نے اخراجات کی مد میں ایک مناسب رقم ضرور بہ اصرار ان کے حوالے کی تھی کہ وہ نہیں جانتا تھا کہ کتنے عرصے انہیں یہاں قیام کرنا پڑے گا اور وہ طویل عرصے تک مہمان بن کر ان پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ خالہ نے شروع میں انکار کیا لیکن پھر آفتاب کا موقف سمجھتے ہوئے رقم قبول کرلی۔ اس طرح وہ دونوں خود کو بہت زیادہ زیر بار نہ کرتے ہوئے آرام سے وہاں رہ رہے تھے۔

خالہ کی ہدایات پر فوری طور پر عمل کرتے ہوئے کشور نے تیار شدہ چائے تھرماس میں بھری اور بھرے ہوئے تھرماس کے ساتھ ایک دھلی ہوئی خالی پیالی لے کر اوپر چلی گئی۔ آفتاب پورے انہماک سے لکھنے میں مصروف تھا۔ اس کے انہماک کو توڑنے کے بجائے اس نے چائے کا بھرا تھرماس اور پیالی اس کے قریب رکھی اور چپکے سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اب اس کا رخ خالہ کے اکلوتے بیٹے بدر کے کمرے کی طرف تھا۔ بدر گھر سے باہر گیا ہوا تھا اس لیے وہ بلا جھجک اس کے کمرے میں چلی گئی۔ سامنے ہی اسے ایک تپائی پر رکھا پارسل نظر آگیا۔ پارسل آفتاب کے نام پر ہی تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ ابھی آفتاب پارسل کھول کر اس میں موجود اخبارات کا جائزہ نہیں لے سکتا چنانچہ اس نے خود وہ پارسل کھول لیا۔ اسے بھی حالات کے متعلق تجسس تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا باپ اس کے غائب ہونے کے بعد آرام سے ہرگز نہیں بیٹھا ہوگا۔ اسے تلاش کرتے رہنے کے سوا اس نے اپنے غیظ و غضب میں کوئی نہ کوئی انتقامی کارروائی تو ضرور کی ہوگی۔

اسی فکر اور تجسس کے ساتھ وہ اخبارات کا جائزہ لینے لگی۔ جلد ہی اس کے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ اخبار میں چھپنے والی ماسٹر منیب اور اس کے ساتھی اساتذہ کے قتل کی خبر ایسی نہیں تھی جسے نظرانداز کیا جا سکتا۔ خبر میں اگرچہ واقعے کو نامعلوم افراد کے کھاتے میں ڈالا گیا تھا لیکن وہ سمجھ سکتی تھی کہ وہ نامعلوم افراد کون ہیں۔ وہ اس کے باپ کے چیلوں کے سوا بھلا کون ہو سکتے تھے؟ وہ اس خبر کو پڑھ کر دیر تک گم صم سی بیٹھی رہی۔ اس خبر کے ساتھ ساتھ طوفانی بارشوں سے ہونے والی تباہ کاریوں کی خبریں بھی اخبار میں شائع ہوئی تھیں بلکہ یہ خبریں آگے کی تاریخوں کے اخبارات میں بھی چھپتی رہی تھیں جبکہ منیب اور اس کے ساتھیوں کے قتل سے متعلق دوبارہ کوئی خبر نہیں آئی تھی لیکن کشور کو سب سے زیادہ اسی ایک خبر نے متاثر کیا تھا۔ قدرتی آفت کا شکار ہونے والوں پر تو صبر کیا جا سکتا تھا لیکن منیب اور اس کے ساتھیوں کے قتل کی وجہ تو وہ اور آفتاب ہی بنے تھے۔ وہ بے چارے بے قصور لوگ صرف ان کی وجہ سے زیر عتاب آئے تھے۔ یہ کوئی سمجھ میں نہ آنے والی بات نہیں تھی۔

وہ جو بدر کے بیڈ پر بیٹھی ہوئی اخبارات کا مطالعہ کر رہی تھی، سر تھام کر جہاں کی تہاں بیٹھی رہ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ اس سے زیادہ آفتاب کے لیے یہ خبر صدمے کا باعث بنے گی۔ ابھی کچھ عرصہ قبل تو اس نے اپنے عزیز دوست افضل کی جدائی کا غم سہا تھا، اب وہ منیب جیسے ساتھی کے بچھڑ جانے کی اندوہناک خبر سنتا تو اس پر کیا گزرتی۔ پریشانی کی اس شدید کیفیت میں اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ کب کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔

"آپ نے کیسے ہمارے اس کمرے کو رونق بخش دی؟" اپنے بہت قریب سے اسے یہ جملہ سنائی دیا تو وہ چونک کر کھڑی ہوئی۔ سامنے بدر بسرخ آنکھیں لیا کھڑا تھا اور اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"سوری! میں بغیر اجازت کے آپ کے کمرے میں آگئی۔ اصل میں ملازمہ غلطی سے اخبارات کا یہ بنڈل یہاں رکھ گئی تھی۔ میں یہی لینے آئی تھی پھر یہیں بیٹھ کر پڑھنے لگی۔" وہ جلدی جلدی وضاحت دیتے ہوئے اخبارات سمیٹنے لگی۔

"کوئی بات نہیں... کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ جب تک چاہیں یہاں بیٹھیں بلکہ چاہیں تو لیٹ جائیں۔" بدر نے اس کے دونوں شانے تھامتے ہوئے اسے واپس بٹھانے کی کوشش کی تو اس کے منہ سے اٹھتا بُو کا بھبکا کشور کے نتھنے سے ٹکرایا۔ اس بُو اور بدر کی حرکات و سکنات نے اسے احساس دلایا کہ وہ نشے میں ہے۔ نشے میں مست آدمی ہوش و حواس سے کس قدر بیگانہ ہوتا ہے اور اخلاق کی حد سے کتنا نیچے گر سکتا ہے، کشور کو اندازہ تھا۔ وہ بدر کو ایک زوردار دھکا دیتی ہوئی باہر کی طرف لپکی۔ پیچھے اس کا بے ہنگم قہقہہ سنائی دیا۔ کشور کمرے سے باہر نکل کر دیوار سے پیٹھ لگا کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ بدر کے رویے نے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ جس گھر کو پناہ گاہ سمجھ رہی تھی، وہ اتنا بھی محفوظ نہیں ہے۔ گرداب میں گھری اس کی زندگی کی کشتی کو ابھی کچھ اور طوفانوں سے نمٹنا ہے۔

☆☆☆

شکاری کتا

ایک بار ملا نصرالدین کو گورنر نے حکم دیا کہ وہ اس کے لیے ایک شکاری کتا لائیں۔ چند دنوں بعد انہوں نے ایک نہایت بے ضرر نمائشی کتا اس کی خدمت میں لے جا کر پیش کیا۔ تندخو اور سخت گیر گورنر نے جیسے ہی اس کتے کو دیکھا آگ بگولا ہو گیا اور بولا۔ "میں نے تم سے شکاری کتا لانے کو کہا تھا یہ کیا مینہ سا بزدل کتا لے آئے؟"

ملا نے نہایت متانت سے جواب دیا۔ "حضور، آپ مطمئن رہیں یہ مینہ آپ کی صحبت میں شکاری کتا بن جائے گا۔"

کراچی سے مبشر علی کا تعاون

"کیسے خشک اور کھردرے ہاتھ ہیں تیرے۔ ایسا لگتا ہے کوئی بدن کو جوتے سے رگڑ رہا ہے۔" صرف ایک جانگیا جسم پر چڑھائے بالا اوندھے منہ پلنگ پر لیٹا ہوا تھا اور شکل سے ہی مظلوم نظر آنے والی بیوی اس کی فرمائش پر اس کے جسم کی تیل سے مالش کر رہی تھی۔ عورت کی بڑی بڑی آنکھیں اور کھڑی ناک سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ماضی میں بھی خوش شکل رہی ہوگی لیکن اب آنکھوں میں بسی ویرانی، رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیوں اور جلد کی شیالی پڑتی رنگت نے اسے قطعی بے رونق و بے کشش بنا ڈالا تھا۔ بالے کے اعتراض پر اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا اور خاموشی سے اس کے سانڈ جیسے بدن کا مساج کرتی رہی۔

"وہ بھی کیا عورتیں ہوتی ہیں جن کے ہاتھ جسم کو چھوئیں تو لگتا ہے مکھن ملائی سے گندھی کوئی چیز جسم کو سہلا رہی ہے۔ ایسی پیاری شکلوں والی، میٹھی میٹھی گلاں کرتی عورتیں... کہ بندہ صرف ان کے پاس بیٹھے تو آدھی تھکن اتر جائے۔ اور یہاں ایسی منحوس شکل دیکھنے کو ملتی ہے کہ چنگا بھلا بندہ بھی بیکار میں غصے میں آجاتا ہے۔ نہ صورت دیکھ کر چین پڑے، نہ گل سننے کا جی چاہے اور نہ چھو کر سواد آئے۔" بازارِ حسن کی سستی طوائفوں کی تعریفوں میں رطب اللسان وہ مسلسل بیوی کو کچوکے لگا رہا تھا اور اس اللہ کی بندی میں اتنی

جرأت نہیں تھی کہ اسے وہ وقت یاد دلا سکے جب وہ کسی مہکتے گلاب کی سی تروتازگی لیے بالے کے آنگن میں اتری تھی۔

شادی کے وقت اس کے حسن کا پورے گاؤں میں چرچا تھا۔ لوگ کہتے تھے وہ شہزادی ہے جسے کوئی شہزادہ ہی بیاہ کرلے جائے گا لیکن اس کی بدقسمتی تھی کہ بالے کی اس پر نظر پڑگئی اور پھر کس کی جرأت تھی کہ اس کی طرف سے بھیجے گئے پیام کے لیے انکار کرسکے... یوں وہ جو شہزادی کہلاتی تھی، ایک دیو کی قید میں آپھنسی۔ بالے کی چند سالہ رفاقت نے اس کی ساری تازگی اور شادابی کو نچوڑ ڈالا۔ وہ بیوی کو پیر کی جوتی بنا کر رکھنے والا ایک حیوان صفت آدمی تھا جس کی وحشت بھری قربت نے بیوی کو تین عدد بچوں کا تحفہ تو ضرور دیا لیکن اس کے من کے اندر کوئی پھول نہ کھل سکا۔ بالے کا وجود اس کے لیے ایک ایسا ناپسندیدہ بوجھ تھا جسے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھانے پر مجبور تھی اور مجبوری کا یہ سودا اس سے اس کا سارا حسن چھین کرلے گیا تھا۔

”ذرا یہ پیر تو داب۔ دن بھر بھاگ دوڑ کرکر کے ٹانگیں اکڑ کر رہ جاتی ہیں۔ کسی کھوتے کی طرح چودھری کی خدمت کرو، تب کہیں جاکر وہ جیب ڈھیلی کرتا ہے لیکن تم لوگوں کو کیا لوڑ...؟ تم تو آرام سے حلق تک نوالے ٹھونس کر مستانی ہو اور اس پر یہ حال ہے کہ ہاتھ پیروں میں دم ہی نہیں۔ سالی ایسے مرے مرے ہاتھوں سے پیر داب رہی ہے جیسے ہفتے بھر سے فاقے پر ہو۔“ اس نے اپنے حکم پر مساج چھوڑ کر پیر دبانے کا کام شروع کردینے والی بیوی کو بے نقط سنائیں۔ یہ سب سناتے ہوئے اسے قطعی یاد نہیں تھا کہ وہ بیوی کو جن حلق بھر کر کھائے جانے والے لقموں کے طعنے دے رہا ہے، وہ لقمے مشکل سے ہی اس بے چاری کے حلق سے نیچے اتر پاتے تھے۔ وہ گھر جس میں اس کے لیے نہ تو عزت تھی، نہ پیار کے دو بول... وہاں رہ کر کچھ کھایا پیا اس کے بدن کو لگتا بھی تو کیسے؟ وہ تو اس آگ میں ہی جل جل کر جھلستی رہتی تھی کہ اس کا شوہر اس کا حق طوائفوں پر لٹاتا آتا ہے۔ رہی سہی کسر پے درپے پیدا ہونے والے تین بچوں نے پوری کردی تھی۔ وہ بچے بھی اپنے باپ کی طرح اس کی جان سے چمٹی جونک کی طرح تھے۔ اس پر بالے کی بوڑھی ماں بھی کم نہیں تھی۔ بہو کو ہر وقت طعنوں سے چھلنی کرنا اور کبھی کبھی موقع دیکھ کر دو چار ہاتھ جڑ دینا وہ ساس ہونے کے ناتے اپنا پیدائشی حق سمجھتی تھی۔

”جانے میری آنکھوں پر کیسی پٹی بندھ گئی تھی جو میں تجھ سے بیاہ کے لیے دیوانہ ہوگیا تھا۔ اب سوچتا ہوں تو پچھتاتا ہوں۔ میرے لیے بھلا کیا کی تھی۔ چنڈی جس کُڑی پر ہاتھ رکھ دیتا، وہ میری ہوجاتی۔“ اسے بیوی کی خاموشی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کے جو جی میں آرہا تھا، وہ سناتا جارہا تھا کیونکہ جانتا تھا کہ یہ بے زبان لونڈی اس کی کسی بھی بات سے اختلاف کی جرأت نہیں کرے گی۔ واقعی وہ چپ رہی لیکن دوسرے پلنگ پر سویا اس کا سب سے چھوٹا بیٹا حلق پھاڑ پھاڑ کر رونے لگا۔ عورت میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ شوہر کی خدمت گزاری سے کچھ دیر کے لیے منہ موڑ کر بچے کو دیکھ لے۔ وہ اسی طرح سر جھکائے اس کے پیر دباتی رہی۔

”پہلے اسے دیکھ... پتا نہیں مردود کو کہاں درد اٹھا ہے۔ ایک تو ماں میں کوئی گن نہیں، اوپر سے اولاد بھی ایسی پیدا کی ہے جو کچھ دیر چین نہیں لینے دیتی۔“ اس نے پیر دباتی بیوی کے پہلو میں ایک لات رسید کرتے ہوئے بیزاری سے اسے حکم دیا۔ وہ چپ چاپ اٹھی اور دوسرے پلنگ پر سوئے بچے کو جاکر چیک کیا۔ بچے نے پیشاب کرلیا تھا اور اسی وجہ سے بے چین ہوکر رو رہا تھا۔ اس نے اس کے کپڑے تبدیل کروائے اور پھر اسے دودھ پلانے لگی۔ ماں کے جسم سے غذا اور حرارت اپنے جسم میں منتقل ہوجانے پر بچہ ایک بار پھر نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ وہ بچے کو پلنگ پر لٹا کر آہستہ آہستہ تھپکنے لگی۔

”کاکے کے پاس جاکر ہی مرگئی ہے کیا؟ خاوند کا تجھے کچھ خیال نہیں کہ تیری راہ دیکھ رہا ہے۔“ نیم تاریک کمرے میں بالے کی غراتی ہوئی آواز گونجی تو وہ جلدی سے بچے کو چھوڑ کر اس کے پلنگ کی طرف لپکی اور آہستگی سے پائنتی بیٹھ کر ایک بار پھر اس کے پیر دبانے لگی۔

”چل چھوڑ یہ پیر دابنا۔ اب لیٹ جا۔“ بالے کی آنچ دیتی ہوئی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو سارے جسم میں پھریری سی دوڑ گئی۔ کئی سال کی رفاقت اور تین بچوں کی پیدائش کے بعد بھی اس کا یہ عالم تھا کہ شوہر کی قربت کے خیال سے کانپ جاتی تھی۔ وہ وحشی تھا جس کی وحشت کے مٹنے... تک وہ نڈھال ہوکر رہ جاتی تھی... لیکن بہرحال انکار کی تاب بھی نہیں تھی چنانچہ چپ چاپ اس کے حکم کی تعمیل میں اس کے پہلو میں لیٹ گئی۔ فوراً ہی ایک بالوں بھرا بازو اس کے جسم سے لپٹا اور پھر وہ اپنی سخت انگلیوں سے اس کے نازک جسمانی خطوط کو ٹٹولنے لگا۔ وہ ہونٹ بھینچے کسی مٹی کے مادھو کی طرح پڑی رہی۔ اس کی یہ سرد مہری کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ دوسرا فریق طلب کی آگ میں اس بُری طرح جھلس رہا تھا کہ اسے اپنے ساتھی کے سرد جذبات سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اپنی طلب کو مٹانے کے لیے وہ مٹی کے اس مادھو کو بُری طرح جھنجھوڑے جارہا تھا۔ اس کی کسی بن مانس کی سی گرم اور پُر وحشت سانسوں کی... بُو کو بار بار سانس روک کر برداشت کرنے کی کوشش کرتی اس کی بیوی ان لمحوں کے مختصر ہوجانے کی دعا مانگ رہی تھی۔ یہ دعا وہ ہر ایسے موقع پر ہمیشہ مانگتی تھی لیکن آج حیرت انگیز طور پر اس کی دعا قبول بھی ہوگئی۔

”بالے بھائی!“ کسی نے بیرونی دروازے کو زور زور سے کھٹکھٹانے کے ساتھ بلند آواز میں پکارا۔

”باہر کوئی تمہیں بلا رہا ہے۔“ بالا فوری طور پر ہوش میں نہیں آیا تھا لیکن اس کی بیوی نے اس کا بازو ہلاتے ہوئے اسے متوجہ کیا۔ وہ اپنی نجات کا یہ موقع کیوں ضائع ہونے دیتی۔

”اس وقت کون آگیا؟“ وہ بڑبڑایا اور حواس بحال کرکے بدن پر دھوتی لپیٹتا ہوا باہر کی طرف لپکا۔ اس دوران دروازے پر دوبار مزید دستک دی جاچکی تھی۔

”کون ہے بھئی جس سے دو منٹ کا صبر نہیں ہورہا؟“ بالے نے دہاڑتے ہوئے دروازہ کھولا۔ ایک تو مسلسل دستک نے اسے جھنجلا دیا تھا، دوسرے وہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ اس کے گاؤں میں، اس کے گھر کے دروازے پر دستک دے کر اسے باہر بلانے والا اس کا کوئی دشمن ہوسکتا ہے۔ وہ بنا کسی احتیاط کے غصے میں دندناتا ہوا باہر نکلا تھا لیکن باہر نکلتے ہی جس طرح اسے چاروں طرف سے چھاپ لیا گیا، اس سے اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ چھاپنے والوں نے اسے کچھ اس طرح سے چھاپا تھا کہ وہ ہاتھ پیر چلاتا تو دور کی بات، منہ بھی نہیں کھول سکا۔ اس کے حلق سے کوئی آواز نکلنے سے قبل ہی اس کے منہ میں کپڑے کا گولا ٹھونس کر اس کی آواز کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ اسے اس طرح بے دست و پا کرنے کے بعد وہ لوگ اسے لے کر چل پڑے۔ رات کا آخری پہر شروع ہوچکا تھا۔ جلدی سو جانے کے عادی گاؤں کے باسیوں میں سے اس کی یہ درگت دیکھنے کے لیے سنسان راہوں میں کوئی موجود نہیں تھا۔ اگر کہیں کسی نے کچھ دیکھا بھی ہوگا تو انجان بن گیا ہوگا کیونکہ وہ پیدا ہونے کے بعد سے یہی سبق سیکھتے آئے تھے کہ ایسے ہر منظر پر آنکھیں بند کرلو اور بعد میں بھی زبان بند رکھو تو اسی میں بہتری ہے۔

بالے کو اٹھا کر لے جانے والے اسے چودھری کے اس گودام تک لے گئے جہاں ایکسپورٹ کیے جانے والے پھلوں کا ذخیرہ موجود تھا۔ بہترین پیکنگ میں موجود یہ پھل اسے اگانے والوں کو بھی میسر نہیں آتے تھے۔ جن کے خون پسینے کی محنت ان پھلوں میں ذائقہ اتارتی تھی، وہ اس کا ذائقہ چکھنے سے بھی محروم تھے کیونکہ ان کو اُگائے جانے کا مقصد صرف اور صرف چودھری کے خزانے میں اضافہ کرنا تھا۔ کل ان پھلوں کی پہلی کھیپ روانہ ہونی تھی۔ بالے کو ساتھ لے کر جانے والے گودام تک پہنچے تو اس نے دیکھا کہ گودام کے دروازے پر ڈیوٹی دینے والا چوکیدار موجود نہیں ہے۔ اسے لے جانے والے اسے گودام کے اندر لے گئے اور کسی بے جان شے کی طرح ..... اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ اس طرح پھینکے جانے سے اس کی کمر اور بازوؤں پر شدید چوٹیں لگیں اور اس نے بے ساختہ ہی چیخنے کی کوشش کی لیکن منہ میں ٹھنسے کپڑے کے گولے کی وجہ سے اس کی چیخیں اس کے حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئیں۔ وہ خوف زدہ نظروں سے اپنے سامنے موجود چاروں افراد کو دیکھنے لگا۔ ان چاروں نے سیاہ رنگ کے چست لباس پہن رکھے تھے اور چہروں کو ماسک کے پیچھے چھپایا ہوا تھا۔

بالے نے اپنی ساری زندگی چودھری کے لیے غنڈا گردی کرتے ہوئے گزاری تھی لیکن اس کی زندگی میں کبھی ایسا وقت نہیں آیا تھا کہ وہ تن تنہا اور بالکل نہتا اس طرح کہیں پھنس گیا ہو۔ اب وقت آیا تو اس کی حالت خراب تھی۔ وہ اشاروں میں خود کو گھیر کر لانے والوں سے التجائیں کرنے لگا لیکن وہ لوگ ایسا لگتا تھا کہ آنکھوں سے اندھے ہیں جنہیں اس کا کوئی اشارہ نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کی کسی بھی التجا کو خاطر میں لائے بغیر انہوں نے گودام میں ہی ایک طرف رکھے ڈنڈے اٹھائے اور اسے پیٹنا شروع کردیا۔ ان کا نشانہ اس کے دونوں پیر اور بازو تھے۔ وہ بے دردی سے ان دونوں اعضا پر تابڑ توڑ وار کرتے رہے۔ تکلیف کی شدت سے بے حال بالے کی چیخیں اس کے حلق میں ہی دم توڑتی رہیں۔ مارنے والوں نے اسے کسی رسی وغیرہ سے باندھا نہیں تھا لیکن وہ اسے اتنی مہلت بھی نہیں دے رہے تھے کہ وہ اٹھ کر بھاگ سکے اور اس گودام سے باہر نکل سکے۔ اپنے بازوؤں اور پیروں پر پے درپے وار سہتے بالے کے پاس اتنی مہلت بھی نہیں تھی کہ وہ منہ میں پھنسایا گیا کپڑے کا گولا ہی کھینچ کر باہر نکال سکے اور کسی کو اپنی مدد کے لیے پکارے۔ اس نے کئی بار یہ کوشش کرکے بھی دیکھی لیکن اس کا ہاتھ ابھی اس کے منہ تک پہنچ نہیں پاتا تھا کہ کسی نہ کسی حملہ آور کے ڈنڈے کی ضرب اسے ہاتھ پیچھے کرلینے پر مجبور کردیتی تھی۔

ایسی بے بسی اس نے اپنی ساری زندگی میں کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ اس کی زندگی کے شب و روز لڑائی جھگڑوں اور مار کٹائی میں ہی گزرے تھے لیکن اس وقت وہ جن لوگوں کے

ہتھے چڑھا تھا، وہ بڑے پروفیشنل انداز میں اسے مار رہے تھے۔ ان کی مہارت کا یہ حال تھا کہ انہوں نے اس کے پیروں اور بازوؤں کو نشانہ بنایا تھا۔ اب تک ایک بھی وار ان دونوں اعضا کے سوا جسم کے کسی دوسرے حصے پر نہیں پڑا تھا۔ اپنی زندگی کے اس پہلے بدترین تجربے سے گزرنے والے نے بالآخر مزاحمت ترک کر دی۔ یوں بھی اب اس میں مزاحمت کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔ روح تک کو لرزا دینے والی تکلیف سہتے ہوئے وہ یہ بات محسوس کر چکا تھا کہ اس کی کئی ہڈیاں ٹوٹ اور چٹخ چکی ہیں اور اب اگر ان لوگوں نے اسے زندہ چھوڑ بھی دیا تو وہ طویل عرصے تک بستر سے نہیں اٹھ سکے گا۔ وہ گودام کے فرش پر کسی قربان کیے جانے والے بکرے کی طرح پڑا تڑپ رہا تھا اور اپنے سینے میں ہی قید ہو جانے والی چیخوں کو خود ہی سنتے ہوئے اس کے دماغ میں بے شمار مظلوموں کی وہ چیخیں گونج رہی تھیں جن سے کبھی وہ قہقہے لگاتے ہوئے لطف اندوز ہوا تھا۔

اپنی زندگی کے ان نازک ترین اور اذیت ناک لمحات میں اسے وہ سب کچھ یاد آرہا تھا جسے کرتے ہوئے اس نے کبھی انسانیت کا بھرم رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ کسی کتے یا گھوڑے کی طرح چودھری کا سدھایا ہوا ایک جانور بن کر اس کے اشاروں پر چلتا رہا تھا۔ اس نے اپنی حیوانی جبلت کو چودھری کے نمک کا حق ادا کرنے کے لیے خوب استعمال کیا تھا اور اب خود بھی کسی حیوان ہی کی طرح کے سلوک سے گزر رہا تھا۔ اس سلوک کو سہتے سہتے آخرکار اس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی اور بالآخر اپنے خون میں لتھڑا وہ بے ہوشی کی تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

اسے مارنے والوں نے جب یہ دیکھا کہ وہ بے ہوش ہو چکا ہے تو انہوں نے اپنے ہاتھ روک لیے اور ہاتھوں میں موجود ڈنڈے ایک طرف پھینکتے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔ وہ چار تھے جن میں سے دو نے اسے کسی تعفن زدہ چوہے کی طرح زمین سے اٹھایا اور گودام سے باہر کی طرف لے گئے۔ ان کی منزل زیادہ دور نہیں تھی۔ انہوں نے اسے گودام سے کچھ فاصلے پر موجود ایک درخت کے نیچے لے جا کر پھینک دیا۔ اسی درخت کے نیچے گودام کا چوکیدار بھی بے ہوش حالت میں پڑا تھا۔ چوکیدار کو بالے کی طرح تشدد کا نشانہ نہیں بنایا گیا تھا۔ اسے صرف سر پر کسی بھاری شے کی ضرب لگا کر بے ہوش کیا گیا تھا۔ بالے کو چوکیدار کے قریب پھینکنے کے بعد وہ دونوں واپس گودام کی طرف پلٹے اور قریب ہی کھڑی جیپ میں سوار ہو کر منتظر نظروں سے گودام کے دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

وہ ایک طے شدہ لائحہ عمل کے مطابق عمل کر رہے تھے اس لیے انہیں اندر جا کر یہ دیکھنے کی قطعی ضرورت نہیں تھی کہ ان کے ساتھی اندر کیا کر رہے ہیں۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ وہی کچھ کر رہے ہوں گے جو طے کر کے آئے ہیں۔ آخرکار مختصر وقفے کے بعد... ان کا انتظار ختم ہو گیا اور انہوں نے اپنے ساتھیوں کو گودام سے باہر آتے ہوئے دیکھا۔ ان دونوں کے جیپ میں سوار ہوتے ہی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص نے جیپ اسٹارٹ کی اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ اب وہ بڑی خاموشی لیکن برق رفتاری سے پیر آباد کی حدود سے نکل رہے تھے۔ وہاں سے نکلنے سے پہلے انہوں نے اپنے عقب میں موجود گودام میں بھڑکتے ہوئے شعلوں کا رقص دیکھا اور اپنے مشن کی سو فیصد کامیابی کا یقین لیے ہوئے پیر آباد سے باہر نکل آئے۔ ان کی اگلی منزل نورکوٹ میں تھی۔ نورکوٹ پہنچے تو کوئی ان کا منتظر تھا۔ انہوں نے جیپ اس منتظر آدمی کے حوالے کی اور پھر نہا دھو کر فریش ہونے کے بعد اپنے لیے تیار کیے جانے والے آرام دہ کمروں میں جا کر خوابِ خرگوش کے مزے لوٹنے لگے۔

رات کا باقی حصہ انہوں نے نہایت سکون سے گزارا اور پھر صبح ایک پُرتکلف ناشتے کے بعد صاف ستھرے لباسوں میں ملبوس ایک گھنٹے کے وقفے کے ساتھ دو دو کی ٹولی بنا کر بس اڈے پر پہنچ گئے۔ ان کے معزز حلیوں کو دیکھ کر کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ پچھلی رات پیر آباد میں داخل ہو کر چودھری کے سب سے سرچڑھے غنڈے کو عبرت کا نشان بنانے والے چار سیاہ پوشوں سے ان کا کوئی تعلق بھی ہو سکتا ہے۔ اور یہی تو ان کا کمال تھا جسے مدِنظر رکھتے ہوئے انہیں اس کام کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔

☆☆☆

دفتر پہنچنے کے کچھ دیر بعد شہریار کو جو پہلی فون کال موصول ہوئی وہ اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھی۔

''میں آفتاب احمد بات کر رہا ہوں سر!'' کال کرنے والے نے اپنا تعارف کروایا تو پہلے تو وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹک گیا پھر اشتعال کی ایک زوردار لہر اس کے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ اس شخص آفتاب احمد کو وہ کتنا پسند کرتا تھا۔ اس کے عزائم اور مستقل مزاجی نے اسے اتنا متاثر کیا تھا کہ وہ سوچتا تھا کہ آفتاب احمد کو دوسروں کے لیے ایک مثال بنا کر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اسکول کے ساتھ آفتاب کی گہری وابستگی نے اسے ہمیشہ یہ احساس دلایا تھا کہ وہ اس کی ٹیم کا سب سے

بہترین ممبر ہے لیکن آفتاب نے اسے بُری طرح مایوس کیا تھا۔ صرف ایک لڑکی کی خاطر وہ اپنی برسوں کی محنت اور شہریار کا لگایا گیا سرمایہ داؤ پر لگا کر چلا گیا۔ اگر وہ چودھری کی بیٹی کے عشق میں مبتلا ہونے کی غلطی نہیں کرتا تو نوبت یہاں تک نہیں پہنچتی۔ چودھری جو پہلے ہی اسکول کا سخت مخالف تھا، طیش کی وجہ سے ہر حد پار کر گیا تھا۔

''خیریت! تم نے کیسے مجھ سے رابطہ کرنے کی زحمت کی؟'' اپنے اشتعال کو سرد مہری میں لپیٹ کر اس نے آفتاب سے سوال کیا۔

''میں بہت شرمندہ ہوں سر کہ فوری طور پر آپ سے رابطہ نہیں کر سکا۔ حالات ہی کچھ ایسے رہے کہ میرے لیے یہ ممکن نہیں ہو سکا لیکن رات پچھلے دنوں کے اخبارات میں پیر آباد سے متعلق خبریں پڑھیں تو رہ نہیں سکا۔ پوری رات شدید کرب کے عالم میں گزری۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہو گیا، ایسا لگتا ہے کہ اخبارات میں جو کچھ چھپا ہے سب غلط ہے۔'' آفتاب کی آواز سے ظاہر تھا کہ وہ شدید جذباتی کیفیت سے گزر رہا ہے اور کسی بھی لمحے رو پڑے گا۔

''حالانکہ اتنے عرصے تک چودھری کو بھگتنے کے بعد تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ اس میں سے کوئی بھی بات غلط نہیں ہو سکتی۔ چودھری جیسا منتقم مزاج اور کینہ پرور آدمی کبھی بھی اور کسی بھی حد سے گزر سکتا ہے اور وہ ایسا کر کے دکھا چکا ہے۔ اسکول کی عمارت کو جو نقصان پہنچا، اس کا مجھے اتنا غم نہیں ہے۔ مالی نقصان قابلِ تلافی ہوتے ہیں لیکن جو انسانی زندگیاں ضائع ہو گئیں، ان کا نعم البدل کہاں سے لایا جائے؟ کیا قصور تھا منیب اور اس کے ساتھی اساتذہ کا؟ بس یہی نا کہ وہ خلوصِ نیت کے ساتھ ہمارے مشن میں شامل تھے اور گاؤں کے بچوں کو جہالت کی تاریکی سے نکال کر علم کی روشنی میں لانا چاہتے تھے۔ وہ بالکل بے ضرر لوگ تھے جن کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی لیکن ان بے چاروں کو تمہارے حصے کی سزا بھگتنی پڑی۔ چودھری کو تم نہیں ملے تو اس نے ان مظلوموں کو اپنے ظلم کا نشانہ بنا ڈالا۔'' وہ اتنے غصے میں تھا کہ آفتاب کی افسردگی محسوس کرنے کے باوجود اس سے کوئی رعایت برتنے کو تیار نہیں ہوا اور بے نقط سناتا چلا گیا۔

''آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں سر! میں خود بھی منیب اور دیگر اساتذہ کی موت کے لیے خود کو مجرم سمجھ رہا ہوں لیکن یقین جانیے کہ مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ چودھری اس حد تک گر جائے گا۔ اور ویسے بھی جو کچھ ہوا، ویسا کب کسی نے سوچا تھا۔ میں تو خود حالات کے دھارے پر بہتا چلا گیا۔ میں نے کبھی اپنی زندگی کے اس رخ کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ میری زندگی میں اسکول اور اپنے کاغذ قلم کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ کشور کیسے اچانک میری زندگی میں آئیں اور میں کیسے ان کی محبت میں ڈوبتا چلا گیا، مجھے بھی اندازہ نہیں۔ شاید لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ یہ جذبہ اتنا زور آور ہوتا ہے کہ اس کے سامنے کسی کی ایک نہیں چلتی۔ میں بھی اس منہ زور جذبے پر کوئی بند نہیں باندھ سکا۔ حالانکہ یہ تو میں ہی جانتا ہوں کہ مجھے پیر آباد چھوڑنے اور اپنے اسکول سے دور ہونے کا کتنا دکھ ہے اور اب اس دکھ میں اپنے ساتھیوں کی ناحق موت کا دکھ بھی شامل ہو کر میرے لیے کیسی اذیت بن گیا ہے۔'' آفتاب کا کہا ایک ایک لفظ سچائی سے پُر تھا، یہ بات شہریار بھی سمجھتا تھا چنانچہ اس بار جب وہ اس سے مخاطب ہوا تو اس کا لہجہ ذرا نرم تھا۔

''تمہیں احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا آفتاب! تم جانتے تھے کہ تم ایک ایسے شخص کی بیٹی سے محبت کر رہے ہو جو کسی صورت اس بات کو قبول نہیں کر سکتا۔ اب دیکھ لو کہ اس کا کیا ردِعمل سامنے آیا ہے۔ وہ ملازمہ رانی جو تمہاری رازداں تھی، دوسری دو ملازماؤں کے ساتھ پہلے ہی ہلاک ہو چکی ہے۔ تمہیں اغوا کر کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا، یہ بھی مجھے معلوم ہے۔ منیب اور اس کے ساتھیوں کے قتل کے پیچھے تمہارے فرار سے چودھری کو ہونے والی کھسیاہٹ ہے، یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں اور ابھی وہ مزید کہاں تک جائے گا اس کا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ مجھے تو ڈر ہے کہ اس نے اپنی بیٹی کو بھی نہیں بخشا ہوگا۔ حویلی کی اونچی دیواروں کے پیچھے اس پر کیا مظالم ڈھائے جا رہے ہوں گے، اس کی خبر دینے والا بھلا کون ہے؟''

''آپ کشور کے لیے پریشان نہ ہوں سر! وہ بخیر و عافیت ہیں اور میرے ساتھ ہی ہیں۔'' آفتاب کے اس انکشاف نے اسے بُری طرح چونکنے پر مجبور کر دیا۔

''کیا مطلب؟ یہ کیسے اور کب ہوا؟'' وہ اپنی حیرت کو لہجے میں در آنے سے نہیں روک سکا۔ جواب میں آفتاب نے وہ سارے حالات بیان کر دیے جن کے باعث اسے کشور کو فوری طور پر پیر آباد سے نکال لے جانے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ شہریار خاموشی سے ساری تفصیلات سنتا رہا۔ ان تفصیلات کو سن کر اسے صحیح معنوں میں اندازہ ہو رہا تھا کہ چودھری کا اتنا شدید ردِعمل سامنے کیوں آیا تھا۔ وہ شخص جو بیٹی کے معاشقے کی خبر سننے کا بھی ظرف نہیں رکھتا تھا، اتنی بڑی بات پر تو اس کا آپے سے باہر ہو جانا ایک یقینی سی بات تھی۔

"تم اپنے آپ کو بہت بڑی مشکل میں گرفتار کر چکے ہو۔ چودھری کسی صورت تم دونوں کو چین سے نہیں بیٹھنے دے گا۔ اس کی ہر ممکن کوشش ہوگی کہ کسی طرح تمہیں ڈھونڈ نکالے اور اس کے بعد وہ تمہارا کیا حشر کرے گا، اس کا اندازہ تو تم اس کی قید میں گزارے گئے وقت کو یاد کر کے بخوبی لگا سکتے ہو۔ میرا اندازہ ہے کہ ابھی تو تمہارے وہ زخم ہی پوری طرح مندمل نہیں ہوئے ہوں گے اور تم بغیر سہارے کے اپنے قدموں پر چلنے کے لائق بھی نہیں ہو سکے ہو گے۔" شہریار نے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

"میرے ان اجنبی محسنوں کے پیچھے آپ ہی تھے ناسر جنہوں نے مجھے چودھری کی قید سے آزادی دلوائی؟ ان لوگوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا لیکن میرا موہوم سا اندازہ تھا کہ شاید یہ آپ ہی ہوں جن کی وجہ سے مجھے اس قید سے نجات ملی۔ آپ کا بہت بہت شکریہ سر!" آفتاب جو مسلسل اس الجھن میں رہا تھا کہ اس کو چودھری کی قید سے کس نے آزادی دلوائی، اس کے بعض جملوں سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے ممنونیت کا اظہار کرنے لگا۔

"تم اچانک اس اسپتال سے کہاں غائب ہو گئے تھے جہاں تمہیں علاج کے لیے داخل کروایا گیا تھا؟" شہریار نے بھی گویا بالواسطہ طور پر اپنی مدد کو تسلیم کر لیا اور اس سے دریافت کرنے لگا۔ جگنو نے آفتاب کو جس اسپتال میں داخل کروایا تھا، وہ وہاں سے اچانک ہی غائب ہو گیا تھا اور تحقیقات سے بس اتنا ہی معلوم ہو سکا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے کسی دوست کی مدد سے وہاں سے گیا تھا۔ آفتاب اپنی مرضی سے گیا ہے، یہ جان کر شہریار کی پریشانی تو دور ہو گئی تھی لیکن یہ الجھن بہرحال رہی تھی کہ وہ کہاں چلا گیا ہے چنانچہ اب یہ سوال اس سے پوچھ بیٹھا۔

"افضل کا خیال تھا کہ میرا اس اسپتال میں رہنا میری سلامتی کے لیے خطرناک ہو سکتا ہے اس لیے اس نے مجھے ایک دوسرے اسپتال میں شفٹ کروا دیا تھا۔ افضل کی موت کے بعد اس کے ایک صحافی دوست نے اس اسپتال سے بھی مجھے شفٹ کروا دیا۔ اس کا خیال تھا کہ چودھری میرے زخمی ہونے کی وجہ سے مختلف اسپتالوں میں تلاش کروا رہا ہو گا اس لیے مجھے اب کسی اسپتال میں نہیں رہنا چاہیے۔ اس کا یہ اندازہ بالکل درست تھا۔ چند منٹوں کے فرق نے مجھے چودھری کے بندوں کے ہاتھ لگنے سے بچا لیا ورنہ مجھے ڈھونڈتے ہوئے وہ لوگ اس اسپتال تک بھی پہنچ گئے تھے۔ اب میں لاہور سے دور ایک دوسرے شہر میں ہوں۔ کشور میرے ساتھ ہیں اور ہم دونوں فی الحال خود کو کافی محفوظ سمجھ رہے ہیں۔ میں نے لکھنے لکھانے کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا ہے اور قلمی نام کی وجہ سے میرے پکڑے جانے کا بھی کوئی اندیشہ نہیں ہے لیکن میں پیرآباد کے حالات کی وجہ سے پریشان ہوں۔ بارشوں کی وجہ سے جو پریشانی پیدا ہوئی ہے، اس سے تو خیر آپ آہستہ آہستہ نمٹ ہی لیں گے لیکن اسکول کے بارے میں سوچ کر میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ منیب اور دیگر ساتھیوں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے، اس کے بعد تو کوئی بھی دوسرا استاد وہاں آنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں خود وہاں پہنچ جاؤں لیکن اس سے بھی کیا فائدہ ہو گا؟ چودھری تو مجھے پیرآباد کی فضا میں دوسرا سانس لینے کا بھی موقع نہیں دے گا۔" آفتاب کے لہجے میں حقیقی پریشانی تھی جسے محسوس کر کے شہریار کو اسے تسلی دینی ہی پڑی۔

"تم یہاں کی فکر نہ کرو۔ اسکول کے لیے کچھ نہ کچھ بندوبست ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر ماریا کی والدہ مسز جوزف نے اسکول میں تدریسی فرائض انجام دینے کے لیے مجھے اپنے تعاون کی پیشکش کی ہے۔ جب تک حالات سنبھل نہیں جاتے، مسز جوزف اسکول کا انتظام دیکھ لیں گی۔ بس یہ سمجھو کہ تم نے جس طرح زیرو سے کام شروع کیا تھا، اسی طرح اب مسز جوزف کو کرنا ہو گا۔ خیر، کوئی بات نہیں... کام جاری رہنا چاہیے، باقی تو سب آہستہ آہستہ معمول پر آ ہی جاتا ہے۔ تمہارے لیے اب میرا یہی مشورہ ہے کہ جہاں ہو، وہاں خاموشی اور سکون سے رہو۔ حالات ذرا بہتر ہو جائیں تو پھر تم کچھ اور کرنے کا سوچ سکتے ہو۔ ویسے بھی دنیا کوئی پیرآباد کے اسکول پر ختم نہیں ہو جاتی۔ پیرآباد کے علاوہ بھی وطن عزیز میں ایسے بہت سے گاؤں اور دیہات ہیں جہاں کے بچے تعلیم سے محروم ہیں۔ تم ایسے کسی دوسرے گاؤں میں کام شروع کر سکتے ہو۔ مقصد تو علم کی روشنی پھیلانا ہے۔ چراغ کو اس سے کیا مطلب کہ وہ کہاں جل رہا ہے؟ ہاں، اگر کبھی تمہیں میری ضرورت محسوس ہو تو مجھ سے رابطہ کر سکتے ہو۔ مجھ سے جو ممکن ہو سکا، وہ تمہارے لیے ضرور کروں گا۔" اس نے آفتاب کو ایک صائب مشورہ دیتے ہوئے فون بند کر دیا اور کچھ دیر گم صم سی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ وہ محبت کی طاقت پر غور کر رہا تھا۔ کیسا عجیب جذبہ تھا کہ ایک شخص کو اس کی زندگی کے محور و مرکز سے اتنی دور کھینچ کر لے گیا اور وہ کچھ نہیں کر سکا۔

کچھ دیر آفتاب کے بارے میں سوچنے کے بعد وہ ایک بار پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس کے لیے اطمینان کی بات یہ تھی کہ بارشوں کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال پر کافی حد تک قابو پا لیا گیا تھا اور جو لوگ اپنے گھر چھوڑ دینے پر مجبور ہو گئے تھے، وہ اب اپنے گھروں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ جن لوگوں کی املاک زیادہ متاثر ہوئی تھیں اور وہ روزمرہ زندگی کے معمولات میں شامل ہونے سے معذور ہو گئے تھے، ان کے لیے اس نے اپنی ٹیم کی مدد سے ایک مربوط پلان بنایا تھا اور اس پلان کے مطابق لوگوں کی امداد کا سلسلہ شروع کیا جا چکا تھا۔ اسے امید تھی کہ جلد ہی باقی ماندہ چھوٹے موٹے مسائل بھی حل ہو جائیں گے اور وہ رک جانے والے ترقیاتی منصوبوں پر ایک بار پھر کام شروع کروا سکے گا۔ اس وقت وہ کاغذوں کے پلندے میں الجھا ہوا انہی معاملات کا جائزہ لے رہا تھا کہ ایک بار پھر فون کی گھنٹی بجی اور اسے آئی جی مختار مراد کی کال کی اطلاع دی گئی۔ اس اطلاع کو سن کر اس کے ہونٹوں پر پُراسرار مسکراہٹ دوڑ گئی۔ یہ اس کی متوقع فون کال تھی جس کا وہ صبح سے انتظار کر رہا تھا۔

"السلام علیکم انکل! کہیے، کیسے مزاج ہیں آپ کے؟" آپریٹر نے اس کی طرف سے اجازت ملنے پر لائن ملائی تو اس نے پہل کرتے ہوئے انہیں سلام کیا اور بڑے جوش سے حال احوال پوچھنے لگا۔

"وعلیکم السلام۔ اللہ کا شکر ہے، میں بالکل بخیر و عافیت ہوں لیکن تم بتاؤ کہ تمہاری طرف کیا چل رہا ہے؟ آئے دن مار دھاڑ اور قتل و غارت کی اطلاعات مل رہی ہیں۔ کل رات بھی سنا ہے کہ چودھری افتخار کے دو بندے زخمی ہو گئے جن میں سے ایک کی حالت بہت خراب ہے۔ حملہ آوروں نے چودھری کے پھلوں کے گودام میں بھی آگ لگا دی تھی جس کی وجہ سے اس کا بہت بڑا مالی نقصان ہوا ہے۔" حسب توقع مختار مراد نے اس سے اسی موضوع پر گفتگو کرنے کے لیے فون کیا تھا جس کا وہ پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا۔

"سنا تو میں نے بھی ہے یہ سب کچھ۔ صبح دفتر آنے سے پہلے ہی ایس پی نے فون کر کے مجھے اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے، ایف آئی آر کاٹو اور تفتیش کرو کہ کس نے یہ حرکت کی ہے۔ اگر مجرم پکڑے گئے اور ان کا جرم ثابت ہو گیا تو پھر ان کے خلاف قانون کے مطابق کارروائی کی جائے گی۔" اس نے نہایت اطمینان سے مختار مراد کو جواب دیا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ چودھری نے مشکوک افراد کی فہرست میں تمہارا نام بھی لکھوایا ہے... بلکہ سب سے زیادہ زور ہی تمہارے نام پر دیا ہے؟" مختار مراد نے گہری سنجیدگی کے ساتھ پوچھا۔

"اب میں کیا کر سکتا ہوں کہ چودھری کو اپنے ہر بگڑے معاملے کے پیچھے میرا ہی ہاتھ نظر آتا ہے۔ حالانکہ دیکھا جائے تو کل اس کا جو بندہ شدید زخمی ہوا ہے، اس کی شہرت کوئی اچھی نہیں ہے۔ اسے علاقے کا سب سے بڑا غنڈا

دور اندیش

ہیش اسٹیشن پر بیٹھا ٹرین کی آمد کا منتظر تھا کہ ایک اجنبی نوجوان اس کے پاس آیا اور اس سے وقت پوچھا۔ ہیش نے اس کے سوال کو اس طرح نظر انداز کر دیا جیسے سنا ہی نہ ہو۔

اجنبی نوجوان نے دوبارہ، سہ بارہ وقت پوچھا مگر ہر مرتبہ ہیش نے حقارت سے اسے دیکھ کر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

اجنبی نوجوان نے حیرت سے کہا۔ "دیکھیے جناب! میں آپ سے ایک ایسی درخواست کر رہا ہوں جس کے باعث آپ کا کوئی نقصان نہیں ہو گا۔ میں صرف وقت پوچھ رہا ہوں۔ آخر آپ اتنے ناراض کیوں ہو رہے ہیں؟"

"میرے پاس بیٹھ جاؤ۔" ہیش نے کہا۔ "اور اب غور سے میری بات سنو۔ میں یہاں ٹرین کا انتظار کر رہا ہوں۔ تم جو میرے لیے بالکل غیر اور اجنبی ہو، آتے ہو اور وقت پوچھتے ہو۔ ہو سکتا ہے میں تمہیں وقت بتا دوں مگر جانتے ہو پھر کیا ہو گا؟ تم میرا شکریہ ادا کرو گے۔ ہم دونوں ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگیں گے۔ باتیں کرتے کرتے تم کہو گے، آؤ ایک پیالی چائے پی آئیں۔ بس ہم چائے پئیں گے پھر تم ٹرین میں میرے ساتھ بیٹھ جاؤ گے۔ اسٹیشن پر میری انتہائی سادہ خوب صورت بیٹی مجھے لینے آئے گی۔ تم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہی عاشق ہو جاؤ گے۔ چھپ چھپ کر ملاقاتیں ہوں گی اور میری بیٹی مجھ سے کہے گی۔ پاپا میں شادی کروں گی تو اسی سے کروں گی ورنہ ساری زندگی کنواری ہی بیٹھی رہوں گی۔ لیکن یہ سمجھ لو میں ایک ایسے شخص کو اپنا داماد ہرگز نہیں بنا سکتا جس کے پاس گھڑی تک نہیں ہے۔ اب سمجھے میں تمہیں وقت کیوں نہیں بتا رہا ہوں؟"

دانش اظہار کی پسند یدگی

تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے لوگوں کے تو بے شمار دشمن ہوتے ہیں۔ کسی کا بھی داؤ چل گیا ہوگا اور اس نے اپنی کوئی دشمنی نکال لی ہوگی۔ میرا بھلا اس قسم کے غنڈوں سے کیا تعلق؟ اگر مجھے اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنی ہوتی تو سیدھے سیدھے پولیس کے ذریعے اسے اٹھواتا اور ڈرائنگ روم میں رکھ کر ایسی خاطر مدارات کرواتا کہ رات والے واقعے میں اس کی جتنی ہڈیاں بچ گئی ہیں، اتنی بھی نہیں بچ پاتیں۔ لیکن آپ بتائیں کہ آپ نے مجھ سے اس معاملے میں بازپرس کرنے کی زحمت کیوں کی؟ کیا آپ کو بھی شک ہے کہ میں ایسے کسی کام میں انوالو ہوسکتا ہوں؟'' اپنے حق میں دلائل دیتے دیتے اس نے اچانک ہی مختار مراد سے شکوہ بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ اصل میں چودھری نے خود مجھے فون کیا تھا اور تمہارے خلاف شکایت کی تو میں نے سوچا کہ تم سے اصل معاملہ پوچھ لوں۔'' مختار مراد اس کے اس سوال پر تھوڑا سا بوکھلا کر وضاحت دینے لگا۔ اپنی برسوں کی ملازمت میں اس نے اس طرح کی بڑی الٹ پھیر دیکھی تھی۔ شہریار کا پُراعتماد لہجہ مختار مراد کو اسے مشکوک سمجھنے سے روک نہیں سکتا تھا لیکن وہ اس کے لیے جو پدرانہ جذبات اپنے دل میں محسوس کرنے لگا تھا، ان کی وجہ سے شہریار کے لہجے میں موجود شکوے نے اسے جذباتی کر دیا تھا۔ وہ اس کے اکلوتے مرحوم داماد سجاد رانا کا بالکل بھائیوں جیسا کزن تھا اور سجاد رانا کی موت کے بعد وہ اس کے اندر اسی کا عکس دیکھنے لگا تھا۔ شاید یہ اولاد نرینہ سے محروم ایک تنہا شخص کی ایک ایسی اندرونی کمزوری تھی جس نے کچھ اس طرح اسے مغلوب کیا تھا کہ وہ خود بھی اس سے واقف نہیں ہوسکا تھا۔

''اصل میں بات یہ ہے انکل کہ میں نے منیب اور اس کے ساتھی اساتذہ کے قتل کے سلسلے میں چودھری پر شک ظاہر کیا ہے اور بے وجہ نہیں کیا۔ منیب کی مرنے سے پہلے جو آخری کال مجھے موصول ہوئی تھی، اس میں اس نے صاف لفظوں میں یہ بات کہی تھی کہ چودھری کے کارندوں نے اس کے مکان کو گھیر لیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس فون کال کی کوئی قانونی حیثیت نہیں اور نہ ہی میرے پاس وہ گفتگو ریکارڈ ہے کہ میں عدالت میں ثبوت کے طور پر پیش کرسکوں۔ لیکن خود مجھے بھی یقین ہے اور چودھری بھی جانتا ہے کہ اس واردات کے پیچھے کون تھا۔ اب چودھری کو موقع ملا ہے تو اس نے جوابی کارروائی کے طور پر مجھے ایک کیس میں مشکوک نامزد کر دیا ہے۔ اس طرح کے الزامات میرے اور اس کے درمیان جاری لڑائی کا ایک حصہ ہیں۔ آپ ان باتوں کی ٹینشن مت لیں۔ چودھری کچھ بھی ثابت نہیں کرسکے گا بلکہ میں الٹا اس پر الزام لگا دوں گا کہ اس نے خود اپنے کارندے کو پٹوایا اور اپنے گودام میں آگ لگوائی ورنہ اور کس میں ہمت ہے کہ باہر سے آکر اس کے خلاف اس کے علاقے میں کارروائی کر سکے۔'' وہ پوری تیاری کے ساتھ بیٹھا تھا اور مختار مراد کے ہر سوال کا پورے اطمینان سے جواب دے رہا تھا۔

''اگر تم مطمئن ہو تو ٹھیک ہے پھر تم خود ہی اس معاملے کو ہینڈل کر لینا۔ میں نے تو اس لیے ذکر چھیڑ دیا تھا کہ تم ہوشیار رہو اور بے خبری میں مارے نہ جاؤ۔ ویسے میرے فون کرنے کا اصل مقصد اس موضوع پر گفتگو کرنا نہیں تھا، میں تمہیں کچھ دوسری اہم باتوں سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔'' انہوں نے گویا سابقہ موضوع لپیٹ دیا۔

''وہ کیا؟'' شہریار نے فوراً ہی پوچھا۔ وہ اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ وہ موضوع کیا ہے۔

''سجاد کے قتل کے معاملے کی تحقیقات کرتے ہوئے کچھ اہم انکشافات ہوئے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کچھ دیگر مشکوک معاملات کی تحقیقات کرتے ہوئے ہمیں سجاد کے قاتلوں کے بارے میں کچھ کلیوز ملے ہیں۔ پچھلے دنوں مری کے ایک ریسٹ ہاؤس سے ندا اور حنا نامی دو لڑکیاں گرفتار کی گئی تھیں۔ یہ لڑکیاں بظاہر وہاں سیر و تفریح کے لیے رکی ہوئی تھیں لیکن ایک تو اپنے طویل قیام کی وجہ سے نظر میں آگئیں، دوسرے یہ بھی نوٹ کیا گیا کہ دونوں بہنیں وی آئی پیز سے تعلقات قائم کرنے کی تگ و دو میں لگی رہتی ہیں۔ مقامی یا غیر مقامی دونوں طرح کے سرکاری افسران، سیاست داں اور اعلیٰ فوجی عہدے داران کا خاص ٹارگٹ تھے۔ ان کی اس دلچسپی کو دیکھ کر انٹیلی جنس کے لوگ ان کے پیچھے لگ گئے اور بالآخر انہیں گرفتار کر کے ان سے یہ اگلوالیا گیا کہ وہ دونوں دراصل بھارتی ایجنٹس ہیں جن کے اصل نام ارمیلا اور گیتا ہیں۔ ان دونوں لڑکیوں نے انکشاف کیا کہ وہ لاہور میں قائم ایک میرج بیورو کی آڑ میں جسم فروشی کا بزنس کرنے والے نیٹ ورک سے جڑی ہوئی تھیں اور ان کے ساتھ کام کرنے والی لڑکیوں میں سے کچھ لڑکیاں خصوصی تربیت یافتہ تھیں جو درحقیقت بھارت کے لیے جاسوسی کا کام کر رہی تھیں۔ ایسی ہی ایک لڑکی کو سجاد سے بھی ملوایا گیا تھا اور بعد میں یہ اندازہ کرنے کے بعد کہ سجاد اس لڑکی کے ذریعے ان کے نیٹ ورک تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے، اس لڑکی کو خودکشی پر مجبور کر دیا گیا۔ ارمیلا اور گیتا نے قبول کیا ہے کہ اس

بات کا قوی امکان ہے کہ سجاد کو بھی را کے اشارے پر ہی ہلاک کیا گیا ہو۔ بہرحال، وہ سو فیصد پُریقین نہیں تھیں اور ان کا کہنا تھا کہ میرج بیورو کی مالکن کا روپ دھار کر رہنے والی ان کی باس اصل حقیقت جانتی ہوگی لیکن اب وہ کہاں ہے، یہ انہیں نہیں معلوم۔ سجاد کے قتل کے فوراً بعد ہی میرج بیورو والا وہ سیٹ اپ ختم کر دیا گیا اور اس کے بعد سے ان کا بھی اپنی باس سے رابطہ نہیں ہوا۔ ہمارے لوگ اس میرج بیورو تک پہنچے تھے لیکن وہاں سے اس عورت کے بارے میں کوئی قابل ذکر بات معلوم نہیں ہوئی۔ عمارت کے مالک نے عورت کا جو حلیہ بتایا ہے، وہ کسی بھی ادھیڑ عمر عیسائی عورت کا حلیہ ہوسکتا ہے جس کی بنیاد پر ہم کسی کو گرفتار نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ہماری تحقیقات کی گاڑی اچھی خاصی چلنے کے بعد ایک بار پھر ٹھپ ہو چکی ہے۔''

''آپ کو ان دونوں لڑکیوں سے ہی اس عورت کا حلیہ اور اتا پتا معلوم کرنا چاہیے تھا۔'' مختار مراد کی فراہم کردہ معلومات سن کر اس نے جوش کے ساتھ مشورہ دیا۔

''اتا پتا تو جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا وہ لڑکیاں جانتی ہی نہیں تھیں اور حلیہ معلوم کرنے کی نوبت نہیں آسکی۔''

''کیا مطلب؟ کیوں نوبت نہیں آسکی؟'' وہ الجھا۔

''وہ کوئی معمولی لڑکیاں نہیں تھیں جو ذرا سی دھمکیوں اور تشدد پر ہمارے قابو میں آجاتیں۔ ہمیں بڑے سائنٹیفک طریقے سے ان پر کام کرنا پڑا تھا، تب کہیں جا کر یہ سب کچھ معلوم ہوا تھا۔ ہم اسٹیپ بائی اسٹیپ آگے بڑھتے ہوئے ان دونوں سے معلومات حاصل کر رہے تھے لیکن بدقسمتی سے مکمل معلومات حاصل ہونے سے پہلے ہی وہ دونوں مر گئیں۔ ارمیلا نے گیتا کا گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کر دیا اور بعد میں دیوار سے اپنا سر ٹکرا ٹکرا کر خود کو اس حد تک زخمی کر لیا کہ واپس ہوش کی دنیا میں نہیں آسکی اور تین دن کومے میں رہنے کے بعد مر گئی۔'' مختار مراد نے اس کی الجھن دور کی تو وہ گہرے تاسف میں ڈوب گیا۔ اسے یقین تھا کہ شینا اور سجاد رانا کے قاتل ایک ہی تھے لیکن ان کی بدقسمتی تھی کہ ہر بار قاتل ہاتھ میں آتے آتے بچ نکلتے تھے۔ ہر عام آدمی کی طرح اس کی بھی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح اصل قاتلوں تک رسائی حاصل کی جا سکے تاکہ انہیں ان کے جرم کی سزا دی جا سکے۔ ان سفاک قاتلوں نے صرف شینا اور سجاد رانا ہی کو ہلاک نہیں کیا تھا، انہوں نے اس کے پورے خاندان سے زندہ رہنے کی امنگ چھین لی تھی۔ یہ امنگ اب کبھی لوٹ کر واپس نہیں آسکتی تھی لیکن زندہ لاش کی طرح جیتے لیاقت رانا، آفرین اور مریم کے

مجبوری

ریلوے اسٹیشن پر نوجوان جوڑا کھڑا تھا۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے اور دونوں ایک دوسرے کو تسلی دینے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ ادھر سے گزرنے والے انہیں دیکھتے تو دل ہی دل میں افسوس کرتے کہ بے چاروں کو ایک دوسرے سے جدا ہونا پڑ رہا ہے۔ اسی اثنا میں انجن سے سیٹی کی آواز آئی۔ یہ گویا اس بات کا اشارہ تھا کہ ٹرین روانہ ہونے والی ہے۔

لڑکی روتی ہوئی اپنے ڈبے میں چلی گئی جبکہ لڑکا پلیٹ فارم پر کھڑا ہو کر الوداعی انداز میں ہاتھ ہلانے لگا۔ ٹرین روانہ ہونے کے بعد ایک عمر رسیدہ خاتون جو جدائی کے اس منظر کو بغور دیکھتی رہی تھیں، لڑکی کے پاس گئیں اور اسے سمجھاتے ہوئے بولیں۔ ''بس بس بیٹی! رونا بند کرو۔ میں جانتی ہوں کہ تم محض اس لیے رو رہی ہو کہ تمہیں اپنے شوہر کو چھوڑ کر جانا پڑ رہا ہے۔''

''نہیں۔'' لڑکی نے سسکی بھر کر کہا۔ ''میں اس لیے رو رہی ہوں کہ مجھے شوہر کے پاس جانا پڑ رہا ہے۔''

دلوں کو یہ ٹھنڈک تو پہنچائی جا سکتی تھی کہ ان کے پیاروں کے خونِ ناحق کا بدلہ لیا جا چکا تھا... لیکن شاید ابھی وہ وقت آنے میں کچھ مدت باقی تھی اور انہیں صبر سے اس مدت کے گزرنے کا انتظار کرنا تھا۔

☆☆☆

''تم آج میرے ساتھ میرے گھر چل رہی ہو۔'' پریکٹیکل ختم ہونے کے بعد وہ لوگ لیب سے باہر نکل رہے تھے، تب راحیلہ نے ماہ بانو کا ہاتھ تھامتے ہوئے یہ حکم صادر کیا۔

''اتنی اچانک؟ پھر کسی دن کا پروگرام رکھ لو۔ اس طرح اچانک جانے میں تو مشکل ہو جائے گی۔'' ماہ بانو نے انکار کیا۔

''کیسی مشکل؟ تمہیں کون سا گھر والوں کو جواب دہی کرنی ہے۔ ہاسٹل ہی تو جانا ہے۔ تین چار گھنٹے لیٹ بھی پہنچ جاؤ گی تو کیا بگڑے گا؟'' راحیلہ نے اس کے انکار کو قطعی اہمیت نہیں دی۔

''لیکن آج ہی جانا کیوں ضروری ہے؟ بعد میں کسی اور دن اطمینان سے بھی تو جایا جا سکتا ہے۔'' ماہ بانو کو اس

طرح اچانک اس کے گھر جانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ویسے بھی اپنے سابقہ تجربات کی بنیاد پر وہ ذرا محتاط رہنا چاہتی تھی اور احتیاط پسندی کا تقاضا یہی تھا کہ وہ خود کو زیادہ سے زیادہ محدود رکھے لیکن راحیلہ کے اصرار کو دیکھتے ہوئے اس سے صاف انکار بھی نہیں کیا جا رہا تھا۔

”آج چلنا اس لیے ضروری ہے کہ آج بھائی کی چھٹی ہے اور میں ان سے کہہ کر آئی تھی کہ میں اپنے ساتھ اپنی دوست کو لے کر آؤں گی۔ آپ کہیں مت جائیے گا۔ اب وہ بے چارے ہمارے انتظار میں گھر پر بیٹھے ہوں گے اور تم نہیں جاؤ گی تو یقیناً انہیں بُرا لگے گا۔“

”تمہیں اپنے بھائی سے کچھ بھی کہنے سے پہلے مجھ سے بات کرنی چاہیے تھی نا۔“ ماہ بانو نے قدرے بے بسی محسوس کرتے ہوئے اسے اس کی غلطی کا احساس دلایا۔

”اب تو غلطی ہو گئی نا! تم کیسی دوست ہو کہ دوست کی ایک غلطی کو نبھا نہیں سکتیں۔ پلیز چلو نا... ہم بھائی سے ایکالوجی کا وہ ٹاپک بھی سمجھ لیں گے جو کل مسز شیرازی کے لیکچر میں سر کے اوپر سے گزر گیا تھا۔“ راحیلہ نے اپنے اصرار میں ایک لالچ کو بھی شامل کیا۔

”ٹھیک ہے، تم اتنا اصرار کر رہی ہو تو میں چلتی ہوں لیکن پلیز آئندہ ایسی غلطی نہیں کرنا۔“ بالآخر ماہ بانو نے ہتھیار ڈال دیے۔

”تھینک یو۔ یہ ہوئی نا دوستوں والی بات۔“ راحیلہ اس کے رضامند ہو جانے پر خوشی سے چہکی۔ پھر وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتی کالج سے باہر آ گئیں۔ باہر نکلنے سے قبل ماہ بانو نے اپنے چہرے کو اچھی طرح چادر کے پلو کا نقاب بنا کر ڈھانپ لیا تھا۔ راحیلہ کے ساتھ اس کے گھر کی طرف روانہ ہوتے ہوئے اسے اطمینان تھا کہ اگر کسی آشنا کی اس پر نظر پڑ بھی گئی تو نقاب کی وجہ سے وہ شناخت نہیں کی جا سکے گی۔ راحیلہ نے رکشے والے کو کلفٹن چلنے کو کہا۔ کالج سے کلفٹن تک کا اچھا خاصا راستہ طے کرنے تک وہ ماہ بانو کو مسلسل مختلف جگہوں اور سڑکوں کے بارے میں بتاتی رہی۔ ماہ بانو توجہ سے سنتے ہوئے ان ساری معلومات کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

کراچی اس کے لیے قطعی اجنبی شہر تھا اور یہاں آنے کے بعد سے اس نے کالج اور ہاسٹل کے سوا کوئی دوسری جگہ نہیں دیکھی تھی۔ یہاں ایسا کوئی شخص تھا ہی نہیں جو اسے یہ نیا شہر گھماتا یا اس کے بارے میں معلومات فراہم کرتا۔ آج راحیلہ کے طفیل وہ اس شہر کو دیکھ رہی تھی تو اسے اچھا لگ رہا تھا

وہ سوچ رہی تھی کہ اچھا ہی ہوا، میں نے راحیلہ کے اصرار کے آگے ہار مان لی۔ جب اس شہر میں رہنا ہی ہے تو پھر اس کے بارے میں کچھ معلومات بھی ہونی چاہئیں۔ تقریباً پینتیس منٹ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ لوگ کشادہ سے علاقے کے ایک بڑے سے گھر کے سامنے پہنچ گئے۔ رکشے سے اترنے کے بعد راحیلہ نے کرایہ ادا کیا اور گیٹ کے سائڈ میں لگی ڈور بیل بجا دی۔ ماہ بانو متاثر ہونے والے انداز میں اس بڑے سے گھر کا جائزہ لیتی رہی۔ راحیلہ نے اسے اپنے متعلق جو کچھ بتایا تھا، اس سے وہ یہی اندازہ لگا سکی تھی کہ اس کا تعلق متوسط طبقے سے ہے لیکن اب وہ جس گھر کے سامنے کھڑی تھیں، وہ اتنا شان دار تھا کہ متوسط طبقے کا کوئی شخص اس میں رہنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اپنی اس حیرت میں غلطاں اسے گیٹ کھولے جانے کا بھی احساس نہیں ہوا۔ راحیلہ نے اس کا بازو ہلا کر اسے اندر چلنے کو کہا تو وہ ہوش میں آئی۔ گھر اندر سے بھی بہت خوب صورت اور صاف ستھرا تھا۔

”تم شاید اس گھر کو دیکھ کر حیران ہو رہی ہو اور دل میں سوچ رہی ہو کہ راحیلہ نے تو اپنے بارے میں کچھ اور بتایا تھا... پھر یہ شان دار گھر اس کا کیسے ہو سکتا ہے؟“ اس کے کوئی سوال کرنے سے قبل ہی راحیلہ نے اس کی حیرانی کو بھانپ لیا اور خود ہی اس کی حیرت کو لفظوں کی زبان دے دی۔ جواباً وہ خاموش رہی۔

”اصل میں یہ گھر ہمارا ذاتی نہیں ہے۔ ہمارا ذاتی گھر تو متوسط طبقے کے ایک علاقے شاہ فیصل میں ہے۔ یہاں ہم اپنے ایک ننھیالی انکل کی وجہ سے رہ رہے ہیں۔ میرے وہ انکل اپنی پوری فیملی کے ساتھ کینیڈا گئے ہوئے ہیں۔ ان کا ارادہ ہے کہ وہ فیملی سمیت کینیڈا میں ہی سیٹل ہو جائیں گے لیکن اپنا یہ گھر انہوں نے احتیاطاً سیل نہیں کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ ایک سال تک جائزہ لیں گے کہ وہ اور ان کے بیوی بچے کینیڈا میں ایڈجسٹ کر سکتے ہیں یا نہیں۔ ایک سال بعد وہ یا تو واپس آ جائیں گے یا وہاں رہنے کی صورت میں مکان سیل کر دیں گے۔ واپسی کے امکان کو ذہن میں رکھتے ہوئے وہ یہ مکان سامان سمیت جوں کا توں چھوڑ کر گئے ہیں۔ کسی کو کرائے پر بھی اس لیے نہیں دیا کہ جانے کرایہ دار کس طرح چیزوں کو استعمال کریں۔ دوسرے ایک سال بعد واپس آنے یا مکان کو سیل کرنے دونوں صورتوں میں وہ کرائے داروں سے مکان خالی کرانے کی جھنجھٹ سے بچنا چاہتے تھے لیکن بھرا ہوا مکان اس طرح خالی بھی نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ وہ ہمارے گھر آئے اور اماں سے استدعا کی کہ ان

کی عدم موجودگی میں ہم لوگ ان کے گھر میں رہائش اختیار کر لیں۔ اماں نے ان کی یہ بات مان لی، یوں ہم اس گھر میں رہتے ہیں۔ گھر میں ایک ملازم موجود ہے جو چوکیداری اور صفائی ستھرائی کے فرائض انجام دیتا ہے۔ اس کی سال بھر کی تنخواہ انکل خود ادا کر کے گئے ہیں۔ باقی کچن کا کام کاج رہ جاتا ہے تو کسی نہ کسی طرح گزارہ ہو جاتا ہے۔ اماں یہاں ہوں تو وہ کچھ پکا دیتی ہیں ورنہ بھائی ہوٹل سے کچھ لے آتے ہیں۔“ راحیلہ نے ایک سانس میں پوری تفصیل کہہ سنائی۔ اس دوران میں وہ دونوں اندر لاؤنج تک پہنچ کر وہاں موجود نرم ملائم قیمتی صوفوں پر براجمان ہو چکی تھیں۔

”تمہاری اماں کیا مستقل تمہارے ساتھ یہاں نہیں رہتیں؟“ راحیلہ کی گفتگو سے نتیجہ اخذ کرنے کے علاوہ گھر میں چھائی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

”کہاں...؟ ابا جی کی وجہ سے وہ بے چاری خوامخواہ گھن چکر بنی ہوئی ہیں۔ اصل میں ہمارے ابا ذرا اور دماغ کے آدمی ہیں۔ انہیں ہمارا اس گھر میں رہنے کا فیصلہ پسند نہیں آیا۔ ان کا کہنا ہے کہ جب اپنا گھر موجود ہے تو پرائے گھر میں جا کر رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ بعد میں بیکار میں اپنا گھر بُرا لگنے لگے گا۔ چار دن کی چاندنی کے بعد اندھیری رات زیادہ کھلے گی وغیرہ وغیرہ۔ ان کے اعتراضات کے جواب میں بھائی نے کہا کہ ابا کی مرضی وہ اسی پرانے گھر میں رہیں، ہم تو چار دن کی چاندنی کے مزے لوٹنے ضرور جائیں گے۔ کیا معلوم کوئی ایسا معجزہ ہو جائے کہ ہمیں واپس ان پتلی پتلی گلیوں اور چھوٹے مکان کی طرف پلٹنا ہی نہ پڑے۔ بس اسی وجہ سے بے چاری اماں گھن چکر بنی رہتی ہیں۔ کبھی یہاں رہتی ہیں اور کبھی ابا کے خیال سے پرانے گھر چلی جاتی ہیں۔ آج بھی وہ وہیں گئی ہوئی ہیں اس لیے تم تیار رہو، ہمیں کھانا باہر کا پکا ہوا کھانا پڑے گا۔ میرے خیال میں بھائی اسی انتظام کے لیے باہر گئے ہوئے ہیں۔“ اس کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے راحیلہ نے آخر میں خیال ظاہر کیا۔

”تو تم خود کھانا تیار کر لیا کرو۔ دو افراد کا کھانا پکانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے؟“ ماہ بانو نے اسے مشورہ دیا۔

”نہ بابا! میں نہیں کر سکتی یہ کام۔ میرا وقت بہت قیمتی ہے۔ میں میڈیکل کے لیے اپنی میرٹ بناؤں یا ان فضول دھندوں میں پڑوں۔“ راحیلہ نے ناک چڑھاتے ہوئے ایک ادا سے جواب دیا تو ماہ بانو نے اسے مزید کوئی نصیحت کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسی وقت پچیس چھبیس سالہ ایک شخص ہاتھ میں بہت سارے شاپرز لیے چلا آیا۔ درمیانی قامت اور

گندمی رنگت والے اس شخص کے نقوش میں راحیلہ کی اتنی مشابہت تھی کہ ماہ بانو دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ وہ اس کے بھائی ڈاکٹر طارق ہیں۔

”یہ لو بھئی، میں لنچ کے لیے چیزیں لے آیا ہوں۔ تم چیک کر لو کہ تمہاری سہیلی کی خاطر مدارات کے لیے ان چیزوں میں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی۔“ ڈاکٹر طارق نے اپنے ہاتھوں میں موجود بھرے ہوئے شاپرز راحیلہ کو تھمائے۔

”میں چیک کر لیتی ہوں، آپ تب تک مہرین کو کمپنی دیں۔“ راحیلہ اس کے ہاتھ سے شاپرز لے کر باہر نکل گئی۔ وہ ماہ بانو کے سامنے ہی ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

”راحیلہ آپ کا اکثر ذکر کرتی رہتی ہے۔ بقول اس کے پہلی بار کلاس میں کوئی ایسی لڑکی آئی ہے جو پڑھائی میں اس کی ٹکر کی ہے۔ میں نے ہی اسے مشورہ دیا تھا کہ آپ سے دوستی کر لے۔“ وہ دھیمی سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے اسے بتانے لگا۔ پھر گویا گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ اس نے ماہ بانو سے اس کی فیملی، تعلیم اور دلچسپیوں سے متعلق ڈھیروں سوال پوچھے۔ وہ اپنے غیر معمولی حالات کو چھپاتے ہوئے اس کے تمام سوالات کے سچائی سے مگر محتاط انداز میں جواب دیتی رہی۔ راحیلہ نے کھانا لگنے کی اطلاع دی تو وہ لوگ لاؤنج سے اٹھ کر ڈائننگ روم میں چلے گئے۔ ڈائننگ روم کی سجاوٹ بھی قابلِ دید تھی اور میز پر جن برتنوں میں کھانا پیش کیا گیا تھا وہ بھی نہایت نازک، نفیس اور خوب صورت تھے۔ ان تینوں نے خوش گوار موڈ میں کھانا ختم کیا اور کھانے کے بعد ایک بار پھر واپس لاؤنج میں آ گئے۔ لاؤنج میں آنے کے بعد راحیلہ کی فرمائش پر طارق نے ان دونوں کو ایکالوجی کا وہ ٹاپک سمجھایا جو انہیں کالج میں دیے جانے والے لیکچر کے دوران میں سمجھ نہیں آیا تھا۔

”اب تم لوگ آپس میں گپ شپ کرو۔ میں ایک گھنٹے کے لیے باہر جا رہا ہوں۔ واپس آ کر مہرین کو اس کے ہاسٹل ڈراپ کر دوں گا۔“ پڑھائی کا سلسلہ ختم ہوا تو طارق یہ کہتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ پھر گویا اچانک کچھ یاد آ جانے پر جاتے جاتے واپس پلٹا۔

”میرے خیال میں، میں تم لوگوں کی کچھ تصویریں بنا دیتا ہوں۔ اچھا ہے یادگار رہیں گی۔“ اس نے جیب سے اپنا موبائل فون نکال لیا۔ یہ کیمرے والا موبائل فون تھا۔

”تصویروں کی کیا ضرورت ہے؟“ ماہ بانو تھوڑا ہچکچائی اور طارق کو روکنے کی کوشش کی۔

”کھینچنے دو نا مہرین! کون کس سے کب جدا ہو جائے

کیا معلوم ہوتا ہے۔ تصویروں کی شکل میں انسان کے پاس کم از کم یادگار ہی رہ جاتی ہے۔'' راحیلہ نے پیار بھرے لہجے میں اصرار کیا تو وہ مزید انکار نہیں کر سکی۔ طارق نے جلدی جلدی اس کی اور راحیلہ کی چار پانچ تصویریں لیں اور پھر انہیں خدا حافظ کہتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد راحیلہ، ماہ بانو کو اوپر کے پورشن میں لے کر آ گئی۔

''یہ میرا بیڈ روم ہے۔ میرا زیادہ تر وقت یہیں گزرتا ہے۔'' ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اسے اندر لے جاتے ہوئے راحیلہ نے بتایا۔ باقی گھر کی طرح اس کمرے کی سجاوٹ بھی نہایت عمدہ تھی۔ پنک اور وائٹ کمبی نیشن نے کمرے کے ماحول کو بڑا خوابیدہ سا بنا دیا تھا۔ ماہ بانو کو بے ساختہ ہی راحیلہ کے والد کا استدلال یاد آیا۔ واقعی وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے کہ بڑے سے شان دار گھر میں رہنے کے بعد اپنے چھوٹے اور معمولی گھر میں واپس جا کر رہنا بہت مشکل لگے گا۔ راحیلہ جو اتنے استحقاق سے پرائے گھر کے ایک کمرے کو اپنا بیڈ روم قرار دے رہی تھی، واپس اپنے اصل گھر جاتی تو جانے کیسا محسوس کرتی۔

''تم بیٹھو۔ میں چائے بناتی ہوں۔'' ماہ بانو کی سوچوں سے بے خبر راحیلہ نے اس سے کہا اور وہاں موجود الیکٹرک کیتل میں چائے کے لیے پانی ڈالنے لگی۔

''پڑھنے کے دوران میں اگر چائے کی طلب ہو تو میں یہیں اپنے لیے چائے بنا لیتی ہوں۔ بھائی نے بھی یہی بندوبست کیا ہوا ہے۔ مجھے ڈسٹرب نہیں کرتے۔'' اپنے کام میں مصروف رہتے ہوئے وہ ماہ بانو کو بتانے لگی۔ وہ اس کی بات پر یونہی سر ہلا کر ٹیرس کی طرف کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھ گئی اور اس دروازے سے گزر کر ٹیرس پر جا پہنچی۔ کشادہ ٹیرس پر سے اس خوب صورت گھر کے لان کے علاوہ پڑوس کے بنگلے کا منظر بھی نظر آ رہا تھا۔ فی الحال دونوں ہی جگہیں ویران لگ رہی تھیں اور کسی انسان کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا لیکن پھر اس منظر میں ایک مرد اور عورت داخل ہو گئے۔ مرد پختہ عمر کا اور کلین شیو تھا۔ اس نے چست جینز کے ساتھ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور اپنے لمبے بالوں کو پونی ٹیل میں قید کر رکھا تھا۔ مرد کے مقابلے میں عورت بہت کم عمر اور خوب صورت تھی۔ اس کے جسم پر جدید تراش خراش کا لباس تھا اور یہ تراش خراش اس حد تک کی گئی تھی کہ عورت کے جسم کے بیشتر اعضا عریاں ہی نظر آ رہے تھے۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے وہاں موجود سیاہ رنگ کی کرولا تک پہنچے۔ باوردی ڈرائیور نے پھرتی سے پچھلی جانب کا دروازہ کھولا اور پھر خود گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف چلا گیا۔ مرد گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے عورت کی طرف گھوما۔ اس کے اس طرح گھومنے سے اس کا چہرہ پوری طرح ماہ بانو کے سامنے آ گیا۔ اس چہرے کو دیکھ کر اس کے ذہن میں شناسائی کا احساس جاگا لیکن فوری طور پر اسے یاد نہیں آیا کہ اس شخص کو اس نے کہاں دیکھا ہے۔ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ذہن پر زور دینے لگی لیکن پھر بے ساختہ ہی چہرہ موڑنے پر مجبور ہو گئی۔ مرد یک دم ہی عورت سے بغل گیر ہو گیا تھا اور اپنے لب اس کے بھرے بھرے ہونٹوں میں پیوست کر دیے۔ ماہ بانو نے چہرہ موڑا تو اسے اپنے برابر میں راحیلہ کھڑی مسکراتی ہوئی نظر آئی۔ وہ کچھ اور بھی جھینپ گئی۔

''بڑے ماڈرن ہیں تمہارے پڑوسی۔ ڈرائیور کی موجودگی کا بھی خیال نہیں۔ اگر ان صاحب کا بیوی سے رومانس کا موڈ ہو رہا تھا تو اندر سے فارغ ہو کر ہی باہر نکلتے۔''

اس نے شرمندہ سے لہجے میں تبصرہ کیا جس پر راحیلہ ہنس پڑی اور پھر بولی۔ ''ہائی سوسائٹی میں سب کچھ چلتا ہے ڈیئر! ویسے تمہیں کس نے کہا کہ وہ دونوں آپس میں میاں بیوی ہیں؟''

''کسی نے نہیں۔ میں نے ان کے اسٹائل سے اندازہ لگایا ہے۔ ظاہر ہے عورت اپنے شوہر سے ہی اس حد تک فری ہو سکتی ہے۔''

''لیکن پڑوس میں موجود خاتون ذرا مختلف ہیں۔ وہ اپنے ہاں آنے والے ہر بندے سے اسی طرح ملتی ہیں۔ ہر بار ان کا اسٹائل یہی ہوتا ہے لیکن ''شوہر'' بدل جاتا ہے۔'' اس کے اندازے کی تردید کرتے ہوئے راحیلہ نے اس پر جو انکشاف کیا، اسے سن کر وہ ہکا بکا رہ گئی۔ اس انکشاف کی روشنی میں تو راحیلہ کی وہ پڑوسن خاصے مشکوک کردار کی عورت تھی۔

''تم اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو؟ آج کل طوائفیں اسی طرح رہنے لگی ہیں۔ کوٹھوں کا رواج اب ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اب کوٹھیوں اور بنگلوں میں بزنس ہوتا ہے۔'' راحیلہ نے کسی پختہ کار عورت کی طرح اسے سمجھایا۔

''ہمیں کیا... چلو اندر چل کر چائے پیتے ہیں۔'' ماہ بانو نے اس موضوع پر گفتگو کو مزید جاری رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ راحیلہ نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ اندر جا کر چائے پینے کے بعد وہ دونوں کمبائنڈ اسٹڈی کرتی رہیں۔ طارق کے واپس آنے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ وہ واپس آیا تو اس نے ماہ بانو کو واپس اس کے ہاسٹل چھوڑ دیا۔ ماہ بانو کے لیے یہ ایک اچھا دن تھا۔ بہت عرصے بعد اسے کسی گھر کی چار دیواری میں وقت گزارنے کا موقع ملا تھا۔ دن کا باقی بچا کھچا حصہ اپنے معمول کے مطابق گزارنے کے بعد اس نے رات کو کافی دیر سے بستر کا رخ کیا تو بھی راحیلہ کے ساتھ گزارے خوش گوار دن کی یادیں اس کے ساتھ تھیں۔

وہ حالات کی وجہ سے ایک طویل عرصہ پڑھائی سے دور رہی تھی اس لیے اسے عام طالب علموں کے مقابلے میں زیادہ وقت اور محنت سے کام لینا پڑ رہا تھا۔ اکثر وہ آدھی رات کے بعد ہی سونے کے لیے لیٹتی تھی۔ آج بھی اسے کافی دیر ہو گئی تھی اور وہ خاصی تھکن محسوس کر رہی تھی لیکن اس کے تھکے ماندے ذہن میں کوئی چیز اس طرح اٹکی ہوئی تھی کہ وہ فوری طور پر سونے میں بھی ناکام تھی۔ اس کا ذہن مسلسل دن بھر کے واقعات کو دہرا رہا تھا۔ واقعات کے اس تسلسل میں راحیلہ کے گھر کے ٹیرس پر کھڑے ہو کر دیکھا جانے والا پڑوس کا منظر بھی شامل تھا۔ اس منظر کی جزئیات کو دہراتے ہوئے جیسے ہی مرد کا چہرہ اس کے ذہن کی اسکرین پر ابھرا، اسے اپنی نیند کے غائب ہونے کی وجہ سمجھ آ گئی۔ اس کا لاشعور مسلسل اس اضطراب میں مبتلا رہا تھا کہ شناسا محسوس ہونے والا وہ چہرہ آخر کس کا تھا۔ اس وقت بھی وہ اس چہرے کے ایک ایک نقش کو ذہن میں دہراتے ہوئے اس کے بارے میں یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کوشش میں جانے کیسے اس کے دماغ نے دیکھے گئے اس چہرے میں کچھ تبدیلیاں کرنا شروع کر دیں۔ اس نئے بننے والے نقش میں پہلے کچھ رنگ شامل ہوئے اور انہوں نے چہرے کو میک اپ زدہ کر کے نسوانی ٹچ دینا شروع کیا۔ پھر لباس کی تبدیلی واقع ہوئی اور جینز اور ٹی شرٹ کی جگہ ایک بھڑکیلے نسوانی لباس نے لے لی۔ لباس کی اس تبدیلی کے ساتھ ہی ماہ بانو کے اندر کوئی جھما کا سا ہوا اور وہ بے قراری ہو کر بستر پر اٹھ بیٹھی۔ اس کے ذہن نے راحیلہ کے پڑوس میں نظر آنے والے مرد کی تصویر کا جو تبدیل شدہ رخ دیکھا تھا، وہ سو فیصد خواجہ سراؤں کے مہاگرو سے مشابہت رکھتا تھا۔ اس کا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ ذہن میں شک بھی ابھرا کہ شاید کوئی غلطی ہو رہی ہے لیکن اندر جیسے کوئی سگنل دے رہا تھا کہ وہ درست ہے۔

اس نے اپنی اضطرابی کیفیت پر قابو پانے کے لیے پہلے ایک گلاس پانی پیا اور ایک بار پھر تجزیہ کرنے لگی۔ نتیجہ اب بھی وہی تھا۔ ہاتھ میں چھرا تھامے کم سن شینا کو قربان کرتا وہ مکروہ وجود اس کی یادداشت سے کبھی مٹ ہی نہیں سکتا تھا۔ اسے اتنی دیر بھی اس لیے لگی تھی کہ ایک خواجہ سرا اور مرد کے درمیان کی تفریق نے نظروں کو فوری طور پر بھٹکا دیا تھا لیکن اب فیصلہ ہو گیا تو اس کے لیے صبح کا انتظار کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے فوراً اپنے تکیے کے نیچے رکھا موبائل نکالا اور شہریار کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ کراچی آنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ وہ شہریار سے رابطہ کر رہی تھی ورنہ اس کی ہمت ہی نہیں ہوئی تھی کہ خود سے اسے فون کر لے۔ کبھی دل بہت ہی خواہش کرتا، تب بھی وہ اسے ڈانٹ ڈپٹ کر چپ کروا لیتی لیکن اب تو معاملہ ہی مختلف تھا۔ وہ جس شخص کے بارے میں اطلاع دینے جا رہی تھی اس سے زیادہ وہ شہریار کو مطلوب تھا۔ اس شخص نے اس کی پیاری بھتیجی کو قتل کیا تھا اور یقیناً وہ اس سفاک قاتل کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے بے چین تھا۔ شہریار اس کا محسن تھا اور اپنے محسن کے کسی کام آنے کا اسے پہلی بار موقع مل رہا تھا تو وہ کسی صورت تاخیر نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے نمبر ملایا تو تیسری بیل پر دوسری طرف سے کال ریسیو کر لی گئی۔

''خیریت تو ہے مہرین! تم نے اتنی رات کو کیسے فون کیا ہے؟'' وہ اس کا فون آنے پر یقیناً پریشان ہوا تھا اور احتیاط پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے اس کے اصل نام سے مخاطب کرنے کے بجائے تبدیل شدہ نام سے پکارا تھا۔

''میں بالکل خیریت سے ہوں لیکن آپ کو ایک اہم اطلاع دینا چاہتی تھی اس لیے بے وقت زحمت دی۔''

''کیسی اطلاع؟'' شہریار اگرچہ چند لمحوں میں ہی بہت سے واہموں اور خدشات سے گزر گیا تھا کہ جانے کیا ہو گیا ہے بہرحال اس نے ماہ بانو کو ٹوکا نہیں اور پرسکون لہجے میں پوچھا۔

''آج میں نے شینا کے قاتل کو دیکھا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ سو فیصد وہی ہے۔'' وہ گویا اسے تفصیل بتانے سے قبل ہی باور کروا دینا چاہتی تھی کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے، اس میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں۔

''تم نے اسے کب اور کہاں دیکھا ہے؟ مجھے پوری تفصیل بتاؤ۔'' اطلاع ایسی تھی کہ شہریار بھی ہل کر رہ گیا اور اس نے بہ مشکل خود پر قابو رکھتے ہوئے اس سے کہا۔ جواباً ماہ بانو نے اسے راحیلہ سے ہونے والی تازہ دوستی، اس کے گھر جانے اور وہاں سے پڑوس میں نظر آنے والے مرد کے بارے میں ساری تفصیل کہہ سنائی۔

''تمہاری دوست کے گھر کا ایڈریس کیا ہے؟'' ساری بات سننے کے بعد شہریار نے اس سے پوچھا۔

''وہ کلفٹن کے علاقے میں رہتی ہے لیکن میں اس کا

بنگلا نمبر وغیرہ نوٹ نہیں کر سکی۔'' ماہ بانو نے معذرت خواہانہ لہجے میں جواب دیا۔

''کل تم اس لڑکی سے ملنا تو کسی بہانے اس سے اس کا ایڈریس لے کر مجھے ایس ایم ایس کر دینا۔ باقی معاملات میں خود دیکھ لوں گا۔ تمہیں مزید پریشان ہونے اور ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب آرام سے سو جاؤ۔'' آخری جملہ اس نے ماہ بانو کی تسلی کے لیے کہا تھا جسے سن کر وہ واقعی پُرسکون ہو گئی۔ فون بند کرتے ہی نیند کی دیوی فوراً ہی اس پر مہربان ہو گئی اور وہ اس دیوی کی بانہوں میں آرام سے سو گئی لیکن دوسری طرف شہریار کا سکون درہم برہم ہو چکا تھا۔ اسے اپنے خاندان کو کبھی نہ بھرنے والا زخم دینے والے شخص کے متعلق اطلاع ملی تھی۔ اس اطلاع کو سن کر اب وہ سکون سے سو سکے، یہ کسی صورت ممکن نہیں تھا۔ رات کا باقی ماندہ حصہ اس نے بہت بے چینی کے ساتھ آئندہ کا لائحہ عمل طے کرتے ہوئے گزارا۔ اب اس کے لیے یہاں رکے رہنا ممکن نہیں تھا۔ اسے ہر صورت شینا کے قاتل تک پہنچنا تھا۔

☆☆☆

''آخر کار تم آ ہی گئیں۔ لیکن سچ کہوں تو بڑا تڑپانے اور انتظار کروانے کے بعد آئی ہو۔'' چودھری نے اپنے سامنے کھڑی لنڈا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اس کی سریلی ہنسی فضا میں بکھر گئی۔ وہ ایک ادا سے بال جھٹکتے ہوئے بولی۔

''خاص چیزوں اور لوگوں کے لیے تو ہمیشہ انتظار ہی کرنا پڑتا ہے۔''

''یہ بھی تم نے صحیح کہا لیکن کچھ تو سامنے والے کی چاہت کا بھی خیال کرنا چاہیے۔'' چودھری نے اس سے شکوہ کیا۔

''آپ کی چاہت کا ہی تو خیال تھا چودھری صاحب جو میں ان حالات میں بھی آپ سے ملنے چلی آئی ہوں۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو یہ رسک ہرگز نہیں لیتا۔''

''کیا مطلب... کیسا رسک؟'' چودھری اس کی بات سن کر چونکا۔

''آپ کے خیال میں یہاں کے حالات مجھ سے چھپے ہوئے ہیں... میں کچھ جانتی نہیں ہوں؟'' لنڈا نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''تمہارا اشارہ کن حالات کی طرف ہے؟'' چودھری کچھ الجھ سا گیا۔ ویسے سابقہ تجربے سے وہ یہ تو جان گیا تھا کہ لنڈا اور ڈیوڈ کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں۔ وہ کسی ایسے نیٹ ورک سے تعلق رکھتے ہیں جن کے لیے کسی بھی طرح کی معلومات حاصل کر لینا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ اس کی ڈیوڈ سے پہلی ملاقات ہی ان حالات میں ہوئی تھی کہ وہ اس کی ماہ بانو میں دلچسپی اور اس کے فرار سے متعلق سب کچھ جانتا تھا۔ دوسری بار ان لوگوں نے اسے یہ بتا کر چونکایا تھا کہ وہ کشور کے حویلی سے فرار سے واقف ہیں۔ انہی لوگوں نے اسے افضل کا اتا پتا بھی دیا تھا لیکن بدقسمتی سے افضل اپنی پرانی دشمنی کی بھینٹ چڑھ گیا اور چودھری کے بندے اس سے آفتاب کا پتا معلوم نہیں کر سکے۔

اپنے ان تجربات کی روشنی میں چودھری کو یقین تھا کہ لنڈا اگر یہ دعویٰ کر رہی ہے کہ وہ پیر آباد کے حالات سے اچھی طرح واقف ہے تو اس دعوے میں کوئی ابہام نہیں ہے لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کا اشارہ خاص طور پر کن حالات کی طرف ہے۔ وہ تو آج کل ہر طرف سے ہی پریشانیوں میں گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف اس کے گودام میں آگ لگا کر اسے کو اس حد تک مارا پیٹا گیا تھا کہ دوبارہ اس کے اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کا امکان کم ہی تھا... تو دوسری طرف اسے کشور کی تلاش میں ناکامی کا سامنا تھا۔ اتنی بھاگ دوڑ اور جدوجہد کے بعد بھی اس کے کارندے صرف اس اسپتال تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکے تھے جہاں کشور اور آفتاب زیر علاج رہے تھے۔ وہ اسپتال سے کب اور کہاں گئے، یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا اور ان حالات نے چودھری کو صحیح معنوں میں زچ کر رکھا تھا۔ آج کل وہ بُری طرح بلبلایا ہوا تھا اور اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں غور و خوض میں مشغول تھا۔

ان حالات میں اسے لنڈا کی کال موصول ہوئی کہ وہ پیر آباد آنے کے لیے لاہور سے روانہ ہو چکی ہے تو اس نے فوراً سے پیشتر اس کے استقبال کی تیاریاں شروع کر دیں۔ منشی اور ایک ڈرائیور حویلی کی سب سے شاندار گاڑی میں اسے ریسیو کرنے کے لیے گئے اور اسے پیر آباد پہنچتے ہی اس شاندار گاڑی میں منتقل کروا لیا۔ لنڈا کو فی الحال حویلی ہی لایا گیا تھا اور اس کی رہائش کا بھی یہیں بندوبست کیا گیا تھا کیونکہ چودھری اسے اپنی معزز مہمان باور کروانا چاہتا تھا۔ براہ راست ڈیرے پر وہ عورتیں لائی جاتی تھیں جو پیشہ ور ہوتی تھیں لیکن لنڈا کا معاملہ ذرا مختلف تھا۔ وہ اپنی خدمات کا معاوضہ کس شکل میں وصول کرے گی، مستفید ہونے والا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ بظاہر تو وہ دوست بن کر ہی سامنے والے کو اپنی قربت سے نوازتی تھی لیکن وہ قیمت وصول ضرور کرے گی، یہ بات چودھری بھی اب سمجھنے لگا تھا۔ وہ لنڈا کی سحر انگیز قربت کے لیے ہر طرح کی قیمت ادا کرنے کو تیار بھی تھا لیکن اس بار وہ اپنے بھی کچھ مفادات حاصل کرنا چاہتا تھا

اس لیے بھی اس نے اسے حویلی میں ٹھہرایا تھا۔ حویلی میں بیویوں کی موجودگی میں اسے خود پر کنٹرول رکھنے میں کچھ آسانی رہتی۔ بعد میں معاملہ سیٹ ہونے پر ڈیرے پر جا کر گل چھرے اڑائے جا سکتے تھے لیکن لنڈا نے تو آتے کے ساتھ ہی اسے الجھا دیا تھا۔ وہ صاف طور پر اس پر احسان جتا رہی تھی کہ وہ حالات کی خرابی کے باوجود اس سے ملنے کے لیے آ گئی ہے۔

''وہی حالات جن میں آپ کے لیے اپنی مال و عزت کی حفاظت کرنا بھی مشکل ہو گیا۔ جان کا خطرہ بھی یقیناً ہو گا لیکن فی الحال تو بے چارے ملازموں کی ہی شامت آئی ہوئی ہے۔ ملازموں کے بعد آپ کے دشمن کب مہمانوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیں، کچھ کہا تو نہیں جا سکتا... لیکن دیکھ لیں، ہم پھر بھی ہمت کر کے آپ کی محبت میں یہاں تک کھنچے چلے آئے ہیں۔'' ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا کر اس نے چودھری پر طنز کے تیر چلائے اور خود ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر کچھ اس انداز سے بیٹھ گئی کہ پہلے ہی اسکرٹ سے نیچے اپنی رعنائی دکھاتی اس کی لمبی سڈول ٹانگوں کی خوب صورتی کچھ اور بھی عیاں ہو گئی۔ چودھری کو اس کے طنزیہ جملوں نے بلبلا کر نہ رکھ دیا ہوتا تو وہ سیدھا جا کر اس کے قدموں میں لوٹنے لگتا۔

''تم نے چند چھوٹے موٹے واقعات سے ہماری طاقت کا غلط اندازہ لگایا ہے۔ میں اگر چپ ہوں تو صرف مصلحتاً۔ تم نے اور ڈیوڈ نے خود مجھے یہ مشورہ دیا تھا کہ اسے ہی شہریار کے خلاف کچھ نہیں کیا جائے۔ تم لوگوں کے کہنے پر ہی مجھے اچھا بھلا اپنے قبضے میں موجود اسے ہی کو رہا کرنا پڑا تھا ورنہ تو میں اس کل کے چھوکرے کا دماغ درست کر دیتا۔ اب بھی میرے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، اسی کی شہ پر ہو رہا ہے۔ یہ میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں لیکن صرف اس لیے چپ ہوں کہ میرا جوابی ردِعمل تمہارے پروجیکٹ کو نقصان نہ پہنچا دے۔'' تیوریاں چڑھا کر اس نے لنڈا کی بات کا ذرا سختی سے جواب دیا۔

''آپ تو بُرا ہی مان گئے چودھری صاحب! میرا مقصد آپ کی بے عزتی کرنا نہیں تھا۔ لیں یہ پیجیے۔ آپ کا موڈ ٹھیک ہو جائے گا۔'' لنڈا کے ہونٹوں پر وہی بجلی کوندنے جیسی مسکراہٹ چمکی اور وہ اپنی خاطر کے لیے سامنے رکھی جانے والی شراب کی بوتلوں میں سے ایک بوتل سے جام بھر کر بہ نفسِ نفیس خود چودھری کے ہونٹوں سے لگانے کے لیے اس کے پہلو میں پہنچ گئی۔ یہ دن تو ون ملاقات تھی جس میں ملازموں اور کنیزوں سمیت کسی کو بھی بلا اجازت اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔

''غیرت کے معاملے میں ہم لوگ بہت نازک مزاج ہوتے ہیں اس لیے آئندہ ایسی کوئی بات کرنے سے پہلے سوچ لینا۔ ہماری غیرت پر حملہ کرنے والے کو جلد یا بدیر اس کا خمیازہ بھگتنا ہی پڑتا ہے۔ میرے جو دشمن ابھی میری پہنچ سے دور ہیں، وہ ہمیشہ دور نہیں رہیں گے۔ میں جلد ان کی شہ رگ تک پہنچ جاؤں گا۔ رہا تمہارے تحفظ کا معاملہ تو بے فکر رہو۔ یہاں کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔'' چودھری کو اس کی قربت نے کافی حد تک پگھلا دیا تھا۔ اس کے ہاتھ سے دو گھونٹ بھرنے کے بعد وہ بولا تو اس کا لہجہ کافی حد تک سنبھلا ہوا تھا لیکن لفظوں کی سختی برقرار تھی۔

''سوری ڈارلنگ! میں آئندہ خیال رکھوں گی۔ اب تو اپنا موڈ ٹھیک کر لو۔'' لنڈا کو کوئی ضرورت نہیں تھی کہ وہ چودھری کی دھمکیوں میں آتی لیکن مصلحتاً اس نے پسپائی اختیار کر لی۔ ویسے بھی اس کا مقصد تو صرف چودھری پر اس کی پوزیشن واضح کرنا تھا، سو وہ کام ہو چکا تھا۔ اوپر سے چودھری کتنا ہی غصہ دکھا لیتا، حقیقت تو بہرحال نہیں بدل سکتی تھی۔

''او کے، اب تم ایسا کرو کہ تھوڑی دیر آرام کر لو۔ پھر ہم لنچ پر دوبارہ ملتے ہیں۔'' اس کے بالکل اپنے پہلو میں بیٹھے ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چودھری نے اس کا ایک بوسہ لیا اور بولا۔

''آرام تو میں لنچ کے بعد بھی کر لوں گی۔ پہلے یہ بتائیں کہ کام کی کیا پوزیشن ہے؟ ہم بہت زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔ ہمیں جلد از جلد نتائج درکار ہیں۔'' وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والی عورت تھی، پل میں چودھری کو اس کے رومینٹک موڈ سے نکال کر کام کی بات پر لے آئی۔

''کام شروع ہو چکا ہے۔ میں نے اپنے بندے مہیا کر دیے ہیں۔ فاریسٹ آفیسر عابد انصاری بھی تم لوگوں کے دعوے کے مطابق تعاون کر رہا ہے بلکہ سارا کام اصل میں اس کے مشوروں کے مطابق ہی ہو رہا ہے۔ یقیناً اسے بھی تم لوگوں نے بڑی قیمت ادا کی ہو گی۔'' رپورٹ دیتے دیتے آخر میں چودھری نے خیال آرائی کی۔

''اسے تعاون کرنا ہی تھا۔ اسی تعاون کے لیے تو اس کا یہاں ٹرانسفر کروایا گیا ہے۔'' لنڈا نے بے نیازی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے، وہ شروع ہی سے تمہارا آدمی ہے؟'' چودھری چونکا۔

''یقیناً۔ وہ ہمارا ہی آدمی ہے... آپ کے لیے مشورہ ہے کہ اسے اپنے پچھلے دھندوں کے لیے اکسانے کی کوشش

مت کیجیے گا۔ وہ پچھلے فاریسٹ آفیسر اقبال باجوہ کی طرح آپ کا ساتھ ہرگز نہیں دے گا کیونکہ اسے ہماری طرف سے اجازت نہیں ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جنگل کا سارا انتظام ظاہری طور پر اتنے شفاف طریقے سے چلتا رہے کہ انتظامیہ مکمل طور پر بے فکر ہو جائے۔ اگر کھالوں اور درختوں کی چوری چکاری کا سلسلہ جاری رہا تو ہمارے پروجیکٹ کو نقصان پہنچ سکتا ہے اور ایسا ہم ہرگز نہیں چاہتے۔ اے سی شہریار کو عابد انصاری کافی حد تک مطمئن کر چکا ہے۔ اگر آپ ہماری طرف سے ملنے والے معاوضے پر... جو بہرحال بہت زیادہ ہے، اکتفا کریں تو آگے بھی حالات ہمارے لیے سازگار رہیں گے۔" لنڈا کا یہ تنبیہہ کرتا ہوا انداز ظاہر کر رہا تھا کہ بہرحال باس وہی ہے اور چودھری حسبِ روایت اس معاملے میں اپنی من مانی نہیں کر سکتا۔ چودھری نے کوشش تو کی تھی کہ عابد انصاری کے ساتھ بھی اقبال باجوہ کی طرح معاملات طے کر سکے لیکن عابد انصاری اس کے ہاتھ نہیں آیا تھا اور اس کی وجہ یقینی طور پر یہی تھی کہ وہ اپنے غیر ملکی آقاؤں کا مکمل وفادار تھا۔

"مجھے تمہارا مطالبہ قبول کرنے میں کوئی اعتراض نہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ بدلے میں رقم کی فراہمی کے سوا بھی تم لوگ میرے ساتھ تعاون کرو۔ ماہ بانو کے لیے تم لوگوں نے وعدہ کیا تھا چنانچہ وہ مجھے ملنی ہی چاہیے۔ اس کے علاوہ مجھے اپنی بھاگی بیٹی اور اس کو ورغلانے والے ماسٹر کا پتا بھی چاہیے۔ میرا یہ کام ہو گیا تو میں سکون سے تم لوگوں کا ساتھ دے سکوں گا ورنہ میری یہ الجھنیں تمہارے لیے بھی مشکل کا باعث بنیں گی۔" چودھری اپنے ان مطالبات کے بارے میں پہلے ہی سوچ کر بیٹھا ہوا تھا چنانچہ موقع ملتے ہی فوراً ہی اپنے مطلب کی بات کہہ ڈالی۔

"ماہ بانو کے معاملے میں ہم آپ سے صرف معذرت ہی کر سکتے ہیں۔ وہ لڑکی اب اس دنیا میں نہیں رہی ہے اس لیے اس کا آپ تک پہنچنا بھی ممکن نہیں۔ اپنے وعدے کو پورا نہ کرنے کی تلافی کے طور پر ہم صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ آپ کے معاوضے میں مزید کچھ اضافہ کر دیں۔ رہا آپ کی بیٹی کی تلاش کا سوال تو میں دیکھوں گی کہ اس سلسلے میں آپ سے کتنا تعاون کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال، یہ ہمارے کیلیبر کا کام نہیں ہے کہ ہم گھر سے بھاگی ہوئی لڑکیوں کو تلاش کر کے ان کے ماں باپ تک پہنچائیں۔ آپ سے خصوصی تعلقات کا خیال کرتے ہوئے کچھ نہ کچھ بہرحال کر ہی دیا جائے گا۔" وہ جو تھوڑی دیر پہلے اس کے غصے میں آ جانے پر اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے اس کے پہلو میں آ بیٹھی تھی، ایک بار پھر اسی لب و لہجے پر اتر آئی لیکن اس بار چودھری کی ہمت نہیں ہو سکی کہ اپنے غصے کا اظہار کر سکے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ اس قبیل کی فرد نہیں جو اس کے غصے کو خاطر میں لائے۔ وہ تو اس کے ملک کے حکمرانوں پر بھی حکمرانی کرنے والوں میں سے تعلق رکھتی تھی چنانچہ وہ کتنا بھی زور آور سہی، اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ بہتری اسی میں تھی کہ غلام بن کر جو کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے، وہ حاصل کر لے اور غلامی کا سب سے سنہری اصول زباں بندی تھا... چنانچہ اس نے بھی اس بار زبان نہیں کھولی۔

"کسی ملازم سے کہیں کہ مجھے میرا کمرا دکھا دیں۔ میں لنچ سے پہلے فریش ہونا چاہتی ہوں۔" اس کے پہلو سے اٹھتے ہوئے لنڈا نے فرمائش کی۔

"کیوں نہیں، میں ابھی کسی کو بلاتا ہوں۔" چودھری نے فوراً گھنٹی کے بٹن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"کل صبح تیاری رکھیے گا۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اس لیے میں جلد از جلد اب تک کے کام کا جائزہ لینا چاہتی ہوں۔" چودھری کی انگلی کے دباؤ سے باہر بجنے والی گھنٹی کے ردِعمل میں کوئی ملازم اندر داخل ہوتا، اس سے قبل لنڈا نے ایک اور حکم جاری کیا۔

"او کے! میں انتظامات کر لوں گا۔" چودھری نے اتنی فرماں برداری کا مظاہرہ کبھی اپنے باپ کے سامنے بھی نہیں کیا ہوگا جتنا لنڈا کے سامنے کر رہا تھا۔

"میڈم کو ان کے کمرے تک لے جاؤ۔" ملازم اندر آیا تو چودھری نے اسے حکم دیا۔ ملازم تابع داری کی تصویر بنا فوراً لنڈا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ اس کی راہنمائی میں چلتی ہوئی کمرے سے باہر جانے لگی۔

"بچ..." اس کے عقب میں چودھری نے زیرِ لب گالی دی۔ اب تک وہ لنڈا سے بہ زبان انگریزی ہی گفتگو کرتا رہا تھا، شاید اسی لیے گالی دینے کے لیے بھی اسی زبان کا انتخاب کیا تھا۔

☆☆☆

"ویلکم مائی ڈیئر فرینڈ! تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے، میں بتا نہیں سکتا۔ اگر تم نے مجھے منع نہ کیا ہوتا تو میں اپنے گھر والوں کو بھی تمہاری آمد کے بارے میں بتاتا اور وہ لوگ بھی تمہارے استقبال کے لیے اس وقت یہاں موجود ہوتے۔" وہ جیسے ہی ارائیول لاؤنج میں پہنچا، وہاں منتظر کھڑے اس کے دیرینہ دوست زبیر نے اسے گرم جوشی سے گلے لگاتے ہوئے خوشی کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ

ہلکا سا شکوہ بھی کیا۔ چند سال قبل زبیر لاہور میں ہی رہائش پذیر تھا۔ اس نے اور شہریار نے ساتھ ہی گریجویشن کیا تھا۔ گریجویشن کے بعد زبیر نے ایم بی اے میں داخلہ لے لیا اور شہریار سول سروسز کی طرف چلا گیا لیکن ان دونوں کی دوستی بہرحال برقرار رہی تھی۔ وہ گاہے بگاہے ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے لیکن پھر زبیر کو ایم بی اے کے دوران ہی کراچی شفٹ ہونا پڑا۔ شفٹنگ کی وجہ اس کے تایا کو ہونے والا شدید ہارٹ اٹیک تھا۔ تایا کی اکلوتی بیٹی سے زبیر کا رشتہ طے تھا اور تایا چاہتے تھے کہ زبیر فوری طور پر ان کی بیٹی سے شادی کرے، ان کا کاروبار سنبھال لے۔ اس موقع پر زبیر کے والد نے بھی اپنے بڑے بھائی کا ساتھ دیا چنانچہ زبیر جو لاہور چھوڑتے ہوئے تھوڑا سا ہچکچا رہا تھا، بزرگوں کے اس فیصلے کو قبول کرنے پر مجبور ہو گیا۔

اس کا یہ فیصلہ اس حساب سے معقول ثابت ہوا کہ اس کے تایا شادی کے محض ایک ہفتے بعد ہی دنیا سے چل بسے اور وہ مرتے ہوئے تایا کی آخری خواہش پوری نہ کرنے کی خلش سے بچ گیا۔ بعد میں اس کے والد نے بھی آہستہ آہستہ اپنا کاروبار کراچی منتقل کر لیا اور وہ سب مل کر ایک جگہ رہنے لگے۔ اس طرح زبیر کو گھر داماد بننے کا جو تھوڑا بہت قلق تھا، وہ بھی دور ہو گیا اور وہ ایک مطمئن زندگی گزارنے لگا۔

شہریار سے اس کا ٹیلی فونک رابطہ رہتا تھا۔ کبھی کبھار لاہور جانے پر شہریار سمیت دیگر دوستوں کے ساتھ ملاقات بھی ہو جاتی تھی اور وہ محفل جما کر پچھلی یادوں کو تازہ کر لیا کرتے تھے لیکن طالب علمی کے دور سے نکل کر عملی میدان میں آنے کے بعد سے یہ سلسلہ ذرا موقوف ہو گیا تھا چنانچہ جب شہریار نے زبیر کو یہ اطلاع دی کہ وہ کراچی آ رہا ہے تو زبیر کھل اٹھا... لیکن اس کی طرف سے لگائی گئی اس قدغن کی وجہ نہیں سمجھ سکا کہ وہ اپنے گھر والوں کو اس کی کراچی آمد کے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا۔ اس وقت بھی اس نے اسی حوالے سے شہریار سے شکوہ کیا تھا۔

"ناراض مت ہو یار! تم جانتے ہو کہ مجھے خود بھی تمہارے گھر والوں سے مل کر ہمیشہ بہت خوشی محسوس ہوتی ہے لیکن اس وقت میں کچھ ایسی نوعیت کے کام سے یہاں آیا ہوں کہ اپنی آمد سے متعلق کم سے کم لوگوں کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنے پی اے تک کو نہیں بتایا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ اسے بھی یہی علم ہے کہ میں لاہور اپنے گھر والوں سے ملنے گیا ہوا ہوں اور ان کے ساتھ چند دن گزار کر واپس آ جاؤں گا۔" اس نے زبیر کے شانے پر ہاتھ رکھ کر چلتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ اس کا چھوٹا سا سفری بیگ جس میں ضرورت کی بس چند بہت ہی اہم اشیا موجود تھیں... زبیر نے اس سے لے کر پہلے ہی اپنے شانے سے لٹکا لیا تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم کسی بہت ہی خفیہ کام سے یہاں آئے ہو... لیکن یار! تم کوئی انٹیلی جنس کے بندے تو نہیں ہو کہ تمہیں اس نوعیت کے کام کرنے پڑیں۔" اس کی معذرت کو قبول کرتے ہوئے زبیر نے نکتۂ اعتراض اٹھایا۔

"میں محکمہ جاتی کام سے آیا بھی نہیں ہوں۔ یہ ذرا نجی نوعیت کا کام ہے لیکن ہے بہرحال ملکی مفاد میں۔ مجھے یہاں رہ کر کچھ ملک دشمن عناصر کے خلاف کارروائی کرنی ہے لیکن اس طرح... کہ کسی کو علم نہ ہو سکے۔ تم پر مجھے بہت اعتماد ہے اس لیے میں نے تمہیں اتنی تفصیل بتا دی ہے۔ اس سے زیادہ مزید تمہیں کچھ نہیں بتا سکوں گا اور تم پوچھنا بھی مت۔" زبیر کی تسلی کے لیے اسے تھوڑا سا بریف کرنے کے ساتھ ہی اس نے آخر میں اسے تاکید کی۔

"جیسے تمہاری مرضی۔ ویسے میں تمہیں یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ جو بھی کرو، بہت سوچ سمجھ کر کرنا۔ تمہاری ایڈونچرز فطرت سے میں اچھی طرح واقف ہوں لیکن اب طالب علمی کا دور نہیں رہا ہے کہ تم بلا سوچے سمجھے جذبات میں کسی بھی معاملے میں انوالو ہو جاؤ۔ تم ایک حساس نوعیت کی پوسٹ پر کام کر رہے ہو اور تمہاری کوئی بھی غلطی تمہارے کیریئر اور خاندان کی عزت کے لیے مسئلہ بن سکتی ہے۔" اب وہ لوگ پارکنگ میں کھڑی زبیر کی گاڑی تک پہنچ چکے تھے۔ گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے ایک اچھے اور مخلص دوست کی طرح شہریار کو مشورہ دینا ضروری سمجھا۔

"تم مجھے جانتے ہو کہ میں غلط کام نہیں کرتا۔ ہاں، غلط کام کرنے والوں کو روکنے کی کوشش ضرور کرتا ہوں اس لیے بالفرض اگر کوئی ایشو کھڑا بھی ہوا تو اس سے صرف میرے کیریئر کو نقصان پہنچے گا۔ خاندان کی عزت کو بہرحال کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔" شہریار نے اپنے مخصوص نپے تلے لہجے میں اسے جواب دیا۔

"چل بھائی، اتنا تو مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تو سب کچھ ٹھان کر آیا ہے۔ اب مجھے بتا دو کہ میرے لیے کیا حکم ہے۔ گھر والوں سے تم اپنی آمد کو خفیہ رکھنا چاہتے ہو اس لیے میرے ساتھ یقیناً گھر تو چلنا پسند نہیں کرو گے۔ تمہارے کام کی نوعیت کے اعتبار سے کون سی جگہ تمہارے لیے مناسب رہے گی، یہ تم خود بتا دو تاکہ میں اسی حساب سے بندوبست کر دوں؟" گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے زبیر نے اس سے

دریافت کیا۔

''کوئی بھی ایسی جگہ ہونی چاہیے جہاں میرا زیادہ لوگوں سے واسطہ نہ پڑے اور میری سرگرمیاں کسی کے علم میں نہ آسکیں۔'' شہریار نے اسے اپنی ڈیمانڈ سے آگاہ کیا۔

''میرے پاس اس طرح کی دو جگہیں ہیں۔ ایک تو کلفٹن کے علاقے میں ایک اپارٹمنٹ ہے۔ جس پروجیکٹ میں میں نے اپنا یہ اپارٹمنٹ لیا ہے وہ ابھی پوری طرح مکمل نہیں ہوا اس لیے چند ایک کے سوا ابھی زیادہ تر اپارٹمنٹس خالی پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے بھی فی الحال کسی کرائے دار کو نہیں رکھا ہے کہ خواہ مخواہ کا جھنجٹ ہوگا۔ دوسرا میرا ایک بنگلا ہے جسے ہفتے بھر پہلے ہی کرائے دار خالی کرکے گئے ہیں اور فی الحال وہاں صرف ایک چوکیدار کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔ اب تم دونوں میں سے جس جگہ رہنا پسند کرو، میں تمہیں وہاں لے چلتا ہوں۔'' زبیر نے اسے تفصیلات بتاتے ہوئے اس کی پسند پوچھی۔

''تمہارا اپارٹمنٹ جس بلڈنگ میں ہے، چوکیدار تو وہاں بھی ہوگا؟'' شہریار نے کوئی بھی فیصلہ سنانے سے پہلے ضروری معلومات حاصل کرنا مناسب سمجھا۔

''وہاں تو بہ یک وقت چار چار چوکیدار ہوتے ہیں۔ دو بلڈنگ کے اگلے گیٹ پر ڈیوٹی دیتے ہیں اور دو پچھلے گیٹ پر تاکہ اگر ایک کو کسی ضرورت کے تحت گیٹ چھوڑنا بھی پڑے تو دوسرا وہاں موجود رہے۔ سیکیورٹی کا بہت اچھا انتظام ہے وہاں۔'' زبیر نے اسے بتایا۔

''اس صورت میں وہاں کسی کی آمدورفت کا چھپا رہنا ممکن نہیں۔ میرے لیے تمہارا بنگلا مناسب رہے گا۔ تم ایسا کرو کہ وہاں موجود چوکیدار کو ایک ہفتے کی چھٹی دے دو۔'' شہریار نے اپنا فیصلہ سنایا۔

''لیکن کسی ملازم کے نہ ہونے کی صورت میں تمہیں پریشانی ہوگی۔ خالی بنگلے میں کون تمہارے کھانے پینے اور دیگر ضروریات کا خیال رکھے گا۔'' زبیر ذرا پریشان ہوا۔

''لیو اٹ یار! میں یہاں کسی تفریحی دورے پر نہیں آیا ہوں کہ ہر طرح کی سہولیات کے ساتھ رہنا ضروری سمجھوں۔ اس وقت میری سب سے اہم ضرورت پرائیویسی ہے اور اس حساب سے تمہارا بنگلا بہت مناسب ہے۔''

''اوکے! پھر میں چوکیدار کو ابھی فون کرکے کہہ دیتا ہوں کہ وہ آدھے گھنٹے میں چھٹی پر جانے کی تیاری کرلے۔ اس دوران ہم دونوں کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں لنچ کر لیتے ہیں۔'' اپنی دوستی کا ثبوت دینے کے لیے زبیر اس سے ہر طرح کا تعاون کرنے کے لیے تیار تھا۔ اس بار شہریار نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس کی رضامندی کو محسوس کرتے ہوئے زبیر نے پہلے چوکیدار کو فون کرکے احکامات جاری کیے پھر گاڑی کا رخ ایک ریسٹورنٹ کی طرف کرلیا۔ ریسٹورنٹ کی پُرسکون فضا میں مزے دار سے لنچ کا لطف اٹھاتے دونوں دوست ماضی کی خوش گوار یادوں کو دہراتے رہے۔ ان باتوں کے دوران ایک گھنٹا کیسے گزر گیا، معلوم بھی نہیں ہوا۔ وہ دونوں ریسٹورنٹ سے نکل کر زبیر کے خالی بنگلے تک پہنچے تو پندرہ منٹ مزید لگ گئے۔

''میں اپنی یہ گاڑی یہیں چھوڑ دیتا ہوں۔ تمہیں آنے جانے میں سہولت رہے گی۔ میں ٹیکسی کرکے واپس چلا جاؤں گا پھر شام میں کسی وقت چکر لگاؤں گا تاکہ تمہارے کھانے پینے کے لیے کچھ لاسکوں۔'' اس کو بنگلے پر پہنچا کر رخصت ہونے سے قبل زبیر نے گاڑی کی چابی اسے تھماتے ہوئے کہا۔ وہ کافی سنجیدہ تھا اور اب اس کے انداز میں وہ جوش و خروش نظر نہیں آرہا تھا جس کا اس نے ائرپورٹ پر شہریار کو دیکھنے کے بعد مظاہرہ کیا تھا۔

''میرے خیال میں تم یہ زحمت نہ کرو۔ میں شاید ہی شام کو تم سے مل پاؤں گا بلکہ کسی بھی وقت کے لیے میں کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ جب میں فارغ ہوں تو خود تمہیں فون کرکے انفارم کردوں۔ میرے کھانے پینے کے سلسلے میں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود ہی کچھ نہ کچھ ارینج کرلوں گا۔ میری سب سے بڑی ضرورت ایک محفوظ رہائش گاہ تھی اور وہ تم مجھے فراہم کرچکے ہو۔''

''اوکے... ایز یو وش۔'' اس بار زبیر نے ذرا بھی بحث نہیں کی اور اس سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''بُرا مت ماننا یار! میں تمہیں نظرانداز نہیں کررہا ہوں، بس کام کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ میں خود مجبور ہوں۔'' شہریار نے اس کے ہاتھ کو ذرا زور سے دباتے ہوئے اس کی دل جوئی کے لیے وضاحت کی۔

''پاگل ہوگئے ہو جو اس طرح کی بات کررہے ہو۔ میں کوئی چھوٹا بچہ ہوں جو ذرا سی بات کا بُرا مان جاؤں گا۔ میں تمہاری فطرت کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں اس لیے تمہارے متعلق کچھ غلط سلط سوچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مجھے اندازہ ہے کہ تمہارے اس رویّے کے پیچھے کوئی بہت ہی خاص وجہ ہوگی اس لیے کسی قسم کی بدگمانی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں، تھوڑی سی مایوسی ضرور ہوئی ہے کہ تم یہاں کراچی میں رہو گے اور پھر بھی ہماری محفلیں نہیں جم سکیں گی... لیکن کوئی بات نہیں۔ وہ کہتے ہیں ناکہ یار زندہ صحبت باقی! تو ہم پھر دوبارہ کسی اچھے ماحول میں فراغت سے ملیں گے۔ تم بے فکری سے یہاں رہ کر اپنا کام کرو اور اگر کسی بھی طرح کی کوئی ضرورت پیش آئے تو مجھے بتا دینا۔ مجھے تمہارے کام آکر خوشی ہوگی۔'' زبیر نے اسے ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔

''تھینک یو دوست! تم نے میرے دل سے بوجھ اتار دیا ورنہ میں تمہاری دل آزاری کا سوچ کر بہت گھبرا رہا تھا۔'' شہریار بے ساختہ ہی اس سے بغل گیر ہوگیا۔ اس کا یہ بے تکلف اظہارِ محبت بس چند لوگوں تک ہی محدود تھا ورنہ جس ماحول میں اس کی تربیت ہوئی تھی، اس کے مطابق وہ زیادہ تر اپنے خول میں ہی بند رہتا تھا۔ شاید اسی تربیت کا اثر تھا کہ وہ محبت کے مسلسل اپنے دل پر دستک دینے کے باوجود ابھی تک انجان بنا بیٹھا تھا اور مستقل اس دستک کو نظرانداز کررہا تھا۔

''ٹھیک ہے تو پھر اب میں چلتا ہوں۔'' دوستوں کے درمیان وہ جذباتی سا لمحہ گزر گیا تو زبیر نے اس سے اجازت لی اور ہاتھ ہلاتا ہوا بنگلے کے گیٹ سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد شہریار نے بھی اس کمرے کا رخ کیا جس کے بارے میں زبیر نے نشاندہی کی تھی کہ وہ اسے اپنے بیڈروم کے طور پر استعمال کرسکتا ہے۔ بنگلا چونکہ مکمل فرنشڈ حالت میں کرائے پر دیا جاتا تھا اس لیے وہاں تمام سہولیات موجود تھیں۔ شہریار نے اپنے سفری بیگ سے لباس نکالتے ہوئے فریش ہونے کے خیال سے واش روم کا رخ کیا۔ ساتھ ہی اس کا ذہن اپنا آئندہ کا لائحہ عمل بھی طے کررہا تھا۔ اس لائحہ عمل کو سوچتے ہوئے اس کا ذہن بار بار کلفٹن کے اس گھر کا ایڈریس بھی دہرا رہا تھا جو ماہ بانو نے اس کے کہنے پر ایس ایم ایس کی شکل میں اسے بھیجا تھا۔

☆☆☆

''لو اب یہ دہی پھینٹ کر سالن میں شامل کردو اور پھر پتیلی پر ڈھکن ڈھانپ کر چولھے کی آنچ ہلکی کردو۔ سات آٹھ منٹ بعد تمہارا سالن بالکل تیار ہوگا۔ کھانا نکالتے وقت اوپر سے ڈش میں ہرا دھنیا چھڑک دینا۔ سالن کی خوشبو اور رونق دونوں بڑھ جائیں گی۔'' اس کے ہاتھ میں دہی کا پیالہ پکڑاتے ہوئے خالہ نے ہدایات جاری کیں۔ کشور نے خود ہی ان سے درخواست کی تھی کہ وہ اسے کھانا پکانا سکھا دیں۔ ڈھیروں ملازماؤں کے جھرمٹ میں رہتے اسے کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی کہ باورچی خانے کا رخ کرتی۔ ہر ٹائم کا کھانا پکا پکایا سامنے آجاتا اور کھا لیا جاتا لیکن اب اسے آفتاب کے ساتھ زندگی گزارنی تھی اور ظاہر ہے یہ زندگی حویلی جیسے شاہانہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ تو گزر نہیں سکتی تھی۔ پھر خود اس کا بھی دل چاہتا تھا کہ اپنے محبوب شوہر کو اپنے ہاتھ سے پکا کر کھلائے لیکن اس کی ککنگ محض چائے بنا لینے تک محدود تھی چنانچہ آج کل خالہ کی زیرِ نگرانی اس کی ٹریننگ جاری تھی۔ آفتاب بھی اب اپنا زیادہ وقت لکھنے لکھانے کو دے رہا تھا، اس لیے وہ اسے ڈسٹرب نہ کرنے کے خیال سے زیادہ تر وقت خالہ کے ساتھ ہی بتانے لگی تھی۔ برسوں سے تنہائی کا شکار خالہ اس کا ساتھ پاکر خوش تھیں۔ کشور کی صورت میں گویا انہیں بیٹی مل گئی تھی جس کے ساتھ ان کا وقت بھی اچھا گزر جاتا تھا اور وہ بیٹی کی تربیت کا شوق بھی پورا کرلیتی تھیں۔ کشور کو خود بھی یہ مہربان خاتون بہت پسند آئی تھیں چنانچہ دونوں کی ایک دوسرے کے ساتھ خوب گزر رہی تھی۔

''یہاں سے جانے کے بعد میں آپ کو بہت یاد کروں گی خالہ! آپ بہت پیاری خاتون ہیں۔ آپ سے مل کر دل چاہتا ہے کہ کاش آپ میری ماں ہوتیں۔'' کشور نے ان کی ہدایات پر عمل کیا اور باورچی خانے میں رکھے اسٹول پر بیٹھتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار کرنے لگی۔ شوق شوق میں وہ گھریلو کام کاج میں شامل تو ہوجاتی تھی لیکن ایک طرف عادت نہیں تھی اور دوسری طرف اس کی حالت بھی کچھ ایسی تھی کہ ذرا دیر میں ہی تھکن محسوس کرنے لگتی۔ اس وقت بھی اسے اپنا بی پی اچھا خاصا لو ہوتا محسوس ہورہا تھا اس لیے اسٹول پر بیٹھ گئی۔

''تم چاہو تو مجھے اپنی ماں سمجھ سکتی ہو لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ یہ یہاں سے جانے کا خیال تمہارے دل میں کیوں آیا؟ بابر نے تو کہا تھا کہ تم دونوں اب یہیں میرے پاس رہو گے۔'' وہ اس سے بازپرس کرتے ہوئے فریج سے سیب نکالنے لگیں۔

''ہم یہاں ہمیشہ تو نہیں رہ سکتے نا! آپ کی زندگی ہمارے رہنے سے ڈسٹرب ہوتی ہوگی۔ اگر آفتاب کی ٹانگ کا مسئلہ نہیں ہوتا تو ہم اب تک اپنی شفٹنگ کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ کرچکے ہوتے۔''

''تو یہ کہو کہ مجبوری میں یہاں رہ رہی ہو اور ابھی جو تھوڑی دیر پہلے اپنائیت کا اظہار ہورہا تھا وہ بس یونہی تھا۔'' وہ اس سے ناراض ہوچکی تھیں اور اس ناراضی کی کیفیت میں ہی دھلے ہوئے سیبوں کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر جوسر مشین میں ڈالتی جارہی تھیں۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے خالہ لیکن انسان کو بہت کچھ سوچنا ہی پڑتا ہے۔ آپ کی محبت اور خلوص پر تو خیر کوئی شک

نہیں لیکن بدر تو اس طرح اچانک ہمارے اپنے گھر میں آ کر بیٹھ جانے کو محسوس کرتا ہوگا۔ نوجوان نسل کہاں پسند کرتی ہے کہ کوئی ان کی پرائیویسی میں دخل انداز ہو... اور ہم نے تو ایک طرح سے آپ کے گھر پر قبضہ کرلیا ہے۔" کشور فوراً ہی انہیں وضاحت دینے لگی۔

"اس نالائق کا ذکر نہ کرو۔ اسے ماں کا خیال ہوتا تو پھر بات ہی کیا تھی۔ دیکھا نہیں ہے تم نے کہ کیسے رات گئے تک گھر سے غائب رہتا ہے۔ کبھی کبھی تو واپس ہی نہیں آتا۔ میں اکیلی بوڑھی عورت ہر وقت اس کی راہ تکتی رہتی ہوں۔ نہ اسے میرا خیال ہے، نہ اپنے مستقبل کی فکر۔ اب بھلا بتاؤ کہ جس شخص کو گھر میں رہنا ہی نہیں ہوتا، اسے کیا غرض کہ گھر میں کون رہتا ہے اور کون نہیں۔" خالہ کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں نظر آنے لگی تھیں لیکن انہوں نے اپنے ہاتھوں کی حرکت نہیں روکی تھی چنانچہ بات کے اختتام پر سیب کے جوس سے بھرا ہوا گلاس انہوں نے کشور کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ جب سے یہاں رہ رہی تھی، خالہ اسی طرح اس کا خیال رکھتی تھیں۔

"بدر ایسا کیوں ہے خالہ؟" اس نے ان سے سوال کیا۔ یہ سوال کرتے ہوئے اس کے ذہن میں وہ بدصورت منظر آ گیا تھا جب بدر نے اس سے بدتمیزی کرنے کی کوشش کی تھی۔

"یہ شروع سے ایسا نہیں ہے۔ پہلے تو اچھا خاصا پڑھنے لکھنے والا تھا لیکن قسمت کی خرابی کہ اس کے میٹرک کرتے ہی اس کے ابّا کا انتقال ہوگیا۔ ان کے جانے سے ہمیں مالی پریشانی تو کوئی نہیں ہوئی لیکن بدر کی نگرانی کرنے والا کوئی نہ رہا۔ اس کے ابّا اچھے عہدے پر تھے۔ اس کے علاوہ ان کی کئی دکانیں اور دو مکانات تھے جو انہوں نے کرائے پر اٹھا رکھے تھے۔ کرائے کی مد میں ہمیں ٹھیک ٹھاک رقم مل جاتی تھی۔ میری عدت کی مدت میں بدر ہی ان کرائے داروں سے لین دین کرنے لگا۔ کرائے داروں میں سے ایک شخص نے جس کے پاس ہماری چار دکانیں تھیں، بدر کو بھٹکانا شروع کر دیا۔ مجھے اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ کب بدر پڑھائی سے دھیان ہٹا کر الٹے سیدھے دھندوں میں دلچسپی لینے لگا۔ جب معلوم ہوا تو پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ یہاں اسلام آباد میں میرا کوئی قریبی عزیز بھی نہیں تھا جس سے میں مدد کے لیے درخواست کرتی۔ ویسے بھی مجھے شرم آتی تھی کہ اپنی اولاد کی خامیاں کسی کے سامنے بیان کروں۔ میں اپنے طور پر ہی اسے سدھارنے کی کوشش کرتی رہی لیکن بھلا اکیلی عورت دنیا کی چالبازیوں کا مقابلہ کیا کر پاتی۔ یوں میرا بچہ مکمل طور پر میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ دکانیں اس نے اونے پونے داموں بیچ ڈالیں بلکہ بیچ بھی کیا، اسی منحوس کرائے دار نے چالاکی سے اپنے نام لکھوا لیں۔ اب مکانوں کے کرائے اور تمہارے خالو کی پنشن سے گھر کا خرچ چلتا ہے۔ مالی پریشانی تو خیر اب بھی نہیں ہے لیکن اپنے اکلوتے بیٹے کی برباد زندگی دیکھ کر کڑھتی رہتی ہوں۔ مفاد پرستوں نے اپنا مفاد حاصل کرنے کے لیے اچھے بھلے لڑکے کو تباہ کر دیا۔ جانے کیا الٹے سیدھے دھندے کرتا پھرتا ہے، مجھے معلوم نہیں لیکن اس کی جیب میں نوٹ ہمیشہ دیکھے ہیں اور یہی بات مجھے ہولاتی ہے کہ تعلیم اور ہنر سے محروم شخص بھلا حلال روزی کہاں سے کما سکتا ہے۔" خالہ کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے تھے اور چہرے پر بے بسی کی انتہا پر پہنچے ہوئے دکھ کی پرچھائیاں تھیں۔ کشور اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قریب گئی اور ان کے دونوں شانے تھام کر تسلی دینے لگی۔

"صبر کریں خالہ! آپ کا یہ صبر ایک دن رنگ لائے گا اور انشاء اللہ بدر سدھر جائے گا۔" خالہ نے اس کی بات سن کر سر ہلایا اور خود ہی اپنے آنسو پونچھتی ہوئی ایک بار پھر کام میں مصروف ہوگئیں۔ ان کے تاثرات سے کشور نے اندازہ لگا لیا کہ وہ بدر کی طرف سے مکمل مایوسی کا شکار ہیں اور اب انہوں نے اس قسم کی تسلیوں سے بہلنا چھوڑ دیا ہے۔ وہ دکھی دل کے ساتھ پیچھے ہٹ گئی۔ اسی وقت اس کی نظر کچن کے دروازے پر پڑی۔ وہاں بدر کھڑا ہوا تھا اور اس کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ اس نے یہاں ہونے والی گفتگو سن لی ہے۔ کشور جھینپ سی گئی۔

"ناشتا..." وہ بہت خراب موڈ کے ساتھ یہ ایک لفظی حکم سنا کر واپس پلٹ گیا۔ خالہ نے بھی بیٹے کو دیکھ لیا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے لیے ناشتا تیار کرنے لگیں اور تیار کرنے کے بعد کام والی کے ہاتھوں ٹرے میں رکھ کر اوپر اس کے کمرے میں بھجوا دیا۔

"تم کیوں یہاں گرمی میں بیٹھی ہوئی ہو؟ اندر کمرے میں جا کر بیٹھو۔ میں بھی کھانے کے لیے یہ دو چار روٹیاں ڈال لوں تو پھر وہیں آتی ہوں۔" سالن تو تیار ہو ہی چکا تھا۔ انہوں نے چاول دم پر رکھنے کے بعد چولھے پر توا رکھا اور کشور کو ٹوکتے ہوئے بولیں تو وہ جو واقعی گرمی محسوس کر رہی تھی، خاموشی سے وہاں سے اٹھ گئی۔ البتہ دل ہی دل میں خالہ کے اسٹیمنا کو داد ضرور دے رہی تھی۔ اس عمر میں بھی وہ بڑی پھرتی سے کام کرتی تھیں اور ان کے ہاتھ میں ذائقہ بھی خوب تھا۔

اندر کمرے میں پہنچ کر اس نے ٹی وی کھول لیا اور مختلف چینلز لگا لگا کر دیکھنے لگی لیکن کہیں پر بھی اس کا دل نہیں لگا۔ خالہ کا دکھ مسلسل اس کے ذہن کو ڈسٹرب کر رہا تھا۔ بالآخر اس نے ٹی وی بند کر کے ریموٹ ایک طرف رکھا اور کچھ وقت آفتاب کے ساتھ گزارنے کے خیال سے اوپر کا رخ کیا۔ ابھی اس نے آخری سیڑھی طے ہی کی تھی کہ بدر اپنے کمرے سے باہر نکلتا نظر آیا۔ کشور نے کوشش کی کہ اس سے کنی کترا کر گزر جائے لیکن وہ لپک کر اس کے قریب آ گیا اور اس کا راستہ روک لیا۔

"میرا راستہ چھوڑو۔" کشور نے دھیمی آواز میں غصے کا اظہار کیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی آواز آفتاب تک پہنچے اور یہاں کوئی بدمزگی پیدا ہو۔

"کیوں؟ ویسے تو مجھ میں بڑی دلچسپی ہے کہ میری ماں سے میرا پورا تفصیلی تعارف حاصل کیا جا رہا تھا اور خود مجھ سے بات کرنا بھی گوارا نہیں۔ کبھی مجھ سے اکیلے میں ملو تو تمہیں اپنے بارے میں صحیح سے بتاؤں۔ بے چاری اماں کو معلوم ہی کیا ہے جو تمہیں بتا سکیں۔" وہ بے باکی سے اسے گھورتے ہوئے بولا۔ کشور کے غصے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

"مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے تمہارے بارے میں کچھ جاننے کی۔ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ ورنہ میں شور مچا دوں گی۔" کشور نے پہلے سے زیادہ غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا لیکن اس کی آواز اب بھی دھیمی ہی تھی۔

"شور مچانے سے کیا ہوگا؟ تمہارا وہ لنگڑا تو آ کر میرا کچھ بگاڑنے سے رہا۔ ویسے تم ہو عجیب بدذوق لڑکی... گھر سے بھاگنے کے لیے تمہیں یہی لنگڑا ملا تھا؟ اور انہیں دیکھو، ہمارے کزن بابر رضا کو۔ ہمارے گھر کو کوئی دارالامان سمجھ کر تم لوگوں کو یہاں بھجوا دیا۔ شاید ہمارے صحافی کزن فی الحال کہیں اور مصروف ہیں، بعد میں تم لوگوں پر کوئی چٹ پٹی سی رپورٹ تیار کر کے اپنے چینل پر چلائیں گے۔" وہ صاف لفظوں میں مذاق اڑا رہا تھا۔ احساس توہین سے کشور کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

"ویسے داد دیتا ہوں میں لنگڑے کی قسمت کو۔ کیا چیز پائی ہے اس نے۔ میں نے تو جب سے تمہیں دیکھا ہے، تڑپ رہا ہوں۔ ایسا کرو، آج رات یہ تڑپ دور کر دو پھر میں تمہارے راستے سے ہٹ جاؤں گا۔ تم دونوں جب تک چاہتا یہاں رہنا، کوئی پابندی نہیں ہوگی... لیکن اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو میں خود تمہارے وارثوں کا اتا پتا ڈھونڈ کر انہیں تمہارے یہاں ہونے کی اطلاع دے دوں گا۔" وہ اپنی بدنیتی کا اظہار کرتے ہوئے اسے لالچ اور دھمکی دونوں دے رہا تھا۔ اس کی باتوں سے بہرحال اتنا ضرور واضح تھا کہ وہ کشور اور آفتاب کی اصلیت سے واقف نہیں ہے اور محض قیاس آرائی سے کام لے رہا ہے۔ اس کی اتنی گری ہوئی باتیں سن کر کشور کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ اس نے ایک جھٹکے سے اسے اپنے سامنے سے ہٹا کر آگے بڑھ جانے کی کوشش کی لیکن بدر نے پوری قوت سے اس کا ہاتھ تھام کر یہ کوشش ناکام بنا دی۔

"میرا ہاتھ چھوڑ دو ذلیل آدمی! پتا نہیں کیسے تم جیسا آوارہ و بدکردار شخص اس شریف گھرانے میں پیدا ہو گیا۔" کشور نے بلبلا کر اسے لعنت ملامت کی۔ جواباً وہ ہنسنے لگا لیکن پھر یک دم ہی اس کی ہنسی رک گئی اور اس نے کشور کا ہاتھ بھی چھوڑ دیا۔ کشور ایک پل کے لیے تو حیران ہوئی لیکن دوسرے ہی پل اسے وجہ سمجھ آ گئی۔ غصے میں بھری ہوئی خالہ اس کے عقب سے نکل کر سامنے آ گئیں اور انہوں نے بدر کے منہ پر لگاتار تین چار تھپڑ جڑ دیے۔

"نکل جاؤ اس گھر سے۔ آئندہ کبھی مجھے اپنی شکل مت دکھانا۔ تجھ جیسے آوارہ کی ماں کہلانے سے بہتر ہے کہ میں خود کو بے اولاد ہی تصور کرلوں۔" وہ غصے کی شدت سے بری طرح کانپ رہی تھیں۔ بدر نے کشور کو دھمکی آمیز نظروں سے گھورا اور دھپ دھپ کرتا سیڑھیاں اتر گیا۔

"مجھے معاف کر دو بچی! میرے بیٹے کی وجہ سے تمہیں جو تکلیف اٹھانی پڑی اس کے لیے میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ تم آرام سے یہاں رہو۔ اب میں اس ناخلف کو دوبارہ گھر میں گھسنے بھی نہیں دوں گی۔" اپنے بیٹے کے جانے کے بعد خالہ اس سے معذرت کرنے لگیں۔

"آپ اس طرح معافی مانگ کر مجھے شرمندہ نہ کریں خالہ! بدر کی بدتمیزی میں آپ کا تو کوئی قصور نہیں۔" کشور کی اپنی طبیعت کافی مکدر ہوگئی تھی لیکن اس نے ایک بوڑھی بے بس ماں کو تسلی دینا ضروری سمجھا۔ ساتھ ہی وہ اپنے کمرے کی طرف بھی دیکھتی جا رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ ہنوز بند تھا جس سے اسے اطمینان محسوس ہو رہا تھا کہ آفتاب کو یہاں ہونے والے ہنگامے کی بھنک نہیں پڑی۔

"میرا ہی قصور ہے۔ میں نے اس کے ابّا کے مرنے کے بعد بے پروائی نہ برتی ہوتی تو یہ اس حد تک نہ بگڑتا۔" اب وہ بہت ہی زیادہ آزردہ تھیں۔

"آپ اتنی ٹینشن نہ لیں ورنہ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔ چلیں، میں آپ کو آپ کے کمرے تک چھوڑ دوں۔ آپ تھوڑی دیر آرام کر لیں۔" کشور زبردستی انہیں

اپنے ساتھ نیچے لے گئی۔ نیچے جاتے ہوئے اس نے آخری سیڑھی پر رکھا اچار کا مرتبان دیکھ لیا تھا۔ یقیناً خالہ اس مرتبان کو دھوپ میں رکھنے کے لیے ہی اوپر آرہی تھیں جو انہوں نے بدر کو اس سے بدتمیزی کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑلیا۔

''دیکھو بیٹی! میں نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ بدر کو آئندہ اس گھر میں قدم نہیں رکھنے دوں گی اس لیے تم یہاں سے جانے کے بارے میں سوچنا بھی مت۔ اور ہاں، اپنے میاں کو بھی کچھ نہیں بتانا۔ اس نے باہر سے تذکرہ کردیا تو وہ کیا سوچے گا کہ خالہ کا بیٹا اتنا بگڑا ہوا ہے۔ میں نے برسوں سے خاندان میں اپنی جو عزت بنا کر رکھی ہوئی ہے، اس آخری عمر میں اس کا بھرم رہ جائے تو اچھا ہے۔'' خالہ کو ان کے بستر پر لٹانے کے بعد اس نے انہیں بلڈ پریشر کنٹرول کرنے والی گولی کھلائی اور پھر انہیں آرام کی تاکید کرتی ہوئی کمرے سے باہر نکلنے لگی تو انہوں نے بڑی لجاجت سے اس سے درخواست کی۔

ان کی درخواست پر یونہی سر ہلاتی ہوئی وہ باہر نکل گئی اور سست روی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اس کا دماغ بری طرح الجھ گیا تھا اور کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ خالہ کتنے ہی دعوے کرتیں، بہرحال یہ بدر کا اپنا گھر تھا اور اسے یہاں آنے سے روکا نہیں جاسکتا تھا۔ اگر روک بھی دیا جاتا تو وہ تو پہلے ہی دھمکی دے چکا تھا کہ کشور کے وارثوں تک اس کی خبر پہنچا دے گا۔ اب انتقام لینے کے لیے تو وہ ضروری اس دھمکی پر عمل کرتا۔ دوسری طرف اسے اندازہ نہیں تھا کہ اگر آفتاب کو سارے حالات بتائے جائیں تو وہ کچھ کرسکے گا یا نہیں۔ فوری طور پر اس گھر کو چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہونا کوئی آسان بات تو نہیں تھی، وہ بھی اس صورت میں کہ وہ لوگ کسی ہوٹل وغیرہ میں ٹھہرنے کا رسک نہیں لے سکتے تھے۔

اسی الجھن کے ساتھ اس نے سیڑھیاں طے کیں اور آخری سیڑھی پر رکھا اچار کا مرتبان اٹھا کر دھوپ میں رکھنے کے بعد اپنے کمرے میں چلی آئی۔ آفتاب رائٹنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور اس کا قلم پوری روانی سے چل رہا تھا۔ چند روز کے عرصے میں ہی کشور اندازہ لگا چکی تھی کہ وہ بہت مگن ہوکر لکھتا ہے اور لکھتے ہوئے اردگرد کے ماحول سے بے نیاز ہوجاتا ہے۔ شاید اسی لیے اسے کمرے سے باہر ہونے والے ہنگامے کا معلوم نہیں ہوسکا تھا۔ اس کی لاعلمی سے اطمینان محسوس کرتی ہوئی وہ بستر پر لیٹ گئی۔ جو کچھ ہوا تھا، اس نے اسے ذہنی وجسمانی طور پر نڈھال کردیا تھا اور وہ خود کو پُرسکون کرکے کوئی لائحہ عمل طے کرنا چاہتی تھی، چنانچہ تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔ ان بند آنکھوں سے وہ نہیں دیکھ سکتی تھی کہ آفتاب کا حرکت کرتا ہوا قلم رک گیا ہے اور اب وہ اس کی طرف رخ کیے بہت تشویش بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا ہے۔

☆☆☆

اس کے موبائل میں راحیلہ کا پتا محفوظ تھا۔ وہاں تک پہنچنے میں اسے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ماہ بانو نے اس بات کی پہلے ہی نشاندہی کردی تھی کہ اس مشکوک عورت کا بنگلا جہاں اس نے مہاگرو کو دیکھا تھا، راحیلہ کے گھر کے بائیں جانب ہے۔ شہریار نے بے حد ہلکی رفتار میں گاڑی اس بنگلے کے سامنے سے گزارتے ہوئے بنگلے کا جائزہ لیا۔ یہ ایک دومنزلہ عمارت تھی جس کی بیرونی دیواروں پر کافی کلر کا پینٹ کیا گیا تھا۔ بنگلے کی دیواریں خاصی اونچی تھیں اور ان دیواروں پر خاردار تار بھی بچھائے گئے تھے۔ باؤنڈری وال کے ساتھ ایسا کوئی درخت بھی نظر نہیں آرہا تھا جس کی مدد سے دیوار پر چڑھا جاسکتا۔ ایک طرح سے بنگلے کو محفوظ رکھنے کا ٹھیک ٹھاک انتظام کیا گیا تھا اور کسی شخص کے لیے وہاں نقب لگانا آسان نہیں تھا۔ شہریار کا چوری چھپے وہاں داخل ہونے کا ارادہ بھی نہیں تھا۔ وہ صرف باہر ہی سے اس بنگلے کو دیکھنا چاہتا تھا ورنہ اس کے ذہن میں کوئی اور ہی منصوبہ تھا۔ اس منصوبے کے تحت ہی اس نے اپنی گاڑی روکے بغیر آگے بڑھادی۔ جب وہ بنگلوں کی اس قطار کو پار کرکے واپس جانب اپنی گاڑی موڑ رہا تھا تو اس نے راحیلہ والے بنگلے کے باہر ایک ٹیکسی کو رکتے ہوئے دیکھا۔ اس ٹیکسی میں سے ایک لڑکا اور لڑکی باہر نکل کر گیٹ کی طرف بڑھے۔ شہریار نے اندازہ لگایا کہ وہ راحیلہ اور اس کے بھائی ڈاکٹر طارق ہوں گے جو کہیں سے واپس لوٹے تھے۔ اسے ان بہن بھائی سے کچھ لینا دینا نہیں تھا اس لیے ان کی طرف زیادہ توجہ دیے بغیر آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہ کسی خاص سمت میں گاڑی نہیں چلا رہا تھا بلکہ اس سارے علاقے میں یونہی اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ اس طرح وہ اس علاقے کے راستوں سے آشنا ہونے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کا کراچی بہت کم آنا جانا رہا تھا اس لیے وہ اس شہر سے بہت کم واقف تھا اور کسی مخصوص علاقے کے اندرونی راستوں سے واقف ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس وقت وہ اپنی اسی کمزوری کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے ذہن میں موجود منصوبے کے مطابق راستوں کا بہ غور جائزہ لے رہا تھا۔ آخرکار اس کی یہ جدوجہد رنگ لائی اور وہ ایک ایسا راستہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگیا جس کی اسے اپنے منصوبے کے مطابق تلاش تھی۔ اس راستے سے گزر کر وہ بائیں جانب موجود ایک تنگ اور ٹوٹی پھوٹی سڑک پر مڑتا تو اس راستے پر آجاتا جس سے اس کے اندازے کے مطابق راحیلہ کی لین میں رہنے والے ہر شخص کو اپنے علاقے سے نکل کر مین روڈ تک پہنچنے کے لیے لازماً گزرنا پڑتا۔

شہریار نے جو منصوبہ بنایا تھا، اس کے مطابق وہ راحیلہ کے پڑوس والے بنگلے کی نگرانی کرتا رہتا اور جب وہاں مقیم عورت اپنی گاڑی میں کہیں جاتی تو خود بھی اس کے تعاقب میں نکل پڑتا لیکن مسلسل اس کی گاڑی کے پیچھے اپنی گاڑی لگا کر رکھنے کے بجائے دوسرے راستے پر چل پڑتا۔ اس وقت اسے یہ دھیان رکھنا تھا کہ اس کی گاڑی کی رفتار اس عورت کی گاڑی کی رفتار سے زیادہ ہو تاکہ وہ بائیں جانب والی تنگ سڑک کو پار کرکے پہلے اس بڑی سڑک پر پہنچ جائے جہاں سے عورت کی گاڑی کو گزرنا تھا۔ وقت کی اس برتری کا فائدہ اٹھا کر وہ یک دم ہی اپنی گاڑی عورت کی گاڑی کے سامنے لاکر اسے رکنے پر مجبور کردیتا اور پھر اسلحے کے زور پر اسے اپنی گاڑی میں بیٹھنے پر مجبور کردیتا۔ مزاحمت کی صورت میں اس کے پاس عورت کو بے ہوش کرنے کا بھی انتظام تھا۔ یہاں سے وہ اس عورت کو زیر کے اس بنگلے میں لے جاتا جہاں وہ خود رہائش پذیر تھا۔ بنگلے میں اس نے اسی مقصد کے تحت کسی ملازم کو نہیں رہنے دیا تھا کہ تنہائی میں آرام سے اس عورت سے پوچھ گچھ کرسکے۔ اپنے اس منصوبے پر اسے پہلے ہی دن عمل کرنے کا موقع مل جائے گا، اس سلسلے میں وہ پُریقین نہیں تھا۔ ہوسکتا تھا کہ عورت آج ہی کہیں جانے کے لیے باہر نکلتی اور یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ دو تین دن تک کہیں بھی نہیں جاتی۔

شہریار دونوں طرح کی صورتِ حال کے لیے تیار تھا۔ اس نے اپنے حلیے میں بھی کافی تبدیلی کرلی تھی۔ چہرے پر موجود مصنوعی فرنچ کٹ داڑھی، مونچھیں اور بڑا سا مَسا اس کی شناخت چھپانے میں اہم کردار ادا کررہے تھے۔ ان چیزوں کے علاوہ اس نے آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ بھی لگا رکھا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس حلیے میں اس کے قریبی جاننے والے بھی فوری طور پر اسے شناخت نہیں کرسکیں گے۔ کراچی میں یوں بھی اس کے آشنا کم ہی تھے اور اس نے حلیے کی یہ تبدیلی کسی ناخوش گوار صورتِ حال سے بچنے کے لیے احتیاطاً کی تھی۔ اگر اسے ایک دن سے زیادہ بار عورت کے بنگلے کی نگرانی کرنی پڑتی تو وہ اسی حلیے میں کچھ چھوٹے موٹے ردوبدل کرسکتا تھا۔ یوں بھی اس کا فل ٹائم نگرانی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ عورت جس قسم کی تھی، اس کا اس نے ماہ بانو کی اشاروں کنایوں میں کی گئی گفتگو سے اندازہ کرلیا تھا اور اسے بہ خوبی معلوم تھا کہ اس قسم کی عورت کا دن کی روشنی میں کہیں باہر نکلنا مشکل ہی ہوتا ہے۔ وہ شام ڈھلے ہی بنگلے سے نکل کر کہیں جاتی ہوگی چنانچہ اس نے اسی حساب سے نگرانی کے وقت کا دورانیہ طے کیا تھا۔

اب بھی اس نے جب اپنا ابتدائی کام نمٹالیا تو گاڑی کو واپس موڑا اور اس بنگلے کے قریب ایسی پوزیشن میں گاڑی لے جاکر روک لی جہاں کسی کی اس کی طرف توجہ نہ جائے لیکن وہ خود بنگلے کو نظر میں رکھ سکے۔

اس علاقے میں کیونکہ زیادہ تر امرا رہائش پذیر تھے اس لیے اردگرد بڑا روایتی سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ متوسط طبقے کی گلیوں کی طرح ٹھیلے اور خوانچوں والوں کے تو یہاں سے گزرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے سوا بھی کوئی ذی نفس نظر نہیں آرہا تھا۔ شہریار کے سامنے بس ایک بنگلے کا گیٹ کھلا تھا اور اس میں سے ایک گاڑی نکل کر تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔ اس بنگلے کے چوکیدار نے اس پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر گیٹ دوبارہ بند کرلیا تھا۔ شہریار نے اپنی گاڑی کھڑی کرنے کے لیے جو جگہ منتخب کی تھی، وہ ایک خالی پلاٹ کے سامنے کا ایریا تھا۔ اگر وہ کسی بنگلے کے سامنے گاڑی کھڑی کرتا تو یقیناً وہاں کا چوکیدار اس سے باز پرس کرنے کی کوشش کرتا لیکن فی الحال اسے اب تک کسی نے کچھ نہیں کہا تھا۔

وہ اپنی گاڑی کا بونٹ اٹھائے وقتاً فوقتاً انجن سے اس طرح چھیڑ چھاڑ کررہا تھا جیسے گاڑی میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی ہو اور وہ اسے صحیح کرنے کی کوشش کررہا ہو۔ اپنی اس اداکاری کے دوران وہ گاہے بگاہے اپنے مطلوبہ بنگلے پر بھی نظر ڈال لیتا تھا۔ اس عمل کے دوران میں اس کی راحیلہ کے بنگلے پر بھی اچٹتی سی نظر پڑ جاتی تھی۔ ایک بار جو اس کی نظر وہاں پڑی تو اس نے بنگلے کے ٹیرس پر اسی لڑکے اور لڑکی کو کھڑا پایا جنہیں یہاں سے پہلی بار گزرتے ہوئے ٹیکسی سے اترتا دیکھ چکا تھا اور قیاس کیا تھا کہ وہ راحیلہ اور اس کا بھائی ڈاکٹر طارق ہیں لیکن اس بار جو اس کی ان دونوں پر نظر پڑی تو اسے یوں محسوس ہوا کہ اس کا اندازہ شاید کچھ غلط تھا۔ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر کھڑے تھے اور ایک دوسرے کو جن مخمور نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، وہ بہن بھائی کے رشتے کے منافی تھیں۔ اس موقع پر شہریار نے ایک بات اور نوٹ کی کہ ان دونوں کے درمیان ذرا بھی مشابہت نہیں

ہے۔ یہ کوئی ضروری تو نہیں کہ بہن بھائی ایک دوسرے سے مشابہ ہوں لیکن عموماً خونی رشتوں سے جڑے افراد میں ایک دوسرے کی جھلک نظر آ ہی جاتی ہے۔ پھر اسے تو ماہ بانو نے بتایا تھا کہ راحیلہ اور اس کا بھائی شکل وصورت اور خیالات میں ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہیں اور اس ہم آہنگی نے انہیں ایک دوسرے سے اتنا قریب کر دیا ہے کہ وہ ماں باپ کے مقابلے میں ایک دوسرے کے ساتھ رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

ٹیرس پر لڑکی کے ساتھ کھڑا لڑکا اسمارٹ تھا لیکن لڑکی اس کے مقابلے میں بہت ہی زیادہ حسین تھی۔ اس کا گلابی رنگت اور سنہری بال اسے لڑکے سے بہت مختلف ظاہر کر رہے تھے۔ پھر ایک اور بات جو اس نے نوٹ کی وہ لڑکی کی عمر تھی۔ وہ خوب صورت ہونے کے باوجود اتنی کم عمر نہیں نظر آ رہی تھی کہ اسے ماہ بانو کا ہم عمر تصور کیا جا سکتا اور راحیلہ کو اس کی ہم جماعت ہونے کی وجہ سے لگ بھگ اسی کی ہم عمر ہونا چاہیے تھا۔ اس کا ذہن الجھ سا گیا لیکن فی الحال وہ راحیلہ یا اس کے بھائی پر تحقیق کرنے یہاں نہیں آیا تھا اس لیے اپنی توجہ اس جوڑے کی طرف سے ہٹالی اور ایک بار پھر انجن پر جھک گیا۔

”کیا بات ہے سر جی! آپ بہت دیر سے یہاں کھڑے ہیں۔ گاڑی میں کوئی بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے؟“ ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ اس نے اپنے عقب میں آواز سنی اور سر گھما کر پوچھنے والے کو دیکھا۔ یہ اس بنگلے کا چوکیدار تھا جس سے کچھ دیر قبل اس نے ایک گاڑی کو نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ چوکیدار اس کی مسلسل یہاں موجودگی سے شاید کچھ مشکوک ہو کر پوچھ گچھ کرنے چلا آیا تھا لیکن اس کا انداز بہرحال مہذبانہ تھا۔ یقیناً شہریار کی قیمتی گاڑی اور نفیس حلیے نے اسے اس احتیاط پسندی پر مجبور کیا ہوگا۔

”گڑبڑ تو اچھی خاصی ہے لیکن میں ٹھیک کر لوں گا۔“ اس نے سپاٹ سے لہجے میں چوکیدار کو جواب دیا۔ وہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کر کے وہ اسے اپنے ساتھ بے تکلف ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

”آپ کو جانا کہاں ہے؟“ چوکیدار نے اس کے لہجے کا اثر لیے بغیر اگلا سوال کیا۔

”خیابانِ شمشیر میں بیرسٹر اظہار الحسن کے بنگلے تک... لیکن تم اتنی انکوائری کیوں کر رہے ہو؟“ اس نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔ بیرسٹر اظہار کا نام وہ اس طرف آتے ہوئے ایک بنگلے کی نیم پلیٹ پر دیکھ کر آیا تھا اور اس کے ذہن میں رہ گیا تھا اور چوکیدار پر اپنی حیثیت جتانے کے لیے اس وقت اس کا استعمال کر ڈالا۔

”آپ کو خیابانِ شمشیر جانا تھا تو اس طرف کہاں نکل آئے؟ وہ تو یہاں سے کافی آگے ہے۔“ چوکیدار نے اعتراض کیا۔

”میں اس شہر کا رہنے والا نہیں ہوں اس لیے راستوں کا صحیح سے اندازہ نہیں ہے۔ مجھے بیرسٹر صاحب نے فون پر راستہ سمجھایا تھا لیکن شاید مجھ سے سمجھنے میں کچھ غلطی ہوئی اور میں بھٹک کر اس طرف آ نکلا۔ اوپر سے یہ گاڑی بھی خراب ہو گئی اور تم بجائے یہ کہ مجھے سکون سے گاڑی ٹھیک کرنے دو، سوالات پر سوالات کیے جا رہے ہو۔“ وہ چوکیدار کو مطمئن کرنے کے لیے اس کے ہر سوال کا جواب ضرور دے رہا تھا لیکن لہجے میں جھنجلاہٹ بھی عیاں تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ ہم جاتا ہے، آپ آرام سے اپنا گاڑی ٹھیک کرو۔“ اس کا موڈ دیکھتے ہوئے چوکیدار واپس جانے لگا لیکن پھر جاتے جاتے پلٹ کر اس سے بولا۔ ”آپ بیرسٹر صاحب کو فون کیوں نہیں کر لیتے؟ وہ اپنا ڈرائیور یہاں بھیج کر آپ کو بلوا لیں گے اور گاڑی بھی ٹھیک ہو جائے گی۔“

”میں کوشش کر چکا ہوں۔ ان کا موبائل آف ہے۔“ بال کی کھال نکالنے والے اس شخص پر دل ہی دل میں لعنت بھیجتے ہوئے اس نے قدرے تحمل سے جواب دیا، ورنہ اب حقیقتاً اسے اس شخص پر غصہ آنے لگا تھا۔ اس کا جواب سن کر چوکیدار سر ہلاتا ہوا واپس پلٹ گیا۔ شہریار بھی کچھ جھنجلاتا ہوا بونٹ گرا کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ اس چوکیدار کے رویے نے اسے احساس دلا دیا تھا کہ روز روز یہاں کھڑے ہو کر نگرانی کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ اگر آج ہی اس کی مطلوبہ عورت اپنے بنگلے سے نہیں نکلی تو اس کی مشکلات میں اضافہ ہو جائے گا۔ ممکن تھا کہ اسے اپنے منصوبے میں ہی تبدیلی کرنی پڑتی۔

انہی سوچوں میں ڈوبا وہ بے خیالی کے عالم میں اپنے مطلوبہ بنگلے کے گیٹ کو گھور رہا تھا کہ اچانک گیٹ کھلتا چلا گیا اور اس میں سے ایک چمکتی ہوئی سرخ رنگ کی گاڑی برآمد ہوئی۔ گاڑی کو نکلتے دیکھ کر اس نے پھرتی سے اپنی گاڑی کا انجن اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی لیکن پھر سرخ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اس شخص کو دیکھ کر اس کے ذہن نے ایسا پلٹا کھایا کہ وہ تعاقب کرنا بھی بھول گیا اور سرخ کار اپنی پچھلی نشست پر بیٹھی طرح دار حسینہ کو لیے آگے نکلتی چلی گئی۔

حادثات و سانحات کی شکار... پناہ کی تلاش میں سرگرداں ماہ بانو کی داستانِ حیات کے واقعات اگلے ماہ پڑھیے

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پُرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرنگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں بیرآباد کا چوہدری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ شہریار اس کے ناجائز کاموں میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ بیرآباد کا رہائشی ماسٹر آفتاب جو غریب ہے، گاؤں کے پرائمری اسکول کی ترقی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ شہریار کا سہارا پاکر مکمل کر اپنے مشن پر کام کرنے لگتا ہے۔ چوہدری کی نخوت پسند بیٹی کشور، آفتاب کو دیکھتی ہے تو اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ آفتاب اور کشور خفیہ نکاح کر لیتے ہیں۔ ماہ بانو کا تعلق بھی بیرآباد سے ہے۔ اس کے والدین بچپن میں ہی اسے اس کے خالہ خالو کو دے دیتے ہیں جن کے ساتھ وہ فیصل آباد میں رہتی ہے لیکن والدین اور بھائی بہنوں سے ملاقات کے لیے اس کا بیرآباد آنا جانا رہتا تھا۔ چوہدری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آ جاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چوہدری کے چنگل سے نکل کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چوہدری اسے اغوا کروا لیتا ہے لیکن ماہ بانو ایک بار پھر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چوہدری افتخار بہرصورت اس سے شادی کرنا چاہتا ہے مگر ماہ بانو شادی سے قبل ہی اپنی بہن زہرہ کے تعاون سے گھر سے بھاگ نکلتی ہے اور شہریار سے جا ملتی ہے۔ شہریار اسے اپنی گاڑی میں چھپا کر بیرآباد سے نکال دیتا ہے اور دارالامان بھجوا دیتا ہے لیکن چوہدری کے آدمی مستقل اس کے پیچھے رہتے ہیں۔ پھر ماہ بانو مشکلات سے گزرتی ہوئی خواجہ سراؤں کے ہتھے لگ جاتی ہے۔ خواجہ سراؤں کا گرو اسے لے کر ایک ہندو سیٹھ کی کوٹھی پہنچتا ہے۔ کوٹھی میں اسے ایک حیرت انگیز منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔ کوٹھی کے تہ خانے میں ایک نوجوان لڑکی کو ایک مورتی کے قدموں میں بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے پھر ایک چھاپے کے دوران ماہ بانو تھانے لے جایا جاتا ہے۔ سجاد رانا کو اپنی بیٹی شینا کی تلاش ہوتی ہے جسے خواجہ سراؤں کے ایک گروہ نے اغوا کر لیا تھا۔ چنانچہ جب اسے یہ اطلاع ملتی ہے کہ خواجہ سراؤں کے ایک گروہ میں ایک لڑکی دیکھی گئی ہے تو وہ اسے اپنی بیٹی سمجھ کر بازیافت کروانے کی کوشش کرتا ہے اور نتیجے میں ماہ بانو آزاد ہو جاتی ہے۔ ماہ بانو کو شہریار کا ماموں زاد بھائی سجاد رانا اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاتا ہے جہاں شہریار بھی موجود ہوتا ہے۔ وہیں وہ شینا کی تصویر دیکھتی ہے اور شہریار کو بتاتی ہے کہ اس لڑکی کو ہندو سیٹھ کی کوٹھی میں ایک دیوی کے قدموں میں بھینٹ چڑھایا جا چکا ہے۔ سجاد رانا کو اپنی بیٹی کے قاتلوں کی تلاش تھی اور یہ تلاش اس کی راہ کے کانٹوں سے مڈبھیڑ کروا دیتی ہے جس کا حتمی نتیجہ اس کے قتل کی صورت میں نکلتا ہے۔ چوہدری ماہ بانو کی سجاد رانا کے گھر موجودگی کی بھنک پا کر اسے وہاں سے اغوا کروانے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہ کوشش ناکام ہو جاتی ہے اور شہریار اپنے ڈرائیور مشابر خان کے مشورے پر ماہ بانو کو کاندے منتقل کر دیتا ہے۔ کچھ لوگ ماہ بانو کو اغوا کر لیتے ہیں اور اس کارروائی میں اکرم خان مارا جاتا ہے۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ ماہ بانو کے بارے میں ساری معلومات حاصل کر لیتا ہے اور یہ جاننے کے بعد کہ چوہدری ماہ بانو کی تلاش میں ہے، وہ ماہ بانو کا لالچ دے کر چوہدری کو اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور، آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ اس کا آفتاب کے دوست افضل اور اس کی بیوی کے ذریعے ہو جاتا ہے۔ کشور کے غیاب پر وہاں کی ملازمائیں زیرعتاب آ جاتی ہیں۔ ماہ بانو عمران نامی لڑکے کے ساتھ دشمنوں کی قید سے بھاگ نکلتی ہے مگر عمران ایک جگہ ان کے قابو آ جاتا ہے اور اس کی وجہ سے ماہ بانو کی جان بچ جاتی ہے۔ ادھر چوہدری افتخار نیویارک سے واپس آ کر کشور کی ملازمہ خاص رانی پر بے پناہ تشدد کرتا ہے مگر رانی موقع پا کر چوہدری کے ریوالور سے خود کو ختم کر لیتی ہے۔ شہریار نور پور سے واپسی پر تھانے جاتا ہے جہاں ایک اناٹی ڈاکٹر سے تفتیش کے دوران موت کے منہ میں چلے جانے والے بچے کا باپ جلول جاتا ہے اور وہ شہریار کا احسان مند ہوتے ہوئے اسے اپنا موبائل نمبر دے کر اپنی خدمات پیش کرنے کی آفر کرتا ہے۔ ادھر مشابر خان ماہ بانو کی تلاش میں اس برف زار تک پہنچ جاتا ہے اور وہ دشمنوں کا پتا لگا لیتا ہے اور وہاں ایکسپلوژن بلاسٹ ہونے سے کافی تباہی ہوتی ہے۔ چوہدری افتخار کو کشور کے غیاب کے حوالے سے ڈیوڈ کی زبانی آفتاب اور افضل سے متعلق اطلاعات ملتی ہیں کہ ان افراد کی شخصیت مشکوک ہے۔ چوہدری، ماسٹر آفتاب کو اغوا کرا لیتا ہے۔ ماہ بانو برف زار میں بھٹکتے بھٹکتے بے ہوش ہو جاتی ہے اور اس دوران اسے ایک مہربان شخص مل جاتا ہے جو کہ مخبر ہوتا ہے، وہ اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ ادھر کشور کو جب آفتاب کے اغوا کی خبر ملتی ہے تو وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ افضل اسے اسپتال لے کر جاتا ہے۔ جب وہ گھر پہنچتا ہے تو اسے اپنی بیوی بچوں کی لاشیں ملتی ہیں۔ ادھر مشابر خان لڑائی کے دوران زخمی ہو جاتا ہے اور پاکستان آرمی والوں کے وہاں پہنچنے سے ان کی تحویل میں پہنچ جاتا ہے۔ شہریار، ماسٹر آفتاب کو چھڑانے کے لیے جگو کا سہارا لیتا ہے اور جگو آفتاب کو چوہدری کے چنگل سے نکال لاتا ہے۔ دہشت گردوں کا ٹھکانا تباہ ہونے سے ڈیوڈ چراغ پا ہو جاتا ہے اور تحقیق کے لیے لنڈا کو پاکستان بھیجتا ہے۔ ادھر ماہ بانو کو بچانے والا مہربان شخص اپنے واقف کار کے توسط سے اسے ایک مجسٹریٹ سے ملوا دیتا ہے جو ماہ بانو کی فراہم کردہ معلومات کے بعد اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ شہریار کو بھی اس واقعے کی اطلاع مجسٹریٹ کے ذریعے مل جاتی ہے اور مشابر خان اور شہریار فوراً اسکردو پہنچ جاتا ہے اور ماہ بانو کو آرمی کی کسٹڈی سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ماہ بانو کو چھڑانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اسے کراچی منتقل کرنے کا منصوبہ بناتا ہے۔ صحافی افضل پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے لیکن وہ زخمی ہو کر اسپتال میں پہنچ جاتا ہے۔ اسپتال میں افضل پر دوبارہ قاتلانہ حملہ ہوتا ہے اور وہ اس حملے میں مارا جاتا ہے اور حملہ آور بھی وہاں موجود گارڈز کی فائرنگ سے شدید زخمی ہو کر مارا جاتا ہے تاہم مرنے سے پہلے اپنا بیان ریکارڈ کروا دیتا ہے۔ لنڈا پاکستان آ کر خفیہ ٹھکانے پر تباہی کا پتا لگاتی ہے۔ ادھر چوہدری افتخار کے آدمی اسکول کی عمارت اور ٹیچرز کی رہائش گاہ کو آگ لگا دیتے ہیں جہاں رہائش پذیر تین اساتذہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ شہریار اس واقعے کی رپورٹ چوہدری کے خلاف درج کروا دیتا ہے۔ ماہ بانو کراچی آ جاتی ہے اور میڈیکل کالج میں مہرین کے نام سے داخلہ لے لیتی ہے۔ وہاں اسے راحیلہ نامی ایک لڑکی ملتی ہے جو اس سے کافی گھل مل جاتی ہے۔ وہ اس کے ساتھ کالج سے باہر چاٹ کھانے نکلتی ہے۔ وہاں ایک خواجہ سرا کو دیکھ کر وہ سہم جاتی ہے۔ کشور اور آفتاب افضل کے ایک دوست ببر کی مدد سے اسلام آباد میں اس کی خالہ کے گھر پناہ گزیں ہو جاتے ہیں مگر کشور کو یہاں بھی سکون میسر نہیں آتا۔ خالہ کا اوباش بیٹا اسے تنگ کرتا ہے۔ ادھر چوہدری کے وفاداروں کو کچھ لوگ یرغمال بنا کر تشدد کا نشانہ بناتے ہیں جس کا الزام چوہدری شہریار پر لگاتا ہے۔ ماہ بانو کو اس کی سہیلی راحیلہ اپنے بھائی سے ملوانے گھر لے جاتی ہے۔ وہاں ماہ بانو چوروں کے بنگلے میں جاگرو کو دیکھ لیتی ہے اور شہریار کو مطلع کرتی ہے۔ شہریار فوراً کراچی جانے کا سوچتا ہے اور کراچی پہنچ جاتا ہے۔ وہاں وہ اپنے ایک دوست کے خالی بنگلے میں ٹھہرتا ہے اور ماہ بانو کے بتائے ہوئے بنگلے کی نگرانی شروع کر دیتا ہے۔ بنگلے سے ایک سرخ کار نکلتی ہے۔ شہریار اس کا پیچھا کرنے کے لیے کار اسٹارٹ کرتا ہے مگر سرخ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص کو دیکھ کر ٹھٹک جاتا ہے اور تعاقب کرنا بھول جاتا ہے۔ سرخ کار اپنی پچھلی نشست پر موجود طرح دار حسینہ کو لیے آگے نکلتی چلی جاتی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیں

سرخ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود باوردی ڈرائیور کا چہرہ اس کے لیے اتنا شناسا تھا کہ اسے گاڑی کا تعاقب کرنے یا اپنے طے شدہ منصوبے پر عمل کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی اور چند لمحوں کا توقف کرنے کے بعد اس نے اپنی گاڑی بھی آگے بڑھا دی۔

راحیلہ والے بنگلے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے ایک اچٹتی سی نظر اس کے ٹیرس پر ڈالی۔ ٹیرس خالی تھا اور وہاں کچھ دیر پہلے نظر آنے والا لڑکا اور لڑکی موجود نہیں تھے۔ وہ اطمینان سے گاڑی چلاتا ہوا وہاں سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس سے کافی آگے سرخ کار جا رہی تھی اور محض ایک دھبے کی صورت میں نظر آ رہی تھی۔ اس کار کے ڈرائیور کو دیکھنے کے بعد ہی اس نے فوری طور پر اپنا منصوبہ تبدیل کر لیا تھا۔ وہ سرمد تھا.... سیٹھ موتی والا کا سابقہ ڈرائیور۔ سیٹھ موتی والا جو کبھی چوہدری کے حلیفوں میں شامل ہوا کرتا تھا اور جنگل سے اسمگل کی جانے والی لکڑی کی اسمگلنگ میں پوری طرح شامل تھا۔ شہریار کا متعدد بار سرمد سے سامنا ہوا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ماہ بانو کے تعاون اور بہادری کے نتیجے میں ہی سرمد اپنی محبت نیلم کو پانے میں کامیاب ہو سکا ہے۔ چنانچہ اس احسان کے بدلے وہ اس کا ساتھ ضرور دیتا۔ سرمد کا ساتھ مل جاتا تو اسے اپنے پہلے منصوبے میں موجود مشکلات اور خطرات کا بھی سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ بہرحال، تن تنہا کسی گاڑی کو روک کر اس میں سوار لڑکی کو اغوا کرنا اتنا بھی آسان کام نہیں تھا۔ یہ منصوبہ بنا کر اس نے ایک طرح سے خود کو خطرے میں ہی ڈالا تھا۔ سرمد ساتھ دیتا تو یہ رسک ہی نہیں لینا پڑتا۔ سرمد کا ساتھ حاصل کرنے کے لیے اس سے ملاقات ضروری تھی لیکن اس ملاقات سے پہلے وہ اپنے ذہن میں ابھرنے والے نئے منصوبے کے بارے میں مزید سوچ لینا چاہتا تھا چنانچہ سرخ کار سے توجہ ہٹاتے ہوئے اس نے مخالف سمت میں اپنی گاڑی کا رخ موڑا اور زبیر کے اس بنگلے کا رخ کیا جہاں آج کل وہ ٹھہرا ہوا تھا۔

☆☆☆

اخبار کے دفتر سے نکل کر بابر اپنی نیلی سوزوکی مہران میں بیٹھا اور اسے اسٹارٹ کرتے ہوئے کیسٹ پلیئر کو بھی آن کر دیا۔ دھیمی دھیمی موسیقی کی لہریں گاڑی میں پھیل گئیں۔ وہ خود بھی ساتھ ساتھ گنگناتے ہوئے مسرور انداز میں گاڑی ڈرائیو کرتا رہا۔ پچھلے دنوں حالات بہت خراب رہے تھے۔ ملک کے تین بڑے شہروں میں دہشت گردی کے بڑے واقعات پیش آئے تھے اور انتظامی مشینری کے ساتھ جو لوگ سب سے زیادہ مصروف اور بھاگ دوڑ کا شکار رہے تھے، وہ میڈیا کے نمائندے ہی تھے۔ بابر بھی بطور صحافی اس بھاگ دوڑ کا حصہ رہا تھا۔ اس آفیشل مصروفیت کے علاوہ وہ افضل سے دوستی نبھانے کے چکر میں آفتاب والے معاملے کو بھی دیکھتا رہا تھا۔ گھر والے جو پہلے ہی اس کے گھر پر وقت نہ دینے کی شکایت کرتے رہتے تھے، کچھ اور بھی شاکی ہو گئے۔ ان شکوہ کرنے والوں میں اس کی بیوی بھی شامل تھی جس کا شکوہ اب بڑھتے بڑھتے ناراضی کی شکل اختیار کر گیا تھا اور پچھلے ایک ہفتے سے یہ حال تھا کہ وہ بطور احتجاج اس سے ضروری بات کرنے کے سوا مخاطب بھی نہیں ہوتی تھی۔ بابر اسے اس رویے میں حق بجانب سمجھتا تھا اور تلافی کا خواہش مند تھا لیکن فی الحال جان بوجھ کر کوئی عملی اقدام اٹھانے سے گریزاں تھا۔ حالانکہ دہشت گردی کے بعد پھیلنے والی بدامنی پر اب قابو پا لیا گیا تھا اور اس کی مصروفیات بھی خاصی کم ہو گئی تھیں۔ دراصل بیوی کو منانے کا معاملہ اس نے خاص موقع کے لیے اٹھا رکھا تھا اور وہ خاص موقع آج آ گیا تھا۔

آج ان کی شادی کی سالگرہ تھی۔ بابر اپنی مصروفیات میں عموماً اس دن کو بھول جاتا تھا یا یاد بھی رہے تو اسے کوئی خصوصی اہتمام کرنے کی فرصت نہیں ملتی تھی، البتہ اس کی بیوی اس موقع کو ہمیشہ یاد رکھتی تھی اور بہت جوش و خروش سے اسے منانے کا اہتمام بھی کرتی تھی۔ بابر کو یقین تھا کہ اس کے سابقہ ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے اس کی بیوی نے یہی گمان کیا ہوگا کہ وہ آج بھی اس اہم دن کو بھول گیا ہوگا.... لیکن ایسا نہیں تھا۔ اس بار اس نے پورے ہفتے اس دن کے آنے کا انتظار کیا تھا اور روٹھی ہوئی بیوی کو منانے کے لیے کچھ خصوصی انتظامات بھی۔ اسے معلوم تھا کہ جب وہ آج خلافِ معمول ذرا جلدی گھر پہنچے گا اور بیوی کے لیے خاص طور سے خریدے گئے تحائف اس کی خدمت میں پیش کرنے کے بعد اسے تیار ہو کر اپنے ساتھ ڈنر پر چلنے کی دعوت دے گا تو وہ خوشی سے جھومتے ہوئے کسی ادھ کھلی کلی کی طرح مسکرا اٹھے گی۔

بیوی کی اس خوشی اور سرشاری کا خیال اسے ابھی سے مسرور کیے دے رہا تھا اور اپنی اس خوشی کو خود ہی انجوائے کرنے کے لیے اپنی پسندیدہ موسیقی سن رہا تھا۔ وہ اتنا مگن تھا کہ اسے یہ بھی اندازہ نہیں ہو سکا کہ اخبار کے دفتر سے ایک گاڑی مسلسل اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ اپنی اس کیفیت میں وہ ڈیش بورڈ پر پڑے اپنے موبائل فون کی رنگ ٹون پر بھی قدرے تاخیر سے متوجہ ہو سکا۔ متوجہ ہونے پر اس نے سیل فون اٹھا کر اس کی اسکرین پر نظر ڈالی۔ کال اس کی بیوی کی طرف سے آ رہی تھی۔

"ہاں بولو۔" اس نے پہلے موسیقی بند کی پھر کال ریسیو کرتے ہوئے جان بوجھ کر بیزار کن لہجے میں بیوی سے مخاطب ہوا۔ اس پل اس کے چہرے پر شریری مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ اسے ستا رہا تھا تاکہ منانے کا پورا پورا لطف حاصل کر سکے۔

"آپ گھر کب تک پہنچیں گے؟" بیوی نے اس سے دھیمی آواز میں دریافت کیا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ابھی تو بہت اہم کام سے جا رہا ہوں۔" اس نے رکھائی سے جواب دیا۔

"کوشش کیجیے گا کہ کھانے کے وقت گھر پر ہی ہوں۔ ہم سب لوگ آپ کا انتظار کریں گے۔" وہ ہر سال شادی کی سالگرہ والے روز رات کے کھانے پر زبردست انتظام کرتی تھی اور اپنی تمام تر ناراضی کے باوجود اس بار بھی اس نے اپنا یہ معمول یقیناً برقرار رکھا تھا لیکن خود بابر کا تو کچھ اور ہی پروگرام تھا اس لیے اصل بات ظاہر کیے بغیر اپنی سابقہ ٹون برقرار رکھتے ہوئے بولا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے میرا انتظار کرنے کی۔ میرا کچھ بھروسا نہیں ہے کہ میں بارہ ایک بجے تک بھی گھر پہنچ سکوں یا نہیں۔ کیا سب لوگوں کو میرے انتظار میں آدھی رات تک بھوکا بٹھا کر رکھو گی؟" وہ جانتا تھا کہ سب لوگ کھانا کھا لیں گے لیکن اس کی بیوی ناراض ہونے کے باوجود اس کے گھر پہنچنے سے قبل کھانا نہیں کھائے گی۔

"ٹھیک ہے۔ جیسی آپ کی مرضی۔" بالآخر اس نے مایوس ہو کر فون بند کر دیا۔ فون بند ہوتے ہی بابر کے حلق سے بہت دیر سے ضبط کیے جانے والے قہقہے ابل پڑے اور وہ موبائل ڈیش بورڈ پر ڈالنے کے بعد ایک بار پھر کیسٹ پلیئر آن کر کے مگن ہو گیا۔ یونہی مگن سی کیفیت میں اس نے تقریباً پندرہ بیس منٹ کی مسافت طے کرنے کے بعد اپنی گاڑی ایک شاپنگ سینٹر کے سامنے لے جا کر روکی اور گاڑی لاک کر کے شاپنگ سینٹر میں داخل ہو گیا۔ یہاں ایک جیولری شاپ پر اس نے بیوی کے لیے ایک بریسلیٹ کا آرڈر دیا تھا۔ شاپ پر پہنچ کر اس نے رسید دکھائی اور اپنا آرڈر کردہ بریسلیٹ وصول کر لیا۔ وہاں سے اٹھ کر شاپنگ سینٹر کے بیرونی گیٹ کا رخ کرتے ہوئے اس کی نظر ایک ہلکی سبز رنگ کی ساڑی پر پڑ گئی۔ ساڑی کی رنگت اور کام دونوں ہی خوب صورت تھے۔ اس کا دل چاہا کہ بیوی کے لیے خرید لے۔ وہ دکان پر رک کر سیلز مین سے اس کی قیمت دریافت کرنے لگا۔

مول تول کرنے کے بعد ساڑی پیک کروانے میں اس کے دس سے پندرہ منٹ مزید خرچ ہو گئے لیکن اس نے زیادہ پروا نہیں کی۔ آج وہ اپنے سارے کام نمٹا کر دفتر سے نکلا تھا اور کل صبح تک فارغ ہی تھا اس لیے کچھ وقت ضائع بھی ہو جاتا تو بس اتنا ہی ہوتا کہ وہ گھر قدرے تاخیر سے پہنچتا اور یہ اس لحاظ سے اچھا ہوتا کہ باقی اہل خانہ کھانے وغیرہ سے فارغ ہو جاتے اور اسے اپنی بیوی کو اکیلے گھر سے لے کر ڈنر کے لیے نکلتے ہوئے معیوب نہیں لگتا۔ اپنی اسی سوچ کے تحت وہ کافی سست روی سے چلتا ہوا شاپنگ سینٹر سے باہر آیا اور گاڑی کی طرف بڑھا۔ گاڑی کے قریب پہنچنے پر اس نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر چابی دروازے کے لاک میں ڈالنی چاہی لیکن چابی اندر داخل نہیں ہوئی۔ اپنی اس کوشش میں ناکام ہونے پر اس نے چابی کو قریب کر کے غور سے دیکھا کہ شاید وہ غلطی سے گچھے میں موجود کوئی اور چابی استعمال کر رہا ہے لیکن چابی بالکل درست تھی۔ اس نے ذرا الجھتے ہوئے ایک بار پھر چابی کو لاک کے سوراخ میں ڈالنے کی کوشش کی لیکن اس بار بھی ناکامی کا سامنا ہوا۔ ساتھ ہی اسے یہ احساس بھی ہو گیا کہ وہ غلط چابی استعمال نہیں کر رہا بلکہ گڑبڑ لاک کے ساتھ ہے۔ کسی نے اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی ہے۔ پریشانی اور الجھن کی ملی جلی کیفیت میں اس نے اپنے اردگرد نظر دوڑائی۔

"کیا بات ہے یار! کیا اس گاڑی کو چرانے کی کوشش کر رہے ہو؟" اچانک ہی اس کے عقب سے ایک شخص نمودار ہوا اور طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ پوچھنے لگا۔ بابر کو خیال آیا کہ اس شخص کو اس نے اندر شاپنگ سینٹر میں بھی اپنے قریب دیکھا تھا۔ جب وہ ساڑی کے لیے مول تول کر رہا تھا تو یہ شخص بھی دکان پر کپڑوں کے تھان کھلوا کھلوا کر دیکھ رہا تھا۔

"مجھے اس گاڑی کو چرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ میری اپنی گاڑی ہے لیکن شاید کسی نے اس کے لاک کے ساتھ شرارت کی ہے اس لیے لاک کھل نہیں رہا ہے۔" اپنے اوپر لگنے والے الزام کا برا ماننے کے باوجود اس نے خود پر قابو رکھتے ہوئے صفائی پیش کی۔

"لاؤ میں چیک کرتا ہوں کہ کیا گڑبڑ ہے۔ شاید میری کوشش سے لاک کھل جائے۔" وہ شخص اس کے بالکل قریب چلا آیا اور اس سے چابی لینے کے لیے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔ بابر نے میکانکی انداز میں چابی اسے تھما دی۔

"میری جیب میں بھرا ہوا ریوالور ہے جو میری انگلی کے صرف ایک اشارے پر تمہارے جسم میں چھید کر سکتا ہے۔ اس لیے تم بغیر شور شرابا کیے خاموشی سے پیچھے کھڑی سفید گاڑی میں جا کر بیٹھ جاؤ۔ دوسری صورت میں نتائج کی ذمے داری میری نہیں ہوگی۔" چابی تھام کر وہ ایسے انداز میں بابر سے یہ دھمکی آمیز جملے بولنے لگا جیسے اس سے کسی موضوع پر تبادلہ خیال کر رہا ہو۔ بابر نے اس کے مطالبے پر چونک کر اس کا جائزہ لیا۔ وہ نیلے رنگ کے ڈھیلے ڈھالے شلوار قمیص میں ملبوس تھا اور اس نے اپنا بایاں ہاتھ قمیص کی جیب میں ڈال رکھا تھا۔ اس ہاتھ کی جنبش اور جیب سے اوپر پیدا ہونے والا ابھار بتا رہا تھا کہ واقعی وہاں کوئی ہتھیار موجود ہے۔

"تم مجھے کہاں اور کس لیے لے جانا چاہتے ہو؟" پہلے بھی کچھ دہشت گردوں کے ہاتھوں اس کے چند ساتھی صحافی اغوا ہو چکے تھے اور وہ اس شخص کو بھی اسی ٹولے کا ایک حصہ سمجھ رہا تھا اس لیے جرأت کرتے ہوئے سوال کر ڈالا۔ اندر سے بہرحال وہ خوف زدہ تھا کہ اغواکار کسی مغوی صحافی سے عموماً کافی برا سلوک ہی کرتے تھے۔

"سوال جواب اور بحث نہیں۔ جو میں نے کہا ہے اس پر عمل کرو۔ ورنہ میرا ریوالور بے آواز ہے۔ گولی چلی تو کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ کچھ ہوا ہے۔" وہ شخص غرایا لیکن اس کا چہرہ سپاٹ ہی رہا۔ بابر نے اس کے لہجے سے اندازہ لگا لیا کہ وہ اپنے کہے پر عمل کرنے سے گریز نہیں کرے گا چنانچہ بابر نے اس کا مطالبہ ماننے میں ہی عافیت جانی اور پیچھے کھڑی سفید گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک مونچھیل ڈرائیور بیٹھا تھا جبکہ پچھلی نشست بھی خالی نہیں تھی۔ وہاں بھی ایک بھاری بھرکم آدمی بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ گاڑی کے قریب پہنچتے ہی پچھلی نشست پر موجود شخص نے دروازہ کھول کر اسے اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس اشارے سے زیادہ اس بڑی نال کی گن کی دہشت تھی جسے بھاری تن و توش کے آدمی نے اپنے دونوں گھٹنوں کے درمیان دبا رکھا تھا کہ بابر انکار نہیں کر سکا اور بے چون و چرا گاڑی کی عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔ اسے گھیر کر یہاں تک لانے والے شخص نے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ سنبھال لی اور فوراً ہی گاڑی حرکت میں آ گئی۔ پُرہجوم شاپنگ سینٹر کے باہر اگر کسی نے یہ سارا واقعہ دیکھا بھی ہوگا تو ہرگز یہ گمان نہیں کر سکا ہوگا کہ یوں بنا کسی شور شرابے کے ان کے سامنے ایک آدمی کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ یہ تو زیادہ سے زیادہ کسی مشکل میں گرفتار شخص کو لفٹ دینے کا منظر تھا۔

"تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" آتشیں اسلحے کی موجودگی میں بے بس سے بیٹھے بابر نے ہمت کر کے اغواکاروں سے سوال کیا۔

"وقت آنے پر بتا دیں گے۔ ابھی تم اپنا منہ بند کر کے بیٹھو۔" اگلی نشست پر بیٹھے شخص نے سرد مہری سے جواب دیا تو اسے مزید کسی سوال کی ہمت نہیں ہوئی اور وہ خاموشی سے سفر ختم ہونے کا انتظار کرتے ہوئے اضطراری طور پر اپنی انگلیاں اس ڈبے پر پھیرتا رہا جس میں کچھ دیر قبل بیوی کے لیے بڑے چاؤ سے خریدی گئی ساڑی موجود تھی۔ وہ جن حالات میں گھر گیا تھا اس میں یہ تو قطعی ناممکن نظر آتا تھا کہ اب وہ یہ ساڑی اسے دے سکے گا۔ اس کا بیوی کو سرپرائز دینے کا سارا منصوبہ چوپٹ ہو گیا تھا۔ اس کا بہت شدت سے دل چاہا کہ گھر فون کرے اور اپنی بیوی کو کم از کم اتنا ہی بتا دے کہ وہ آج کا دن بھولا نہیں ہے لیکن ظاہر ہے اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کا اپنا موبائل فون گاڑی کے ڈیش بورڈ پر ہی رکھا رہ گیا تھا اور اگر پاس ہوتا بھی تو اسے اغوا کرنے والے اس کی اجازت کب دینے والے تھے؟

وہ اسی طرح کی سوچوں میں گھرا بیٹھا رہا اور گاڑی جانی پہچانی سڑکوں سے گزرتے ہوئے گلبرگ کے علاقے میں داخل ہو گئی۔ اس کی منزل ایک ون یونٹ بنگلا تھا جس کا نمبر تک بابر نے گاڑی کے گیٹ سے اندر داخل ہونے سے قبل خوب اچھی طرح دیکھا۔ اس طرح کے واقعات میں عموماً یہی سننے میں آتا تھا کہ اغوا کنندہ کو مکمل اندھیرے میں رکھا جاتا ہے کہ وہ کہاں اور کس جگہ موجود ہے لیکن اسے تو بالکل کھلے عام یہاں تک لایا گیا تھا۔ شاید یہ بنگلا ان کا عارضی ٹھکانا تھا اور وہ تھوڑی دیر اسے یہاں رکھنے کے بعد یا تو آزاد کرنے والے تھے یا کسی اور خفیہ جگہ پر منتقل کرنے والے تھے۔ وہ بہرحال کوئی حتمی نتیجہ نہیں نکال سکا تھا اور قیاس آرائیوں سے کام چلاتا رہا۔ بنگلے میں لے جانے کے بعد اسے ایک ایسے کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں داخل ہوتے ہی اسے احساس ہوا کہ کمرا مکمل طور پر ساؤنڈ پروف ہے اور یہاں سے کوئی آواز باہر نہیں جا سکتی۔

"اسے کرسی سے باندھ دو۔" شلوار قمیص میں ملبوس شخص نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ اس حکم کے ملنے پر ان لوگوں نے پہلے اس کی جامہ تلاشی لی پھر کرسی سے باندھ دیا۔ بابر نے مزاحمت نہیں کی۔ وہ جانتا تھا کہ اس میں اتنی طاقت اور صلاحیت نہیں کہ اکیلا اسلحے سے لیس ان غنڈوں کا مقابلہ کر سکے۔

"ہم تمہیں صرف ایک سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے یہاں لائے ہیں۔ اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ اس سوال کا جواب کتنی جلدی دے کر اپنی جان چھڑاتے ہو۔ ہمیں بہرحال ہر صورت جواب چاہیے۔" شلوار قمیص میں ملبوس شخص اس کے سامنے بیٹھ گیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔

"کون سا سوال؟" بابر نے حیرت سے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔

"تم نے ماسٹر آفتاب اور اس کی ساتھی لڑکی کو کہاں چھپایا ہے؟" اس شخص نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے پوچھا تو بابر چونک گیا۔ اسے تو خیال ہی نہیں آیا تھا کہ وہ آفتاب کے چکر میں دھرا گیا ہے۔

"کون ماسٹر آفتاب؟ میں کسی ماسٹر آفتاب کو نہیں جانتا۔" خود پر قابو پاتے ہوئے اس نے انجان بننے کی کوشش کی۔

"لگتا ہے تمہاری یادداشت کچھ کمزور ہے۔ اسے بحال کرنے کے لیے ہمیں کچھ علاج شلاج کرنا پڑے گا۔" وہ بابر کا چونکنا نوٹ کر چکا تھا اور پھر اسے اطلاع بھی یہی دی گئی تھی کہ یہ شخص ماسٹر آفتاب کا پتا بخوبی جانتا ہے۔ چنانچہ استہزائیہ لہجے میں بولا اور اپنے ساتھی کو کوئی اشارہ کیا۔ بابر نے بھی یہ اشارہ دیکھ لیا اور تشویش میں مبتلا ہو گیا کہ جانے وہ لوگ اب پر کس قسم کا تشدد کر کے سچ اگلوانے والے ہیں۔ کمرے میں داخل ہوتے وقت جب اس نے کمرے کا جائزہ لیا تھا تو وہاں ایسا کوئی آلہ نظر نہیں آیا تھا جو تشدد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہو لیکن ایک منٹ کے وقفے میں اپنی پشت پر محسوس ہونے والی معمولی کھٹر پٹر کے بعد جو کچھ اس کے سامنے آیا اس نے اسے لرزا کر رکھ دیا۔ بھاری تن و توش کے آدمی نے بجلی کا ایک تار نیلی شلوار قمیص والے کے ہاتھ میں لا تھمایا تھا اور خود دوبارہ پیچھے ہٹ گیا۔

"سنا ہے پاگل خانوں میں مریض کی یادداشت بحال کرنے کے لیے اسے بجلی کا جھٹکا لگاتے ہیں۔ تمہاری یادداشت بھی چلی گئی ہے اس لیے ہم تم پر بھی یہ طریقہ آزما کر دیکھیں گے۔" نہایت سفاکی سے کہتا ہوا وہ بابر کے قریب آیا اور تار کا ننگا سرا اس کے بازو پر رکھ کر انگلی سے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ فوراً ہی بابر کے پورے جسم کو ایک جھٹکا لگا اور اس نے اپنے دماغ میں چنگاریاں سی پھوٹتی محسوس کیں۔ برقی رو ایک ڈیڑھ سیکنڈ سے زیادہ اس کے جسم سے نہیں گزری تھی پھر بھی وہ پورا پورا پسینے میں نہا گیا۔

"یہ معمولی سا جھٹکا تھا۔ اگر اس نے تمہاری یادداشت ٹھیک کر دی ہو تو صحیح ہے ورنہ اگلا جھٹکا اس سے زیادہ شدید ہو گا۔ میں تمہیں پانچ منٹ دیتا ہوں۔ تم اچھی طرح سوچ لو۔" وہ بابر کے قریب سے ہٹ کر دوبارہ کرسی پر جا بیٹھا۔ بابر کے بازو پر جہاں بجلی کا تار رکھا گیا تھا، وہاں انگارے سے دہک رہے تھے لیکن اسے اس تکلیف کو نظر انداز کر کے فی الحال سوچنے کا کام کرنا تھا۔ خود کو ملنے والی پانچ منٹ کی مہلت اس نے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے گزاری۔ اسے علم تھا کہ آفتاب کو ڈھونڈنے والا پیر آباد کا چودھری افتخار ہے اور آفتاب کے ساتھ جو لڑکی موجود ہے وہ چودھری کی بیٹی ہے۔ یعنی اس وقت جو لوگ اسے اغوا کر کے یہاں لائے تھے وہ چودھری کے گماشتے تھے۔

چودھری یہ بات اچھی طرح سمجھتا ہو گا کہ جب وہ یہاں سے نکلے گا تو پولیس کو بیان دیتے ہوئے اپنے اغوا کی وجہ ضرور بتائے گا۔ بابر عام آدمی ہوتا تو بات چھپ بھی جاتی لیکن وہ میڈیا کا بندہ تھا جو زبان بھی کھولتا اور ہر طرف چودھری کی بدنامی بھی ہوتی۔ یعنی مطلوبہ معلومات حاصل کرنے کے بعد بھی بابر کی رہائی کسی صورت چودھری کے مفاد میں نہیں تھی۔ بابر کو یہ بات بھی سمجھ آ گئی تھی کہ اسے اس بنگلے تک لاتے ہوئے اس سے اس کی لوکیشن چھپانے کی کوشش کیوں نہیں کی گئی تھی۔ ظاہر ہے، وہ یہاں زندہ لایا ضرور گیا تھا لیکن زندہ واپس جانے والا نہیں تھا اس لیے اس سے ایسا کوئی خدشہ نہیں تھا کہ وہ بعد میں اس جگہ کی نشان دہی کر سکے گا۔ حالات کا یہ تجزیہ اسے سمجھا رہا تھا کہ اس کی زندگی بس اس وقت تک ہے جب تک اس کی زبان بند ہے ورنہ ادھر وہ آفتاب کا پتا بتائے گا اور اُدھر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

"ہاں بھئی، کیا سوچا تو نے؟ کچھ یاد آیا کہ کدھر چھپا رکھا ہے تو نے اس ماسٹر کو؟" پانچ منٹ کی مہلت ختم ہو گئی تھی اور وہ شخص ایک بار پھر اس کے سر پر مسلط تھا۔

"مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں کسی آفتاب کو نہیں جانتا۔" اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بابر نے جواب دیا۔

"ابھی پہلوان! مجھے تار پکڑا۔ لگتا ہے صحافی بابو کو ابھی اور علاج کی ضرورت ہے۔" اس کا جواب سن کر نیلی شلوار قمیص والا اپنے بھاری تن و توش والے ساتھی سے مخاطب ہوا۔ اسے شاید اس کے تن و توش کی وجہ سے ہی پہلوان کہہ کر پکارا جاتا ہو گا۔ پہلوان نے حکم کی تعمیل میں ایک بار پھر بجلی کا تار لا کر اپنے لیڈر کو تھمایا اور خود پیچھے ہٹ گیا۔ وہ بابر کے عقب میں موجود سوئچ بورڈ کے ساتھ کھڑا ہوا تھا اور اشارہ ملنے پر بٹن آن آف کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ لیڈر نے اس بار تار بابر کی ران پر رکھ کر اشارہ کیا۔ اشارہ ہوتے ہی برقی رو دندناتی ہوئی بابر کے جسم میں داخل ہوئی اور جسم کے ایک ایک خلیے سے گزرتے ہوئے اسے چیخنے پر مجبور کر دیا۔ چیخوں کا ایک تسلسل تھا جس سے پورا کمرا گونج اٹھا لیکن شلوار قمیص والا شخص یوں مطمئن تھا جیسے کسی تڑپتے ہوئے انسان کی چیخوں کے بجائے موسیقی سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔ اپنے طے شدہ وقت کے حساب سے جب اس نے پہلوان کو برقی رو کا سلسلہ منقطع کرنے کا اشارہ کیا تو بابر کی چیخیں بند ہو چکی تھیں اور بے ہوشی کی وجہ سے اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا تھا۔ اس دوسرے جھٹکے نے اس کی حالت اس حد تک تباہ کر دی تھی کہ منہ سے رال بہہ نکلی تھی۔

"اسے ہوش میں لاؤ۔" وہ واپس کرسی پر جا بیٹھا اور پہلوان کو حکم دیا۔ پہلوان حکم کی تعمیل میں آگے آیا اور اس کی نبض چیک کی۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ تین چار منٹ کی کوشش کے بعد اسے کامیابی حاصل ہوئی اور بابر ہوش میں آ گیا لیکن اس کی حالت یہ تھی کہ چہرہ بالکل سفید پڑ چکا تھا اور وہ خالی نظروں سے اپنے سامنے موجود لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔

"پھر کیا ارادے ہیں صحافی صاحب! ہمیں ماسٹر آفتاب کا پتا بتاتے ہو یا ایک جھٹکا اور کھانا ہے لیکن سوچ لو کہ کہیں اگلا جھٹکا تمہیں دوسری دنیا میں نہ پہنچا دے۔ ابھی تو تم صرف بے ہوش ہوئے تھے اس لیے ہم ہوش میں لے آئے ..... مر مرا گئے تو لاش کسی کچرا خانے میں پھینکنے کے سوا کچھ نہیں کر سکیں گے۔" سفاکی میں ڈوبی یہ آواز سن کر بابر کو یاد آیا کہ وہ کس صورت حال سے گزر رہا ہے۔ اس نے اپنی حالتِ زار پر بھی غور کیا۔ باچھوں سے بہتی رال جسے وہ بندھا ہوا ہونے کی وجہ سے صاف بھی نہیں کر سکتا تھا، اس کی بے بسی کا مذاق اڑا رہی تھی۔ وہ یک دم ہی اپنے اعصاب پر کنٹرول کھو بیٹھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"ابے کیا عورتوں کی طرح دھاڑیں مار کر رو رہا ہے۔" پہلوان نے اس کے پیٹ میں اتنی زوردار لات ماری کہ وہ کرسی سمیت الٹ کر گرا۔ گرنے کے باعث اس کا سر بڑی زور سے پختہ فرش سے ٹکرایا اور اس سے نکلنے والا خون فرش پر بہنے لگا۔

"مار ڈالو، مجھے جان سے مار ڈالو لیکن میں پھر بھی کچھ نہیں بتاؤں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ میں نے تمہیں بتا بھی دیا تو تم مجھے نہیں چھوڑو گے۔ تم مجھے مارنے کے لیے ہی یہاں لائے ہو ورنہ اپنے یہ مکروہ چہرے کبھی مجھے نہیں دکھاتے۔" ایک اور نئی چوٹ کھا کر وہ رونا بھول گیا اور ہیجانی انداز میں چیخنے لگا۔ اس کے الفاظ نے پہلوان اور اس کے لیڈر کو احساس دلایا کہ ان سے غلطی ہو گئی ہے۔ ان کی بے پروائی نے بابر کو سمجھا دیا ہے کہ وہ اسے زندہ رکھنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے اور یہ آگہی خطرناک تھی۔ جس شخص کو اپنی موت کا یقین ہو جائے پھر اس سے جسمانی تشدد کے ذریعے کچھ نہیں منوایا جا سکتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مجھے مرنا تو ہر صورت ہے۔

"پہلوان! مجھے وہ ڈبا تو دینا جو یہاں آتے ہوئے اس کے ہاتھ میں تھا۔" کچھ دیر بابر کو تولتی ہوئی نظروں سے دیکھنے کے بعد شلوار قمیص والے شخص نے اپنے ساتھی کو حکم دیا۔ وہ فوراً ہی وہ ڈبا لے آیا۔ ڈبے میں وہی ساڑی تھی جو اس نے اپنی بیوی کو دینے کے لیے خریدی تھی۔ وہ ڈبا لے کر اسے کھولنے لگا لیکن اس سے قبل وہ پہلوان کو گری ہوئی کرسی سیدھی کرنے کا حکم دے چکا تھا۔ جب تک پہلوان نے کرسی سیدھی کی، وہ ڈبے پر موجود خوب صورت ریپر کو پھاڑ کر اسے کھول چکا تھا اور اس میں موجود ساڑی باہر نکال لی تھی۔

"یہ تم نے یقیناً اپنی بیوی کے لیے خریدی ہے؟" ساڑی اس نے بابر کی نظروں کے سامنے لہرائی۔ وہ بنا جواب دیے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم اپنی بیوی کو اس ساڑی میں دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہو گے۔ چچ چچ ..... مجھے تو تمہاری قسمت پر رونا آ رہا ہے۔ چلو ایسا کرتے ہیں کہ تمہاری بیوی کو یہیں بلوا لیتے ہیں۔ پھر تم اسے یہ ساڑی پہنا لینا..... لیکن ایک شرط ہے۔ اس کے بدن پر جو کپڑے پہلے سے ہوں گے انہیں ہم اتاریں گے۔" وہ جو دھمکی دے رہا تھا، بابر کو بخوبی سمجھ آ رہی تھی۔ معاملہ اب اس کی جان سے بڑھ کر عزت تک آ پہنچا تھا۔ جان اسے ہر حال میں دینی تھی لیکن بیوی کو بے آبرو کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

"وہ اسلام آباد میں میری خالہ کے گھر میں ہیں۔ وہ سیکٹر....." پست آواز میں وہ خالہ کے گھر کا پورا ایڈریس بتاتا چلا گیا۔ اُدھر مکمل پتا بتا کر اس کی زبان خاموش ہوئی، اِدھر کمرے میں ایک فائر کی آواز گونجی۔ چند انچ کے سیسے نے اس کے سینے میں اتر کر اس دل کی دھڑکنوں کو خاموش کر دیا تھا جو مشکل سے ایک ڈیڑھ گھنٹے قبل بڑی لے میں دھڑک رہا تھا اور اپنی بیوی کو سرپرائز دینے کے خیال سے مسرور تھا۔ سرپرائز تو اس بے چاری کو اب بھی ملتا ..... جب شوہر کی زخم زخم لاش اس کی چوکھٹ پر اترتی اور اس پر خوشیوں کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتے .....

☆☆☆

"کشور......" وہ گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی کہ آفتاب نے اسے آہستہ سے ہلاتے ہوئے سرگوشی میں پکارا۔

"کیا بات ہے آفتاب..... آپ ابھی تک سوئے نہیں؟" وہ اٹھ کر بیٹھی اور حیرت سے پوچھنے لگی۔ رات اگرچہ بہت زیادہ نہیں گزری تھی اور گیارہ بجے سے کچھ اوپر کا ہی وقت ہوا تھا لیکن یہاں جلد سو جانے کے رواج کی وجہ سے وہ دونوں بھی جلدی ہی سو جاتے تھے۔ کشور جب سونے کے لیے لیٹی تھی تو

آفتاب بھی اس کے ساتھ ہی بستر پر لیٹا تھا اور فوراً ہی آنکھیں بند کر کے خاموشی بھی اختیار کرلی تھی۔ اس نے یہی گمان کیا تھا کہ وہ دن بھر کام میں مصروف رہنے کی وجہ سے تھک گیا ہے اس لیے جلد نیند آگئی ہے لیکن اب وہ جس طرح چاق و چوبند اور تیار اس کے سرہانے کھڑا تھا، اس سے تو یہی لگتا تھا کہ وہ سرے سے سویا ہی نہیں تھا۔

''آپ اٹھ کر منہ ہاتھ دھولیں اور برقع پہن لیں۔ ہمیں فوری طور پر یہاں سے روانہ ہونا ہے۔'' آفتاب نے سنجیدگی سے اس کے سوال کا جواب دیا۔

''یا اللہ خیر! ایسا کیا ہو گیا کہ ہمیں رات کے اس اندھیرے میں یوں اچانک روانہ ہونا ہے؟'' پکڑے جانے کا خوف تو ہر پل ہی اس کے اعصاب پر سوار رہتا تھا۔ آفتاب نے نیند سے اٹھا کر اچانک روانگی کی اطلاع دی تو یہی خیال ذہن میں آیا کہ کوئی انہونی ہوگئی ہے اس لیے سراسیمہ ہوکر پوچھنے لگی۔

''آپ گھبرائیں مت اور آرام سے تیار ہوں۔ فوری طور پر خطرے کی کوئی بات نہیں ہے...... لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا مزید اس گھر میں رہنا آپ کے لیے مناسب نہیں ہوگا اس لیے میں نے کسی اور جگہ رہائش کا بندوبست کرلیا ہے اور کچھ دیر بعد ہم وہیں جانے والے ہیں۔'' آفتاب نے نہایت رسان سے اسے بتایا پھر بھی وہ چونک گئی اور غور سے آفتاب کی شکل دیکھنے لگی۔ اس کے اس فوری فیصلے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بدر کی دوپہر والی بدتمیزی سے واقف تھا اور اُس وقت جان بوجھ کر انجان بن گیا تھا۔

''آپ ایسا بدر کی وجہ سے کر رہے ہیں نا...... لیکن اُسے تو خالہ نے اسی وقت گھر سے نکال دیا تھا۔ اب ہم اس طرح اچانک خالہ کو چھوڑ کر چلے گئے تو یہ اُن کے ساتھ زیادتی والی بات ہوگی۔'' اسے آفتاب کا فیصلہ اس حساب سے مناسب نہیں لگا تھا کہ خالہ نے ان کی محبت میں اپنے اکلوتے بیٹے کو گھر بدر کر دیا اور اب وہ خالہ کو چھوڑ کر چلے گئے تو وہ بالکل اکیلی رہ جائیں گی۔

''آپ جذباتی ہوکر مت سوچیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ بدر اپنے گھر واپس لوٹ کر نہ آئے۔ خالہ نے فی الحال جذبات میں اسے نکال دیا ہے لیکن ہیں تو بہر حال وہ اس کی ماں۔ دو چار دن میں ان کا غصہ ٹھنڈا پڑ جائے گا اور وہ آپ سے شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے اسے گھر آنے کی اجازت دے دیں گی۔ بالفرض وہ اپنے قول پر قائم بھی رہتی ہیں تو کیا آپ کے خیال میں بدر جس قماش کا آدمی ہے، وہ چپ چاپ یہ سب برداشت کر لے گا؟ وہ تو ہنگامہ مچا دے گا اور ہم پہلے ہی اتنے مشکل حالات میں گھرے ہوئے ہیں کہ مزید کسی نئی دشمنی کو افورڈ نہیں کر سکتے۔ مناسب یہی ہے کہ ہم خاموشی سے یہ گھر چھوڑ دیں۔'' اس نے کشور کو سمجھایا۔

''ہم صبح خالہ کو بتا کر بھی تو جا سکتے ہیں؟ ہمارے اس طرح جانے سے انہیں دکھ ہوگا۔'' وہ اب بھی تذبذب کا شکار تھی۔

''نہیں، ہم نے انہیں بتایا تو وہ ہمیں روکنے کی کوشش کریں گی اور آپ ان کے پُرخلوص اصرار پر جذباتی ہوکر مجھے ان کا مطالبہ ماننے پر مجبور کریں گی...... تو اس لیے بہتر ہے کہ میں ایسی کوئی گنجائش ہی نہ چھوڑوں کہ ایسی کسی سچویشن کا سامنا کرنا پڑے۔'' آفتاب نے صاف انکار کیا۔

''جیسی آپ کی مرضی۔ جب آپ فیصلہ کر ہی چکے ہیں تو میں آپ سے اختلاف کیسے کر سکتی ہوں۔'' وہ کچھ روٹھی ہوئی سی بستر سے اٹھ کر ملحقہ غسل خانے میں گھس گئی۔ غسل خانے میں جاتے جاتے اس نے یہ دیکھ لیا تھا کہ جو سفری بیگ وہ اپنے ساتھ لے کر آئے تھے، بالکل تیار کمرے کے وسط میں رکھا تھا اور آفتاب نے ٹیبل پر موجود اپنے لکھنے پڑھنے کا سامان بھی سمیٹ لیا تھا۔ یعنی وہ اس کے سونے کے دوران روانگی کی مکمل تیاری کر چکا تھا بلکہ اصل تیاری تو دن میں کسی وقت اس کی کمرے میں عدم موجودگی کے دوران ہوئی ہوگی۔ رہائش گاہ کا بندوبست کیے بغیر وہ دونوں بھلا اس وقت کہاں جا سکتے تھے۔ آفتاب کے اس رویّے پر اس سے کچھ کچھ ناراض وہ غسل خانے میں جا کر منہ ہاتھ دھونے لگی۔ دوسری طرف آفتاب اس کے انتظار میں بستر پر ہی ٹک گیا تھا۔ اس نے کشور کی ناراضی کو بخوبی محسوس کیا تھا لیکن فی الحال نظر انداز کر دینے پر اس لیے مجبور تھا کہ اس کی اپنی اندرونی کیفیت کچھ مضطرب سی تھی۔

بدر کی کشور سے بدتمیزی کے بعد اس نے خالہ کا رویّہ دیکھا تھا اور ان کے خلوص اور حق پرستی سے متاثر بھی ہوا تھا۔ کسی غیر کو اپنے سگے بیٹے پر ترجیح دینا کوئی معمولی بات نہیں تھی لیکن اس کے باوجود اس کا دل نہیں مانا تھا کہ وہ کشور کے ساتھ مزید یہاں رُکے۔ یہاں مزید رُکنے کے خیال سے ہی اسے عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگتی تھی۔ چنانچہ اس نے بہت سوچ سمجھ کر اخبارات میں شائع ہونے والے اشتہارات کی مدد سے ایک اسٹیٹ ایجنسی سے رابطہ کیا اور کسی نہ کسی طرح مالک کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اشتہار میں مذکور فلیٹ کو آج ہی ان کے حوالے کر دے گا۔ اس سلسلے میں اُس نے مالک کی تمام شرائط قبول کرنے اور ایڈوانس و کرایہ فوری طور پر ادا کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ اسے اس فیصلے میں آسانی اس لیے بھی رہی تھی کہ اسلام آباد پہنچتے ہی کشور نے اپنی انگلی میں موجود ایک ڈائمنڈ رنگ فوری طور پر فروخت کردی تھی تاکہ وقتِ ضرورت ان کے پاس نقد رقم موجود رہے۔ ڈائمنڈ رنگ ٹھیک ٹھاک قیمت پر فروخت ہوئی تھی۔ کرایہ اور ایڈوانس دینے کے بعد بھی ان کے پاس کچھ نہ کچھ رقم ضرور بچ جاتی۔ اس رقم سے وہ اپنے ابتدائی اخراجات پورے کر سکتے تھے۔ اس کے بعد تو آفتاب کو اس کے کالمز کا معاوضہ ملنا شروع ہو جاتا تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں رہتا۔ وہ دونوں بہت آرام سے، بشرطیکہ دشمن انہیں رہنے دیتے...... اپنی زندگی گزار سکتے تھے۔ انہی سوچوں کے تانے بانے میں الجھا وہ بیڈ پر بیٹھا تھا کہ کشور چہرے کو تولیے سے تھپتھپاتی ہوئی غسل خانے سے باہر نکلی۔

''مجھے ذرا کاغذ قلم تو دے دیں۔ میں خالہ کے نام ایک مختصر سا رقعہ ہی لکھ دوں۔'' ناراضی کا اظہار کرتے لہجے میں اس نے آفتاب سے مطالبہ کیا تو اس نے بنا کسی تعرض کے دونوں چیزیں اس کے حوالے کر دیں۔ کشور نے مختصر وقت میں رقعہ لکھ کر اسے ٹیبل پر پیپر ویٹ تلے رکھا اور برقع اوڑھ کر اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ اس نے آفتاب سے یہ تک پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟ اور یہ واحد عمل تھا جس کے پیچھے اس کی ناراضی کے بجائے آفتاب پر موجود حد درجے کا اعتماد تھا۔ بہت احتیاط سے سیڑھیاں طے کر کے وہ دونوں نچلی منزل پر پہنچے۔ وہاں مکمل خاموشی اور تاریکی تھی اور صرف خالہ والے کمرے کے دروازے کے نیچے سے جھانکتی نائٹ بلب کی نیلگوں روشنی بتا رہی تھی کہ وہاں کوئی ذی نفس موجود ہے۔

اس بوڑھی عورت کو یوں تنہا چھوڑ کر جاتے ہوئے کشور کا دل بھر آیا لیکن اس کی مجبوری تھی کہ وہ آفتاب سے اختلاف رکھنے کے باوجود اس کی بات نہیں ٹال سکتی تھی۔ نہایت بوجھل دل کے ساتھ وہ اس کے ہمراہ گھر سے باہر نکل آئی۔ دروازے میں آٹومیٹک لاک لگا تھا اس لیے وہ دونوں مطمئن تھے کہ گھر کو غیر محفوظ چھوڑ کر نہیں جا رہے۔ باہر نکلتے ہی کشور نے آفتاب کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ایسا اس نے اسے سہارا دینے کے لیے کیا تھا تاکہ اس کو اپنی ٹانگ کی تکلیف کی وجہ سے چلنے میں دشواری پیش نہ آئے۔ اس کا مقصد سمجھتے ہوئے آفتاب زیر لب مسکرایا۔ اسے اطمینان تھا کہ کشور اس سے ناراض تو ہو سکتی ہے لیکن محبت کرنا نہیں چھوڑ سکتی۔ اندھیرے کی وجہ سے کشور اس کی یہ مسکراہٹ نہیں دیکھ سکی۔

وہ دونوں قدم بہ قدم ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہوئے گلی سے باہر نکل گئے اور دائیں طرف اس راستے پر چلنے لگے جو ٹیکسی اسٹینڈ تک جاتا تھا۔ انہیں قطعی علم نہیں تھا کہ جب وہ اس راستے پر مڑے ہیں تو عین اسی وقت بائیں جانب سے آنے والی ایک گاڑی خالہ کی گلی میں داخل ہوئی ہے اور سیدھی خالہ کے دروازے کے آگے جا ٹھہری ہے۔ گاڑی سے اترنے والے افراد وہی تھے جنہوں نے بابر کو اغوا کرنے کے بعد اس سے بے پناہ جسمانی و ذہنی تشدد کے ذریعے آفتاب کا یہ موجودہ پتا معلوم کیا تھا۔ ان افراد کی تعداد میں البتہ مزید دو کا اضافہ ہو گیا تھا لیکن ان کا لیڈر وہی نیلی شلوار قمیص والا شخص ہی تھا۔ یہ آدمی اور اس کا ساتھی پہلوان، دونوں کا پیرآباد سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ لاہور کے رہائشی تھے اور رقم لے کر ہر قسم کے مجرمانہ کام سرانجام دیتے تھے۔ بالے کے بستر سے لگ جانے کے بعد چودھری کو مجبوراً ان لوگوں سے رابطہ کرنا پڑا تھا۔ انہیں ہائر کرنے کی کئی وجوہات تھیں۔ پہلی تو یہ کہ وہ اپنے مزید ملازموں کو اس معاملے میں ملوث نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ جس قدر راز داں بنائے گا، بات اتنی ہی کھلے گی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس نے اپنے خاص لوگوں کو پوست کی کاشت کرنے والے مزارعوں کی نگرانی پر رکھ چھوڑا تھا۔ کچھ افراد اسے اپنی سیکیورٹی کے علاوہ مہمان بن کر آنے والی لینڈا کے لیے بھی درکار تھے۔ ان اتنے سارے کام کے بندوں کو چھوڑنے کے بعد بھی بے شک اس کے پاس کئی نمک خوار بچ جاتے تھے لیکن یہ وہ لوگ تھے جن کی موٹی عقلوں پر وہ بھروسا نہیں کر سکتا تھا اور وہ بس مار دھاڑ کے ہی کام آتے تھے۔ چنانچہ ان حالات میں اسے کرائے کے ان ٹٹوؤں کا سہارا لینا پڑا۔

نیلی شلوار قمیص والے شخص کا نام شاور تھا اور وہ بہت اونچے دام لے کر کسی پارٹی کے لیے کام کرتا تھا۔ خالہ کے گھر کے دروازے کے سامنے گاڑی رکنے کے بعد اس نے اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا تو وہ سر ہلاتا ہوا گاڑی سے اتر کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے کے قریب جا کر لاک پر جھکنے کے بعد اس نے مشکل سے ایک منٹ ہی صرف کیا ہوگا کہ لاک کھل گیا۔ لاک کھولنے والا یہ شخص بہت ماہر نقب زن تھا اور نقب زنی کی بڑی بڑی وارداتوں میں خفیہ ترین لاکرز کے پیچیدہ ترین لاکس کو بھی بڑی کامیابی سے کھولنے یا توڑنے میں کامیاب رہا تھا۔ اس جیسے شخص کے سامنے بھلا ایک گھر کے گیٹ پر موجود لاک جو بے شک مکینوں کے خیال میں خاصا مضبوط تھا، کیا اہمیت رکھتا تھا۔ ایک منٹ سے بھی قلیل وقت میں لاک کھولنے کے بعد اس نے گاڑی کی طرف رخ کر کے ہاتھ سے کامیابی کا اشارہ کیا تو شاور، پہلوان اور ان کا ایک اور ساتھی گاڑی سے اتر آئے۔ ان کے اترتے ہی گاڑی آگے بڑھ گئی جبکہ وہ سب دندناتے ہوئے گھر کے اندر جا گھسے۔ پورے گھر

پر خاموشی کا راج تھا۔ انہوں نے ایک ایک کر کے سارے کمرے دیکھ ڈالے۔ ایک کمرے میں سوئی ہوئی خالہ کے سوا انہیں وہاں کوئی دوسرا ذی نفس نظر نہیں آیا۔

''اوپر کی منزل چیک کرو۔'' شاور نے حکم دیا تو پہلوان اور ایک آدمی اوپر چڑھ گئے۔

''اوپر بھی پورا گھر خالی پڑا ہے۔ کوئی موجود نہیں ہے۔'' ذرا دیر بعد نیچے آ کر انہوں نے اطلاع دی تو شاور سوچ میں پڑ گیا۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ بابر نے ہمیں دھوکا دیا ہو اور مرتے مرتے جھوٹ بول گیا ہو؟'' اس نے پہلوان سے رائے لی۔

''ایسا لگتا تو نہیں۔ اس کی اطلاع میں کوئی تو سچائی تھی۔ اس گھر کو دیکھ کر بھی یہی لگتا ہے کہ یہاں ایک سے زیادہ لوگ رہتے ہیں اور فی الحال کہیں گئے ہوئے ہیں۔'' پہلوان نے اپنا بڑا سا سر ہلاتے ہوئے رائے دی۔

''ایسا کرو کہ اس بڑھیا کو اٹھا کر اس سے پوچھو۔ اگر وہ لوگ کہیں گئے ہوئے ہیں تو اسے ضرور معلوم ہوگا۔'' پہلوان کی رائے سے متفق ہوتے ہوئے شاور نے حکم دیا۔

''اے بڑی بی! بہت سولیں۔ اب اٹھ جاؤ۔'' حکم ملنے پر ایک آدمی نے بےدردی سے خالہ کو جھنجوڑ کر جگایا۔ وہ بے چاری بلڈ پریشر کی دوا کھا کر سوئی تھیں اسی لیے گھر میں مچی ہلچل سے بےخبر گہری نیند سو رہی تھیں۔ اس طرح جگائے جانے پر ہڑبڑا کر اٹھیں اور اپنے اردگرد موجود ان چاروں افراد کو خوف زدہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔

''کک...... کون ہو تم لوگ؟'' انہوں نے ہکلاتے ہوئے بہ مشکل یہ سوال کیا۔

''ہم جو بھی ہیں تم بتاؤ کہ وہ ماسٹر کہاں ہے جسے تم نے اپنے گھر میں چھپا رکھا ہے؟'' شاور نے آگے بڑھ کر ان کی گردن دبوچتے ہوئے پوچھا تو خالہ کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ بابر نے آفتاب اور کشور کو یہاں بھیجتے ہوئے سرسری ساذکر تو کیا تھا کہ انہیں اپنے کچھ دشمنوں سے بچنے کے لیے پناہ کی ضرورت ہے لیکن وہ دشمن ایسے خطرناک ہوں گے کہ آدھی رات کو تالا توڑ کر ان کے گھر میں آگھسیں گے، اس کی انہیں امید نہیں تھی۔

''جلدی بتا بڑھیا! کہاں ہیں وہ لوگ؟'' شاور نے خالہ کی گردن پر کچھ اور دباؤ ڈالتے ہوئے اپنا سوال دہرایا اور ساتھ ہی منہ پر ایک تھپڑ بھی دے مارا۔ اس بے چاری بوڑھی عورت کے لیے اتنا تشدد بھی بہت تھا۔

''او...... پر۔'' انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے بہ مشکل بتایا۔

''وہاں کوئی نہیں ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں۔'' اس ڈر سے کہ کہیں بڑھیا کچھ بتانے سے قبل ہی مر نہ جائے، شاور نے ان کے گلے پر سے ہاتھ ہٹالیا اور جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''وہ اوپر ہی ہیں۔'' گلا چھوڑے جانے پر خالہ پہلے کھانسیں۔ کھانسی قابو میں آئی تو بڑے وثوق سے زور دے کر بولیں۔ ویسے انہیں حیرت تھی کہ آفتاب اور کشور کہاں چلے گئے ہیں جو ان لوگوں کو نہیں ملے۔ اس حیرت میں یہ خوشی بھی شامل تھی کہ وہ دونوں ان دشمنوں کے ہتھے نہیں چڑھ سکے۔ ان کے دشمنوں سے بچ جانے پر دل ہی دل میں اطمینان محسوس کرتی وہ بڑے اعتماد سے بولیں۔ ''میں خود اوپر جا کر دیکھتی ہوں۔ وہ دونوں وہیں ہوں گے۔'' ان کے اس اعتماد کو دیکھتے ہوئے شاور نے کوئی تعرض نہیں کیا اور خود بھی ان کے پیچھے چل پڑا۔

''یہ میرے بیٹے کا کمرا ہے اور اس کمرے میں آفتاب اور اس کی بیوی ٹھہرے ہوئے ہیں۔'' اوپر پہنچ کر انہوں نے اس انداز میں شاور کو بتایا جیسے انہیں اب بھی پختہ یقین ہو کہ آفتاب اور کشور کمرے میں ہی موجود ہوں گے۔ ان کے پر یقین لہجے نے شاور کو بھی تذبذب میں ڈال دیا کہ کہیں تلاشی کے لیے اوپر آنے والوں سے کوئی غلطی تو نہیں ہوئی۔ کیا معلوم کہ وہ دونوں کمرے میں ہی کسی ایسی جگہ چھپ گئے ہوں جہاں اس کے آدمیوں کا دھیان نہ گیا ہو۔ وہ کچھ چوکنا سا خالہ کے پیچھے کمرے میں داخل ہوا۔ خالہ خود کچھ پریشان سی کھڑی کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پوری طرح سے روشن کمرے کا منظر بالکل واضح تھا۔ باتھ روم کا کھلا دروازہ اور الماریوں کے کھلے...... پٹ بتا رہے تھے کہ وہاں کی بہت اچھی طرح تلاشی لی جا چکی ہے۔ خالہ نے ایک نظر میں ہی دیکھ لیا تھا کہ نہ تو الماری میں آفتاب اور کشور کا سامان ہے اور نہ ہی میز پر کتابوں اور کاغذات کا وہ پلندا جو سارا دن آفتاب کی توجہ کا مرکز بنا رہتا تھا۔ کمرے کی واحد کھڑکی جس کے بارے میں انہوں نے گمان کیا تھا کہ دشمنوں کے گھر کے اندر آگھسنے سے واقف ہو جانے کی وجہ سے وہ دونوں میاں بیوی پھاند کر فرار ہو گئے ہوں گے، اندر سے بند تھی۔ اس صورتِ حال پر وہ خود خاصے تذبذب کا شکار نظر آنے لگیں۔ آخر تو یہی بتا رہے تھے کہ آفتاب اور کشور پہلے ہی اپنا سامان سمیٹ کر خاموشی سے وہاں سے چلے گئے ہیں۔ یک دم ہی ان کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور دوپہر والا واقعہ یاد آ گیا۔ وہ سمجھ گئیں کہ وہ دونوں اس واقعے کی وجہ سے ہی اچانک وہاں سے چلے گئے ہیں۔ وہ دل شکستہ سی رائٹنگ ٹیبل کے ساتھ رکھی کرسی پر ٹک گئیں۔ اسی وقت ان کی نظروں میں پیپر ویٹ کے نیچے دبا وہ کاغذ آ گیا۔ انہوں نے کاغذ نکال

کر اس پر لکھی تحریر پڑھی۔ وہ تحریر کشور کی طرف سے تھی۔ اس نے لکھا تھا۔

''پیاری خالہ!

میں معذرت چاہتی ہوں کہ آپ کو اطلاع دیے بغیر ہم لوگ یہاں سے جا رہے ہیں۔ اصل میں آفتاب نے دوپہر والا واقعہ دیکھ لیا تھا اور اب وہ ایک دن بھی یہاں رکنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہم کہاں جا رہے ہیں، فی الحال مجھے بھی معلوم نہیں ہے۔ کبھی موقع ملا تو آپ سے ملنے ضرور آؤں گی۔ ہم دونوں میاں بیوی اور ہمارے ہونے والے بچے کو اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیے گا۔

آپ کی شرمسار بیٹی کشور۔''

خالہ نے یہ مختصر رقعہ پڑھنے کے بعد شاور کی طرف بڑھا دیا۔ وہ مشکل سے آخری لائن پڑھ سکا تھا کہ ڈور بیل زور زور سے بجنے لگی۔

''نیچے چلو۔'' کچھ نہ ملنے کا یقین ہو جانے پر شاور نے انہیں حکم دیا تو انہوں نے خاموشی سے حکم کی تعمیل کی۔ ان کا دل بہت بوجھل ہو رہا تھا۔ دوسری طرف گھنٹی مسلسل بجے جا رہی تھی۔ شاور نیچے پہنچا تو اس نے اپنے ساتھیوں کو تذبذب کے عالم میں پایا۔

''کیا ہوا؟ کون ہے باہر؟'' اس نے ان تینوں سے دریافت کیا۔

''لگتا ہے اس بڑھیا کا بیٹا ہے۔ کم بخت نشے میں ہے اور بڑا شور مچا رہا ہے۔ کہیں شور سن کر محلے والے نہ جمع ہو جائیں۔'' پہلوان نے تشویش سے جواب دیا تو شاور نے بھی اپنے کان باہر سے آنے والی آوازوں پر لگا دیے۔

''دروازہ کھولو۔ کوئی الو کا پٹھا مجھے اس گھر میں آنے سے نہیں روک سکتا۔ یہ میرے باپ کا گھر ہے۔ میری ماں بھی مجھے یہاں سے نہیں نکال سکتی۔ جس کے لیے اس نے میری بے عزتی کی ہے اس کا میں حشر خراب کر دوں گا۔ خود کو سمجھتی کیا ہے وہ آوارہ گھر سے بھاگی ہوئی عورت۔ میں پچ چورا ہے پر لے جا کر اس آوارہ کی عزت خراب کروں گا۔'' اس سے آگے گالیوں کا ایک طوفان تھا جو وہ مسلسل کسی نامعلوم عورت کو دے رہا تھا۔ شاور جس نے کشور کا خط پڑھ لیا تھا، کافی حد تک معاملے کو سمجھ گیا تھا لیکن اسے خود بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ باہر موجود اس شرابی کا کیا کیا جائے جسے یہ بھی ہوش نہیں تھا کہ دروازہ غیر مقفل ہے اور ذرا سا دھکا دینے پر کھل سکتا ہے۔ وہ بس اپنی ہی دھن میں بیل بجانے اور گالیاں دینے میں مصروف تھا۔

''ٹھیک ہے۔ مت کھولو دروازہ۔ میں لاک ہی توڑ دوں گا۔'' شاور نے اپنے ایک آدمی کو دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا ہی تھا کہ باہر سے بدر کی دھمکی سنائی دی اور اگلے ہی لمحے فائر کی آواز گونجی۔ دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھنے والا آدمی اس گولی کی زد میں آ گیا اور اس کے حلق سے زوردار چیخ بلند ہوئی۔ وہ اپنا پیٹ پکڑ کر نیچے بیٹھتا چلا گیا۔ اسی پل بدر نے گھر میں قدم رکھا۔ اپنے ساتھی کو لگنے والی گولی نے شاور کو طیش دلا دیا تھا چنانچہ اس نے ہاتھ میں موجود گن سیدھی کی اور لگاتار کئی گولیاں بدر کے ڈگمگاتے وجود میں اتار دیں۔ اس انتقامی کارروائی کے بعد وہ اور اس کے ساتھی وہاں رکے نہیں اور اپنے زخمی ساتھی کو اٹھا کر باہر کی جانب بھاگے۔ ڈرائیور سمیت کچھ فاصلے پر کھڑی ان کی گاڑی فوراً ہی نزدیک آئی اور وہ سیکنڈوں میں اس میں سوار ہو کر وہاں سے فرار ہو گئے۔

اس سارے شور ہنگامے پر بیدار ہو جانے والے محلے دار فرار ہوتے مجرموں کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکے تھے البتہ دوڑ کر خالہ کے گھر تک پہنچے۔ گیٹ سے دو قدم اندر ہی بدر کی اپنے خون میں نہائی ہوئی لاش پڑی تھی اور اس سے چند قدم کے فاصلے پر بیٹے سے اس کی آوارہ گردی پر سدا ناراض رہنے والی ماں گری ہوئی اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ اپنے لختِ جگر کو خون میں نہایا ہوا دیکھ کر اس کا دل ہمت ہار بیٹھا کیونکہ وہ ایک ایسی ماں کا دل تھا جو بیٹے پر گھر کے دروازے تو بند کر سکتی تھی، دل کے دروازے نہیں۔

☆☆☆

''آپ کی کارکردگی قابلِ اطمینان ہے۔ میں واپس جا کر ڈیوڈ کو رپورٹ دوں گی تو وہ بہت خوش ہوگا ورنہ پچھلے دنوں آپ جس بے پروائی کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں، اس کی وجہ سے وہ تشویش کا شکار تھا اور آپ کی جگہ کسی اور کو دینے پر غور کر رہا تھا...... لیکن میں نے اُسے روکا کہ میں خود جا کر چودھری صاحب کو دیکھتی ہوں۔ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا کہ چودھری صاحب میری خاطر بھی کام پر توجہ نہ دیں اور مجھے خوشی ہے کہ آپ نے مجھے ناامید نہیں کیا۔'' وہ لوگ کاشت شدہ پوست کا جائزہ لے کر واپس پلٹ رہے تھے جب لنڈا نے چودھری کے ساتھ چلتے ہوئے لگاوٹ بھرے لہجے میں اس سے یہ باتیں کہیں۔ اس کے موجودہ لہجے کو سن کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ کل یہی عورت اپنی مکمل حاکمیت ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھی اور چودھری جیسے بندے سے پُررعونت انداز میں بات کر رہی تھی۔ چودھری نے اس کا یہ لگاوٹ بھرا لہجہ سنا لیکن کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ وہ بہت سنجیدہ اور خاموش تھا۔

''اپنا موڈ ٹھیک کریں چودھری صاحب! آپ اس طرح

خاموش رہیں گے تو شکار کا کیا خاک مزہ آئے گا؟" لنڈا نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے ایک ادا سے ٹوکا تو اس کے لمس کی سنسناہٹ چودھری کے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ جانے اس عورت میں کیا جادو تھا کہ جب چاہے مرد کو ایک پل میں چاروں شانے چت کر دیتی تھی۔

"فکر نہ کرو ڈارلنگ! ہم تمہیں ایسا شکار کروائیں گے کہ ہمیشہ یاد رکھو گی لیکن خود ہم افسردہ ہیں کہ ہمارا شکار ہاتھ آتے آتے نکل گیا۔ جب تک ہم اس ماسٹر کے بچے اور اپنی باغی بیٹی کو ان کے انجام تک نہیں پہنچا دیتے، ہمیں چین نہیں آئے گا۔" لنڈا کے ہاتھ کی نرمی اور حدت کو محسوس کرتے ہوئے چودھری نے اسے جواب دیا۔

"اب یہ تو آپ کی بیڈ لک ہے نا کہ وہ دونوں پہلے ہی نکل گئے تھے ورنہ ہم نے تو آپ سے دوستی نبھاتے ہوئے آپ کو بالکل صحیح کلیو دیا تھا۔ حالانکہ اس طرح کے مسائل حل کرنا ہمارے اور آپ کے درمیان ہونے والے اگریمنٹ میں طے بھی نہیں ہوا ہے۔" بے نیازی سے شانے جھٹکتے ہوئے اس نے جواب دیا تو چودھری جواباً کچھ کہہ بھی نہیں سکا۔ حقیقت تو یہی تھی کہ آفتاب اور کشور والا معاملہ اس کا نجی مسئلہ تھا جسے حل کرنے کی ذمے داری ان لوگوں پر عائد نہیں ہوتی تھی۔

"یہاں جنگل میں شکار کی کیا صورت حال ہے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمیں بہت زیادہ وقت برباد کرنا پڑے۔ میں چار پانچ گھنٹوں سے زیادہ یہاں رکنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ میرا شیڈول کافی سخت ہے۔ پرسوں صبح تک مجھے ہر صورت روانہ ہونا ہے۔" چودھری کی خاموشی کو بھانپ کر لنڈا نے خود ہی موضوع بدل دیا۔ وہ لوگ شکار کے بہانے ہی جنگل میں آئے تھے۔ یہاں پہنچ کر ایک مناسب مقام پر انہوں نے جیپیں روکیں اور ملازموں کو خیمے نصب کرنے اور شکار کے سلسلے میں دیگر تیاریاں کرتا ہوا چھوڑ کر پیدل اس سمت نکل گئے جہاں پوست کی کاشت کی جا رہی تھی۔ ان کے ساتھ دو مسلح محافظ بھی تھے جو اب بھی کچھ فاصلے سے ان کے پیچھے چل رہے تھے۔ خود چودھری کے شانے سے بھی اس کی شکاری بندوق لٹک رہی تھی۔ گاؤں کی طرح جنگل میں بھی اس کا راج چلتا تھا اس لیے اس سے زیادہ حفاظتی انتظامات کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

"شکار یہاں بہت ملتا ہے۔ دو تین گھنٹوں میں بھی ہم اچھا خاصا شغل کر لیں گے۔ اس حوالے سے تم پریشان مت ہو۔" چودھری نے اسے تسلی دی اور پھر خود یک دم ٹھٹک کر رک گیا۔

"کیا ہوا چودھری صاحب؟" اس کے اس طرح ٹھٹکنے پر لنڈا نے بھی اپنے قدم روک لیے اور پوچھا۔

"شش......" چودھری نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور چند فٹ کے فاصلے پر موجود جھاڑیوں پر نظر گاڑتے ہوئے شانے پر لٹکی بندوق اتاری۔

"ان جھاڑیوں کے پیچھے ایک ہرن چھپا ہوا ہے۔" بندوق سیدھی کرتے ہوئے اس نے سرگوشی میں لنڈا کو بتایا تو وہ غور سے جھاڑیوں کا جائزہ لینے لگی۔ اس کی نظروں نے بھی ہرن کو گرفت میں لے لیا۔

"مجھے دیں بندوق۔ میں اسے شکار کروں گی۔" اس نے چودھری کے ہاتھوں سے بندوق جھپٹ لی لیکن اس دوران ہرن نے خطرے کی بو سونگھ لی تھی چنانچہ اس کے لبلبی دبانے سے پہلے ہی جھاڑیوں سے نکل کر بھاگا۔ اس کے بھاگنے کی پروا نہ کرتے ہوئے لنڈا نے بندوق سیدھی کی اور پورے سکون کے ساتھ فائر داغ دیا۔ بھاگتا ہوا ہرن گولی کھا کر اچھلا اور زمین پر گر گیا۔ ان کے پیچھے چلنے والے چودھری کے ملازم تیزی سے زخمی ہرن کی طرف دوڑے۔

"بہت خوب! بھاگتے ہوئے جانور کا اتنا سچا نشانہ لینا بڑے کمال کی بات ہے۔" چودھری نے اسے بے ساختہ سراہا۔

"میرا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا چودھری صاحب۔" لنڈا نے ایک ادا سے سر جھٹکتے ہوئے معنی خیز لہجے میں جواب دیا اور بندوق واپس چودھری کو تھما دی۔

"یہ تو خیر ماننے والی بات ہے۔" چودھری مسکرایا۔ وہ اپنے سابقہ موڈ سے نکل آیا تھا اور پوری طرح لنڈا کی طرف متوجہ تھا۔ لنڈا نے اس کے مزاج میں در آنے والی اس تبدیلی کو محسوس کر لیا اور زیر لب مسکرائی۔ اس کی موجودگی میں کوئی مرد زیادہ دیر تک اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا تھا، اس بات کا اسے خاصا تجربہ تھا۔

"میں نے آپ سے کہا تھا کہ کل شام اے سی اور دوسرے خاص خاص لوگوں کو ڈنر پر انوائٹ کر لیں۔ ذرا مل کر دیکھتے ہیں آپ کے اے سی صاحب سے کہ موصوف کتنے پانی میں ہیں۔" وہ لوگ اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھے جہاں ان کے خیمے نصب تھے، تب لنڈا نے چودھری سے کہا۔

"میں نے معلوم کروایا تھا۔ اے سی آج کل چھٹیوں پر اپنے گھر لاہور گیا ہوا ہے۔ اگر تم چاہو تو میں دوسرے لوگوں کو انوائٹ کر لیتا ہوں۔"

"نہیں پھر رہنے دیں۔ مجھے تو صرف اے سی سے ہی ملنے کا اشتیاق تھا۔" لنڈا نے انکار کیا۔ اس کے پاس شہریار سے متعلق جو خبریں پہنچتی رہی تھیں، انہیں سن سن کر اس کے دماغ میں اس سے ملنے اور اسے تسخیر کرنے کا سودا سا گیا تھا لیکن اب

چودھری نے اسے جو اطلاع دی تھی، اسے سن کر وہ نہ صرف مایوس ہوئی تھی بلکہ یہ بھی سوچا تھا کہ شہریار کی قسمت اچھی ہے جو اس کے حسن کے جال میں پھنسنے کے لیے موجود ہی نہیں۔ اس گفتگو کے بعد دونوں کے درمیان خاموشی رہی اور پھر وہ تین خیموں کے درمیان موجود سب سے بڑے خیمے میں گھس گئے۔

"تھکن سی ہو گئی ہے۔ ذرا کچھ پینے کو تو نکالیں۔" اندر پہنچ کر وہ ایک نرم میٹرس پر گرنے کے انداز میں بیٹھی اور شکار کی مناسبت سے پہنی گئی چمڑے کی جیکٹ اتار کر دور پھینکتے ہوئے ایک زوردار انگڑائی لی۔ جیکٹ کے نیچے اس نے سفید رنگ کا نہایت مختصر بلاؤز پہن رکھا تھا۔ انگڑائی لینے کے عمل میں بلاؤز کا اختصار کچھ اور بھی واضح ہو گیا۔ چودھری نے للچائی ہوئی نظروں سے اس کے سنہری دمکتے جسم کی ہوش ربائیوں کو دیکھا اور شراب کی بوتل اور جام لے کر اس کے بالکل قریب بیٹھ کر اس کے عریاں بازو کو سہلاتے ہوئے بولا۔

"اگر تھک گئی ہو تو تھوڑی دیر آرام کر لو۔ اپنے حصے کا شکار تو تم نے ویسے بھی مار گرایا ہے۔"

لنڈا نے فوراً اس مشورے کو قبول کر لیا اور ایک جام حلق سے اتارنے کے بعد آرام کے لیے دراز ہو گئی۔ آزاد معاشرے کی اس آزاد ترین عورت کا آرام جامے کی قید میں تو ممکن نہیں تھا، چنانچہ جب وہ میٹرس پر دراز ہوئی تو چودھری کے حیوانی جذبات مکمل طور پر بھڑک چکے تھے۔

"میں تمہارے پاؤں دباتا ہوں۔" کسی کو خاطر میں نہ لانے والا کسی پالتو کتے کی طرح اس کے قدموں میں جا بیٹھا اور آہستہ آہستہ ان لمبی سڈول ٹانگوں کو دبانے لگا جو لنڈا کی شخصیت میں سب سے نمایاں اور خوب صورت تھیں۔ چند لمحوں کے لیے ہی ٹانگیں دبانے کے بعد اس کے ہاتھوں نے بھٹکنا شروع کر دیا۔ چت لیٹی لنڈا کی طرف سے کوئی تعرض نہیں ہوا چنانچہ چودھری کے حوصلے بلند ہوتے گئے۔

"کل صبح ایک گاڑی ڈرائیور سمیت میرے حوالے کر دیجیے گا۔ میں آپ کے گاؤں کی سیر کروں گی اور یہاں رہنے والوں سے ملاقاتیں بھی۔" لنڈا نے فرمائش کی۔

"ٹھیک ہے۔" چودھری نے بنا کسی سوال کے ہامی بھر لی۔ ان لمحوں میں اگر وہ کوئی بادشاہ ہوتا اور لنڈا اس سے اس کا تاج و تخت مانگ لیتی تو وہ وہ بھی دے دیتا۔ اتنی معمولی سی فرمائش کے لیے تو کسی حجت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بھری ہوئی شراب کی بوتل سے بڑھ کر نشیلی عورت..... جس کا نشہ چھلکا پڑ رہا ہو، بڑے بڑے پارساؤں اور عقل مندوں کی مت مار دیتی ہے۔ چودھری جیسا نفس پرست تو کسی گنتی میں ہی نہیں آتا تھا جسے وقت کے اس حصے میں اگر کوئی فکر تھی تو بس اتنی کہ کسی طرح ان لمحات کو طویل سے طویل تر کیا جا سکے۔

☆☆☆

"اگر اپنے وطن سے محبت کرتے ہو تو کیفے شان میں گیارہ بجے مجھ سے ملنے آ جاؤ۔ میں تمہارے لیے اجنبی نہیں۔ امید ہے کہ تم دیکھتے ہی پہچان لو گے۔" مختصر پیغام پر مشتمل اس خط کو تیسری چوتھی مرتبہ پڑھنے کے باوجود سرمد اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا کہ اسے یہ عجیب و غریب پیغام کس کی طرف سے ملا ہو گا۔ اسے ملنے والا یہ خط کوریئر سے آیا تھا اور لفافے کے باہر صاف لکھائی میں اس کا نام لکھا تھا چنانچہ وہ یہ شک نہیں کر سکتا تھا کہ کسی اور کا خط اس تک پہنچ گیا ہے۔

"یہ کس کا خط لے کر گم صم بیٹھے ہو، کسی پرانی محبوبہ نے تو نہیں پکار لیا؟" نیلم کمرے میں آئی تو اسے مسلسل ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے دیکھ کر چھیڑا۔ سرمد نے خط اس کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ تو بڑا عجیب سا پیغام ہے۔" مختصر تحریر کو پڑھنے کے بعد اس نے تبصرہ کیا۔

"اسی لیے تو میں پریشان ہو گیا ہوں۔ بھلا یہ کون ہو سکتا ہے جو مجھے جانتا ہے اور میری وطن سے محبت کو آزمانا چاہتا ہے۔"

"کہیں تمہارا کوئی دوست تو نہیں؟ ہو سکتا ہے کسی دوست نے تمہیں یہاں دیکھ لیا ہو اور اسے مذاق سوجھا ہو کہ تمہیں تنگ کرے۔" نیلم نے خیال ظاہر کیا۔

"ایسا ہو بھی سکتا ہے لیکن یہ کوئی پکی بات تو نہیں۔ کچھ اور بھی معاملہ ہو سکتا ہے۔" سرمد تشویش کا شکار تھا۔ نیلم سے شادی کے بعد اس نے جب سے لاہور چھوڑا تھا، کبھی کسی پرانے دوست سے نہیں ملا تھا۔ بس ایک عامر تھا جس سے کبھی کبھی فون پر رابطہ ہو جاتا تھا اور اس کی طرف سے ایسا پیغام ملنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ عامر اچھا خاصا سنجیدہ مزاج تھا اور بخوبی جانتا تھا کہ سرمد اپنے اور نیلم کے گھر والوں سے سامنا نہیں کرنا چاہتا اس لیے ماضی کے تمام دوستوں کو چھوڑ کر کراچی میں بیٹھا ہوا ہے۔ ان حالات میں اسے اس طرح کا مبہم پیغام بھیجنا، اسے پریشان کر دینے کے مترادف تھا اور وہ یہ نہیں کر سکتا تھا۔

"ایسا کرو کہ تمہیں جہاں بلایا گیا ہے، وہاں چلے جاؤ۔ وہ جو بھی ہے، بھرے بازار میں تو تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" نیلم کے نزدیک یہ کسی دوست کی ہی شرارت تھی اور پھر پیغام بھیجنے والے نے بلایا بھی ایک پُرہجوم بازار میں واقع کیفے میں تھا، اس لیے تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔

"میرے خیال میں جانا تو پڑے گا ہی ورنہ خواہ مخواہ ذہن الجھا رہے گا۔" سرمد نے ہامی بھر لی لیکن اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ وہ خط کے پیغام کو اپنی موجودہ ملازمت کے تناظر میں دیکھ رہا تھا اور اس صورت میں یہ صورتِ حال کافی گمبھیر لگ رہی تھی۔

"میں تمہارے لیے چائے بنا دیتی ہوں۔ ابھی سوا دس بجے ہیں۔ چائے پی کر تم نکلو گے تو آرام سے گیارہ بجے تک وہاں پہنچ جاؤ گے۔" اسے جانے کے لیے آمادہ دیکھ کر نیلم اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔ سرمد چائے بہت شوق سے پیتا تھا اس لیے جب بھی وہ اسے خوش کرنا چاہتی یا اس کا دھیان بٹانا مقصود ہوتا تو گرما گرم چائے کی پیالی تیار کر کے پیش کر دیتی۔

"نہیں، رہنے دو اور اگر تمہیں اندر بیگم صاحبہ کے کسی کام سے نہیں جانا تو تھوڑی دیر یہاں میرے پاس بیٹھ جاؤ۔" سرمد یہاں ڈرائیور تھا جبکہ نیلم کچن کا کام سنبھالتی تھی۔ سرمد کو نیلم کا کام کرنا پسند نہیں تھا لیکن یہاں ملازمت کی شرط ہی یہ تھی کہ کوئی ایسا جوڑا ہو جو یہ دونوں کام سنبھال لے چنانچہ نیلم نے ازخود کچن کی ذمے داری سنبھالنے کی ہامی بھر لی۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو انہیں بڑی مشکل ہو جاتی۔ وہ لاہور سے کراچی آتے وقت جو رقم اپنے ساتھ لائے تھے، وہ تیزی سے ختم ہوتی جا رہی تھی اور ملازمت نہ ملنے کی صورت میں انہیں رہائش اور کھانے پینے دونوں کا مسئلہ ہو جاتا جبکہ یہاں یہ دونوں ہی مسئلے آرام سے حل ہو رہے تھے۔

"بیگم صاحبہ بارہ بجے سے پہلے اٹھتی ہی کب ہیں جو مجھے ان کا کوئی کام کرنا ہو گا..... اور اٹھ کر بھی انہوں نے کیا کھا لینا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک گلاس جوس اور اس بدذائقہ براؤن بریڈ کے دو پیس ہی کھائیں گی تو اس کے لیے مجھے کون سے ہل جوتنے ہیں۔ ادھر حکم دیں گی، اُدھر میں دو منٹ میں لے جا کر سامنے رکھ دوں گی۔" نیلم بُرے بُرے منہ بنا کر تبصرہ کرتی ہوئی دوبارہ بیٹھ گئی۔

"ایسا کھانا کھاتی ہے بیگم صاحبہ تب ہی تو اتنی اسمارٹ اور خوب صورت ہے۔ تُو نے تو پراٹھے کھا کھا کر خود پر مُٹاپا چڑھا لیا ہے۔" سرمد نے اس کے فربہی مائل جسم کی طرف دیکھتے ہوئے اسے چھیڑا۔

"تو تجھے کون سا بیگم صاحبہ کی طرح سارے شہر کے لوگوں کا دل لبھانا ہے۔ میں اِدھر تیرے لیے اپنا آپ سنبھال کر بیٹھی ہوں۔ اگر تجھے..... مجھے سوکھا چرخ دیکھنا ہے تو بول۔ آج سے ہی فاقے شروع کر دوں گی۔" نیلم نے چمک کر اس کی بات کا جواب دیا تو وہ ہنس پڑا۔

"تُو تو بُرا ہی مان گئی۔ میں کیوں تیرے سے فاقے کرواؤں گا۔ جو دل میں آئے کھایا پیا کر۔ مجھے تُو ہر حال میں اچھی لگتی ہے۔" اس نے تعریف کے کارگر ہتھیار سے پل میں بیوی کا موڈ بحال کر دیا۔ وہ اس کی بات سن کر خوشی سے مسکرانے لگی۔

"اچھا سن! میں کیفے پہنچ کر تجھے وہاں سے فون کروں گا۔ اگر کوئی دوست ہوا تو لازمی ہے، منع نہیں کرے گا ورنہ تُو سمجھ جانا کہ میں کسی مشکل میں پڑ گیا ہوں۔ اِدھر چوکیدار وغیرہ کو خبر کر دینا۔" اپنے اندر ابھرتے اندیشوں اور خدشات کے پیشِ نظر اس نے نیلم کو ہدایت کرنا ضروری سمجھا۔

"ہائے سرمد! اگر کسی گڑبڑ کا ڈر ہے تو مت جا۔ رہنے دے۔ جس کو ملنا ہو گا، وہ آپ یہاں آ جائے گا۔" اس کی ہدایت سن کر نیلم خوف زدہ ہو گئی اور اسے روکا۔

"لے ..... ابھی تو خود کہہ رہی تھی کہ اتنے ہجوم میں کوئی میرا کیا بگاڑ سکتا ہے اور اب مجھے روک رہی ہے۔ پاگل! میں تو صرف احتیاط کے طور پر ایسا کہہ رہا ہوں ورنہ کسی نے میرا کیا بگاڑنا ہے۔ میری واحد دشمن تو تیری سوتیلی ماں ہے اور اس کی اتنی پہنچ نہیں کہ اِدھر کراچی میں مجھے اور تجھے ڈھونڈ کر نکال سکے۔" اپنے خدشات کے برعکس وہ ہلکے پھلکے لہجے میں نیلم کو تسلی دینے لگا۔

"ٹھیک ہے پھر تُو مجھے پہنچتے ہی فون ضرور کر دینا۔" وہ رضامند ہو گئی۔ سستے سے سیکنڈ ہینڈ موبائل فونز دونوں ہی میاں بیوی کے پاس موجود تھے اس لیے ایک دوسرے سے رابطے میں بھی کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔

"اچھا تو پھر میں نکلتا ہوں۔ کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ دوست سے ملنے گیا ہوں۔" سرمد گھڑی میں وقت دیکھتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ یہاں سے نکل کر کیفے شان پہنچنے میں بیس سے پچیس منٹ تو لگ ہی جاتے اور اب ساڑھے دس بج چکے تھے۔ بیگم صاحبہ سے اجازت لینے کی اسے اس لیے ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی کہ وہ عموماً شام کے بعد ہی گھر سے نکلتی تھی۔ کبھی دن میں کہیں جانا ہوتا تو اسے ایک دن پہلے یا صبح صبح پیغام مل جاتا اور آج کے لیے ایسا کوئی پیغام نہیں تھا۔ وہ نیلم کو خدا حافظ کہہ کر آرام سے بنگلے سے روانہ ہو گیا۔ توقع کے مطابق وہ گیارہ بجے سے ایک دو منٹ قبل ہی کیفے شان پہنچ گیا۔ کیفے میں زیادہ رش نہیں تھا۔ وہ داخلی دروازے کے قریب ہی کھڑا ہو کر وہاں موجود لوگوں کا جائزہ لینے لگا لیکن اسے کوئی شناسا چہرہ نظر نہیں آیا۔

"میرے ساتھ آؤ۔ ہم وہاں بیٹھتے ہیں۔" یک دم ہی کسی

نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرم لہجے میں کہا تو وہ چونک پڑا اور اس کی طرف دیکھا۔ شناخت کے مراحل طے کرنے میں اسے چند پل سے زیادہ وقت نہیں لگا۔

"اے سی صاحب آپ! آپ نے مجھے یہاں بلوایا ہے؟" اس نے تحیر سے سوال کیا۔

"پہلے وہاں چل کر بیٹھو پھر آرام سے بات کرتے ہیں۔" شہریار نے اس سے کہا تو وہ سر ہلاتا ہوا اس کے ساتھ اس میز کی طرف بڑھ گیا جس کی طرف اس نے اشارہ کیا تھا۔

"ایک منٹ ... میں اپنی بیوی کو خیریت کا فون کردوں پھر آپ سے بات کرتا ہوں۔" کرسی سنبھالتے ہی اسے نیلم یاد آئی۔ چنانچہ شہریار سے معذرت خواہانہ لہجے میں بولتے ہوئے موبائل نکال کر نیلم کا نمبر ملایا۔ پہلی ہی گھنٹی پر اس نے کال ریسیو کرلی۔

"ہاں نیلم! دیکھو، میں بالکل خیریت سے ہوں اور ایک دوست کے ساتھ ہوں۔ تم کسی سے کچھ مت کہنا۔" اس نے مختصر بات کرکے فون بند کردیا۔

"میں نے آپ کو دوست کہا، آپ بُرا مت مانیے گا۔ میری اور آپ کی دوستی کا بھلا کیا سوال ... لیکن دس سوالوں سے بچنے کے لیے ضروری تھا کہ میں بیوی سے یہ چھوٹا سا جھوٹ بول دوں۔" سلسلہ منقطع کرنے کے بعد اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں شہریار کو وضاحت دی۔

"کوئی بات نہیں، میں نے بُرا نہیں مانا۔" شہریار نے اپنے مختصر نپے تلے لہجے میں اسے جواب دیا اور پھر غور سے اس کی شکل دیکھنے لگا۔ اس کے اس طرح دیکھنے سے سرمد نروس ہونے لگا۔

"کیا دیکھ رہے ہیں سر؟ مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے کیا؟" اس نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میرے خط کے الفاظ پڑھ کر واقعی اپنا جذبۂ حب الوطنی ثابت کرنے آئے ہو یا محض تجسس دور کرنے۔"

"گھر سے نکلا تھا تو دماغ میں دونوں ہی باتیں تھیں لیکن اب آپ کو سامنے دیکھ کر یقین ہوگیا ہے کہ وطن سے محبت کے دعوے کو سچ ثابت کرنے کا وقت آگیا ہے۔ آپ حکم کریں، میں آپ کی ہر خدمت کے لیے تیار ہوں۔"

موتی والا کے ڈرائیور کی حیثیت سے وہ شہریار کے کردار سے کافی حد تک واقف تھا اس لیے خلوص سے بولا۔

"پہلے یہ بتاؤ کہ آج کل تم جس عورت کے ہاں ملازمت کررہے ہو اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ وہ کس کردار کی عورت ہے؟" شہریار نے اسے جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

"وہ کچھ مشکوک سے کردار کی عورت ہے۔ اس کا مردوں سے آزادانہ میل ملاپ ہے۔ کبھی کبھی مجھے شک گزرتا ہے کہ وہ ان عورتوں میں سے ہے جو کوٹھوں سے اٹھ کر کوٹھیوں میں چلی آئی ہیں لیکن اس کے انداز میں ایک عجیب سا رعب و دبدبہ ہے جو اسے طوائف کہنے سے روکتا ہے۔ عام طوائفوں کی طرح وہ راگ رنگ کی محفلیں بھی نہیں سجاتی لیکن راتوں کو اکثر غیر مرد بنگلے پر رکنے کے لیے آتے ہیں۔ ان مردوں کو دیکھ کر ہی پتا لگ جاتا ہے کہ وہ بڑی اونچی حیثیت کے مالک ہیں۔ ایک دو وزیروں کو تو میں نے خود بھی پہچانا ہے۔" سرمد نے خوب سوچ کر اس کے سوال کا جواب دیا۔

"کیا وہاں آنے والوں میں کوئی ایسا بھی ہے جس کا مستقل آنا جانا لگا رہتا ہو؟"

"جی ہاں، ایک دو بندے ایسے ہیں جو وہاں اکثر آتے رہتے ہیں۔ ان سے بیگم صاحبہ کی دوستی بھی بہت ہے۔"

"میں تمہیں ایک آدمی کا حلیہ بتا رہا ہوں۔ اس شخص کو ابھی دو تین دن پہلے ہی تمہاری بیگم صاحبہ کے ساتھ بنگلے میں دیکھا گیا ہے۔ ذرا اچھی طرح سوچ سمجھ کر بتاؤ کہ تم اس بندے کے بارے میں کچھ جانتے ہو یا نہیں۔" اس نے سرمد کو مہاگرو کا وہ حلیہ بتایا جس حلیے میں ماویانو نے اسے راحیلہ کے گھر کے ٹیرس پر سے دیکھا تھا۔

"یہ تو چوہان صاحب کا حلیہ ہے۔ وہ بیگم صاحبہ کے خاص دوست ہیں اور اکثر ان سے ملنے آتے رہتے ہیں۔" حلیہ سن کر سرمد نے جوش سے بتایا۔

"مجھے تمہارے ان چوہان صاحب سے ہی غرض ہے۔ اس شخص کے بارے میں مجھے شک ہے کہ وہ غیر ملکی جاسوس ہے۔ تمہاری بیگم صاحبہ اگر اس کی دوست ہے تو یقیناً وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری بیگم صاحبہ کے ذریعے چوہان نامی اس شخص تک پہنچ سکوں۔ اس سلسلے میں میرا منصوبہ یہ ہے کہ کسی طرح اس عورت کو اغوا کیا جائے اور پھر اس سے چوہان کا پتا اگلوایا جائے۔ تم کیونکہ اس کے ڈرائیور ہو اور وہ تمہارے ساتھ ہی آتی جاتی ہے تو تمہاری مدد سے میں یہ کام بہت آسانی سے کرسکتا ہوں۔" اس نے سرمد کو اپنی پلاننگ سے آگاہ کیا۔

"اگر آپ کو چوہان کا پتا چاہیے تو اس کے لیے اتنے لمبے چوڑے بکھیڑے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ایک دو بار بیگم صاحبہ کو چھوڑنے اس کے گھر گیا ہوں اس لیے مجھے معلوم ہے کہ وہ کہاں رہتا ہے۔" سرمد نے اسے اطلاع فراہم کی تو وہ کھل اٹھا۔ قدرت خود ہی اس کے کام کو آسان بناتی جارہی تھی۔ اس نے سرمد سے چوہان کا پتا اچھی طرح سمجھ لیا۔ یہ ایک ایسے رہائشی پروجیکٹ کا پتا تھا جہاں لگژری اپارٹمنٹس تعمیر کیے گئے تھے۔

"تھینک یو سو مچ سرمد! تم نے میرا کام آسان کردیا۔ تم ذہین آدمی ہو اور یقیناً مجھے تم سے یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ میرے اور تمہارے درمیان ہونے والی گفتگو کا کسی کو علم نہیں ہونا چاہیے۔ اپنی بیوی کو بھی کچھ مت بتانا۔ عورتیں ہلکے پیٹ کی ہوتی ہیں، اگر اس کی زبان سے کچھ نکل گیا تو دشمن ہوشیار ہو جائیں گے۔" اس نے سرمد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے ہدایت کی۔

"میں سمجھتا ہوں سر! میں ایسی کوئی غلطی نہیں کروں گا جس سے میرے وطن کے دشمنوں کو بھاگ نکلنے کا موقع مل سکے۔" سرمد جذباتی لہجے میں بولا۔

"گڈ!" شہریار نے اسے سراہا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نوٹ نکالنے کے بعد اس کی طرف بڑھائے۔ "یہ رکھ لو۔ گھر جاتے ہوئے بیوی کے لیے کوئی تحفہ لے جانا اور اس سے کہنا کہ یہ تحفہ تمہارے دوست نے اس کے لیے دیا ہے۔"

"نہیں سر! میں یہ رقم نہیں لے سکتا۔ اگر میں نے آپ سے یہ روپے لے لیے تو مجھے لگے گا کہ میں نے اپنے وطن کی ایک معمولی سی خدمت کرنے کا بھی معاوضہ وصول کرلیا۔" سرمد نے نوٹ لینے کے لیے اس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے انکار کیا۔

"میں تمہیں معاوضہ نہیں دے رہا ہوں۔ یوں سمجھ لو کہ یہ میری طرف سے تمہاری شادی کا تحفہ ہے۔"

"آپ کی بڑی مہربانی سر لیکن اس موقع پر میں نے کوئی تحفہ بھی قبول کیا تو میرے اندر یہی احساس ابھرے گا کہ میں نے معاوضہ لیا ہے۔ اس لیے بس آپ رہنے دیں۔" وہ کسی صورت اس سے رقم لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ شہریار نے بھی مزید اصرار نہیں کیا۔ درحقیقت سرمد کے انکار نے اسے ایک طرح سے یہ اطمینان دلایا تھا کہ اس نے کسی غلط آدمی پر اعتماد نہیں کیا ہے اور معاملہ راز میں ہی رہے گا۔

"ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔ میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں اس لیے مزید اصرار نہیں کروں گا۔" اس نے سرمد سے مصافحہ کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے اور ساتھ ہی اسے وہاں سے جانے کی اجازت دے دی۔ مہاگرو، چوہان یا پھر کوئی اور شناخت رکھنے والے اس دشمن پر گرفت کرنے کے لیے اسے بہت سوچ سمجھ کر اقدامات کرنے تھے۔ سرمد کو رخصت کرنے کے بعد وہ کیفے سے روانہ ہوا تو اس کا ذہن اسی سلسلے میں منصوبہ بندی کررہا تھا۔ پیچھے میز پر کافی کی وہ پیالیاں اَن چھوئی ہی رکھی رہ گئی تھیں جو اس نے سرمد سے گفتگو کے دوران آرڈر کی تھیں۔ گفتگو کی گمبھیرتا میں ان دونوں ہی کو کافی پینے کا خیال نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

"کیا بات ہے..... آپ کچھ پریشان نظر آرہے ہیں؟" کشور ظہر کی نماز سے فارغ ہوکر آفتاب کے پاس آکر بیٹھنے کے خیال سے کمرے میں آئی تو اسے دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھا دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ نماز کے لیے دوسرے کمرے میں جانے سے قبل تو وہ اسے بالکل ٹھیک ٹھاک چھوڑ کر گئی تھی۔ نئے فلیٹ میں یہ ان کا پہلا دن تھا۔ رات کو تو وہ کافی دیر سے وہاں پہنچے تھے پھر اسٹیٹ ایجنٹ سے کرائے اور ایڈوانس کے معاملات نمٹانے اور بے حد مختصر سامان کے ساتھ آمد کے سلسلے میں وضاحت پیش کرنے میں اچھا خاصا وقت صرف ہوگیا تھا۔ ایجنٹ کو رخصت کرنے کے بعد بھی دونوں ہی کو بہت دیر تک نیند نہیں آسکی۔ نتیجتاً ان کے دن کا آغاز اس وقت ہوا جب یقیناً لوگ اپنے گھر میں دوپہر کے کھانے کی تیاری کررہے ہوں گے۔ ان کے پاس کچن میں استعمال ہونے والا ساز و سامان اور کھانے پینے کی اشیا تو تھی نہیں کہ کچھ پکایا جاسکتا۔ آفتاب نے بہت ضروری اشیا کی فہرست بنائی اور بلڈنگ کے چوکیدار کو وہ فہرست مع رقم دے کر اس سے یہ چیزیں منگوالیں۔ اپنی ٹانگ کی تکلیف اور بیوی کے پردے دار ہونے کے علاوہ شہر سے ناواقف ہونے کا عذر اس موقع پر ان کے کام آیا تھا۔ منگوائی جانے والی چیزوں میں پکا پکایا کھانا اور آج کا اخبار بھی شامل تھا۔ چونکہ انہوں نے رات کے کھانے کے بعد سے اب تک کچھ نہیں کھایا تھا، اس لیے کھانا اخبار سے پہلے توجہ کا حق دار ٹھہرا۔ کھانے کے بعد کشور تو نماز پڑھنے کے لیے اٹھ گئی جبکہ آفتاب نے اخبار تھام لیا اور اب کشور واپس آئی تھی تو اخبار ایک طرف رکھا تھا اور آفتاب چہرے پر غم و غصہ لیے پریشان بیٹھا نظر آرہا تھا۔ اس نے پریشانی کی وجہ پوچھی تو زبان سے جواب دینے کے بجائے اس کے ہاتھ میں اخبار تھما دیا۔ جلد ہی وہ دونوں خبریں کشور کی نظر میں بھی آگئیں جنہوں نے آفتاب کو اس کیفیت میں مبتلا کیا تھا۔

اخبار میں ان کی محسن خالہ کے گھر کے برباد ہونے کی خبر کے ساتھ ساتھ سینئر صحافی بابر رضا کے قتل کی خبر بھی شائع ہوئی تھی۔ یہ اسلام آباد سے شائع ہونے والا اخبار تھا لیکن بابر کے

صحافی ہونے کی وجہ سے اس کے قتل کی خبر کو نمایاں جگہ دی گئی تھی۔ تفصیلات کے مطابق بابر رضا کو شام کے وقت دفتر سے نکلنے کے بعد اغوا کیا گیا تھا اور بے پناہ تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد گولی مار کر قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کی لاش رات گئے ایک کچرا گھر کے پاس پڑی ملی تھی جبکہ گاڑی ایک پُررونق شاپنگ سینٹر کے باہر کھڑی پائی گئی تھی۔ گاڑی کے لاک کے ساتھ کی گئی گڑبڑ نے ہی پولیس کو اس امکان پر سوچنے پر مجبور کیا تھا کہ بابر کو شاپنگ سینٹر کے سامنے سے اغوا کیا گیا تھا۔

خبر کے مطابق پولیس اغوا اور قتل کی وجوہات تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی تاکہ مجرموں تک پہنچا جا سکے۔ دوسری طرف خالہ کے گھر ہونے والے حادثے کو ڈکیتی کی ناکام واردات قرار دیا جا رہا تھا جو اس وجہ سے کامیاب نہیں ہو سکی تھی کہ عین وقت پر خالہ کا بیٹا بدر گھر پہنچ گیا تھا۔ اہلِ محلہ کے مطابق بدر جس وقت گھر پہنچا، نشے میں تھا اور شاید اسی وجہ سے گھر میں پہلے سے موجود ڈاکوؤں سے بھڑنے کی حماقت کر بیٹھا تھا۔ ڈاکوؤں نے مشتعل ہو کر اسے گولی ماری اور خود فرار ہو گئے۔ خالہ بے چاری بیٹے کی موت کا صدمہ نہ سہار سکیں اور ہارٹ فیل کا شکار ہو کر موقع پر ہی چل بسیں۔

یہ دونوں خبریں اخبار میں الگ الگ جگہ پر شائع ہوئی تھیں اور کسی عام قاری کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ان دونوں خبروں کے درمیان کوئی ربط موجود ہے لیکن کشور نے اس ربط کو تلاش کر لیا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ اس کے باپ کے گماشتے کسی طرح بابر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ انہوں نے پہلے تشدد کے ذریعے بابر سے ان دونوں کا پتا اگلوایا پھر اسے قتل کر کے رات گئے خالہ کے گھر پر چڑھائی کر دی۔ وہ تو ان کی قسمت اچھی تھی کہ وہ پہلے ہی وہاں سے نکل چکے تھے ورنہ بے خبری میں مارے جاتے۔ اب بھی اگر وہ بچ گئے تھے تو اپنی خوش قسمتی کے احساس سے زیادہ اپنے محسنوں کی موت کا ملال دل پر حاوی تھا اور دل گہری اداسی میں ڈوب گیا تھا۔

کتنی ہی دیر وہ دونوں میاں بیوی ساتھ ساتھ بیٹھے ہونے کے باوجود ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کی ہمت بھی نہیں کر سکے۔ صرف کشور کے ہونٹوں سے نکلنے والی سسکیاں تھیں جو کمرے کے خاموش ماحول میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں ورنہ آفتاب کا تو یہ حال تھا کہ وہ بالکل ساکت بیٹھا تھا۔ جب کشور کی سسکیاں زیادہ ہی تیز ہو گئیں تو اس کے ساکت وجود میں جنبش پیدا ہوئی اور اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اسے خود سے قریب کر لیا۔ یہ ایک خاموش دلاسا تھا جس نے کشور کو مزید بکھیر دیا۔ وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر تڑپ تڑپ کر رونے لگی۔ جو لوگ مر گئے، ان سے احسان کا تعلق تو تھا ہی لیکن خالہ تو ایک ایسی ہستی تھیں جن کے وجود میں اس نے ممتا کا احساس پایا تھا اور اس چند روزہ ممتا کے کھو جانے پر وہ بُری طرح دل گرفتہ تھی۔

''بس کریں۔ اس طرح تو آپ کی اپنی طبیعت خراب ہو جائے گی۔ آپ کی جو حالت ہے، اس میں آپ کو پُرسکون رہنے اور آرام کرنے کی ضرورت ہے لیکن حالات مسلسل ایسے ہیں کہ میں چاہتے ہوئے بھی آپ کو یہ دونوں چیزیں مہیا نہیں کر پا رہا ہوں۔'' آفتاب اسے سمجھاتے ہوئے خود بھی بڑا افسردہ تھا۔

''اس دنیا میں اتنا ظلم کیوں ہے اور یہاں لوگ اتنے بے درد کس لیے ہیں کہ دو انسانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ من پسند زندگی گزارتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے؟ میں نے اباجی کی حویلی، ان کی دولت و جائداد سمیت سب کچھ چھوڑ دیا ہے تو پھر وہ کیوں میرا پیچھا چھوڑ کر مجھے میرے حال پر نہیں چھوڑ دیتے؟ کیوں ان کے کرگے ہر جگہ میری بو سونگھتے پھر رہے ہیں؟'' وہ ایسے سوالات کر رہی تھی جن کا جواب مبہم نہیں تھا اور وہ خود بھی بخوبی جانتی تھی۔ دنیا میں ہر ظلم اور زیادتی کے پیچھے صرف اور صرف فرعونیت چھپی ہوئی ہے۔ خس و خاشاک سے بھی کم تر حیثیت رکھنے والا انسان ذرا سا اقتدار اور اختیار پا کر خود کو کل کائنات کا مالک سمجھنے لگتا ہے اور پھر اس زعم میں وہ وہ حرکتیں کرتا ہے جو اسے زیب نہیں دیتیں۔

''خود کو سنبھالیں کشور! ابھی حالات ہمارے لیے ناموافق ہیں لیکن یہ حالات سدا ایسے ہی نہیں رہیں گے۔ اللہ نے چاہا تو وہ دن ضرور آئے گا جب ہم اس دربدری اور خوف کی زندگی سے آزاد ہو کر کہیں کسی جگہ سکون سے رہ سکیں گے۔'' وہ اسے وہی خواب دکھانے کی کوشش کر رہا تھا جن سے وہ ہمیشہ بہل جاتی تھی۔

''معلوم نہیں مجھے قبر سے باہر سکون کا وہ دن کبھی نصیب ہو گا بھی یا نہیں... لیکن میں سچ کہوں آفتاب! میں اس دنیا میں بہت زیادہ نہیں لیکن اتنا ضرور جینا چاہتی ہوں کہ ہمارے پیار کی نشانی آپ کو دے سکوں۔ میں ایک بار... صرف ایک بار اپنے بچے کا چہرہ دیکھنا چاہتی ہوں۔'' وہ بہت خوف زدہ اور مایوس تھی۔

''پھر وہی مایوسی کی باتیں؟ شاید پہلے بھی ہمارے درمیان یہ طے ہو چکا ہے کہ ایسی باتیں آئندہ نہیں ہوں گی۔'' آفتاب نے خفگی کا مظاہرہ کیا۔

''میں کیا کروں؟ میں ایسی باتیں نہیں کرنا چاہتی لیکن حالات مجبور کر دیتے ہیں۔'' وہ کسی معصوم بچے کی سی بے بسی سے بولی تو آفتاب نے بے اختیار اسے چوم لیا اور بولا۔

''میری جان! حالات کبھی سدا ایک سے نہیں رہتے۔ ہمارے حالات بھی بدلیں گے اور ہم بھی انشاء اللہ ایک اچھی زندگی گزاریں گے۔''

''سچ؟'' کشور نے امید بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بالکل سچ۔ آپ میرا یقین کریں۔'' آفتاب نے اسے یقین دلایا تو وہ گویا مطمئن ہو کر اس کی گود میں سر رکھے وہیں فرش پر دراز ہو گئی اور شاید کوئی نیا خواب بُننے لگی لیکن اسے یہ تسلی دینے والا آفتاب خود کہاں مطمئن تھا۔ اسے یاد تھا کہ خالہ کے گھر سے نکلنے سے پہلے کشور ان کے نام ایک رقعہ لکھ کر آئی تھی۔ وہ رقعہ چوہدری کے آدمیوں کے ہاتھ بھی لگا ہو گا۔ یہ کوئی امکان سے باہر کی بات نہیں تھی اور اس رقعے کو پڑھ کر نہ صرف اس کی اور کشور کی وہاں موجودگی کنفرم ہوئی ہو گی بلکہ یہ اندازہ بھی لگا لیا گیا ہو گا کہ وہ دونوں اسلام آباد کی حدود میں ہی موجود ہیں۔

چوہدری جس نے نامعلوم کس طریقے سے بابر تک رسائی حاصل کر لی تھی، اسلام آباد میں اسے ڈھونڈنے پر تل جاتا تو یہ کوئی ناممکن تو نہیں تھا کہ اس فلیٹ تک بھی پہنچ جاتا۔ کوئی بھی ہوشیار شخص کسی اجنبی شہر میں باہر سے آئے ہوئے افراد کو ڈھونڈنے کے لیے ہوٹلوں وغیرہ کے بعد ان اسٹیٹ ایجنٹوں کی طرف ہی متوجہ ہوتا جن کے ذریعے جائداد کی خرید و فروخت اور کرائے پر چڑھائے جانے کے معاملات طے پاتے ہیں۔ وہ اور کشور جن مشکوک حالات میں اس فلیٹ میں آئے تھے، اس سے ان کا اسٹیٹ ایجنٹ پہلے ہی چونکا ہوا تھا اور بظاہر اس نے آفتاب کا یہ بہانہ قبول کر لیا تھا کہ وہ دونوں میاں بیوی جلدی میں مختصر سامان کے ساتھ وہاں آ گئے ہیں اور ان کا دیگر سامان ایک ہفتے بعد پہنچے گا لیکن حقیقت میں تو وہ مطمئن نہیں ہو گا اور کسی کے معلوم کرنے پر فوراً اگل دے گا کہ ایک مشکوک جوڑا فلاں فلیٹ میں ٹھہرا ہوا ہے۔ اس سے آگے کی ناخوشگوار صورتِ حال سے بچنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ جتنی جلدی ممکن ہو، اس فلیٹ کو چھوڑ دیں۔ ایڈوانس میں دی ہوئی بھاری رقم کی وجہ سے اسے اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے میں کچھ دشواری پیش آ سکتی تھی لیکن وہ کچھ رقم کی قربانی دے کر کسی معقول بہانے کے ساتھ رقم نکلوا سکتا تھا۔ یہاں سے نکل کر وہ کشور کے ساتھ کسی چھوٹے سے گمنام گاؤں یا قصبے میں پڑاؤ ڈال دیتا۔ اس کے لکھنے لکھانے کا کام تو کہیں بھی رہ کر جاری رہ سکتا تھا۔

اپنے ذہن میں یہ ساری منصوبہ بندی کرنے کے بعد اس

حساب دانی

ایک بڑے میاں ہر اتوار کو اپنے پوتے کے ساتھ گرجا گھر جاتے اور پادری کے وعظ کے دوران میں سو جاتے۔ ایک روز پادری نے پوتے سے کہا۔

''بیٹے! میں تمہیں دو ڈالر انعام دوں گا۔ تم اپنے دادا جان کو میرے وعظ کے دوران میں سونے نہ دیا کرو۔''

بچہ بڑی خوشی سے راضی ہو گیا مگر اگلے ہفتے بڑے میاں پھر زور شور سے خراٹے لے رہے تھے۔ وعظ کے بعد پادری نے غصے میں پوتے سے کہا۔

''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میں تمہیں دو ڈالر دوں گا، تم دادا جان کو سونے نہ دینا۔''

''جی جناب! مگر دادا جان نے مجھے تین ڈالر دیے تھے اور کہا تھا کہ مجھے جگانا نہیں۔''

میر علی بلوچ کا شگوفہ گوادر سے

نے اپنی گود میں سر رکھے آنکھیں موند کر لیٹی کشور کے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور نرمی سے اس کے نقوش کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے چھونے لگا۔ اس عورت کی محبت میں وہ بے شک اپنے مقصدِ حیات سے دور ہٹ کر جینے پر مجبور ہو گیا تھا لیکن سچ یہ تھا کہ اسی عورت نے اسے محبت کی اس شدت سے آشنا کروایا تھا کہ اسے اکثر خود پر رشک آنے لگا تھا۔ وہ لوگ جنہیں کوئی اپنا سب کچھ مان کر خود سے بڑھ کر چاہے، کم خوش قسمت تو نہیں ہوتے اور آفتاب کو بہرحال اپنی خوش قسمتی کا یقین تھا۔

☆☆☆

ابھی صبح کا اجالا پوری طرح سے پھیلا نہیں تھا اور مناظر کو صبح دم گرنے والی دھند نے اپنی لپیٹ میں لے کر قدرے چھپا

رکھا تھا۔ اتنی صبح بس چند مخصوص لوگ ہی تھے جو راستے پر سے گزرتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ سڑک پر کوئی گاڑی بھی بہت وقفے کے بعد نمودار ہوتی تھی اور اس کی ہیڈ لائٹس کی روشنیاں دھند کی چادر کو چیرتی ہوئی تیزی سے نظروں سے اوجھل ہو جاتی تھیں۔ اس دھندلی صبح میں ایک کالا بھجنگ جوڑا فٹ پاتھ پر پیدل چلا جا رہا تھا۔ عورت دبلی پتلی اور مناسب قامت کی تھی اور اس نے اپنے جسم پر ایک پرانی سی سوتی ساڑی لپیٹ رکھی تھی۔ ساڑی کا پلو اس کے سر پر تھا جس نے اس کا آدھا چہرہ بھی چھپا رکھا تھا۔ اگر کوئی شخص اسے پشت پر سے دیکھتا تو اس کی مناسب جسامت پر بجی ساڑی کو سراہے بغیر نہیں رہ سکتا تھا لیکن اسی شخص کو سامنے سے اس عورت کو دیکھ کر شدید مایوسی ہوتی۔ بے تحاشا سیاہ رنگت نے اس کے پورے وجود کو اس طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا کہ دیکھنے والے کو پہلی نظر ڈالنے کے بعد دوسری کی خواہش ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کے ساتھ چلتا اسی جیسی رنگت والا مرد لمبے قد کا مالک تھا۔ اس نے بے حد پرانی جینز کے ساتھ اس سے بھی زیادہ گھسی ہوئی سیاہ رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور کچھ اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ ٹی شرٹ کی ہاف آستینوں سے جھانکتے اس کے بازوؤں پر کہاں آستینیں ختم ہو جاتی ہیں۔ جسامت اس کی بھی البتہ بہت شاندار تھی اور دیکھنے والے برملا کہہ سکتے تھے کہ وہ یا تو باقاعدگی سے ورزش کرنے کا عادی ہے یا پھر کوئی ایسا مشقت کا کام کرتا ہے جس کے باعث اس کے جسم پر کہیں ذرا بھی اضافی گوشت نہیں چڑھ پاتا۔

”تم نے سچویشن کو پوری طرح سمجھ لیا ہے نا؟ تمہیں ڈر تو نہیں لگ رہا؟“ فٹ پاتھ پر سیدھے چلتے ہوئے اس نے اپنی ہم قدم عورت سے سوال کیا۔

”میں سب سمجھ گئی ہوں اور مجھے ڈر بھی نہیں لگ رہا۔“ ساڑی کے پلو کے اندر سے خوب صورت اور نرم آواز ابھری۔

”اگر تمہیں لگے کہ گڑبڑ ہے اور سچویشن تمہارے ہاتھ سے نکل رہی ہے تو بلا دریغ گولی چلا دینا۔ آگے کے معاملات میں خود سنبھال لوں گا۔ میرا دیا ہوا پسٹل تم نے احتیاط سے اپنے پاس سنبھال کر رکھا ہے نا؟“ ان کی گفتگو اور انداز کسی بھی طرح ان کے موجودہ حلیے سے میل نہیں کھا رہے تھے اور حقیقت بھی یہ تھی کہ ان کا یہ حلیہ دراصل بہروپ تھا۔ وہ ماہ بانو اور شہریار عادل تھے جو ساتھ ساتھ چلتے فلک سٹی کی طرف جا رہے تھے۔ فلک سٹی کے بلاک بی میں سیکنڈ فلور پر ایک لگژری اپارٹمنٹ میں سرمد کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق مہاگرو، چوہان کے نام سے رہائش پذیر تھا۔ شہریار نے اپنے طور پر ان معلومات کی تصدیق کرلی تھی اور ان معلومات کی روشنی میں ہی اس نے ایک منصوبہ تشکیل دیا تھا۔ اس منصوبے پر عمل پیرا ہونے کے لیے اس کا کل کا سارا دن بھاگ دوڑ میں گزرا تھا۔ ماہ بانو کو بھی اپنی مدد کے لیے بلانا پڑا تھا لیکن کچھ پریشان تھا کہ جانے یہ کم عمر اور ناتجربہ کار لڑکی صحیح طریقے سے اپنا کردار ادا کر بھی سکے گی یا نہیں۔ وہ اسے کوئی نقصان پہنچنے کے خیال سے بھی ڈر رہا تھا لیکن مجبوری یہ تھی کہ وہ یہاں اس شہر میں ماہ بانو سے بڑھ کر کسی اور پر اعتماد بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ماہ بانو نے اس کے بتائے ہوئے منصوبے میں شامل ہونے کے لیے ایک لمحے کا بھی توقف کیے بغیر بلا جھجک ہامی بھرلی تھی اور اب اس کے ساتھ چلتے ہوئے بے شک اس کا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا لیکن وہ شہریار کے سامنے اپنی اس کیفیت کو ظاہر کرنے سے مکمل گریزاں تھی۔

”آپ میرے لیے پریشان نہ ہوں۔ ایک خطرناک مجرم اور قاتل کو اس کے انجام تک پہنچانے کے لیے اگر مجھے اپنی جان بھی قربان کرنی پڑی تو مجھے کوئی ملال نہیں ہوگا۔“ اس نے اپنی طرف سے شہریار کو اطمینان دلایا۔

”گڈ..... ہم جو کام کرنے جا رہے ہیں اس کی کامیابی کے لیے اسی اسپرٹ کی ضرورت ہے لیکن تم اس بات کو دھیان میں رکھنا کہ تمہاری جان کی میرے نزدیک بہت اہمیت ہے اس لیے بلاوجہ خود کو خطرے میں مت ڈالنا اور میری ہدایت پر عمل کرنا۔“ مخصوص ٹھہرے ہوئے لہجے میں ادا کیے گئے ان الفاظ میں اگرچہ کسی جذبے کی آمیزش کو محسوس کرنا بہت مشکل تھا پھر بھی ماہ بانو کا دل دھڑک اٹھا اور یہ اندازہ ہونے کے باوجود کہ شہریار یہ الفاظ اپنے کسی بھی ساتھی کے لیے ادا کر سکتا تھا، اس نے خود کو کچھ دیر کے لیے خوش فہمی میں مبتلا رکھنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا۔ یہاں تک کہ وہ دونوں فلک سٹی کے مین گیٹ تک جا پہنچے۔ گیٹ پر موجود چوکیدار نے انہیں سرتاپا دیکھا اور سخت لہجے میں پوچھا۔

”کون ہو تم لوگ؟“

”یہ روپ وتی ہے۔ پاروتی کی بہن اور میں اس کا گھروالا مہندر ہوں۔ پاروتی کی ساس کا کل شام دیہانت ہو گیا تھا اس لیے وہ اور اس کا پتی اس کا کریا کرم کرنے گاؤں گئے ہوئے ہیں۔ جاتے جاتے پاروتی میری روپا سے کہہ گئی تھی کہ ہم پتی پتنی ایک دو دن کے لیے ان کے حصے کا کام سنبھال لیں، اس لیے ہم یہاں آئے ہیں۔ ہمیں آنے میں دیر تو نہیں ہوئی؟“ لہجے میں زمانے بھر کی عاجزی سموتے ہوئے شہریار نے اپنی سوچی ہوئی کہانی سنائی اور آخر میں بڑی فکرمندی سے سوال بھی کر ڈالا۔

”دیر تو خیر نہیں ہوئی لیکن پاروتی اور کمار کو چاہیے تھا کہ جانے سے پہلے خود اطلاع دے جاتے۔“ چوکیدار نے اعتراض کیا۔

”بات تمہاری بھی ٹھیک ہے بھائی لیکن ذرا سوچو کہ ایسی پریشانی میں منش کا دماغ کام ہی کہاں کرتا ہے جو ان پتی پتنی کو سوجھا، ہمیں بول گئے۔ اب تم بتاؤ کہ ہمیں اندر جا کر کام کرنے دو گے یا ہم یہیں سے واپس لوٹ جائیں؟ پر یاد رکھنا کہ ایسی صورت میں ان دونوں کی پگار میں سے کچھ نہیں کٹنا چاہیے۔ پہلے ہی کمار قرضے میں پھنسا ہوا ہے، پگار میں سے رقم کٹی تو اور مشکل میں پڑ جائے گا۔“ اس بار اس نے لہجے کی عاجزی کو کم کر کے تھوڑا جارحانہ رویہ اپنا لیا تھا۔

”میں کیوں روکوں گا، تمہیں کام سے؟ تم شوق سے کام کرو۔ میں دوسرے چوکیدار کو بھیج کر چیک کرواؤں گا کہ صحیح سے صفائی ہوئی ہے یا نہیں۔“ چوکیدار نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے جواب دیا اور ایک سمت میں اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”ادھر اے بلاک کی سیڑھیوں کے نیچے جھاڑو ئیں اور دوسرا ضرورت کا سامان رکھا ہے، وہاں سے نکال لو اور کام ختم کرنے کے بعد جانے سے پہلے ساری چیزیں واپس جگہ پر رکھ دینا۔“ اس کی ان ہدایات پر سر ہلاتے ہوئے ماہ بانو اور شہریار خاموشی سے اشارہ کی ہوئی سمت میں بڑھ گئے۔ ذرا دیر بعد ان کے ہاتھوں میں بھاری جھاڑو..... اور مجبور کی نوکریوں کے علاوہ صفائی سے متعلق دوسرا سامان بھی نظر آرہا تھا۔ اتفاق سے چوہان کے اپارٹمنٹ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے شہریار نے جن کرداروں کا انتخاب کیا تھا، وہ یہاں خاکروب کے فرائض انجام دیتے تھے۔ بلڈنگ کے برآمدوں، سیڑھیوں اور کمپاؤنڈ کی زیادہ تر صفائی کمار خود کرتا تھا جبکہ اس کی پتنی پاروتی نے دو تین چھڑے چھانٹ مردوں کے گھروں کی صفائی کا کام سنبھال رکھا تھا۔ ان مردوں میں سے ہی ایک مرد چوہان بھی تھا جس کے اپارٹمنٹ کی پاروتی صبح سب سے پہلے صفائی کرتی تھی۔ یہ ساری معلومات حاصل کرنے کے لیے شہریار کو ان دونوں میاں بیوی کو اپنا مہمان بنانا پڑا تھا۔

کل جب وہ فلک سٹی کا جائزہ لینے آیا تھا تو اس نے اس خاکروب جوڑے کو باہر نکلتے دیکھا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر اسے خیال آیا کہ اس خاکروب جوڑے کا تو بلڈنگ کے ہر بلاک اور فلور پر آنا جانا ہوگا اور وہ تمام رہائشیوں سے بھی اچھی طرح واقف ہوں گے..... تو کیوں نا انہیں چوہان نامی شخص کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جائے۔ اس نے اُن دونوں کا پیچھا کیا اور رقم کا لالچ دے کر ان سے چوہان کے بارے میں معلومات حاصل کرلیں جو کہ بہت کارآمد ثابت ہوئیں۔ اسے پتا چلا کہ پاروتی چوہان کے اپارٹمنٹ میں صفائی ستھرائی کا کام کرتی ہے اور علی الصباح سب سے پہلے وہیں جاتی ہے۔ پاروتی کے مطابق چوہان صبح خیز تھا اور اس کے پہنچنے سے بھی پہلے جاگ جاتا تھا۔ وہ جب تک صفائی ستھرائی کا کام نمٹاتی، چوہان لاؤنج کی کھڑکیاں کھولے ورزش اور یوگا وغیرہ میں مصروف رہتا۔ اس دوران کمار بھی بلاک کے دیگر اپارٹمنٹس سے کچرا اکٹھا کرتا اور سیڑھیوں کی صفائی کرتا ہوا وہاں پہنچ جاتا تھا۔ پاروتی چوہان کے اپارٹمنٹ کا کوڑا کرکٹ اس کے حوالے کرتی اور خود بھی اس کے ساتھ اگلے بلاک میں کام کرنے کے لیے چلی جاتی۔

شہریار نے جو میاں بیوی کا یہ معمول سنا تو فوری طور پر اس کے ذہن میں ایک منصوبہ تشکیل پا گیا۔ اس منصوبے پر عمل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ پاروتی اور کمار اگلے دن اپنی ڈیوٹی پر نہ پہنچیں۔ وہ ان دونوں کو بہلا پھسلا کر زبیر کے بنگلے پر لے گیا اور انہیں مزید رقم کا لالچ دے کر اس بات پر راضی کرلیا کہ وہ اگلے دن ڈیوٹی پر نہیں جائیں گے۔ ایک اچھی بات یہ تھی کہ وہ خاکروب جوڑا بے اولاد تھا اس لیے اسے انہیں بنگلے پر روکے رکھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ماہ بانو کو وہ خود اس کے ہاسٹل سے جا کر لے آیا تھا اور اسے تمام تفصیلات سمجھانے کے ساتھ اس کا حلیہ بدلنے میں بھی مدد دی تھی۔ اب وہ دونوں پاروتی کے بہن بہنوئی کے روپ میں فلک سٹی میں موجود تھے اور پاروتی اور اس کا شوہر کمار زبیر کے بنگلے میں گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ ان دونوں کی طرف سے تعاون کے وعدے کے باوجود شہریار نے احتیاطاً انہیں کھانے میں خواب آور دوا ملا کر کھلا دی تھی اور انہیں کمرے میں لاک کر کے آیا تھا تاکہ وہ کسی پریشانی کا باعث نہ بن سکیں۔

”میں تمہارے چوہان کے اپارٹمنٹ میں جانے کے پانچ منٹ بعد ہی گھنٹی بجا دوں گا۔ تم جلدی سے آکر دروازہ کھول دینا۔ اس کے بعد کی ساری سچویشن کو میں خود سنبھال لوں گا۔“ بلاک بی کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے ماہ بانو کو ہدایت دی۔ اصل میں وہ چوہان یا مہاگرو کو اس کے اپارٹمنٹ کے اندر ہی گھیرنا چاہتا تھا اس لیے اسے ماہ بانو کی مدد کی ضرورت پڑی تھی۔ اس کی وجہ سے اسے اپارٹمنٹ میں گھسنے میں آسانی ہو جاتی ورنہ وہ جانتا تھا کہ چوہان جیسے لوگ اتنے ہوشیار رہتے ہیں کہ کسی اجنبی کو اپنے قریب پھٹکنے بھی نہیں دیتے۔

سیکنڈ فلور کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ دانستہ تھوڑا سا پیچھے رہ گیا جبکہ ماہ بانو آگے بڑھ کر چوہان کے اپارٹمنٹ کے سامنے جا ٹھہری۔ ڈور بیل کا بٹن دبانے کے بعد اس نے ذرا سا رُخ موڑ لیا تاکہ اگر چوہان ڈور آئی سے جھانک کر دیکھے تو اسے اس کا چہرہ واضح طور پر نظر نہ آئے۔ حسبِ توقع دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ ماہ بانو کھلے دروازے سے اندر داخل ہوگئی جبکہ چوہان اس کی طرف دیکھے بغیر ہی اندر کی طرف بڑھ گیا۔ حقیقتاً ماہ بانو خود بھی اس کی صرف پشت ہی دیکھ سکی تھی اور لمبے بالوں کی پونی ٹیل نے تصدیق کردی تھی کہ یہ وہی ہے جس کو اس نے راحیلہ کے پڑوس میں دیکھا تھا۔

اس کے پورے وجود میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی، ساتھ ہی اس نے شکر بھی کیا کہ وہ شخص وہاں رک کر اس سے مخاطب نہیں ہوا ہے اگر وہ رک جاتا اور پاروتی کی جگہ اسے دیکھ کر اس سے سوال جواب کرتا تو وہ اسے بھی وہی جوابات دے کر مطمئن کرنے کی کوشش کرتی جو نیچے شہریار نے چوکیدار کو دیے تھے۔ مگر خیر گزری اور ایسی کوئی نوبت ہی نہیں آئی۔ وہ دل ہی دل میں شکر ادا کرتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی کیونکہ پاروتی کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق وہ سب سے پہلے کچن ہی کی صفائی کرتی تھی۔ کچن میں پہنچ کر اس نے بے ترتیب پڑی چیزوں کو ترتیب وار رکھنا شروع کردیا۔ اس کا اس شخص کے کچن میں کام کرنے کو قطعی دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن اگر وہ یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے کھڑی رہتی تو خاموشی کے باعث وہ چونک بھی سکتا تھا۔ ناچار اسے اپنے ہاتھوں کو حرکت دینی پڑ رہی تھی لیکن کان مسلسل ڈور بیل کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ دروازے کا آٹومیٹک لاک اس کے اندر پہنچتے ہی خود بخود بند ہوگیا تھا اور اب شہریار اسی صورت اندر آسکتا تھا کہ وہ اس لاک کو کھولتی۔ پانچ منٹ کا وہ مختصر سا دورانیہ بڑی مشکل سے گزرا اور جیسے ہی ڈور بیل کی آواز اس کے کانوں میں ابھری، وہ دروازے کی طرف دوڑ گئی۔

”اے..... کون ہو تم؟ رکو۔“ خلافِ معمول بجنے والی گھنٹی کو سن کر چوہان خود بھی اپنی یوگا کی مشقیں چھوڑ کر آگیا تھا اور اس موقع پر اس نے نوٹ کرلیا تھا کہ جو عورت دروازہ کھولنے کے لیے بھاگی ہے، وہ پاروتی کے بجائے کوئی اور ہے۔ اس نے فوراً ہی جست لگائی اور ماہ بانو کو جالیا۔ وہ جو لاک پر ہاتھ رکھ چکی تھی اور انگلیوں کی ذرا سی جنبش سے لاک کھول سکتی تھی، اس صورت حال پر گھبرا گئی۔

”کیا پوچھ رہا ہوں میں..... کون ہو تم؟“ چوہان نے اپنی انگلیاں سختی سے اس کے بازو میں گاڑتے ہوئے سرد مہری سے پوچھا۔

”میں پاروتی کی بہن روپ وتی ہوں جی۔ وہ اپنی سورگ باشی ساس کے کریا کرم کے لیے گاؤں گئی ہے اس لیے اس نے مجھے اور میرے پتی کو اپنی جگہ کام پر بھجوا دیا ہے۔ باہر شاید میرا پتی ہی مجرا لینے آیا ہے۔“ وہ گھبرائی گھبرائی سی وہ کہانی سنانے لگی جو یہاں آنے سے پہلے ہی طے ہوچکی تھی لیکن چوہان کوئی معمولی آدمی نہیں تھا جو بلڈنگ کے چوکیدار کی طرح آرام سے بہل جاتا۔ وہ کھٹک گیا تھا اور اس کے تربیت یافتہ دماغ کو بصری سگنل دینے والی آنکھوں نے بھانپ لیا تھا کہ ماہ بانو کی جلد کی سیاہی اور نیچرل نہیں ہے اور اسے میک اپ کے ذریعے یہ روپ بخشا گیا ہے۔

”جھوٹ بولتی ہے سالی!“ اس نے ایک زوردار تھپڑ ماہ بانو کے رخسار پر رسید کیا۔ تھپڑ اتنا شدید تھا کہ ماہ بانو کا گال اندر سے پھٹ گیا اور اس نے منہ کے اندر خون کا ذائقہ محسوس کیا۔ اسی وقت بے حد عجلت میں گھنٹی دوبارہ بجائی گئی۔ گھنٹی کی آواز سن کر ماہ بانو کا پست پڑتا حوصلہ ایک بار پھر جاگا اور اس نے ابھی تک لاک پر جمی اپنی انگلیوں کو جنبش دے ڈالی۔ کھٹ کی آواز کے ساتھ لاک کھل گیا۔ لاک کھلتے ہی باہر سے دروازہ پوری قوت سے دھکیلا گیا۔ چونکہ ماہ بانو اور چوہان دونوں ہی دروازے کے بالکل سامنے موجود تھے، اس لیے دونوں ہی زد میں آگئے اور دروازے کے دھکے سے دور جا کر گرے۔ اگلے ہی لمحے شہریار اپارٹمنٹ کے اندر تھا۔

اندر داخل ہوتے ہی اس نے دروازہ بند کردیا۔ اب اندر کی آوازیں باہر نہیں جاسکتی تھیں۔ دوسری طرف چوہان نے بھی بے حد پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا اور نیچے گرتے ہی فوراً سنبھلنے کے بعد تقریباً اڑتا ہوا شہریار پر آپڑا تھا۔ اس کے حملے سے بچنے کے لیے شہریار نے بائیں جانب جھکائی دی لیکن پھر بھی چوہان کی لات کا چھچلتا ہوا وار اس کے دائیں شانے پر لگ ہی گیا۔ اس تنگ سی راہداری میں وہ اس سے زیادہ اپنا بچاؤ کر بھی نہیں سکتا تھا، البتہ اس نے چوٹ کھانے کے بعد بھی بے مثال پھرتی کا مظاہرہ کیا اور گھومتے ہوئے بائیں ہاتھ کا گھونسا چوہان کی گردن پر دے مارا۔ یہ نپا تلا گھونسا اگر کسی عام آدمی کی گردن پر پڑا ہوتا تو وہ فرش پر لمبا لیٹا ہوا نظر آرہا ہوتا لیکن چوہان منہ سے ہلکی سی اُوغ کی آواز نکالتا ہوا فوراً ہی سنبھل کر اس پر حملہ آور ہوا اور شہریار کے پیٹ میں ایک زوردار لات رسید کی۔ اس وار کو کرتے ہوئے اس نے شاید اپنی پوری جسمانی قوت استعمال کر ڈالی تھی، چنانچہ شہریار کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے اس کے پیٹ پر کوئی اینٹ دے ماری ہو۔ وہ تکلیف کی شدت سے دُہرا ہوگیا۔ خود چوہان بھی اپنے ہی وار کے ردِ عمل میں پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ یہ لڑائی میں آنے والا پہلا لمحہ تھا جو دونوں فریقوں میں سے کسی نے بھی فوری طور پر ایک دوسرے پر وار نہیں کیا تھا۔ اس مختصر لمحے میں خاموش تماشائی بنی ماہ بانو حرکت میں آئی۔ دروازے کا دھکا لگ کر گرنے کے بعد اسے سنبھل کر کھڑا ہونے میں چوہان کے مقابلے میں کچھ وقت لگا تھا۔ کھڑے ہونے کے بعد بھی وہ اس لڑائی میں دخل دینے کی ہمت نہیں کرسکی تھی اور ایک دیوار کے ساتھ چپک گئی تھی۔ البتہ اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر وہ ننھا سا پسٹل نکال لیا تھا جو یہاں آنے سے پہلے شہریار نے اسے دیا تھا۔ شہریار اور چوہان کو ایک دوسرے سے ذرا فاصلے پر پاکر اس نے اس پسٹل کو استعمال میں لانے کی جرأت کی اور اس کا رُخ چوہان کی طرف کرتے ہوئے بولی۔

”ہینڈز اپ! اگر حرکت کی تو گولی ماردوں گی۔“ اس کی اس دھمکی پر چوہان نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ یہ ایک نظر ہی اسے یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ اسے دھمکی دینے والی بے شک پسٹل چلانا جانتی ہے لیکن اس کام میں مہارت نہیں رکھتی۔ ماہ بانو کے ہاتھوں میں موجود خفیف سی لرزش اس کی زیرک نگاہوں سے چھپی نہیں رہ سکی تھی، چنانچہ اس کی دھمکی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس نے یک دم ہی اس پر چھلانگ لگا دی۔ اسی پل شہریار نے بھی خود کو سنبھال لیا تھا چنانچہ وہ چوہان کو ماہ بانو کی طرف چھلانگ لگاتا دیکھ کر حرکت میں آیا اور خود چوہان پر چھلانگ لگا دی۔ اُن دونوں کے جسم فضا میں ہی ایک دوسرے سے ٹکرائے اور دونوں ہی نیچے زمین پر آرہے۔ چوہان کی بدقسمتی کہ نیچے گرتے ہوئے اس کا سر پوری قوت سے راہداری کی دیوار سے ٹکرا گیا اور اس کی آنکھوں کے سامنے ستارے سے ناچنے لگے۔ اس کی اس حالت کا شہریار نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور کھڑی ہتھیلی کا ایک نپا تلا وار اس کے سر پر مزید رسید کردیا۔ اس وار نے چوہان کی رہی سہی سدھ بدھ بھی چھین لی اور وہ نیم بے ہوش سا ہوگیا۔ شہریار نے اس کے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور کھینچتا ہوا اندر لے گیا۔

”یہاں کی کھڑکیاں بند کردو۔“ چوہان کو لاؤنج سے گھسیٹ کر ایک کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے اس نے ماہ بانو کو حکم دیا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے حکم پر عمل کرنے لگی۔ کھڑکیاں بند ہونے کے بعد اپارٹمنٹ ایک طرح سے ساؤنڈ پروف ہوگیا تھا۔ تنہائی پسند اور اپنی پرائیویسی کے لیے سخت کانشس رہنے والے طبقے کے لیے تعمیر کیے گئے ان اپارٹمنٹس کی بناوٹ میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ اندر کی آوازیں باہر نہ جائیں اور باہر کی آوازیں اندر نہ آسکیں۔ چنانچہ اب اس اپارٹمنٹ میں جو کچھ ہوتا، اس کا باہر والوں کو علم نہیں ہوسکتا تھا۔ اگر تھوڑی بہت آوازیں باہر جاتیں بھی تو سننے والے زیادہ سے زیادہ یہی گمان کرتے کہ اندر بلند آواز میں ٹیلی ویژن چل رہا ہے۔

”تم دوسرے کمرے میں بیٹھ کر میرا انتظار کرو۔“ کھڑکیاں بند کرنے کے بعد ماہ بانو خود بھی اس کمرے میں آگئی تھی جو شاید ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ شہریار جو

صوفی کے لیے عجیب نسخہ

ایک صوفی کی روایت ہے کہ: ”میں بادیہ پیمائی کرتا اِدھر اُدھر کے چکر کاٹتا ایک شہر میں پہنچا۔ دیکھا ایک طبیب کے مطب پر مریضوں کا ٹھٹ کا ٹھٹ لگا ہے۔ وہ بیچ میں بیٹھا ہے اور مریض اسے گھیرے ہوئے ہیں۔ وہ ہر ایک کی نبض دیکھتا ہے، حال سنتا ہے، نسخہ لکھتا ہے اور رخصت کردیتا ہے لیکن مریضوں کی کثرت کا یہ عالم ہے کہ ایک جاتا ہے تو اس کی جگہ لینے کو دو آدمی پہنچ جاتے ہیں۔ میں بھی ان ہی مریضوں میں گھل مل کر بیٹھ گیا۔ جب میری باری آئی تو میں نے طبیب سے کہا:

”خدا آپ پر رحم کرے۔ میرا روگ کسی طرح دور کردیجیے!“ طبیب نے قدرے مڑ کر مجھے دیکھا اور یہ نسخہ استعمال کرنے کی ہدایت کی:

”فقر کی ٹہنیاں، صبر کی پتیاں، تواضع کے پھول، ان سب کو ایک جگہ جمع کرکے یقین (ایمان) کے ظرف میں ڈالو، پھر اس مجموعے پر زندگی کا پانی چھڑکو اور اس کے نیچے حزن کی آگ لگاؤ پھر رضا کے جام میں توکل کی شراب انڈیلو، صدق کی ہتھیلی پر جام رکھو اور استغفار کے پیالے میں سب چیزیں ڈال کر پی جاؤ۔ اس کے بعد خوفِ خدا کے پانی سے کلی کرو، اور اپنے نفس کو حرص و طمع کے حملوں سے محفوظ رکھو، بس اس نسخے کے استعمال کے بعد اللہ نے چاہا تو تمہارا سارا روگ جاتا رہے گا۔“

سبیلہ سے امان لاسی کی تلاش

کہ چوہان کو نائیلون کی ڈوری کی مدد سے ایک کرسی سے باندھ رہا تھا، اس کی موجودگی کو محسوس کر کے تحکمانہ لہجے میں بولا۔ اس وقت وہ ایک قطعی بدلا ہوا انسان لگ رہا تھا جس کے چہرے سے سنجیدگی کے ساتھ ساتھ قدرے سفاکی بھی جھلک رہی تھی۔ ماہ بانو نے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھے اور خاموشی سے باہر نکل گئی۔

اس کے باہر نکلنے کے بعد شہریار، چوہان کو باندھنے سے فارغ ہوا تو اس نے اپنی جینز کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک پتلا سا تیز دھار چاقو باہر نکال لیا۔ چاقو کی دھار کی چمک نے اس کے چہرے پر موجود سفاکی کو کچھ اور بھی بڑھا دیا۔ اس کی نرم خوئی اور قانون پسندی کو پے در پے ملنے والی ناکامیوں اور خامیوں کی بالادستی نے وقتی طور پر سلا دیا تھا اور پھر یہاں تو سامنے تھا بھی وہ شخص جس نے اس کی معصوم اور کم عمر بھتیجی شینا کو نہایت بے دردی سے قتل کیا تھا۔ سجاد رانا کی موت کی ذمے داری بھی یقیناً اسی شخص پر عائد ہوتی تھی اور سب سے بڑھ کر اس کے بارے میں شک تھا کہ وہ ملک کا دشمن ہے جو یہاں رہ کر پڑوسی ملک کے مفادات کے لیے کام کر رہا ہے۔ اس نے کسی رو و رعایت سے کام لیے بغیر چاقو کی نوک چوہان کے رخسار پر رکھی اور تقریباً دو انچ لمبی ایک لکیر کھینچ دی۔ خون کی اس سرخ لکیر کے ابھرتے ہی چوہان نے ہلکی سی سسکاری لیتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔

"کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟" آنکھ کھلتے ہی اس نے بے خوفی سے شہریار سے سوال کیا۔

"سوال تم نہیں میں کروں گا اور تمہیں میرے ہر سوال کا جواب دینا ہوگا۔" شہریار اس کے زخمی رخسار پر ایک زوردار تھپڑ رسید کرتے ہوئے غرایا۔ تھپڑ کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ چوہان کا منہ دوسری طرف گھوم گیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" چوہان کے لمبے بالوں کی پونی ٹیل پکڑ کر اس کا منہ سیدھا کرتے ہوئے شہریار نے دریافت کیا۔

"چوہان خان۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا اور شہریار کے چہرے کو جانچتی ہوئی نظروں سے ٹٹولنے لگا۔ یک دم ہی اس کی آنکھوں میں چمک ابھری اور وہ زیرِ لب مسکرا دیا۔ اس نے سیاہی کے پیچھے چھپا اسے کی شہریار عادل کا چہرہ شناخت کر لیا تھا۔

"اصل نام بتاؤ۔" شہریار نے جنون کے عالم میں پے در پے کئی مکے اس کے منہ پر دے مارے۔ ان مکوں نے چوہان کے کئی دانت توڑ ڈالے اور اس نے ابکائی لیتے ہوئے ان دانتوں کے ساتھ بہت سا خون بھی اگل ڈالا۔

"مجھے اپنا صحیح نام بتاؤ ورنہ میں تمہارے جسم کا ایک ایک ریشہ ادھیڑ ڈالوں گا۔ اور ہاں، اس غلط فہمی میں نہ رہنا کہ میں تمہارے بارے میں کچھ جانتا ہی نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم را کے ایجنٹ ہو جس کے جرائم کی لسٹ اتنی لمبی ہے کہ پولیس کسٹڈی میں جاتے ہی سیدھے پھانسی کے پھندے پر لٹکائے جاؤ گے۔" اس نے ضروری سمجھا کہ چوہان پر اس کی حیثیت واضح کر دے۔

"تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے مسٹر! میں ایک پاکستانی شہری ہوں۔ تم چاہو تو میرا شناختی کارڈ دیکھ سکتے ہو۔" اس نے کمال ڈھٹائی سے جواب دیا۔ دانت ٹوٹ جانے کی وجہ سے اس کی آواز بہت عجیب سی نکل رہی تھی۔

"تمہاری مرضی۔ اگر تم میرے ہاتھوں اپنا حلیہ بگڑوانے پر ہی مصر ہو تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" شہریار کو اس کا جواب پسند نہیں آیا اور اس نے چاقو کی نوک چوہان کے سر پر عین اس جگہ رکھ دی جہاں کچھ دیر قبل دیوار سے ٹکرا جانے کے باعث بڑا سا گومڑ بن گیا تھا۔ چاقو کی نوک کو اس مقام پر رکھنے کے بعد اس نے اسے گھمانا شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ نوک سوراخ بناتی ہوئی اندر اترنے لگی۔ بننے والے سوراخ سے خون نکل کر چوہان کے چہرے پر بہنے لگا۔ ابتدائی ایک ڈیڑھ منٹ تک اس نے ضبط سے کام لیا اور ہونٹ بھینچے بیٹھا رہا لیکن پھر اس کی برداشت جواب دے گئی اور اس کے حلق سے بے اختیار چیخیں نکلتی چلی گئیں۔ شہریار نے اس کی چیخوں کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنا کام جاری رکھا۔ چاقو کی نوک آدھے انچ سے زیادہ اندر جا چکی تھی اور وہ جس مستقل مزاجی سے یہ کام کر رہا تھا، اس کو دیکھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ چاقو کا پھل دستے تک چوہان کے سر میں اسی پُراذیت طریقے سے اتارنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ چوہان نے اس کا یہ جنون بھانپ لیا اور ہانپتے ہوئے بولا۔

"رک جاؤ..... تم جو کچھ پوچھو گے میں بتانے کے لیے تیار ہوں۔"

"ٹھیک ہے تو پھر شروع کرتے ہیں۔ تم میرے سوالوں کا جواب دیتے جاؤ۔ جہاں تمہاری زبان رکی، وہاں میرا ہاتھ چلنا شروع ہو جائے گا۔"

"پہلے مجھے پانی پلا دو۔" اس نے اپنے خون آلود ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے فرمائش کی۔

"تم نے میری معصوم بھتیجی کو اپنی پتھر کی مورتی کے چرنوں میں بھینٹ چڑھاتے ہوئے اسے پانی پلایا تھا جو اپنے لیے پانی مانگ رہے ہو؟" شہریار اس کی فرمائش سن کر ایک بار پھر مشتعل ہو گیا اور پونی ٹیل سے پکڑ کر اس کے سر کو کئی جھٹکے دیے۔

"او کے..... مت پلاؤ پانی۔ جو پوچھنا ہے پوچھو۔" اپنے لیے کوئی رعایت نہ پا کر اس نے سپر ڈال دی اور نڈھال سے لہجے میں بولا۔

"نام؟" شہریار نے یک لفظی سوال کیا۔

"ورما۔"

"را کے لیے کب سے پاکستان میں کام کر رہے ہو؟"

"تقریباً تین سال سے۔"

"لاہور میں سیٹھ سندر رام کی کوٹھی کے تہ خانے میں خواجہ سراؤں کو جمع کر کے دیوی کے چرنوں میں ڈی آئی جی سجاد رانا کی بیٹی کو بھینٹ چڑھانے کا جو ڈراما کھیلا گیا اس کے پیچھے کیا مقصد تھا؟"

"میں نے اپنے کچھ خاص ساتھیوں کی مدد سے ہندو خواجہ سراؤں کا ایک گروہ تشکیل دیا تھا۔ چند ایک کے سوا گروہ کے تمام افراد کا تعلق پاکستان سے ہی ہے لیکن میں نے مہا گرو کی حیثیت سے ان کے ذہنوں میں یہ خیال راسخ کر دیا تھا کہ ہندو ہونے کے ناتے ان کی ساری وفاداریاں بھارت ماتا کے ساتھ ہونی چاہئیں۔ میں ان کا مذہبی پیشوا بھی بنا ہوا تھا اور میں نے یہ ریت ڈالی تھی کہ اگر ہم دیوی ماں کے چرنوں میں پابندی سے ہر پورن ماشی کی رات ایک جوان کنیا کی بھینٹ چڑھائیں اور پرارتھنا کریں تو دیوی ماں اُن جیسے ادھورے وجودوں کو جنم دینا چھوڑ دے گی۔ اس طریقے سے وہ لوگ ذہنی طور پر میرے غلام بن گئے تھے اور میں جو کچھ کہتا تھا، اس پر عمل کرتے تھے۔ ان میں سے کئی خوب صورت خواجہ سراؤں نے میرے حکم پر کئی شوقین مزاج سرکاری عہدے داروں کو اپنے دام میں گرفتار کر کے مجھے بہت سی کارآمد معلومات فراہم کیں لیکن پھر میری جاری کردہ رسم ہی نے میرے لیے مصیبت کھڑی کر دی۔

"خواجہ سراؤں کا ایک گروہ انجانے میں ڈی آئی جی سجاد رانا کی بیٹی کو اغوا کر کے لے آیا۔ میں نے بھی لڑکی کا بائیو ڈیٹا جاننے کی کوشش نہیں کی، نتیجے میں سجاد رانا نے پیچھا پکڑ لیا۔ اس سے بچنے کے لیے مجھے خود اپنے کئی لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنا پڑا اور میں گروہ کو منتشر کر کے بنا بنایا سیٹ اپ ختم کرنے پر مجبور ہو گیا۔" وہ جانتا تھا کہ کسی عدالت کے سامنے اقبالی بیان نہیں دے رہا ہے جو اس بیان کی بنیاد پر اسے کوئی سزا سنا دی جائے۔ یہ بیان ایک ایسے شخص کے سامنے دیا جا رہا تھا جو پہلے ہی بہت کچھ جانتا تھا اور زبان بند رکھنے کی صورت میں فوری طور پر بھی اس کی جان لے سکتا تھا، چنانچہ اپنے لیے مہلت حاصل کرنے کے لیے بولتا جا رہا تھا۔ بعد میں جب اسے کسی حکومتی ادارے کی تحویل میں دیا جاتا تو وہ ہر بات سے مکر جاتا۔ لمبی عدالتی کارروائیوں اور پیشیوں کے دوران کوئی ایسا موقع بھی مل سکتا تھا جب وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا..... لیکن ابھی وہ اپنی زبان بند رکھ کر اس جنون میں مبتلا شخص کے اشتعال کو اتنا بڑھانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا کہ وہ اسے جان ہی سے مار دے۔ بھارت ماتا کے لیے جان وار دینے کا سبق ان لوگوں نے صرف اپنے نیچے کے کارکنوں کو پڑھایا تھا۔ خود اسے اور اس کے لیول کے دوسرے لوگوں کو اپنی جانیں بہت عزیز تھیں چنانچہ وہ سب سے پہلے خود کو ہی بچانے کی کوشش کرتے تھے اور خود کو اور دوسروں کو بہلانے کے لیے یہ دلیل ہوتی تھی کہ ہم زندہ رہیں گے تو اپنی دھرتی کے لیے بہت کچھ کر سکیں گے۔

"ڈی آئی جی سجاد رانا کو بھی تم نے ہی قتل کروایا تھا؟" ورما کا اعترافی بیان سنتے ہی شہریار نے اسے سرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"سجاد رانا کا قتل ہمارے پروگرام میں شامل نہیں تھا لیکن وہ ہماری راہ پر اس طرح لگ گیا تھا کہ اگر ہم اس سے اپنی جان نہ چھڑاتے تو وہ ہمیں تباہ کر دیتا اس لیے ہمیں مجبوراً اس کا پتا صاف کرنا پڑا۔" ورما نہیں جانتا تھا کہ اس کا ہر اعتراف شہریار کی رگوں میں دوڑتے خون کی گردش تیز کرتا جا رہا ہے۔ وہ اپنے اس یقین کی بنیاد پر کہ بالآخر اسے قانون کے حوالے کر دیا جائے گا، اعتراف پر اعتراف کیے جا رہا تھا۔

"اپنے ساتھیوں کے نام اور ان کا پتا ٹھکانا بتاؤ۔" اس کے تسلسل سے ہم اور ہمیں کا صیغہ استعمال کرنے پر شہریار نے اس سے فرمائش کر ڈالی لیکن اس سوال کا جواب آسانی سے دے دینا ورما کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس نے یک دم ہی ہونٹ بھینچ لیے۔

"بتاؤ، ورنہ میں تمہارا قیمہ کر ڈالوں گا۔" اس کی خاموشی شہریار کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ چپ ہوا تو اس کا چاقو والا ہاتھ حرکت میں آ گیا اور اس نے پے در پے کئی وار ورما کے دونوں بازوؤں پر کر ڈالے۔ یہ وار کھا کر ورما کسی ذبح کیے جانے والے بکرے کی طرح چیخنے لگا۔ اس کی یہ چیخیں ہی تھیں جو ماہ بانو کو دوسرے کمرے سے یہاں لے آئیں۔ وہاں کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں خوف سے پھٹی رہ گئیں۔ خون میں نہایا ہوا ورما اور درندگی پر اترا شہریار اس کی نرم خو طبیعت کے لیے ناقابلِ برداشت تھے۔ ایک پل کے لیے اس منظر کو دیکھ کر ٹھٹکنے کے بعد وہ تیزی سے حرکت میں آئی اور شہریار کے ورما کے جسم پر گھاؤ لگانے کے لیے ایک بار پھر بلند ہوتے ہاتھ کو

اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

”نہیں سر! ایسا مت کریں۔ یہ بہت زخمی ہوگیا ہے، اب اور زخم لگے تو مر جائے گا۔“ وہ بولتے بولتے شہریار سے چمٹ گئی۔ اس کے بدن کے لمس نے شہریار کے اندر حیرت انگیز تبدیلی رونما کی اور اس کا تنا ہوا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے ایک نظر خود سے لپٹ کر کانپتی ہوئی ماہ بانو پر ڈالی اور اس کے گرد بازو کا گھیرا بنا کر ورما سے دور ہٹ گیا۔

☆☆☆

”میں تمہیں کیا کہوں جوان.... میری سمجھ میں نہیں آرہا۔ ایک طرف دیکھا جائے تو تم نے بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے لیکن حقیقت میں تم نے اپنی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے قانون کو ہاتھ میں لینے کی غلطی کی ہے۔ میں نے کتنی مشکل سے اس سچویشن کو ہینڈل کیا ہے، یہ میں ہی جانتا ہوں۔“ آئی جی مختار مراد کے لہجے میں اس کے لیے بہ یک وقت شفقت اور ناراضی دونوں موجود تھیں۔ ان کا شکوہ سن کر وہ ہنس پڑا۔

”مجھے معلوم تھا کہ آپ اس سچویشن کو ہینڈل کریں گے اسی لیے تو میں نے آپ کو کال کی تھی۔ ورنہ وہ خبیث تو گیا تھا میرے ہاتھ سے۔“

”اب بھی اُس کی حالت بہت خراب ہے۔ اس کے جسم سے خون بہت زیادہ بہہ گیا تھا۔ چوبیس گھنٹوں سے زیادہ وقت گزر جانے کے باوجود ڈاکٹرز ابھی تک حتمی طور پر اس کی زندگی کے بارے میں کچھ کہنے سے قاصر ہیں۔“ مختار مراد نے سنجیدگی سے اسے بتایا۔

”آپ فکر نہ کریں۔ ایسے ڈھیٹ لوگ اتنی آسانی سے دنیا کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ وہ بچ جائے گا۔ نہیں بھی بچا تو مجھے کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ مجھے اس سے جو اعترافات کروانے تھے، وہ اُس سلوک کے بغیر کر ہی نہیں سکتا تھا جو میں نے اس کے ساتھ کیا۔“ شہریار کا لہجہ بے لچک تھا۔ ورما سے اس کی نفرت کے پیچھے کوئی ایک وجہ نہیں تھی اور تمام ہی وجوہات ایسی تھیں جن کے بدلے وہ اس کی جان لینا درست سمجھتا تھا۔ وہ تو ماہ بانو عین وقت پر اس کے سامنے آگئی اور اسے اپنا ہاتھ روکنا پڑا ورنہ ورما کی جان تو چلی ہی جاتی۔

ماہ بانو نے اسے روکا تو وہ اپنی جنونی کیفیت سے باہر آیا اور مختار مراد کو فون کر کے مختصراً ساری صورتِ حال بتائی۔ مختار مراد کے لیے لاہور میں بیٹھ کر کراچی میں درپیش اس صورتِ حال کو ہینڈل کرنا ناممکن نہیں تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر فون گھمائے اور کراچی کی انتظامیہ حرکت میں آگئی۔ زخمی ورما کو اس کے اپارٹمنٹ سے ایمبولینس میں اسپتال منتقل کرنے سے لے کر اس کے اپارٹمنٹ کی تلاشی لینے اور کلفٹن کے بنگلے سے اس کی ساتھی عورت کو گرفتار کرنے تک کے مراحل بہت تیزی سے انجام پائے تھے۔ شہریار اور ماہ بانو پولیس کے اپارٹمنٹ پر پہنچنے سے پہلے ہی وہاں سے نکل گئے تھے۔ اس نے ماہ بانو کا حلیہ درست کروا کر پہلے اسے اس کے ہاسٹل پہنچایا پھر زبیر کے بنگلے میں موجود پاروتی اور اس کے شوہر کمار کو انعام و اکرام سے نوازنے کے بعد اس دھمکی سمیت کہ جو کچھ ہوا وہ خفیہ پولیس کی کارروائی تھی..... اور اگر ان دونوں میاں بیوی نے کسی کے سامنے زبان کھولی تو وہ بھی دھر لیے جائیں گے، رخصت کر دیا۔

ان سب کاموں سے فارغ ہونے کے بعد وہ کراچی سے لاہور جانے والی پہلی فلائٹ کے ذریعے روانہ ہوگیا۔ زبیر کو بھی اس نے فون پر اپنے جانے کی اطلاع دیتے ہوئے ائرپورٹ پہنچنے کا کہا تھا۔ بے چارہ زبیر بھاگم بھاگ ائرپورٹ پہنچا تو اس نے اسے اس کے بنگلے کی چابیاں تھمائیں اور آئندہ کبھی فرصت میں اس کے گھر آنے کا وعدہ کر کے اس سے رخصت ہوگیا۔ لاہور پہنچ کر بھی اس نے مشکل سے تین چار گھنٹے لیاقت رانا کی کوٹھی پر گزارے اور پھر وہاں سے نورکوٹ کے لیے روانہ ہو گیا۔ نتیجتاً اگلی صبح وہ ٹھیک وقت پر اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے لیے دفتر میں موجود تھا۔ مختار مراد کی یہ کال اسے دفتر میں ہی موصول ہوئی تھی اور وہ گزرے ہوئے کل کے مقابلے میں آج بہت پُرسکون ہو کر ان سے بات کر رہا تھا۔

”میں تمہاری اس بات سے متفق ہوں کہ ورما سے تم نے جو اعترافات کروائے، وہ اسی سلوک کے ساتھ ممکن تھا...... لیکن تمہارے سامنے کیے گئے اعترافات کی اُس وقت تک کوئی حیثیت نہیں جب تک ورما ہوش میں آنے کے بعد بھی وہ سب کچھ قبول نہیں کر لیتا۔ البتہ اس کے اپارٹمنٹ سے ملنے والے دستاویزی ثبوتوں اور اس کی گرفتار ہونے والی ساتھی کی وجہ سے ہمیں بہت مدد مل سکتی ہے۔ ان ثبوتوں کی روشنی میں ہی ورما پر کافی مضبوط کیس بنے گا۔ میرے محکمے کے لوگ بھی اگر میری تاویلیں قبول کر رہے ہیں تو اس لیے کہ ملنے والی دستاویزات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ورما مبینہ طور پر بھارتی جاسوس ہے لیکن ذاتی طور پر مجھے تمہارا اقدام پسند نہیں آیا۔“ انہوں نے اس پر اپنی ناپسندیدگی ظاہر کی۔

”حالانکہ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ میری وجہ سے آپ کے محکمے کی ساکھ ہی تھوڑی سی بہتر ہوگئی۔ سنا ہے آپ کا وہ آفیسر تو بہت خوش ہے جسے میری جگہ اس کارنامے کا کریڈٹ دیا جا رہا ہے۔“ شہریار نے لطیف سے لہجے میں ان پر طنز کیا۔

”وہ سب اپنی جگہ ہے لیکن تم نہیں جانتے کہ تم نے خود اپنے لیے کتنا بڑا رسک لیا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ سب کچھ تمہارے طے کردہ منصوبے کے مطابق ہی ہوتا۔ بازی الٹ بھی سکتی تھی۔ وہاں کراچی میں تمہیں کچھ ہو جاتا تو ہمیں خبر بھی نہ ہو پاتی۔ تم تو جانے سے پہلے کسی کو ذرا سی ہوا بھی نہیں لگا کر گئے تھے۔ ہم زیادہ سے زیادہ کچھ کر پاتے تو یہی کہ تمہاری لاش کھوج نکالتے۔ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ ان سوالوں کا جواب دینے کے لیے ہمیں کون ملتا؟ اور مل بھی جاتا تو تمہیں کھونے کے بعد ہمیں کیا حاصل ہوتا؟ ہم بوڑھوں کے حال پر رحم کرو بیٹا! میں نے اور رانا نے ابھی کچھ عرصہ قبل ہی اپنے بوڑھے شانوں پر دو جوان جنازوں کا بوجھ سہا ہے۔ ہم دونوں کے خاندان ٹوٹ چکے ہیں۔ ہمارے پاس واحد تم بچے ہو اور ہم تمہیں کھونا نہیں چاہتے۔“ مختار مراد کے الفاظ اور لہجے نے اسے اس جذباتی بحران کا احساس دلایا جس سے وہ گزر رہے تھے۔ وہ اس کی وجہ، خوف سے متفق نہ ہوتے ہوئے بھی شرمندہ ہوگیا۔

”آئی ایم سوری انکل! آئندہ میں احتیاط سے کام لوں گا۔“ اسے بجائے یہ دلیل دینے کے کہ جو رات قبر کے اندر لکھی ہے، وہ کسی صورت باہر نہیں گزاری جا سکتی.... اس نے سیدھے سیدھے معذرت کر لینا مناسب سمجھا۔ یہ پسپائی مختار مراد کی باتوں سے قائل ہو کر نہیں اختیار کی گئی تھی بلکہ اس محبت کے لیے خراجِ تحسین تھی جو ہر حال میں بہت قابلِ احترام تھی۔

”میں نے تمہاری بات پر بالکل بھی یقین نہیں کیا کیونکہ ایسے لیکچرز میں پہلے بھی تمہیں بہت دے چکا ہوں اور ان کا اثر بھی میں نے دیکھ رکھا ہے۔ حقیقتاً دیکھا جائے تو میری پوسٹ پر کام کرنے والے کسی شخص سے ایسی جذباتیت کی امید بھی نہیں رکھی جا سکتی..... لیکن سچ یہ ہے کہ بہرحال ہم پولیس اور آرمی وغیرہ کے لوگ بھی آخرکار ہوتے تو انسان ہی ہیں اور انسان جذبات سے خالی نہیں ہو سکتا۔“ اس کی اتنی فرماں برداری سے کی گئی معذرت کے جواب میں مختار مراد ہنس پڑا اور اس پر واضح کر دیا کہ بہرحال وہ اس سے بہت سینئر ہے اور اس کے اندر انسانوں کو پڑھ لینے کی صلاحیت اس سے کہیں زیادہ موجود ہے۔

”تھینک گاڈ کہ آپ نے میری بات پر یقین نہیں کیا ورنہ مجھے خواہ مخواہ وعدے کی پاسداری کے لیے کچھ نہ کچھ سوچنا پڑتا۔“ اس کا موڈ تبدیل ہوتا محسوس کر کے وہ خود بھی ہنس پڑا اور یوں ان کے درمیان جاری گمبھیر گفتگو ہلکے پھلکے انداز پر ختم ہوئی۔ اس فون سے فارغ ہونے کے بعد اس نے عبدالمنان کو اپنے دفتر میں کال کر لیا۔ اس سے اپنی غیر موجودگی میں پیش

میں

میں نے ہمیشہ تین نصیحتوں پر عمل کیا ہے اور مرنے سے پہلے یہی نصیحتیں اپنی اولاد کو کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی نصیحت یہ ہے کہ سگریٹ نوشی مت کرو۔ میرا مطلب ہے، زیادہ سگریٹ نوشی مت کرو۔ میری عمر تہتر سال چھ مہینے ہے اور میں پچھلے تہتر سال سے سگریٹ نوشی کر رہا ہوں مگر میں نے کبھی زیادہ سگریٹ نہیں پیے۔ ہمیشہ اعتدال سے کام لیا اور ہمیشہ ایک وقت میں ایک ہی سگریٹ پیا۔

دوسری نصیحت یہ ہے کہ عشق مت کرو یعنی زیادہ عشق مت کرو۔

تیسری نصیحت یہ ہے کہ شادی مت کرو۔ مطلب یہ ہے کہ اعتدال سے کام لو اور میری طرح ایک وقت میں ایک ہی شادی پر اکتفا کرو۔

مائیکل ایس جان ... صدر، کراچی

آنے والے حالات کی رپورٹ بھی تو لینا ضروری تھا۔

”سب کچھ معمول پر رہا سر! تمام پروجیکٹس بارش سے متاثر ہونے کے بعد دوبارہ نئے سرے سے جاری ہو چکے ہیں۔ پیرآباد کے اسکول کو بھی مرمت کے بعد اس لائق کر دیا گیا ہے کہ وہاں تدریسی سلسلہ جاری ہو سکے۔ مسز جوزف وہاں پڑھانا شروع بھی کر چکی ہیں۔ ان کے ساتھ فی الحال کوئی چھیڑ چھاڑ بھی نہیں کی گئی البتہ آپ کے لیے ایس پی صاحب کی طرف سے ایک پیغام ملا تھا۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ آپ ان کی ذاتی فرمائش پر ٹھنڈے دل سے اس آفر پر غور فرمائیں۔“ عبدالمنان اس کے بلاوے پر اندر آیا اور اس کے حکم پر اسے مختصراً رپورٹ پیش کرنے لگا۔

”ایسی کون سی آفر لے کر آئے ہیں ایس پی صاحب میرے لیے۔“ اس نے ٹیبل پر سے اپنا ہاتھ ہٹا کر کرسی پر بالکل سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا۔

"ان کا کہنا ہے کہ اگر آپ اور چودھری صاحب چاہیں تو وہ عدالت سے باہر آپ دونوں کے درمیان صلح کروا کر کوئی سیٹل منٹ کروا سکتے ہیں۔ آپ چودھری صاحب پر نیب اور دوسرے ٹیچرز کے قتل کے کیس سے دستبردار ہو جائیں، جواب میں چودھری صاحب بھی آپ پر کیے گئے مقدمے سے پیچھے ہٹ جائیں گے۔ بقول ایس پی صاحب، جان تو دونوں طرف کے کیسز میں نہیں ہے۔ آپ دونوں ہی ایک دوسرے کو عدالت میں مجرم ثابت نہیں کر سکیں گے اس لیے بیکار کی کھینچا تانی سے کیا حاصل؟ بہتر ہے آپس میں صلح کر لیں اور شیر اور بکری کے ایک گھاٹ پر پانی پینے کی مثال قائم کریں۔" عبدالمنان نے کچھ سا مسکراتے ہوئے اسے ایس پی کا پیغام سنایا۔

"مگر یہ کیسے طے ہوگا کہ ہم دونوں میں سے شیر کون ہے اور بکری کون؟" ورما کی گرفتاری نے اس کے موڈ پر بڑا ہی خوش گوار اثر ڈالا تھا اس لیے اس پیغام کو سن کر کسی قسم کی ناگواری کا اظہار کیے بغیر بڑے ہلکے پن سے سوال کیا۔

"سوری سر! مجھے یہ اتنا ٹیکنیکل سوال پوچھنے کا خیال نہیں رہا۔ اگر آپ کہیں تو ابھی ایس پی صاحب سے وضاحت طلب کر لی جائے؟" اس کا موڈ بھانپ کر عبدالمنان نے خود بھی شوخ انداز اختیار کیا۔

"نہیں، رہنے دو۔ شیر کبھی کسی سے اپنی شناخت پوچھتا ہے نہ بیان کرتا ہے۔ اس کا عمل خود بتا دیتا ہے کہ وہ شیر ہے۔ تم ایس پی صاحب کو جوابی پیغام بھجوا دو کہ کیس واپس نہیں لیا جائے گا۔ بے شک اس کیس کا فیصلہ عدالت میں نہ ہو سکے لیکن یہ کیس حق و باطل کی جنگ کی علامت کے طور پر کھلا رہے گا۔" ان الفاظ کو ادا کرتے ہوئے اس کے لہجے میں گہری سنجیدگی تھی۔

"او کے سر! میں آپ کا پیغام پہنچا دوں گا۔" عبدالمنان نے بھی فوراً سنجیدگی اختیار کر لی۔

"ویسے آج کل اپنے چودھری صاحب کی مصروفیات کیا ہیں؟ پچھلے دنوں ان کے جو نقصانات ہوئے، ان کے دکھ سے تو وہ باہر نکل آئے ہوں گے؟" ایک فائل کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس نے عبدالمنان سے پوچھا۔

"آپ کی غیر موجودگی میں چودھری صاحب کی تالیف قلب کے لیے بڑا شاندار انتظام ہو گیا۔ ان کی کوئی امریکن دوست ملاقات کے لیے آئی ہوئی ہیں۔ میں نے خاتون کو دیکھا تو نہیں لیکن ان کے حسن کی شہرت بہت سنی۔ معلوم نہیں کہ وہ واقعی حسین ہیں یا ہمارے ہاں کے لوگوں کی عادت کے مطابق ہر گوری میم کی طرح حسین لگی ہیں۔ بہر حال، سنا ہے کہ چودھری صاحب خاتون کے ساتھ خوب گھومے پھرے، انہیں جنگل میں شکار کے لیے بھی لے جایا گیا۔ شکار کس کا ہوا، یہ اطلاع نہیں مل سکی۔ البتہ خاتون کے گاؤں میں ذوق و شوق سے گھومنے پھرنے کی اطلاعات ملتی رہیں۔ مسز جوزف کا فون آیا تھا۔ انہوں نے اطلاع دی ہے کہ چودھری صاحب کی مہمان لیڈی گاؤں کے اسکول بھی تشریف لے گئی تھیں جہاں انہوں نے اسکول کی حالت پر افسوس کرتے ہوئے مسز جوزف کو اچھے خاصے ڈالرز امداد کی مد میں دیے ہیں جو انہوں نے امانتاً اپنے پاس رکھ لیے ہیں اور منتظر ہیں کہ یہاں سے کوئی جائے تو اس کے حوالے کیے جائیں یا پھر یہاں سے جو ہدایات ملیں اس کے مطابق خرچ ہوں۔" عبدالمنان نے اسے بتایا۔

"کاش میں چودھری کو ان دونوں عورتوں کی مثال دے کر کوئی اچھی سی نصیحت کر سکتا۔ وہ غیر مذہب اور قوم کی ہو کر یہاں کے بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ دیکھنا چاہتی ہیں جب ہی تو ایک اسکول میں پڑھانے کھڑی ہے اور دوسری امداد دے گئی ہے لیکن مجھے معلوم ہے کہ چودھری صاحب پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ انہیں دولت اور اختیار کے ساتھ ساتھ فرعونی صفات بھی اپنے اجداد سے ورثے میں ملی ہیں اور وہ جب تک اپنے عمل پر قائم رہیں گے، جب تک کوئی موسیٰ کا وارث بن کر ان کے سامنے ڈٹ کر نہیں کھڑا ہوگا۔" اس نے افسوس اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں تبصرہ کیا جسے سن کر عبدالمنان کچھ بولا نہیں لیکن اس کے چہرے پر ایک بھرپور نظر ضرور ڈالی۔ روشن پیشانی اور بے ریا آنکھوں والے اپنے اس باس کو وہ کسی سے بھی تشبیہ نہ دے سکا۔

☆☆☆

"پھر آج تم میرے ساتھ گھر چل رہی ہو نا؟ میں نے بھائی سے کہہ دیا تھا کہ وہ گھر پر ہی رہیں، مجھے اور مہرین کو آپ سے کچھ اہم ٹاپکس سمجھنے ہیں۔ محترم کچھ نخروں سے مانے لیکن مان گئے۔ آخر سامنے بھی تو میں تھی۔" اس کے برابر میں بیٹھ کر سوال کرتے ہوئے راحیلہ خود ہی اپنے کارنامے پر اترائی اور فرضی کالر کھڑے کرنے لگی۔

"اگر وہ معروف تھے تو تمہیں ان کے ساتھ زبردستی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ مجھے اندازہ ہے کہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے ان کی کتنی ٹف روٹین ہوگی۔ ایسے میں ان کے آف ڈے پر ہم زبردستی ان کے سر پر مسلط ہو جائیں تو کچھ اچھا نہیں لگتا۔" ڈاکٹر طارق کے مشکل سے راضی ہونے کا سن کر وہ کچھ پزل سی ہو گئی۔ اصل میں وہ جس روز شہریار کے کہنے پر کالج کی چھٹی کر کے اس کے ساتھ ورما کے اپارٹمنٹ پر گئی تھی، اس روز اس کے کئی اہم لیکچرز مس ہو گئے تھے۔ اس نے اگلے روز راحیلہ سے

ان لیکچرز کے نوٹس لے لیے اور اس سے مشکل پوائنٹس سمجھانے کی درخواست بھی کر ڈالی۔ اب معلوم نہیں راحیلہ کے سمجھانے میں کچھ کمی تھی یا وہ ورما کے اپارٹمنٹ پر ہونے والی کارروائی سے ذہنی طور پر اتنی ڈسٹرب تھی کہ باوجود کوشش کے اسے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ راحیلہ نے یہ صورتِ حال دیکھی تو آفر کردی کہ وہ اس کے بھائی ڈاکٹر طارق سے گھر چل کر پڑھ سکتی ہے۔ ماہ بانو کو ڈاکٹر طارق کے پڑھانے کا موثر انداز پسند آیا تھا اس لیے اس نے اس آفر کو قبول کرلیا لیکن اب راحیلہ کی زبانی یہ سننے کے بعد کہ وہ مشکل سے آمادہ ہوا ہے، ہچکچاہٹ کا شکار ہو گئی تھی۔

"یہ فضول تکلف کی باتیں جانے دو۔ بھائی کی ساری نخرے بازی میرے لیے ہوتی ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ اصل میں مہرین کو آپ کی مدد کی ضرورت ہے تو وہ فوراً راضی ہو گئے۔ ویسے بھی تم کافی پسند آئی ہو انہیں۔" آخری جملہ کہتے ہوئے راحیلہ کا انداز کچھ معنی خیز تھا لیکن اپنی دُھن میں بیٹھی ماہ بانو نے غور نہیں کیا۔ آج کل اس کا دماغ کچھ یونہی اڑا اڑا سا رہتا تھا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ اس سے اچانک آکر ملنے والا اور پھر اسے ایک اہم مشن میں شامل کر لینے والا شخص شہریار ہی تھا۔ وہ تو بس ایک خواب کی طرح سے آکر چلا گیا تھا۔

شہریار سے اس کی ہونے والی یہ غیر متوقع ملاقات اتنی سنسنی خیزی سے بھرپور تھی کہ کہیں کوئی رومانس کا چانس نکلتا ہی نہیں تھا پھر بھی اسے بار بار وہ لمحے یاد آجاتے تھے جب وہ ورما کو شہریار کی جنوں خیزی سے بچانے کے لیے اس کے ساتھ لپٹ گئی تھی۔ اس کے اس عمل نے یک دم ہی شہریار کے جنون کو قابو میں کرلیا تھا اور وہ ورما سے دور ہٹ گیا تھا لیکن ماہ بانو کے لیے ایک خوش فہم سا سوال ضرور جنم لے چکا تھا۔ "کیا میں شہریار عادل کے لیے اتنی اہم ہوں کہ وہ میرے کہنے پر اپنے غصے کو قابو کر گئے؟" کبھی اسے لگتا کہ یہ سچ ہے اور واقعی وہ شہریار کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ کبھی وہ خود ہی اپنے خیال کو رد کر دیتی اور یہ دلیل دیتی کہ وہ جس کیفیت میں مبتلا تھا، میری جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو اس کی طرف سے اسی ردِعمل کا اظہار ہوتا۔ اس اُدھیڑ بن نے اس کے ذہن کو اچھا خاصا منتشر کردیا تھا اور وہ بیٹھے بیٹھے کھو سی جاتی تھی۔

"اچھا چلو اٹھ جاؤ اور زیادہ نخرے مت دکھاؤ۔ بھائی کو پتا چلا کہ تم میری بات سن کر گھر آنے سے انکاری ہو گئیں تو وہ مجھ سے سخت خفا ہوں گے۔" راحیلہ کو اس کی اندرونی کیفیت کا بھلا کیا علم تھا۔ وہ اپنے اندازوں سے جو سمجھ رہی تھی، اس کے مطابق ہی بولتی جارہی تھی۔

"ٹھیک ہے چلتے ہیں۔" ماہ بانو اس کے مسلسل اصرار پر ہتھیار ڈالتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ حسبِ سابق انہوں نے رکشے پر راحیلہ کے گھر تک کا سفر طے کیا۔

"پچھلی بار تم نے ہمارے برابر والے بنگلے میں جس عورت کو دیکھا تھا، اسے پولیس نے گرفتار کرلیا ہے۔" راحیلہ کے گیٹ پر اترنے کے بعد اس کی نظریں بے ساختہ اس کے پڑوس کے بنگلے پر اٹھ گئی تھیں۔ یہیں تو اس نے مہا گرو کو دیکھ کر اس کے بدلے ہوئے حلیے کے باوجود شناخت کیا تھا۔

"کیوں؟ پولیس نے اس عورت کو کیوں گرفتار کیا؟" وہ سب جانتی تھی لیکن اصولی طور پر اسے راحیلہ سے سوال کرنا چاہیے تھا چنانچہ اس نے کیا۔

"واضح طور پر تو کوئی وجہ سامنے نہیں آئی، بہت خاموشی سے ریڈ کیا گیا تھا۔ بعد میں اخبارات تک میں کوئی ذکر نہیں آیا لیکن میرا جہاں تک خیال ہے، وہ عورت کوئی کال گرل ہی تھی کسی نے مخبری کردی ہوگی اس لیے پولیس نے ریڈ کر ڈالا لیکن ایسی عورتیں پھنس جائیں تو نکلنے کے سو گر جانتی ہیں۔ اُن کے عاشقوں کی کوئی کمی تو ہوتی نہیں۔ دیکھنا چند دن بعد ہی باہر ہوگی اور شان سے اپنا کاروبار چلائے گی۔" اس سے باتیں کرنے کے دوران راحیلہ نے دروازے کی گھنٹی بھی بجائی تھی اور چوکیدار کے گیٹ کھولنے پر وہ دونوں اندر بھی داخل ہو گئی تھیں۔ اپنی پڑوسی عورت کے بارے میں راحیلہ نے جو خیال آرائیاں کی تھیں، ماہ بانو نے ان پر کوئی جوابی تبصرہ کرنا ضروری نہیں سمجھا ورنہ اس سے بہتر کون جانتا تھا کہ وہ عورت جس چکر میں گرفتار کی گئی ہے، وہ کوئی معمولی نہیں ہے۔

"دیکھیں خاتون! میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ آپ یہاں سے تشریف لے جا سکتی ہیں۔ آپ کی بہن کس کے ساتھ اور کہاں گئی، مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میری اس سے آخری بار اسپتال میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد میں نے نہ تو اسے دیکھا اور نہ ہی کہیں ملاقات کے لیے بلایا۔" وہ دونوں ابھی لاؤنج کے دروازے پر ہی تھیں کہ انہیں اندر سے ڈاکٹر طارق کی سخت آواز سنائی دی۔ اس کے اور راحیلہ کے قدم ٹھٹک گئے اور وہ وہیں رک گئیں۔ کھلے دروازے سے اندر کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔ سامنے ڈاکٹر طارق چہرے پر غصے کی سرخی لیے کھڑا نظر آرہا تھا جبکہ اس کے مقابل ایک فربہی مائل عورت بیٹھی تھی جس کی دروازے کی طرف پشت ہونے کی وجہ سے وہ دونوں اس کی شکل نہیں دیکھ سکتی تھیں، البتہ پشت پر موجود اس کے بالوں کی موٹی سی چوٹی کی سیاہ رنگت اتنا ضرور بتا رہی تھی کہ عورت جوان العمر ہے۔

"لیکن روبی نے خود گھر سے روانہ ہونے سے پہلے مجھے بتایا تھا کہ وہ ڈاکٹر طارق یعنی آپ سے ملنے جارہی ہے۔ وہ مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولتی تھی۔ میں نے اس کے لیے ہمیشہ بڑی بہن سے زیادہ سہیلی کا کردار ادا کیا ہے۔ آپ جب سے اس کی زندگی میں آئے تھے، میں تب سے ہی آپ کو جانتی ہوں۔ روبی نے مجھ سے آپ کے بارے میں کچھ نہیں چھپایا تھا۔ کل شام بھی وہ تیار ہوکر گھر سے نکلی تھی تو اس نے مجھے یہی بتایا تھا کہ ڈاکٹر طارق کی سالگرہ ہے اور انہوں نے خاص طور پر مجھے انوائٹ کیا ہے۔ میں رات دس ساڑھے دس بجے تک بنا تشویش اس کا انتظار کرتی رہی کہ ڈنر وغیرہ سے فارغ ہونے میں اتنا ٹائم تو لگ ہی جاتا ہے .... پھر روبی نے یہ بھی کہا تھا کہ ڈاکٹر طارق خود مجھے چھوڑنے گھر تک آئیں گے اس لیے بھی مجھے خاص فکر نہیں تھی .... لیکن روبی رات بھر گھر نہیں آئی۔ میں اس کے سیل فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن وہ بند تھا۔ میں نے کئی بار آپ کا نمبر بھی ملایا۔ آپ کا نمبر بھی نہیں مل سکا۔ رات بھر پریشانی میں گزار کر میں صبح اسپتال گئی تو معلوم ہوا کہ آپ نائٹ ڈیوٹی کر کے گھر واپس جاچکے ہیں۔ میں اسپتال سے آپ کے گھر کا پتا لے کر یہاں پہنچ گئی تاکہ آپ سے روبی کے بارے میں معلوم کرسکوں لیکن آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ کچھ نہیں جانتے۔ اب آپ بتائیں کہ میں کیا کروں؟ کہاں سے اپنی بہن کو ڈھونڈ کر لاؤں؟" اپنی بات کے اختتام پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"مجھے افسوس ہے خاتون کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ آپ نے جو کچھ بتایا، اسے سن کر میں یہی اندازہ لگا سکا ہوں کہ روبی مسلسل آپ سے جھوٹ بولتی رہی ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ کل میری سالگرہ کا دن ہی نہیں تھا تو میں اسے کیسے ڈنر پر انوائٹ کرسکتا تھا؟ ہوسکتا ہے روبی کا کسی اور شخص سے افیئر چل رہا ہو اور وہ شخص اس لائق نہ ہو کہ وہ اسے گھر والوں کے سامنے پیش کرسکے اس لیے اس نے اپنے وقت بے وقت باہر آنے جانے کے لیے ایک اچھے جواز کے طور پر آپ کے سامنے میرا نام لے لیا ہو۔ بہرحال، میں آپ پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ نہ تو میرا روبی سے ایسا کوئی تعلق تھا اور نہ ہی وہ اس حساب سے میرے معیار پر پوری اترتی تھی کہ میں اس کے بارے میں ایسا کچھ سوچتا۔" طارق کا انداز بے حد دو ٹوک بلکہ ایک طرح سے کافی بے رحم تھا۔

"میں نہیں مان سکتی۔ میری بہن ایسی لڑکی نہیں ہے کہ اس قسم کے جھوٹ بولے۔" خاتون نے روتے ہوئے طارق کی بات کو رد کیا۔

"بھائی بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں محترمہ! اس بات کی گواہی تو میں بھی دے سکتی ہوں کہ کل شام میں یہ سات بجے تک گھر پر ہی تھے اور اس کے بعد اپنی ڈیوٹی کے لیے اسپتال چلے گئے تھے اس لیے اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ انہوں نے آپ کی بہن کو کہیں بلایا ہو۔" ماہ بانو کے ساتھ دروازے پر ہی رکی راحیلہ یک دم ہی لاؤنج میں داخل ہوئی اور اپنے بھائی کی حمایت میں بیان دیا۔

"تو پھر وہ کہاں چلی گئی؟" خاتون کی آواز میں نمایاں بے بسی تھی۔

"وہ جہاں بھی گئی ہو، کم از کم یہاں نہیں آئی۔ اس لیے پلیز آپ یہاں سے تشریف لے جائیں اور کہیں اور اسے تلاش کریں۔ میں اپنی بہن کی موجودگی میں اس بے ہودہ موضوع کو مزید جاری نہیں رکھنا چاہتا۔" خاتون نے سوال تو جانے کس سے کیا تھا لیکن جواب طارق نے نہایت خراب موڈ کے ساتھ دیا۔ اس کے اس رویّے کے بعد خاتون کے لیے وہاں رکنا ہر صورت میں بے کار تھا۔ وہ آنسو بہاتی ہوئی ماہ بانو کے قریب سے گزر کر بیرونی راستے کی طرف بڑھ گئیں۔ پینتیس سے چالیس کی درمیانی عمر کی وہ قبول صورت سی خاتون جس مایوسی کے عالم میں وہاں سے نکلی تھیں، اس نے ماہ بانو کے دل پر گہرا اثر کیا لیکن بات وہی تھی کہ خاتون جس مسئلے سے دوچار تھیں، اس میں وہ ان کی کوئی مدد بھی نہیں کرسکتی تھی۔

"یہ کون محترمہ تھیں بھائی جو اس طرح منہ اٹھا کر آپ پر الزام دھرنے چلی آئی تھیں؟" خاتون کے جانے کے بعد ڈاکٹر طارق سر تھام کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ راحیلہ نے اپنے ہاتھ میں موجود کتابیں اور فائلیں وغیرہ میز پر پٹخنے کے انداز میں رکھیں اور تیز لہجے میں اس سے سوال کیا لیکن انداز سے صاف ظاہر تھا کہ لہجے کی یہ تیزی بھائی کے لیے نہیں بلکہ اُن خاتون کے لیے ہے جو ابھی ابھی وہاں سے روانہ ہوئی تھیں۔

"پہلے اپنی سہیلی کو تو اندر بلا کر بٹھاؤ پھر یہ تفتیش کر لینا۔" ابھی تک دروازے کے قریب تذبذب کے عالم میں کھڑی ماہ بانو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر طارق نے راحیلہ کو ٹوکا۔

"اوہ، سوری مہرین! پلیز تم تو اندر آکر آرام سے بیٹھو۔ اصل میں گھر میں گھستے ہی ایسی سچویشن کا سامنا کرنا پڑا ہے کہ دماغ کچھ کام نہیں کر رہا۔" وہ جلدی سے ماہ بانو کی طرف متوجہ ہوئی اور اس کے اندر آکر بیٹھنے کے بعد ایک بار پھر بھائی کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"تم تو اس طرح مجھے گھور رہی ہو جیسے میری نانی جان ہو۔ بہرحال، تمہاری تسلی کے لیے میں تمہیں تفصیل بتا دیتا ہوں۔

روبینہ عرف روبی اس اسپتال میں نرس ہے جہاں میں جاب کرتا ہوں۔ ایک دو دفعہ میں اس کی فرمائش پر اس کی بیمار والدہ کا چیک اپ کرنے اس کے ساتھ اس کے گھر گیا تھا۔ روبینہ کے والد یا کوئی بھائی نہیں ہے۔ پہلے اس کی والدہ ملازمت کرتی تھیں پھر بڑی بہن نے ایک گارمنٹ فیکٹری میں جاب کر کے ان کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ روبینہ نے بھی نرسنگ کی ٹریننگ لے کر دو سال پہلے جاب کا آغاز کیا تھا۔ والدہ اپنی بیماری کی وجہ سے بہت عرصے سے ملازمت چھوڑ چکی تھیں۔ یوں سمجھ لو کہ میں ان لوگوں سے ملا تو مجھے یہ خاصا بے بس اور تنہا خاندان محسوس ہوا اور ہمدردی کے جذبے کے تحت میں کبھی کبھار روبینہ کے گھر فون کر کے اس کی والدہ اور بہن سے خیر خیریت لینے لگا۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ میری اس ہمدردی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے روبینہ نے گھر میں کیا کہانی سنائی اور میری آڑ لے کر کس سے ملنے جاتی رہی۔ اس کی بہن سے میری جو بات چیت ہوئی ہے، وہ تم لوگوں نے بھی سن لی ہے اس لیے میرے خیال میں ہمیں اب مزید اس موضوع کو ڈسکس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم دونوں آرام سے بیٹھو، میں ابھی تھوڑی دیر میں کھانے پینے کے لیے کچھ لے کر آتا ہوں۔ خاتون کی آمد کی وجہ سے میں پہلے باہر نہیں نکل سکا تھا۔" مختصراً ساری بات بتا کر ڈاکٹر طارق باہر چلا گیا۔

"آج کل جانے لڑکیوں کو کیا ہو گیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس راہ پر چل رہی ہیں۔" ڈاکٹر طارق کے جانے کے بعد راحیلہ نے بڑی بوڑھیوں کی طرح تبصرہ کیا۔ اس کے بعد بھی وہ ماہ بانو کو ایسے کئی قصے سناتی رہی جن میں گھر سے بھاگ جانے والی لڑکیوں کا ذکر تھا۔ ماہ بانو بے دلی سے یہ قصے سنتی رہی۔ ڈاکٹر طارق کے واپس آنے کے بعد ان لوگوں نے کھانا کھایا لیکن ہر شخص ہی اپنی جگہ اعصابی دباؤ کا شکار تھا اس لیے کسی نے بھی اچھی طرح کھانا نہیں کھایا۔

"میرے خیال میں آج میں تم لوگوں کو یکسوئی سے نہیں پڑھا سکوں گا اس لیے بہتر ہے کہ کسی اور دن پر یہ پروگرام رکھ لو۔" کھانے کے بعد ڈاکٹر طارق نے اعلان کیا۔

"ٹھیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن اس صورت میں، میں مزید یہاں رکنے کے بجائے ہاسٹل جانا پسند کروں گی۔ روز روز ہاسٹل سے دیر تک باہر رہ کر میں کسی کو خود پر انگلی اٹھانے کا موقع نہیں دے سکتی۔" اس کی بات سن کر ماہ بانو یک دم ہی کھڑی ہو گئی۔

"ابھی بھی کیا جلدی ہے یار! تھوڑی دیر ٹھہر کر چلی جانا۔" راحیلہ نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

"مہرین ٹھیک کہہ رہی ہے راحیلہ! یہ ہاسٹل میں رہتی ہے اس لیے اسے زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔" ماہ بانو کے کچھ کہنے سے قبل ڈاکٹر طارق نے بہن کو جواب دیا اور پھر ماہ بانو سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"آئیں مہرین! میں آپ کو ہاسٹل چھوڑ دیتا ہوں۔ اس وقت یہ علاقہ بالکل ہی سنسان ہوتا ہے اس لیے آپ کا اکیلے جانا مناسب نہیں۔ ایسا کرو راحیلہ تم بھی ہمارے ساتھ ہی چلو۔" راحیلہ کو ساتھ چلنے کا کہہ کر اس نے ماہ بانو کے لیے انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی چنانچہ وہ تینوں ایک ساتھ گھر سے روانہ ہو گئے۔ ڈاکٹر طارق کے پاس سواری کے لیے موٹر سائیکل تھی جس پر ظاہر ہے، وہ تینوں ایک ساتھ نہیں جا سکتے تھے۔ انہیں ٹیکسی کے لیے خاصا فاصلہ پیدل طے کر کے روڈ تک جانا پڑا۔ اُمرا کے اس علاقے میں جہاں لوگ اپنی ذاتی سواریوں کے مالک ہوتے ہیں، ٹیکسی کا اس بھری دوپہر میں ملنا بھی ایک کارِ دشوار تھا۔ انہیں انتظار میں کھڑے کھڑے تقریباً دس منٹ گزر گئے لیکن کسی ٹیکسی کی صورت نظر نہیں آئی۔ سڑک سے جتنی بھی گاڑیاں گزر رہی تھیں، وہ لوگوں کی ذاتی ملکیت تھیں۔ پبلک ٹرانسپورٹ کا کوئی نام و نشان ہی نہیں تھا۔ اس صورتِ حال پر کوفت زدہ سے کھڑے وہ تینوں آپس میں باتیں کرتے ہوئے بوریت سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اپنے قریب بریکس کی چرچراہٹ سن کر چونک گئے۔ تینوں نے بیک وقت نظر اٹھا کر اپنے قریب رکنے والی گاڑی کو دیکھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر لکیر جیسی پتلی مونچھوں والا ایک لمبا چوڑا آدمی بیٹھا تھا۔ اس آدمی کو دیکھ کر ماہ بانو کی روح فنا ہونے لگی۔ وہ چودھری کے اہم کارندوں میں سے ایک کارندہ شیدا تھا جو اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے انگلی سے یوں اشارہ کیا جیسے اُسے اپنے پاس بلا رہا ہو۔ چودھری کے خاص ملازمین اتنے سرچڑھے تھے کہ اپنے اشارے کو بھی حکم کا درجہ دیے جانے کی خواہش رکھتے تھے۔ مگر ماہ بانو میں اتنی سکت ہی کہاں تھی کہ وہ اس کے حکم کی تعمیل میں اپنے قدموں کو حرکت دے پاتی۔ سرد ہوتے ہاتھ پیروں کے ساتھ وہ وہیں کھڑے کھڑے بھربھری مٹی کی طرح نیچے زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

"مہرین! کیا ہوا؟" ہوش کھونے سے قبل اس نے ڈاکٹر طارق کی تشویش بھری آواز سنی۔

حادثات و سانحات کی شکار... پناہ کی تلاش میں سرگرداں ماہ بانو کی داستانِ حیات کے واقعات اگلے ماہ پڑھیے

''مہرین... اٹھو مہرین، آنکھیں کھولو۔'' اسے یوں لگ رہا تھا کہ کوئی بہت دور سے آوازیں دے رہا ہو۔ فوری طور پر تو وہ یہ بھی نہ سمجھ سکی کہ پکارنے والا اسے پکار رہا ہے۔ حالات نے اسے ماہ بانو سے مہرین بن کر رہنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن وہ پوری طرح اپنے اس دوسرے نام کو قبول نہیں کر سکی تھی۔ بے ہوشی سے ہوش کی دنیا تک سفر کرتے ہوئے اس کا ذہن بہت مشکل سے یاد کر سکا کہ مہرین کے نام کی یہ پکار دراصل خود اس کے لیے ہے۔ اس نے بڑی مشکل سے بوجھل پلکوں کو کھول کر پکارنے والے کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں نے سب سے پہلے ڈاکٹر طارق کے چہرے کو گرفت میں لیا۔ وہ اس کی بائیں کلائی کو اپنی انگلیوں کی گرفت میں لیے دائیں ہاتھ سے دھیرے دھیرے اس کا رخسار تھپتھپا رہا تھا۔ ڈاکٹر طارق کے پیچھے ہی راحیلہ کچھ پریشان سی کھڑی تھی۔ اس نے نظریں گھما کر اردگرد دیکھا۔ آشنا در و دیوار نے اسے بتایا کہ وہ راحیلہ کے بنگلے میں اس کے بیڈ روم میں موجود ہے لیکن اس حال میں کیوں موجود ہے؟ اس سوال کا جواب اسے کچھ دیر بعد یاد آیا۔ یاد آتے ہی وہ متوحش سی ہو کر بستر پر اٹھ بیٹھی۔

''ریلیکس مہرین!'' ڈاکٹر طارق نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''وہ... وہ کہاں ہے؟'' وہ یوں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی جیسے ابھی کمرے کی کوئی دیوار شیدے کو اگل دے گی۔ وہ شیدے کو دیکھ کر ہی تو بے ہوش ہوئی تھی۔ اسے یاد تھا کہ ڈاکٹر طارق اور راحیلہ اسے ہاسٹل چھوڑنے کے لیے جا رہے تھے۔ وہ لوگ ٹیکسی کے انتظار میں سڑک کے کنارے کھڑے تھے، جب شیدے نے اپنی گاڑی عین اس کے سامنے لا کر روکی تھی اور پھر اسے اشارے سے بلایا بھی تھا۔ شیدے کے ہاتھ لگ جانے کا مطلب تھا، وہ ایک بار پھر چودھری کے چنگل میں جا پھنستی۔ بہت عرصے بعد تو گرداب میں پھنسی اس کی زندگی میں یہ دن آئے تھے کہ وہ اپنی من پسند زندگی کا ایک حصہ گزار رہی تھی۔ اس زندگی میں اپنے گھر والوں کی جدائی تو ضرور تھی لیکن اسے اپنے ڈاکٹر بننے کا خواب پورا ہوتا نظر آ رہا تھا۔

''تم کس کے بارے میں پوچھ رہی ہو؟'' ڈاکٹر طارق نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ شیدا... چودھری افتخار کا کارندہ۔'' اس نے اسی خوف زدہ سے انداز میں جواب دیا۔

''کون چودھری افتخار؟ ذرا کھل کر تفصیل سے بتاؤ۔''

ڈاکٹر طارق نے اسے ٹوکا تو اسے یک دم جھٹکا سا لگا اور وہ خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

''بتاؤ نا مہرین! یہ شیدا اور چودھری افتخار کون ہیں؟ تمہارے ساتھ آخر ایسا کیا مسئلہ ہے کہ تم اچانک ہی بالکل مختلف طریقے سے بی ہیو کرنے لگتی ہو۔ کیا تمہاری کسی سے کوئی دشمنی ہے جس کی وجہ سے تم راہ چلتے یکایک خوف زدہ ہو جاتی ہو۔ اس دن کالج کے سامنے تم خواجہ سرا سے ڈر گئی تھیں اور اب ایک راہ گیر سے اتنی خوف زدہ ہوئیں کہ خوف کی شدت سے بے ہوش ہی ہو گئیں۔ تم اپنے اس خوف کی وجہ بتاؤ تو شاید ہم تمہاری کچھ مدد کر سکیں۔'' راحیلہ جواب تک خاموش کھڑی تھی، اس کے قریب آ کر بہت اصرار سے پوچھنے لگی۔

''میں اگر تمہیں سب کچھ بتا بھی دوں تو تم لوگ میری مدد نہیں کر سکتے۔ میرا دشمن بہت طاقتور اور بااختیار ہے۔ تم اس کی پہنچ کا اندازہ اس بات سے لگا لو کہ میں کہیں بھی جا کر چھپ جاؤں... چند دن سے زیادہ چھپی نہیں رہ سکتی۔ اس کے ہرکارے مجھے ڈھونڈتے ہوئے وہاں پہنچ جاتے ہیں... مجھے لگتا ہے کہ اب ان لوگوں نے میرا یہاں بھی سراغ لگا لیا ہے۔ وہ شخص جس نے ہمارے قریب گاڑی لا کر روکی تھی، میرے دشمن کا خاص ملازم تھا۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ تم لوگ مجھے اس سے بچا کر یہاں تک کیسے لائے ہو۔''

''لیکن وہ تو صرف کسی کا ایڈریس معلوم کرنے کے لیے ہمارے پاس رکا تھا۔ تم اچانک بے ہوش ہو گئیں تو بھائی نے اس سے درخواست کی کہ وہ ہمیں گھر تک چھوڑ دے۔ وہ بے چارہ شرافت سے ہمیں یہاں چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کے رویّے سے بالکل بھی ظاہر نہیں ہوا کہ وہ تمہیں جانتا ہے یا تم سے کوئی پرخاش ہے۔'' ماہ بانو کی بات سن کر راحیلہ نے اسے بتایا۔

''ہوسکتا ہے وہ ایکٹنگ کر رہا ہو۔ وہ اکیلا تھا اس لیے اس نے بیچ راستے میں کوئی جھگڑا کھڑا کرنا مناسب نہیں سمجھا ہو۔ وہ مدد کے بہانے تم لوگوں کا گھر دیکھ گیا ہے، مناسب موقع دیکھ کر اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ یہاں آئے گا اور مجھے لے جانے کی کوشش کرے گا۔'' راحیلہ کی بتائی ہوئی بات کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ اسی خوف سے بھرے لہجے میں یقین سے بولی۔

''میرے خیال میں مہرین تمہارا اندازہ درست نہیں ہے۔ اس شخص نے واقعی تمہیں نہیں پہچانا تھا۔ تم نے اپنے چہرے پر نقاب لگایا ہوا تھا اور میں نہیں سمجھتا کہ تمہاری گاڑی

میں سے نظر پڑنے پر کوئی شخص کسی نقاب پوش لڑکی کو شناخت کر سکتا ہے۔'' ڈاکٹر طارق نے ان دونوں کی گفتگو میں دخل دیتے ہوئے ایک ایسی دلیل دی جس پر ماہ بانو کو قائل ہونا پڑا۔ اپنے خوف کے باعث اسے اس بات کا دھیان ہی نہیں رہا تھا کہ وہ چار دیواری سے باہر نقاب کا استعمال کرنے لگی ہے اور اس کی وجہ یہی تھی کہ کوئی اسے شناخت نہ کر سکے۔

''آپ یقیناً ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اصل میں، میں شید ے کو دیکھ کر اتنی بری طرح ڈر گئی تھی کہ مجھے کچھ ہوش ہی نہیں رہا۔'' اس نے شرمندگی کے ساتھ اپنی بے وقوفی کا اعتراف کیا۔

''شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یقیناً تمہارے حالات ایسے ہوں گے کہ تم بلا ارادہ اس طرح ری ایکٹ کر گئیں۔ غیر معمولی حالات میں انسان کس طرح کے رد عمل کا اظہار کرے گا، اس کا اندازہ کوئی دوسرا شخص تو کیا، خود وہ شخص بھی نہیں لگا سکتا جو ان حالات سے گزر رہا ہو۔ میرے حساب سے تو تم ایک بہت بہادر اور باہمت لڑکی ہو جو مشکل حالات میں بھی بہت رکھ رکھاؤ کے ساتھ رہ رہی ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تم نے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔ اتنی بہادر لڑکی نے اگر ایک چھوٹی سی بزدلی کا مظاہرہ کر دیا ہے تو یہ اتنی قابلِ گرفت بات نہیں۔'' بے حد نرمی سے یہ سب کہتے ہوئے ڈاکٹر طارق آخری جملے کی ادائیگی کے بعد دھیرے سے مسکرایا تو ماہ بانو جھینپ گئی۔

''چلیں محترمہ! آپ کو تو بیٹھے بٹھائے بھائی کی طرف سے بہادری کا سرٹیفکیٹ مل گیا۔ اب آپ ذرا کھل کر اپنے حالات بھی بتا ڈالیں تاکہ ہم یقین کر سکیں کہ سرٹیفکیٹ غلط جاری نہیں ہوا۔'' راحیلہ نے شوخی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک بار پھر ماہ بانو سے اصرار کیا۔

''راحیلہ کے اصرار سے تم خود کو کسی دباؤ میں محسوس نہیں کرنا۔ اگر مناسب سمجھو تو بتا دو ورنہ کوئی بات نہیں۔ البتہ میں نہایت خلوص سے یہ ضرور کہوں گا کہ تمہارے بااختیار دشمن کے مقابلے میں ہم تمہاری کوئی مدد بے شک نہ کر سکیں لیکن مخلص دوستوں سے اپنے مسائل شیئر کر کے نہ صرف تم خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرو گی بلکہ ہمارا بھی مان بڑھ جائے گا کہ تم نے ہمیں کسی لائق سمجھا۔'' وہ اب بھی تذبذب کا شکار تھی لیکن ڈاکٹر طارق کی بات نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ ان سے اپنے حالات کہہ ڈالے۔ آہستہ آہستہ وہ ان واقعات کو بیان کرنے لگی جن کے گرداب میں گھری اس کی زندگی ہر روز اسے ایک نئے امتحان سے دوچار کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر طارق

اور راحیلہ بنا کوئی دخل دیے اس کے ہونٹوں سے نکلا ایک ایک لفظ بہت غور سے سنتے رہے۔

☆☆☆

سست روی سے درختوں کے درمیان سے گزرتے اکو پر گہری یاسیت طاری تھی۔ اس کے سانولے اور بے رونق چہرے پر موجود آنکھوں میں ویرانی نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ سیاہی مائل موٹے موٹے ہونٹ آپس میں اس طرح پیوست تھے کہ گویا کبھی مسکراہٹ نے ان ہونٹوں کو چھوا ہی نہ ہو۔ اسے دیکھ کر یہ لگتا تھا کہ وہ قوتِ گویائی سے محروم ہو گا لیکن یہ حقیقت نہیں تھی۔ وہ بھی ایک ہنستا مسکراتا، خوش گپیاں کرنے والا زندگی سے بھرپور جوان ہوا کرتا تھا لیکن رانی کی موت نے اس سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ رانی جو اس کی منگیتر تھی اور جس کے ساتھ اس نے اپنی پوری زندگی گزارنے کے خواب دیکھے تھے... یوں اچانک اس کی زندگی سے نکل دی گئی کہ اسے خود کو ہزار باور کروانے کے باوجود اس حادثے پر یقین نہیں آتا تھا، حالانکہ اس نے رانی کے لہولہان جسم کو قبر میں اتارے جانے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ روزانہ کئی کئی گھنٹے قبرستان میں اس کی قبر کے پاس بیٹھ کر گزارتا تھا مگر محبت کرنے والوں کی مخصوص بے یقینی اسے گھیرے ہوئے تھی۔ ہر عاشق کی طرح وہ یہ یقین کرنے سے گریزاں تھا کہ اس کا محبوب اسے بیچ سفر میں چھوڑ گیا ہے۔ اسے ہر دم یہی لگتا کہ اچانک ہی رانی کہیں سے نمودار ہوگی اور بڑی ادا سے ہنستے ہوئے کہے گی۔

''دیکھا اکو! میں نے تمہیں کیسا بے وقوف بنایا۔ بھئی! میں تو صرف تمہیں آزما رہی تھی۔ میں بھلا تمہیں چھوڑ کر کہیں کیسے جا سکتی ہوں؟''

وہ اس سے اسی طرح شوخی سے بات کیا کرتی تھی۔ کبھی کبھی جب وہ بہت اصرار کر کے اسے ملاقات کے لیے بلاتا تھا تو بھی وہ اسے ستانے سے باز نہیں آتی تھی۔ وہ مقررہ وقت پر ملاقات کے لیے طے شدہ جگہ پہنچتا تو معلوم ہوتا کہ رانی کا کوئی اتا پتا ہی نہیں ہے۔ وہ بے قراری سے ٹہلتا، راستے کو گھور گھور کر دیکھتا کہ شاید وہ آتی ہوئی نظر آ جائے اور پھر بہت دیر گزر جانے پر جھنجلاتا ہوا واپسی کے لیے پلٹنے لگتا تو وہ کسی خفیہ مقام سے نکل کر اچانک ہی نکل کر سامنے آ کھڑی ہوتی اور پھر خوب کھلکھلا کر ہنستی۔ اکو اس کی اس حرکت پر مصنوعی غصے سے اسے خوب گھورتا لیکن پھر ہار مان کر خود بھی ہنس پڑتا۔

رانی کی کھلکھلاہٹ میں اس کی ہنسی شامل ہوتی تو لگتا کہ

سارے منظر مسکرانے لگے ہوں لیکن قسمت نے اس کے ساتھ عجیب ہی کھیل کھیلا تھا۔ اس کی رانی کسی سے وفاداری نبھاتے نبھاتے خود اس کے ساتھ بے وفائی کر گئی تھی۔ رانی نے اس کے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں لیکن جان اپنی کشور بی بی پر لٹا بیٹھی تھی۔ اگرچہ وہ نہیں جانتا تھا کہ رانی کی موت کن حالات میں ہوئی اور وہ کس کس طرح چودھری کے عتاب کا نشانہ بنی لیکن اس بات کا اسے یقین تھا کہ وہ کشور کا ساتھ دینے کے جرم میں ہی زندگی سے محروم کر دی گئی ہے۔ وہ کشور کی دیوانی تھی۔ کشور کی نرم خوئی اور مہربان طبیعت نے اسے کشور کا اتنا گرویدہ کر رکھا تھا کہ وہ سارا وقت اسی کے نام کی مالا جپتی رہتی تھی۔ وہ... جس نے ہمیشہ کشور کی اترن بڑے ذوق و شوق سے پہنی تھی، اس کے حصے کی موت کو بھی بخوشی گلے لگا بیٹھی تھی۔

اکو ایک کمزور آدمی تھا اور چودھری سے رانی کے قتل کا بدلہ لینے کی طاقت نہیں رکھتا تھا لیکن اس کی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح چودھری کیفرِ کردار تک پہنچ جائے۔ رانی کے قتل کے الزام میں نہ سہی، اسے کسی اور جرم کی ہی سزا ضرور ملے۔ اسی خواہش کی وجہ سے اس نے آفتاب کے اغوا کی اطلاع غیب تک پہنچائی تھی۔ اس اطلاع کے نتیجے میں آفتاب کو تو بچا لیا گیا لیکن چودھری سزا سے محفوظ رہا۔ قسمت کی خرابی کہ جس رات غیب اور اس کے ساتھی اساتذہ کو قتل کیا گیا، وہ تیز بخار کے باعث گھر میں نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا تھا اس لیے اسے گاؤں میں بپا ہونے والے ہنگامے کی خبر ہی نہیں ہو سکی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ اتنے بڑے ظلم کے خلاف گاؤں بھر میں سے کسی نے گواہی نہیں دی تو بہت افسردہ ہوا اور رہ رہ کر کفِ افسوس ملتا رہا کہ میں کیوں اس رات اپنے ہوش میں نہیں تھا۔ اگر اس نے وہ سارا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوتا تو دنیا کی کوئی طاقت اسے گواہی دینے سے نہیں روک سکتی تھی لیکن شاید ابھی قدرت چودھری کو ڈھیل دینا چاہتی تھی۔

اس واقعے کے بعد اکو پر چھائی اداسی مزید گہری ہوئی اور وہ ہر طرف سے تقریباً بیگانہ ہی ہو گیا۔ وہ تانگا جس سے اس کی اور گھر والوں کی روزی روٹی کا سلسلہ بندھا تھا، فارغ کھڑا رہنے لگا۔ گھر کا چولہا کس طرح جل رہا ہے اور جل بھی رہا ہے کہ نہیں، اسے پروا نہیں رہی۔ خود اس کا یہ عالم تھا کہ ماں چند لقمے زبردستی منہ میں ڈال دیتی تو حلق سے نیچے اتار لیتا ورنہ پورا پورا دن گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا رہتا۔ ماں کے مسلسل کھانسنے کی آواز بھی اس کے کانوں سے ٹکرا کر بے اثر لوٹ جاتی تھی لیکن کل رات عجیب ہی معاملہ ہوا۔ وہ اپنی

مخصوص کیفیت میں سر گھٹنوں میں چھپائے بیٹھا رانی کے مرنے کا سوگ منا رہا تھا، اسے یہ بھی ہوش نہیں تھا کہ آج پورے دن اس کے حلق سے ایک لقمہ تک نیچے نہیں اترا ہے کہ اچانک ہی حکیم جی وہاں چلے آئے اور پھر انہوں نے اسے جو بے نقط سنانی شروع کی تو بہت دیر تک خاموش نہیں ہوئے۔

وہ چپ چاپ حکیم جی کی باتیں سنتا رہا۔ بالآخر وہ بے چارے بکتے جھکتے مایوسی کے عالم میں وہاں سے چلے گئے لیکن اصل بات یہ تھی کہ ان کا بکنا جھکنا رائگاں نہیں گیا تھا۔ اکو کی سمجھ میں کم از کم اتنی بات تو آ گئی تھی کہ اس کی ماں شدید بیمار ہے اور اس کے علاج کے لیے خالص شہد درکار ہے۔ حکیم جی کے جانے کے بعد اس نے جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ گھر کا نعمت خانہ بالکل خالی پڑا ہے اور رقم کے نام پر ماں کے پاس چند سکے بھی باقی نہیں بچے تھے۔ ایسے میں خالص شہد کی فراہمی کیونکر ممکن ہو پاتی۔ کسی سے مانگنا اس کی غیرت کو گوارا نہ تھا۔ چنانچہ رات بھر کی سوچ بچار کے بعد اسے یہی حل سوجھا کہ جنگل کا رخ کیا جائے اور کسی درخت پر لگے شہد کے چھتے کو اتار لیا جائے۔ چھتے سے شہد نکال کر ماں کا علاج بھی ہو جاتا اور بچا کھچا شہد بیچ کر تھوڑی سی رقم بھی مل جاتی۔ مسئلے کے اس فوری حل کے بعد وہ معمول کے مطابق اپنا تانگا چلانا شروع کر دیتا تو حالات آہستہ آہستہ دوبارہ سنبھل جاتے۔

اپنی سوچ پر عمل پیرا ہونے کے لیے وہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی گھر سے نکل کھڑا ہوا اور سیدھا جنگل کا رخ کیا۔ اتنی صبح وہاں اس کے سوا کوئی دوسرا انسان موجود نہیں تھا۔ جنگل کے مخصوص ماحول میں چرند پرند کی آوازوں کے سوا جو آواز سنائی دیتی تھی، وہ ان سوکھے پتوں کے چرمرانے کی آواز تھی جو اس کے قدموں تلے آ کر روندے جاتے تھے۔ خود اس کا یہ عالم تھا کہ وہ ہر طرح کی آوازوں سے بے نیاز تھا۔ اس کے کان گر سنتے تھے تو اس کی کھلکھلاہٹ اور گنگناہٹ سنتے تھے جو اپنی ذرا سی جھلک دکھا کر کسی درخت کے تنے کے پیچھے جا چھپتی تھی۔ وہ ہر جگہ تھی اور کہیں بھی نہیں تھی۔ اکو کبھی نیلے پیڑوں میں اس کا عکس جھلملاتا دیکھتا تو کبھی وہ سبز پیراہن میں پتوں کی آڑ میں چھپ جاتی۔ رانی کے آنکھ مچولی کھیلتے تصور سے دل کو بہلاتا وہ بڑی مشکل سے خود کو یاد دلا سکا کہ جنگل میں اس کی آمد کا مقصد ماں کے لیے شہد کا حصول ہے۔ یاد آنے پر وہ ایک جگہ رک کر اردگرد موجود درختوں کا جائزہ لینے لگا۔ سال کے اس حصے میں شہد اتنی آسانی سے نہیں ملتا تھا۔ یہ وہ موسم تھا جب شہد کی مکھیاں اپنا

تیار کردہ شہد پی کر چھتے کو چھوڑ جاتی تھیں۔ جائزہ لینے پر اسے ایک بھی درخت ایسا نظر نہیں آیا جس پر شہد کے چھتے کا امکان ہو۔ تلاش میں ناکام ہو کر وہ ایک بار پھر چل پڑا۔ اس کے ہر بڑھتے قدم کے ساتھ جنگل گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ بے خیالی میں وہ پہلے ہی کافی آگے تک آچکا تھا اور اب یہ سوچ کر آگے بڑھ رہا تھا کہ جہاں اتنا فاصلہ طے کیا ہے، وہاں ماں کی خاطر تھوڑی سی کوشش اور کر لینی چاہیے۔ اس سوچ کے پیچھے یہ احساس بھی کارفرما تھا کہ مجبوبہ کے خیالوں میں ڈوب کر جنگل کی ہولنا کی نظر نہ آسکی تو پھر ماں کے لیے کیوں اس ہولنا کی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا؟ اس کا ذہنی انتشار اسے آگے بڑھاتا رہا ورنہ اس سے قبل وہ کبھی جنگل میں اتنا آگے نہیں آیا تھا۔ گاؤں کے دیگر لوگوں کی طرح وہ جنگل کے ابتدائی حصے تک ہی محدود رہتا تھا۔ اندر تک وہی لوگ جاتے تھے جن کے پاس مناسب اسلحہ اور ساز و سامان ہوتا تھا اور یہ لوگ عام طور سے چودھری کے کارندے ہی ہوتے تھے۔

چلتے چلتے اسے یکدم ہی اپنی ناک کی پھنک پر شدید درد کا احساس ہوا اور پھر فوراً ہی بھنبھناہٹ سی سنائی دی۔ اس کی نظروں نے آواز کا تعاقب کیا تو زرد رنگ کی شہد کی مکھی اڑتی نظر آئی۔ اس مکھی نے ہی اس کی ناک پر ڈنک مارنے کی جسارت کی تھی۔ مکھی کی اس جسارت پر غصے یا تکلیف کا اظہار کرنے کے بجائے وہ بے تابی سے اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا۔ بالآخر اس کی نظروں نے ایک بہت بلند درخت کی شاخوں کے آس پاس چند مزید زرد مکھیوں کو بھنبھناہٹ کے ساتھ چکراتے دیکھ لیا۔ شاخوں کے آس پاس چکراتی یہ مکھیاں نشان دہی کر رہی تھیں کہ وہاں کوئی چھتا موجود ہے۔ وہ درخت کے نیچے رک گیا اور اوپر چڑھ کر چھتا اتارنے کی تیاری کرنے لگا۔ سب سے پہلے اس نے نیچے گرے سوکھے پتے اور گھاس پھوس جمع کر کے ایک گٹھر سا بنایا اور اس گٹھر کو رسی کی مدد سے باندھ کر اپنے گلے میں لٹکا لیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اپنے چہرے کو گردن میں پڑے مفلر نما کپڑے سے اچھی طرح ڈھانپا اور چپلیں اتار کر درخت پر چڑھنے لگا۔ اتنے بلند درخت پر چڑھنا آسان بات نہیں تھی لیکن گاؤں کے دیگر بچوں کی طرح اس کا بچپن بھی اسی طرح کی سرگرمیوں میں گزرا تھا اس لیے اسے بہت زیادہ دشواری پیش نہیں آئی اور وہ تنے پر پہنچے جاتا چند منٹوں میں ہی کافی اوپر تک پہنچ گیا۔ اب اسے چھتا نظر آنے لگا تھا اور چھتے سے چمٹی بے شمار مکھیوں کو دیکھ کر یہ یقین بھی ہو گیا تھا کہ چھتا شہد سے بھرا ہوا ہے۔ اس اطمینان کے بعد اس نے اپنی جیب ٹٹول کر اس میں سے ماچس کی ڈبیا نکالی اور ایک تیلی جلا کر گٹھر کو آگ دکھا دی۔ گٹھر فوراً ہی سلگنے لگا اور ذرا دیر میں وہاں دھواں سا بھر گیا۔ دھوئیں کی وجہ سے مکھیاں بے چین ہو گئیں۔ وہ دھواں چھوڑتے اس گٹھر کو بے پناہ احتیاط سے سنبھالے چھتے تک کا باقی فاصلہ طے کرنے لگا۔ دھوئیں سے پریشان دو چار مکھیاں اس کی طرف لپکیں اور اس کے بازوؤں میں اپنے ڈنک اتار دیے۔ اس کے بازوؤں میں ناک کی پھنک کی طرح مرچیں سی بھر گئیں لیکن اس نے پروا نہیں کی اور آگے بڑھتا رہا۔ چھتے تک اس کے رسائی حاصل کرنے تک شہد کی مکھیاں دھوئیں کے آگے ہتھیار ڈال کر پسپائی اختیار کر چکی تھیں اور کافی فاصلے پر چکراتی پھر رہی تھیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر شہد سے بھرا چھتا اپنے قبضے میں کیا اور شانے سے لٹکتے پلاسٹک کے مضبوط تھیلے میں منتقل کر لیا۔ اس عمل میں اس کی انگلیاں شہد سے لتھڑ گئی تھیں۔ درخت سے چند پتے توڑ کر وہ ان لتھڑی ہوئی انگلیوں کو صاف کرنے لگا۔ اس عمل کے دوران اس نے یونہی اپنی نظروں کو اِدھر اُدھر دوڑایا تو بہت دور نظر آتے ایک منظر کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

وہ لکڑی کا ایک مکان تھا جس سے نکلتے ہوئے تین چار افراد کو وہ فاصلے کے باوجود دیکھ سکتا تھا۔ ان لوگوں نے اپنے ہاتھوں میں کدال اور پھاوڑے جیسی چیزیں اٹھا رکھی تھیں۔ اکو حیران رہ گیا کہ یہ کون لوگ ہیں اور جنگل کے اس حصے میں کیا کر رہے ہیں؟ ایک بار اسے خیال آیا کہ شاید یہ وہ ڈاکو ہیں جن کی دہشت اردگرد کے سارے دیہاتوں میں پھیلی ہوئی ہے لیکن جانے کیوں ان لوگوں کے انداز سے اسے یہ نہیں لگ رہا تھا کہ وہ ڈاکو ہو سکتے ہیں۔ ان کے ڈاکو ہونے کا امکان رد کرنے کے بعد ان افراد کے بارے میں اس کا تجسس مزید گہرا ہونے لگا۔ عام لوگوں کے جنگل کے اس حصے میں ہونے اور باقاعدہ مکان بنا کر رہنے کی وجہ سمجھ سے باہر تھی۔ اگر وہ اتنے بلند درخت پر موجود نہ ہوتا تو اس کو وہ لوگ نظر بھی نہ آپاتے۔ ان کے نظر آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ خود جس حصے میں موجود تھے، وہاں درخت وغیرہ بہت ہی کم تھے اور جنگل چھدرا محسوس ہو رہا تھا۔

تجسس میں مبتلا اکو واپس گاؤں کی طرف لوٹنا بھول گیا اور درخت سے اتر کر اس سمت چل پڑا جہاں اسے وہ مکان اور آدمی نظر آئے تھے۔ درخت کی بلندی سے نظر آنے والی وہ جگہ اچھے خاصے فاصلے پر تھی۔ اسے یہ فاصلہ طے کرنے میں تقریباً آدھا گھنٹا لگ گیا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ لکڑی کے اس مکان کی پشت تک پہنچ گیا جس سے اس نے چند آدمیوں کو نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ مکان کا رقبہ ساٹھ ستر گز سے زیادہ نہیں تھا اور اس کی پچھلی طرف دو عدد جالی دار کھڑکیاں موجود تھیں۔ اکو نے ایک کھڑکی کے قریب جا کر مکان کے اندر جھانکا۔ جھانکنے پر اسے اندازہ ہوا کہ مکان اندر سے کمروں وغیرہ میں منقسم نہیں ہے بلکہ ایک ہال سا تھا جس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر زمین پر بستر بچھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ بستروں کے ساتھ ہی ٹین کے چھوٹے سائز کے صندوق بھی رکھے ہوئے تھے جو یقیناً ان بستروں پر سونے والوں کی اشیائے ضرورت رکھنے کے کام آتے ہوں گے۔ ہال نما کمرے کے ایک کونے پر دو بڑے پانی کے مٹکے اور کھانا پکانے اور کھانے کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ مکان کا یہ غریبانہ منظر ظاہر کرتا تھا کہ مکان محنت کشوں کے استعمال میں ہے جو دن بھر کی محنت مزدوری کے بعد اسے صرف شب بسری کے لیے استعمال کرتے ہیں لیکن سوال وہی تھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور جنگل میں کس قسم کا کام کر رہے ہیں؟

ان سوالوں کا جواب حاصل کرنے کے لیے وہ مکان کی سائڈ سے ہوتا ہوا اگلی جانب پہنچا۔ اگلی جانب مکان کے سامنے اینٹیں رکھ کر چولہے بنائے گئے تھے۔ ان چولہوں کے لیے ایندھن کا کام دینے والی ادھ جلی لکڑیاں بتا رہی تھیں کہ وہاں باقاعدگی سے کھانا پکایا جاتا ہے۔ وہ اس جگہ کا جائزہ لیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ چند قدم کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے مدھم سی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ آوازوں سے سمت کا تعین کرتا ہوا وہ مزید آگے بڑھتا چلا گیا۔ آخرکار اس کی نظروں نے حرکت کرتے ہوئے انسانی جسموں کو دیکھ لیا۔ وہ کسان تھے اور بڑی تن دہی سے اپنے کام میں جتے ہوئے تھے۔ اکو مزید قریب پہنچا تو اسے ان لوگوں کے چہرے بھی دکھائی دینے لگے۔ یہ چہرے اس کے لیے شناسا تھے۔ وہ ان میں سے تقریباً ہر ایک کو ہی جانتا تھا۔ یہ لوگ چودھری کی زمینوں پر کاشت کیا کرتے تھے اور یہاں بھی یہی کام کر رہے تھے۔ اسے سمجھ نہیں آیا کہ چودھری کو اپنی ڈھیر ساری زمین چھوڑ کر جنگل میں کاشت کروانے کی کیا ضرورت پڑی ہے؟

اس نے آنکھیں سکیڑ کر زمین سے سر اٹھاتے ننھے پودوں کا جائزہ لیا اور پھر اچھل پڑا۔ اگر اس سے اندازے کی غلطی نہیں ہو رہی تھی تو وہ یقینی طور پر پوست کے پودے تھے... یعنی جنگل کے اس حصے میں چودھری اپنے بندوں کے ذریعے خفیہ طور پر پوست کاشت کروا رہا تھا۔ اکو کا خون اس حقیقت کو جاننے کے بعد تیزی سے رگوں میں گردش کرنے لگا۔ یہ زیرِ کاشت پوست چودھری کی مجرمانہ سرگرمیوں کا ایک بڑا ثبوت تھی۔ اگر وہ کسی طرح قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ذمے داران کو یہاں تک لانے میں کامیاب ہو جاتا تو چودھری کے لیے اپنی گردن چھڑانی مشکل ہو جاتی۔

جوش میں بھرا وہ تیزی سے وہاں سے جانے کے ارادے سے پلٹا تو یکبارگی اس کی نظر ایک آدمی پر پڑی۔ وہ شاید حوائج ضروریہ کے لیے درختوں کے جھنڈ میں گیا تھا اور اب اپنی شلوار کا ازار بند باندھتا ہوا واپس پلٹ رہا تھا۔ اکو نے اس شخص کو پہچان لیا۔ وہ چودھری کے خاص ملازمین میں سے ایک تھا۔ اس شخص نے بھی اکو کو دیکھ لیا اور ایک پل کے لیے ازار بند باندھنا بھول کر حیرت سے منہ کھولے اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اکو اس کی اس حیرت کا فائدہ اٹھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بھاگنے پر اس شخص کو بھی ہوش آیا۔

''پکڑو... پکڑو... جانے نہ پائے۔'' شور مچاتا ہوا وہ خود بھی اپنی شلوار سنبھالتا اس کے پیچھے دوڑا۔ اکو کو معلوم تھا کہ اگر وہ ان لوگوں کی گرفت میں آ گیا تو چودھری کو قانون کے شکنجے میں پھنسوانے کی خواہش تو ایک طرف رہی، وہ اپنی جان بھی نہیں بچا سکے گا۔ چنانچہ کئی دنوں کی کم خوراکی کے باعث ہونے والی جسمانی کمزوری کے باوجود وہ پوری قوت سے بھاگتا چلا گیا۔ جس جگہ اسے دیکھا گیا تھا، وہاں تو درخت نہ ہونے کے برابر تھے لیکن خود کو پوشیدہ رکھنے کے لیے اس نے اس حصے کا رخ کیا جہاں جنگل گھنا تھا اور وہ بھاگتے ہوئے درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ لے سکتا تھا۔ حیوانات و نباتات سے بھرے جنگل میں وہ جان بچانے کے لیے کسی وحشت زدہ ہرن کی طرح دوڑتا جا رہا تھا۔ ان لمحات میں اسے جنگلی جانوروں کا خوف بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا کیونکہ اس کے تعاقب میں جو لوگ تھے، وہ جانوروں سے بھی زیادہ خطرناک درندے تھے۔ ان درندوں سے بچنے کے لیے وہ اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔ اس کے پاس موجود پلاسٹک کا وہ تھیلا جس میں اس نے شہد کا چھتا رکھا تھا، اس بھاگ دوڑ میں جانے کب اور کہاں گر گیا تھا۔ وہ ماں کی صحت کا سامان کرنے کے لیے جنگل میں آیا تھا اور اب اپنی ہی زندگی داؤ پر لگ گئی تھی۔ زندگی سے اسے پیار نہیں تھا کہ رانی کے بعد اس کے لیے دنیا کی ہر شے سے کشش ختم ہو گئی تھی لیکن وہ رانی کے قاتل کو سزا دلوانا چاہتا تھا اور اس کے خیال میں قدرت نے اسے ایک بہترین موقع فراہم کر دیا تھا۔ اگر وہ کسی طرح کسی ذمے دار شخص تک پہنچ جاتا تو اسے جنگل میں خفیہ طور پر

کاشت کی جانے والی پوست کے بارے میں اطلاع دے کر چودھری کو پھنسوانے کا سامان کرسکتا تھا۔

چودھری کے گرگے اس کے تعاقب میں تھے اور وہ ان سے چھپتا ہوا ہی آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اپنی تمام تر پریشان حالی کے باوجود اس نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ بے سمت نہ ہونے پائے اور اس راستے پر ہی دوڑے جو اسے جنگل سے باہر لے جاسکتا ہے۔ دوسری صورت میں وہ جنگل کی بھول بھلیوں میں بھٹک کر رہ جاتا۔ وقت کے ان لمحات میں اس دیوانے کا دماغ تیزی سے کام کررہا تھا اور وہ اپنی تمام تر ناتوانی کے باوجود بہت تیز رفتاری سے بھاگ رہا تھا۔ گھنے جنگل سے نکلنے تک اس نے اپنا تعاقب کرنے والوں کو کافی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ درختوں اور جھاڑیوں کا سلسلہ چھدرا ہوا تو اسے خیال آیا کہ اس جگہ اسے آسانی سے دیکھا جاسکتا ہے اور وہ جانتا تھا کہ اگر اسے دیکھ لیا گیا تو جان بچانا مشکل ہوگی۔ وہ اپنی ٹانگوں کا بہترین استعمال کر کے بے شک متعاقب دشمنوں سے کافی دور نکل آیا تھا لیکن یہ فاصلہ کسی دور مار رائفل سے نکلی گولی کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا اور چودھری کے بندے خالی ہاتھ تو ہو نہیں سکتے تھے۔ ان حالات میں اس کا آبادی تک پہنچنا بہت مشکل تھا اور پہنچ بھی جاتا تو وہاں چودھری کی راج دھانی میں محفوظ کیسے رہتا؟

درختوں کی آڑ لے کر بھاگتے ہوئے اس کے ذہن سے تیزی سے یہ سارے خیالات گزر رہے تھے۔ اچانک ہی اس کی نظر دور نظر آتے فاریسٹ آفیسر کے بنگلے پر پڑی اور یکدم ہی امید کی کرن جاگ اٹھی۔ وہ اس بنگلے تک پہنچنے میں کامیاب ہوجاتا تو فاریسٹ آفیسر کو اعتماد میں لے کر اسے سب کچھ بتا سکتا تھا۔ اس خیال کے آنے پر اس نے اپنے بے دم ہوتے قدموں کی رفتار اور بھی تیز کردی لیکن اب اسے آڑ فراہم کرنے والے درخت بہت کم رہ گئے تھے۔ ایک درخت سے دوسرے درخت تک کا فاصلہ طے کرتے ہوئے وہ کھلے میں آجاتا تھا اور یہ ایک خطرناک صورتِ حال تھی۔ پیچھے سے آنے والے متوقع فائر کے ڈر سے وہ یہ درمیانی فاصلہ زگ زیگ انداز میں بھاگتے ہوئے طے کررہا تھا۔ اپنی اس حکمتِ عملی کی افادیت کو اس نے اس وقت خوب محسوس کیا جب فضا میں فائر کی زوردار آواز گونجی اور ایک گولی اس سے کچھ فاصلے پر سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ دوسرا فائر ہوا تو وہ درخت کی آڑ میں پہنچ چکا تھا۔ وہاں اس نے پل بھر رک کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ اس کے تعاقب میں آنے والے وہ دو افراد تھے جن میں سے ایک کے ہاتھ میں دور مار رائفل تھی جبکہ دوسرا نہتا نظر آرہا تھا۔

اس کے پاس اپنے بچاؤ کے لیے کوئی ذریعہ نہیں تھا، البتہ بھاگتے رہنے میں اس بات کا کسی حد تک امکان تھا کہ وہ خود پر چلائی جانے والی گولیوں سے بچ کر بنگلے تک پہنچنے میں کامیاب ہوجاتا، چنانچہ آڑ سے نکل کر ایک بار پھر بنگلے کی سمت بھاگنا شروع کردیا۔ اس بار قسمت نے اس کا زیادہ ساتھ نہیں دیا اور ایک گولی اس کے بازو میں گھس گئی۔ اسے لگا کہ اس کے بازو میں انگارے دہک اٹھے ہوں۔ اس نے تکلیف کی شدت سے کراہتے ہوئے اپنے دوسرے ہاتھ سے زخمی بازو کو پکڑ لیا۔ اس کی انگلیاں اپنے ہی خون میں تر بتر ہوگئیں لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اور بھاگنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ یوں بھی اب بنگلا چند گز کے فاصلے پر ہی رہ گیا تھا۔ حیرت انگیز طور پر اس کے یہ فاصلہ طے کرنے تک پیچھے سے مزید کوئی فائر نہیں کیا گیا۔ وہ اپنی تمام تر توانائیوں کا استعمال کرتے ہوئے بالآخر بنگلے کے گیٹ پر پہنچا تو وہاں موجود چوکیدار اس کے ابتر حلیے اور بہتے خون کی وجہ سے چونک اٹھا۔

''اے... کون ہے تو؟'' اس نے اکو کی دھول مٹی میں اٹی شکل کو گھور کر پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا لیکن وہ بے چارہ اتنی بری طرح ہانپ رہا تھا کہ فوری طور پر کوئی جواب نہیں دے سکا۔

''کیا گل ہے؟ تو کدھر سے بھاگ کر آرہا ہے؟ کون تیرے پیچھے پڑا ہے؟'' اس کی ابتر حالت کی وجہ سے اسے مشکوک نظروں سے گھورتے ہوئے چوکیدار اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر پے در پے سوالات کرتا چلا گیا۔

''صاحب ہیں؟ مجھے صاحب سے ملنا ہے۔'' اکو بولنے کے قابل ہوا تو اس نے مطالبہ کیا۔ ساتھ ہی گھبرائے ہوئے انداز میں پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تعاقب کنندہ نہ جانے کہاں رہ گئے تھے جو نظر نہیں آرہے تھے۔ شاید اس کے بنگلے تک پہنچ جانے کی وجہ سے انہوں نے پیچھا چھوڑ دیا تھا۔

''صاحب سے کیوں ملنا ہے؟ پہلے مینو دسو فیر میں صاحب کو بتاؤں گا۔ ان کی مرضی ہوئی تو تجھ سے مل لیں گے۔'' چوکیدار نے قطعی لہجے میں اسے جواب دیا۔

''دیکھ بھرا! مجھے صاحب سے ملنے دے۔ میری زندگی کا کچھ پتا نہیں، دیر ہوگئی تو شاید فیر مجھے موقع ہی نہ ملے۔'' اکو نے سہارے کے لیے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ ساتھ ہی اس کی نظریں مسلسل ادھر اُدھر کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ کب اور کس سمت سے گولی آکر اسے چاٹ جائے گی۔

''پر میں تجھ پر کیسے اعتبار کروں؟ ہوسکتا ہے تو صاحب کا کوئی دشمن ہو۔'' چوکیدار پر اس کی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ اس کی طرف سے مشکوک ہی رہا۔

''اللہ پاک کی قسم، میری صاحب سے کوئی دشمنی نہیں۔ مجھے تو بس انہیں ایک ضروری گل دسنی ہے۔'' مسلسل بہتے خون کی وجہ سے اکو پر نقاہت طاری ہونے لگی تھی، چنانچہ اسے یہی حل نظر آیا کہ قسم کھا کر چوکیدار کو یقین دلانے کی کوشش کرے۔ اس کی یہ کوشش بارآور ثابت ہوتی، اس سے قبل ہی گیٹ کے اندرونی جانب سے گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ چوکیدار اکو کو چھوڑ کر پھرتی سے مڑا اور گیٹ وا کیا۔ ہارن دینے والی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر فاریسٹ آفیسر عابد انصاری براجمان تھا۔ اکو دیوار سے ہٹ کر گیٹ کے سامنے اس طرح آکھڑا ہوا کہ عابد انصاری کے لیے گاڑی نکال لے جانے کا راستہ نہ رہا۔

''چوکیدار! یہ آدمی کون ہے؟'' عابد انصاری نے اسے کچھ کہنے کے بجائے چوکیدار کی طرف چہرے کا رخ کرتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔ یہ سوال کرتے ہوئے اس کا لہجہ سنجیدہ ضرور تھا لیکن اس میں تختی یا برہمی کا نام و نشان نہیں تھا۔

''معلوم نہیں صاحب کون ہے؟ کام بھی نہیں بتاتا، بس آپ سے ملنے کی ضد کیے جارہا ہے۔'' چوکیدار نے مؤدبانہ جواب دیا۔

''مجھ سے ملنا چاہتا ہے؟'' عابد انصاری حیرت سے زیرِ لب بڑبڑایا پھر بولا۔ ''اچھا، اسے اندر آنے دو۔ میں اس کی بات سن لیتا ہوں۔'' گاڑی وہیں چھوڑ کر وہ نیچے اتر آیا اور اکو کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ اس کا مہربان رویہ دیکھ کر اکو کو کافی حوصلہ ملا اور یقین ہونے لگا کہ وہ صحیح جگہ پہنچ گیا ہے۔

''تم اس کے لیے جلدی سے مرہم پٹی کا سامان لے آؤ۔ یہ اتنا زخمی ہے کہ تمہیں کسی بحث میں پڑنے کے بجائے سب سے پہلے اس کی مرہم پٹی کرنی چاہیے تھی۔'' اکو لڑکھڑاتے قدموں سے اس کی جانب بڑھا تو اس نے چوکیدار کو حکم دیتے ہوئے قدرے ناراضی کا اظہار کیا لیکن اس کا لہجہ بہرحال تب بھی نرم ہی تھا۔ چوکیدار یہ حکم سن کر تیزی سے اندر کی طرف مڑ گیا جبکہ خود اس نے آگے بڑھ کر اکو کو سہارا دیا۔ اکو کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کسی اتنے بڑے افسر کو ایسا مہربان دیکھا تھا۔ اسے ہی شہریار کی نیک دلی کی بھی بہت تعریف کیا کرتے تھے لیکن اکو نے اس کی شخصیت میں بھی ہمیشہ ایک رعب و دبدبہ سا محسوس کیا تھا جس کی وجہ سے اس سے بے تکلف ہونے کی ہمت نہیں ہو پاتی تھی۔ عابد انصاری اسے اپنے ساتھ لے کر برآمدے تک پہنچ گیا۔ وہاں چار کرسیاں اور ایک میز رکھی تھی۔ اس نے اکو کو ایک کرسی پر بٹھا دیا۔

''مجھے آپ کو وڈی ضروری گل دسنی تھی صاحب! ادھر جنگل میں...'' اکو نے بیٹھتے ہی اسے بتانے کی کوشش کی لیکن اس نے ہاتھ سے اشارہ کر کے کچھ بھی بولنے سے روک دیا۔

''اپنی مرہم پٹی کروالو پھر بات کرنا۔ پہلے ہی تمہارا کافی زیادہ خون بہہ چکا ہے۔'' عابد انصاری نے اس سے کہتے ہوئے فرسٹ ایڈ بکس لے کر آنے والے چوکیدار کو اشارہ کیا تو وہ آگے بڑھ کر اس کے زخمی بازو کو دیکھنے لگا۔

''اندر گولی ہے صاحب! اسے تو اسپتال لے جانا پڑے گا۔'' چوکیدار نے اس کے زخم کا جائزہ لینے کے بعد عابد انصاری کو اطلاع دی۔

''اوہ...'' اس کے ہونٹ فکرمندی کے اظہار کے لیے سکڑے پھر وہ بولا۔ ''ابھی تو تم پٹی باندھ کر اس کا خون روکنے کی کوشش کرو پھر اسے اسپتال بھی لے جاتے ہیں۔'' چوکیدار اس کی ہدایات پر عمل کرنے لگا۔ عابد انصاری کے کہنے پر اس نے اکو کو درد کش دوا بھی کھلا دی پھر فرسٹ ایڈ بکس اٹھا کر وہاں سے چلا گیا۔

''آپ کے کہنے پر میں نے مرہم پٹی کروالی ہے صاحب... لیکن اسپتال جانے سے پہلے آپ کو میری گل سننی ہوگی۔ جو کچھ مجھے آپ کو بتانا ہے، وہ میری زندگی سے زیادہ اہم ہے۔'' چوکیدار کے جاتے ہی عابد انصاری کے حکم کے احترام میں اب تک خاموش بیٹھے اکو نے اس سے کہا۔

''اگر ایسا ہے تو پھر میں تمہاری بات نہیں ٹالوں گا۔ تم جو کچھ بتانا چاہتے ہو، بتاؤ۔'' عابد انصاری نے گویا اس کے اصرار کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ اسے ہمہ تن گوش دیکھ کر اکو نے اسے اپنے حالات سے مختصراً آگاہ کرتے ہوئے جنگل جانے اور وہاں جو کچھ نظر آیا، اس کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ چہرے پر سنجیدگی لیے اس کی ہر بات غور سے سنتا رہا۔ اکو خاموش ہوا تو وہ بولا۔

''تم نے اپنی جان پر کھیل کر جو اطلاع مجھ تک پہنچائی ہے، اس کے لیے میں تمہارا بہت مشکور ہوں۔ فاریسٹ آفیسر کی حیثیت سے جنگل میں ہونے والی ہر سرگرمی کی ذمے داری مجھ پر عائد ہوتی ہے لیکن ظاہر ہے، میں اکیلا پورے جنگل پر نظر نہیں رکھ سکتا۔ اس کام کے لیے مجھے اپنے اسٹاف

کے تعاون کی ضرورت ہے اور جو کچھ تم نے مجھے بتایا ہے، اس سے مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ میرا اسٹاف میرے ساتھ تعاون کرنے کے بجائے چودھری کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ بہرحال، میں خاموشی سے جنگل میں جا کر خود جائزہ لوں گا پھر اوپر والوں کو رپورٹ کروں گا۔ تم تسلی رکھو... مجرم کسی صورت بچ نہیں سکیں گے۔"

"ایسا ہو گیا تو یہ ہم غریبوں پر آپ کا بہت بڑا احسان ہوگا صاحب!" اکو کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ یہ تو نہیں جانتا تھا کہ چودھری کو پوست کاشت کروانے کے جرم میں کیا سزا مل سکتی ہے لیکن اس کے لیے اتنا بھی کافی تھا کہ چودھری جیسا بااختیار شخص کچھ عرصے جیل کی ہوا کھالے۔ اس طرح اس کی مظلوم رانی کی روح کو کچھ تو سکون حاصل ہو جاتا۔

"احسان کی کوئی بات نہیں۔ میں صرف اپنا فرض ادا کروں گا۔ اب تم یہاں آرام سے بیٹھو۔ میں تمہیں اسپتال پہنچانے کا بندوبست کر کے ابھی آتا ہوں۔" عابد انصاری نے اسے جواب دیا اور خود تیزی سے چلتا ہوا بنگلے کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ اکو نے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا لیا۔ نقاہت اور پین کلر کے اثر کی وجہ سے اس پر غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔

"چلو بھئی، تمہارے لیے گاڑی آگئی ہے۔" اسے اندازہ نہیں ہوا کہ کتنا وقت گزر چکا ہے۔ چوکیدار نے اس کا شانہ ہلاتے ہوئے یہ اطلاع دی تو وہ غنودگی سے باہر آیا۔ چوکیدار اسے سہارا دے کر باہر کی طرف لے گیا۔ گیٹ کے قریب جہاں اس نے عابد انصاری کی گاڑی دیکھی تھی، اب وہاں کوئی دوسری گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ چوکیدار نے اسے گاڑی کی پچھلی نشست پر بٹھایا۔ آگے ڈرائیونگ سیٹ پر صرف ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا جس کی شکل اس کے لیے آشنا نہیں تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھ گیا تو اس آدمی نے گاڑی اسٹارٹ کر کے گیٹ سے باہر نکال لی۔ پیچھے چوکیدار نے فوراً ہی گیٹ بند کر لیا۔ دھیمی رفتار سے چلتی گاڑی نے مشکل سے تین چار گز کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ وہ رک گئی اور کوئی بہت تیزی سے پچھلی طرف کا دروازہ کھول کر اکو کے برابر میں بیٹھ گیا۔ اکو کی آنکھیں بند تھیں لیکن اس نے اس ساری کارروائی کو محسوس کر لیا اور صورت حال کو صحیح طرح سمجھنے کے لیے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ آنکھیں کھولتے ہی اسے اپنے برابر میں بیٹھے شخص کی شکل نظر آئی جس پر نظر پڑتے ہی اس کے اعصاب شل ہو گئے۔

☆☆☆

آفتاب کی کرسی پر اس کی رائٹنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی کشور کے چہرے پر کچھ حیرت سی پھیلی ہوئی تھی تاہم اس حیرت کے باوجود وہ بہت دلچسپی سے اپنے ہاتھ میں موجود کاغذات پر لکھی تحریر کو پڑھنے میں مصروف تھی۔ ہر طرف کتوں کی طرح بو سونگھتے چودھری کے گرگوں سے بچنے کے لیے انہوں نے اب ایک چھوٹے اور قدرے غیر ترقی یافتہ گاؤں میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ اس گاؤں میں ان کے مشاغل کافی محدود ہو گئے تھے۔ یہاں نہ تو موبائل سروس کام کرتی تھی، نہ انٹرنیٹ اور کیبل کی سہولیات تھیں۔ ٹیلی وژن پر صرف پی ٹی وی کی نشریات دکھائی جاتی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اس نئے ٹھکانے پر ٹیلی وژن رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ یوں بھی انہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ کب تک یہاں چھپے رہنے میں کامیاب رہیں گے اور کب اچانک یہاں سے کوچ کرنا پڑے گا؟ اس لیے بہت زیادہ ساز و سامان جمع کرنے سے گریز کیا تھا جو سامان خریدا گیا تھا، وہ بھی سیکنڈ ہینڈ تھا۔ کالم نگاری کے عوض آفتاب کو معاوضہ تو خاصا مناسب ملتا تھا لیکن اس معاوضے کا بیشتر حصہ اسکول پر لگا دینے کے باعث اس کے پاس زیادہ جمع جتھا نہیں تھا۔ ان حالات میں ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ احتیاط سے کام لیں تاکہ معاشی مسائل کا شکار نہ ہوں۔ کشور کے آرام کے سلسلے میں البتہ آفتاب نے کوئی کوتاہی نہیں کی تھی۔ گھریلو امور انجام دینے کے لیے گاؤں کی ہی ایک عورت جز وقتی طور پر ملازم رکھ لی تھی۔ وہ عورت سارا کام کاج نمٹا کر دوپہر تک واپس چلی جاتی تھی۔

کشور کے پاس اپنی فراغت کا یہی علاج تھا کہ وہ اپنا زیادہ تر وقت مطالعے میں گزارے۔ آفتاب جس دن شہر جاتا، اس کے لیے کتابیں لے کر آجاتا۔ ان کتابوں کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ آفتاب کے لکھے کالمز اور روزانہ کا اخبار بھی پابندی سے پڑھتی تھی۔ کالمز وہ عموماً چھپنے سے پہلے ہی پڑھ لیا کرتی تھی۔ آج آفتاب صبح سے شہر گیا ہوا تھا۔ جب تک کام کرنے والی عورت گھر میں رہی، کشور اس کے ساتھ مصروف رہی۔ اس کے جانے کے بعد وہ کمرے میں آکر رائٹنگ ٹیبل پر رکھی چیزوں کو ترتیب دینے لگی۔ اس کام کے دوران ہی اس کے ہاتھ میں وہ صفحات آئے جنہیں وہ یونہی وقت گزاری کے لیے پڑھنے لگی اور پھر اتنی دلچسپی محسوس ہوئی کہ پڑھتی ہی چلی گئی۔ دلچسپی کے ساتھ ساتھ اسے حیرت اس لیے محسوس ہو رہی تھی کہ وہ جو کچھ پڑھ رہی تھی، اسے آفتاب نے ہی لکھا ہے... اس بات کا یقین نہیں آرہا تھا۔

"اتنے ذوق و شوق سے کیا پڑھا جا رہا ہے کہ آپ کو اردگرد کا کوئی ہوش ہی نہیں ہے۔" لکھے ہوئے صفحات میں سے ایک دو صفحات ہی پڑھنا رہ گئے تھے جب وہ آفتاب کی آواز سن کر چونکی۔

"ارے آپ! آپ کیسے اندر آئے؟" اس نے تحریر پر سے نظر ہٹا کر آفتاب سے پوچھا۔

"باہر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔" آفتاب نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

"اُف!" اس نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ "میں شاید کام والی کے جانے کے بعد دروازہ بند کرنا بھول گئی تھی۔"

"آپ کو خیال رکھنا چاہیے۔ ہمارے حالات اتنے سازگار نہیں ہیں کہ ہم ایسی بے احتیاطی کے متحمل ہو سکیں۔" آفتاب کی سنجیدگی برقرار تھی۔

"سوری آفتاب! میں آئندہ خیال رکھوں گی۔" کشور نے فوراً اس سے معذرت کر لی۔ اس کے اس انداز پر آفتاب فوراً ہی موم ہو گیا۔

"آپ کو مجھ سے معذرت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے آپ کو جو کچھ کہا، اس کا مقصد آپ کو شرمندہ کرنا نہیں تھا۔ مجھے آپ کی فکر ہے اور میں آپ کے معاملے میں کوئی کوتاہی، چاہے وہ آپ سے ہی سرزد ہوئی ہو برداشت نہیں کر سکتا۔" یہ سب کہتے ہوئے اس کی آواز جذبات سے مغلوب تھی۔ کشور پر اس کے ان جذبات کا گہرا اثر ہوا اور وہ بے ساختہ ہی اس کے سینے سے آلگی۔ آفتاب کا ہاتھ خودکار انداز میں اس کے وجود سے لپٹ گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ کشور کا جسم ہولے ہولے لرز رہا ہے۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے اپنے سینے پر رکھا اس کا چہرہ اٹھا کر دیکھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ وہ کچھ گھبرا گیا۔

"یہ کیا؟ آپ رو رہی ہیں۔ شاید آپ کو میری بات بری لگ گئی ہے۔"

"اوں ہوں۔" کشور نے نفی میں سر ہلایا پھر گلوگیر لہجے میں بولی۔ "میری آنکھیں تو اپنی خوش قسمتی کو محسوس کر کے بھر آئی ہیں۔ مجھے زندگی میں بھی کوئی اتنا چاہے گا، میں نے سوچا تک نہیں تھا۔"

"ابھی تو یہ ابتدا ہے، آگے آگے دیکھیے گا ہوتا ہے کیا؟" اس کا جواب سن کر آفتاب کو اطمینان ہوا تو اس کے بالوں کی ایک لٹ کھینچتے ہوئے شوخی سے بولا۔

اس کے انداز پر کشور کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔ پھر وہ اس سے الگ ہوتے ہوئے بولی۔ "آپ منہ ہاتھ دھو کر آجائیں، میں تب تک کھانا نکالتی ہوں۔ کافی دیر ہو گئی ہے، مجھے بھی اب بھوک لگ رہی ہے۔" اس کی بات سن کر آفتاب فوراً ہی کمرے سے باہر نکل گیا۔ فریش ہو کر واپس آیا تو کشور کھانا لگا چکی تھی۔

"آپ نے جن کتابوں کے نام نوٹ کروائے تھے، وہ میں لے آیا ہوں۔ میرے بیگ میں رکھی ہیں، نکال لیجیے گا۔" کھانا کھانے کے دوران اس نے کشور کو بتایا۔

"ٹھیک ہے، میں نکال لوں گی لیکن آپ بتائیں کہ آپ آج کل کیا لکھ رہے ہیں؟ جس وقت آپ آئے میں آپ کا لکھا ہوا ہی پڑھ رہی تھی۔ وہ تو کالمز سے ہٹ کر بالکل الگ چیز ہے۔"

"وہ..." آفتاب مسکرایا۔ "آج کل میں ایک ناول لکھ رہا ہوں۔ اس ناول کا نام منجدھار ہوگا۔"

"مجھے اسی لیے تو حیرت ہو رہی تھی کہ آپ جیسا بندہ جو سیاسی اور معاشرتی مسائل پر تجزیاتی کالمز لکھتا ہو، ناول نگاری کی طرف کہاں چلا گیا۔ یہ تو آپ کا میدان نہیں ہے۔"

"میرے کالمز کی طرح میرا ناول بھی سیاسی اور معاشرتی مسائل پر ہی مبنی ہوگا۔ جو کچھ کالمز میں بے وجوہ نہیں لکھا جا سکتا یا جسے چھاپنے سے اخبار کے ایڈیٹرز و مالکان مصلحتاً گریز کرتے ہیں، وہ فرضی کرداروں کے ساتھ ناول میں آسانی سے لکھا جا سکتا ہے۔ ہمارا کام تو ظلم، ناانصافی، معاشرتی تفریق اور دیگر مسائل کو اجاگر کر کے عوام کو باشعور ہی بنانا ہے نا... اب چاہے اس کے لیے کالم نگاری کا سہارا لیں یا ناول نگاری کا، اصل مقصد تو پورا ہو جاتا ہے۔ ویسے میں آپ کو بتا دوں کہ میں صرف کالم نگار نہیں ہوں۔ طالب علمی کے زمانے میں، میں نے کئی افسانے لکھے تھے جو مختلف ادبی رسائل میں چھپتے رہے۔ بعد میں، میں صحافت کے ساتھ اتنا زیادہ انوالو ہو گیا کہ افسانہ لکھنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ پیر آباد میں اسکول کا سلسلہ شروع کرنے کے بعد رہی سہی فرصت بھی ختم ہو گئی۔ اب عرصے بعد فرصت ملی ہے تو میں نے سوچا کہ چلو یہ کام کر لیتے ہیں۔ اس جگہ نیٹ کی سہولت نہ ہونے کی وجہ سے یوں بھی کرنٹ افیئرز سے فوری طور پر آگاہ نہیں ہو پاتا۔ الیکٹرانک میڈیا کے اس دور میں صرف اخبار پڑھ کر گزارہ نہیں ہوتا، خصوصاً صحافت کی دنیا میں پاؤں جما کر رکھنے کے لیے۔ پچھلی بار میری اپنے ایڈیٹر سے فون پر بات ہوئی تھی تو ہمارے درمیان یہ طے پا گیا تھا کہ میں ہفتے میں دو کے بجائے صرف ایک کالم لکھا کروں گا۔ اس حساب

سے ظاہر ہے میری انکم بھی آدھی رہ جائے گی لیکن فکر کی بات نہیں، ہمارا گزارہ ہو جائے گا۔ بعد میں جب میں یہ ناول مکمل کرلوں گا تو کوئی بھی اچھا پبلشر اسے ٹھیک ٹھاک رائلٹی دے کر چھاپنے پر تیار ہو جائے گا۔ مطالعہ کرنے والوں کے حلقے میں میرے نام کی اچھی شہرت ہے اس لیے مجھے ایسی کوئی فکر نہیں کہ میرا ناول چھپ نہیں سکے گا۔ ناول چھپے گا تو جہاد بالقلم کا حق بھی ادا کرے گا اور ہمارے گھر کو آسودگی بھی دے گا۔''

اس نے کشور کی بات کا جو تفصیلی جواب دیا، اس نے کشور کو بہت سی دوسری باتوں کے ساتھ اس بات کا بھی احساس دلایا کہ آنے والا وقت ان کے لیے معاشی تنگ دستی بھی لاسکتا ہے۔ وہ جن آسائشوں سے بھری حویلی کو ٹھوکر مار کر آئی تھی، اس کے مقابلے میں تو اب بھی کچھ میسر نہیں تھا لیکن ان مادی آسائشوں کے بدلے اسے جو محبت کی دولت ملی تھی، اس نے اسے اتنا مالا مال کر دیا تھا کہ وہ خود کو اس عورت سے بھی زیادہ خوش قسمت تصور کرتی تھی جس کے لیے ایک شہنشاہ نے تاج محل تعمیر کروایا تھا۔ اس کے لیے آفتاب کی سنگت میں یہ چھوٹا سا دو کمروں کا معمولی مکان بھی تاج محل سے بڑھ کر تھا مگر یہ احساس کہ اس کی خاطر آفتاب کو بار بار کوئی نہ کوئی قربانی دینی پڑتی ہے، اسے رنجیدہ کر رہا تھا۔

''کیا بات ہے۔ آپ نے کھانا کھانا کیوں چھوڑ دیا؟''

اس کی خاموشی کو محسوس کر کے آفتاب نے اسے ٹوکا۔

''کچھ نہیں۔ بس میں یہ سوچنے لگی تھی کہ آپ کا ناول نہ جانے کتنے عرصے میں مکمل ہوگا۔ میں نے آپ کے لکھے جو چند صفحات پڑھے ہیں، ان کو پڑھ کر دل چاہ رہا تھا کہ جلد سے جلد پورا ناول پڑھنے کو مل جائے۔'' اس نے خود پر قابو پاکر مسکراتے ہوئے آفتاب کو جواب دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ آفتاب پر اس کی رنجیدگی ظاہر ہو۔ پہلے بھی بعض مواقع پر اس نے اپنی اس طرح کی کیفیات کا اظہار کیا تھا تو آفتاب کو بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ ہرگز یہ بات پسند نہیں کرتا تھا کہ وہ اتنی محبت سے جو کچھ اس کے لیے کرتا ہے، وہ اسے کوئی احسان سمجھے یا شرمندہ ہو۔

''اللہ نے چاہا تو ننھے مہمان کی آمد سے قبل میں اپنا یہ ناول ضرور مکمل کرلوں گا۔'' آفتاب کے دیے جواب نے کشور کی کیفیت کو یکسر بدل دیا اور وہ ایک ننھے ہمکتے وجود کے خیال سے یوں کھل اٹھی کہ کچھ دیر پہلے دل کو گھیر لینے والی رنجیدگی پل بھر میں اڑن چھو ہو گئی۔ آفتاب نے اس کے ہونٹوں پر پھیلی خوب صورت مسکراہٹ کو دیکھ کر اپنے دل میں

گہرا اطمینان محسوس کیا۔ کشور نے اپنی خاموشی کی وجہ اس سے چھپانے کی کوشش کی تھی، اس کے باوجود وہ اصل بات کی تہ تک پہنچ گیا تھا اور اسے ٹوکے بغیر غیر محسوس طور پر اس کی سوچ کا دھارا ایسے رخ پر موڑ دیا تھا کہ وہ مسکرائے بغیر رہ ہی نہیں سکی تھی۔

☆☆☆

ایک مریض کی کیس ہسٹری پڑھتے پڑھتے ڈاکٹر نقوی نے فائل پر سے نظریں ہٹائیں اور سامنے لگے وال کلاک میں وقت دیکھا۔ آٹھ بجنے میں ابھی چالیس منٹ باقی تھے۔ ٹھیک آٹھ بجے وہ اسپتال سے اپنی ڈیوٹی آف کر کے گھر کے لیے روانہ ہو جاتا تھا۔ روانگی سے آدھا گھنٹا قبل وہ پرائیویٹ رومز میں موجود اپنے مریضوں کا حال معلوم کرنے کے لیے ان رومز کا ایک راؤنڈ ضرور لگاتا تھا۔ یہ اس کا برسوں کا معمول تھا جس میں کسی بڑی ایمرجنسی کے پیش نہ آنے کی صورت میں کبھی رد و بدل نہیں ہوتا تھا۔ پابندیٔ وقت کی یہ عادت اس نے اپنے کیریئر کے آغاز سے ہی اختیار کر لی تھی جو اب اس کے اسپتال کے سب سے سینئر سرجن بن جانے تک بے حد پختہ ہو چکی تھی۔ اب بھی اس نے گھڑی دیکھ کر یہی اطمینان کیا تھا کہ اس کے پاس راؤنڈ لینے کے لیے دس منٹ باقی ہیں اور وہ اس عرصے میں زیرِ مطالعہ کیس ہسٹری کو بہ آسانی پڑھ لے گا لیکن اس سے قبل کہ وہ دوبارہ یہ سلسلہ شروع کرتا اس کا موبائل بجنے لگا۔ اس نے میز پر اپنے بائیں ہاتھ کے قریب رکھے موبائل کو اٹھانے سے پہلے اس کی اسکرین پر نظر ڈالی۔ اسکرین پر اس کی اکلوتی بیٹی عائشہ عرف عاشی کا نام جگمگا رہا تھا۔ عاشی کا نام دیکھ کر اس نے موبائل اٹھایا اور ریسیو کا بٹن پش کیا۔ عاشی اور اس کی بیوی اسپتال کے اوقات میں کبھی بھی سخت ضرورت کے بغیر اسے فون کرنے کی عادی نہیں تھیں اس لیے اپنے کام میں خلل محسوس کرنے کے باوجود اس نے کال ریسیو کر لینا ہی مناسب سمجھا۔

''ڈیڈی...'' اس نے ابھی ''ہیلو'' کہا ہی تھا کہ عاشی نے بڑے کرب بھرے لہجے میں اسے پکارا اور پھر ایک سسکی لی۔

''کیا بات ہے بیٹا! تم ٹھیک تو ہو؟ گھر پر سب خیریت تو ہے نا؟'' عاشی کا لہجہ اور پھر سسکی سن کر وہ بے قرار سا ہو گیا اور تیزی سے پوچھنے لگا۔

''شوبی اسکول سے واپس گھر نہیں پہنچا ڈیڈی!'' عاشی نے اسے جواب دیا اور پھر بلک بلک کر رونے لگی۔ اس کا

جواب سن کر اس نے ایک گہری سانس لی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے۔ اس کی بے حد لاڈلی اور کسی حد تک خودسر بیٹی سے نوجوانی میں ایک غلطی ہوئی تھی اور اس کی غلطی کی سزا انہیں اب بھی وقتاً فوقتاً بھگتنی پڑتی تھی۔ عاشی کی اس غلطی کا نام کامران تھا۔ کامران اس کا کلاس فیلو تھا جس کی محبت میں وہ اس بری طرح گرفتار ہو گئی تھی کہ اسے ماں باپ کی محبت پر بھی یقین نہیں رہا تھا۔ جب اس نے پہلی بار کامران کو اپنی پسند کی حیثیت سے والدین سے متعارف کروایا تھا تو گویا دل میں یہ ٹھان چکی تھی کہ ہر حال میں اپنی پسند کو اپنا کر رہے گی اور اگر والدین میں سے کسی نے مخالفت کی تو اس مخالفت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے انتہائی قدم اٹھانے کی ضرورت پڑی تو وہ بھی اٹھا لے گی۔

ڈاکٹر نقوی اور ان کی بیگم دونوں ہی پڑھے لکھے اور باشعور تھے جو بلاوجہ بیٹی کی پسند کو قبول کرنے سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ کامران سے ہونے والی پہلی ملاقات میں اس کے لیے دل میں ناپسندیدگی محسوس کرنے کے باوجود ڈاکٹر نقوی نے عاشی سے اس کا رشتہ کرنے سے فوراً انکار کرنے کے بجائے بہت سوچ بچار سے کام لیا اور ایک ہفتے کامران کے متعلق چھان بین کرتا رہا۔ اس چھان بین کے نتیجے میں اسے کامران کے کردار کے بارے میں تو ایسی کوئی بات سننے کو نہیں ملی جس کو بنیاد بنا کر وہ اسے ریجیکٹ کر سکتا لیکن بہرحال، وہ اسے اپنے اکلوتے داماد کی حیثیت سے کچھ اچھا بھی نہیں لگا۔ لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والے کامران کے بہن بھائیوں کی تعداد آدھا درجن تھی اور وہ جس چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے، وہاں عاشی کی شادی ہونے کی صورت میں اسے کہاں رکھا جاتا؟ اس بات کا جواب ڈاکٹر نقوی کو کم از کم نہیں سوجھا تھا۔ کامران کے خاندان میں تعلیم کا بھی کچھ خاص رجحان نہیں تھا۔ اس کے والدین قطعی ان پڑھ تھے اور بہن بھائی بھی بس یونہی رسمی سی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ خود کامران بھی زیادہ اچھا طالب علم نہیں تھا اور اب تک اوسط درجے سے ہی کامیاب ہوتا رہا تھا۔ اس کے ان کوائف سے ظاہر تھا کہ وہ مستقبل میں بھی کسی نمایاں مقام اور اچھی ملازمت وغیرہ کے حصول میں ناکام رہے گا۔ کامران سے شادی کرنے کی صورت میں عاشی کو اپنے باپ کے گھر کے مقابلے میں بہت مشکل زندگی گزارنی پڑتی لیکن ڈاکٹر نقوی اور اس کی بیوی عاشی کو یہ بات نہیں سمجھا سکے۔ اس پر عشق کا وہی بھوت سوار تھا جو ماں باپ کو بھی ظالم سماج کی قطار میں کھڑا کر دیتا ہے۔ عاشی کی ضد دیکھتے ہوئے ڈاکٹر نقوی نے ہتھیار ڈال دیے لیکن شادی سے قبل کامران کے سامنے یہ شرط ضرور رکھی کہ وہ عاشی کو علیحدہ گھر میں رکھے گا۔ یہ گھر اس نے ایک لگژری فلیٹ کی صورت میں خود عاشی کے جہیز میں دیا اور کافی حد تک مطمئن ہو گیا کہ بیٹی کے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے وہ شادی کے بعد بھی مستقل تحائف کی صورت میں اور کبھی کبھار بذریعہ کیش اس کی مالی معاونت کرتا رہتا تھا۔ کئی ماہ تک عاشی والدین کے سامنے اپنی خوش گوار ازدواجی زندگی کا ڈھونگ کرتی رہی لیکن پھر ایک دن اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہو گیا۔

اس روز وہ اور اس کی بیوی ایک تقریب سے واپسی میں اچانک عاشی سے ملاقات کے لیے اس کے فلیٹ پر پہنچے تو دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ ایسا پہلے بھی دو چار بار ہو چکا تھا جس کے جواب میں عاشی نے انہیں بتایا تھا کہ وہ کامران کے ساتھ آؤٹنگ کے لیے گئی ہوئی تھی۔ اس بار بھی تالا دیکھ کر انہوں نے یہی گمان کیا اور آپس میں یہ طے کرتے ہوئے کہ آئندہ عاشی سے فون پر پوچھے بغیر اس کے گھر نہیں آئیں گے، واپس پلٹنے لگے... لیکن اس سے قبل کہ وہ دونوں لفٹ تک پہنچتے، ایک نوعمری لڑکی نے انہیں آواز دے کر اپنی طرف متوجہ کیا اور پھر اس نے جو انکشافات کیے انہیں سن کر دونوں میاں بیوی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

لڑکی کے مطابق عاشی اندر ہی موجود تھی اور اس کا شوہر روزانہ کی طرح اسے تالے میں بند کر کے گیا تھا۔ لڑکی نے انہیں یہ بھی بتایا کہ کامران عاشی کو روزانہ زدوکوب کرتا ہے اور وہ بہت تکلیف دہ زندگی گزار رہی ہے۔ یہ سب جان لینے کے بعد ڈاکٹر نقوی ایکشن میں آ گیا اور بالآخر عاشی کی شادی کامران سے خلع کی صورت میں انجام تک پہنچی۔ بعد میں عاشی نے ہی اسے بتایا تھا کہ کامران ایک بے پناہ لالچی اور پست ذہنیت کا آدمی تھا جو اسے نہ صرف باپ سے رقم مانگنے پر مجبور کرتا تھا بلکہ اس پر تشدد بھی کرتا تھا۔ وہ خود چند ماہ میں کامران سے اکتا گئی تھی لیکن کیونکہ اپنی ضد سے شادی کی تھی، اس لیے کامران کی مار پیٹ اور گالم گلوچ کے باوجود باپ پر اس کی اصلیت ظاہر کرتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ یہ دراصل اس کی ایک اور حماقت تھی لیکن بہرحال اسے کچھ بھی جتائے بغیر ڈاکٹر نقوی نے اسے کامران نامی مصیبت سے نجات دلا دی۔ کامران سے علیحدگی کے وقت عاشی پریگننٹ تھی۔ بیٹا پیدا ہونے کے بعد مسز نقوی نے بچے کی ذمے داری خود سنبھال لی اور عاشی نے اپنا تعلیمی سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا۔ زندگی اچھی خاصی معمول پر آ گئی تھی۔ عاشی